

گوہرِ وفا



رفاقت جاوید

گوہرِ وفا

رفاقت جاوید

القریبش پنبلی کیشنز

بکس نمبر ۱۱۰، بازار اڑکھ پور

فون 042-37652546, 37668958

معیاری اور خوبصورت کتابیں

باہتمام محمد علی قریشی

جملہ حقوق محفوظ ہیں

بار اول 2013ء

مطبع نیر اسد پریس لاہور

کمپوزنگ کلائمکس گرافکس

قیمت 400/- روپے

ہیش افند

یہ اپنا ناول "عمر ہاواں" ایک تاریخی اور اصلاحی ناول ہے۔ جس میں عورت کی اصلاحی صلاحیتوں کی بھرپور عکاسی کی گئی ہے۔ میں نے ہرگز exaggeration نہ کیا ہے بلکہ ایک اعلیٰ حقیقت ہے میری ذات۔

یہ ناول "کوہر ونا" کی کہانی بھی اسی ذات کے ارد گرد گھومتی ہے۔ اس ناول کی کہانی میں دل میں محبت کا ٹھکانہ مارتا ہوا سمندر موجزن ہو گیا ہے۔ لے لے اور اپنی مستقل مزاجی سے کوہ ہمالیہ کو بھی ہنس کر سر کر لے۔ پانی لہو لہا لے رہا ہے۔ یہاں آپ بات کا نام دے دے۔ صرف محبت کی خاطر۔

اس ناول میں وہی اعلیٰ ذات نے اپنی کم مائیگی اور کسمپرسی سے نکلنے کے لئے کہا۔ یہی اعلیٰ ذات ہے نہ ہالے دیا اور اپنے معاشرے، اپنے خاندان اور اپنے گھر کے لئے تمام اصواہ اور قوانین کو پس پشت ڈال کر اپنے پیارے خونی رشتوں کو نبھایا۔ بعد میں اس کے ایثار کو خود غرضی کا نام کیونکر دیا گیا؟ ماں کے تصور کی ہاداش میں اس کی بیٹی، زمانے کی چکی میں پستی ہی چلی گئی اور بھٹی میں کندن بن کر اٹھ گیا۔ یہی ذات کہ اپنی ذات کی پہچان بن گئی۔

میں نے یہ ناول ان معصوم، ناسمجھ اور ناتجربہ کار بچیوں کے لئے لکھا ہے جو اپنی لڑائیوں کی اعلیٰ کی وجہ سے والدین کے درست فیصلوں کو اہمیت نہیں دیتیں۔ اپنی محبت اور دوسرے کی ان دیکھی چاہت کے بل بوتے پر ان رشتوں کو چھوڑ دیتی ہیں۔ بن کی ازل سے بنیاد ہی اللہ تعالیٰ نے بے لوث پیار پر رکھی ہے۔ سوال یہ ہے کہ اس

اسٹیج پر لانے والا کون ہے کہ وہ بے وقعت، بے حیثیت اور بے نشان ہو کر دکھوں اور
پچھتاؤں کی آماجگاہ کی باسی بن کر رہ جاتی ہیں۔

ایسا کیوں ہے؟..... یہ سوال ہے آپ سب سے کہ عورت کی اس تباہی و بربادی
میں کس کا کتنا ہاتھ ہے؟

ناول پڑھیے اور سوال کا جواب پا کر خود کو مستحکم بنائیے۔ اور اپنی زندگی میں ہر قسم
کا فیصلہ کرتے وقت دل کی آواز پر توجہ دینے کے بجائے ذہن کی پکار سنیں۔ شکریہ۔ میں
بے حد مسرت و فخر سے محمد علی قریشی صاحب کا تہہ دل سے شکریہ ادا کرتی ہوں جنہوں
نے میرے ساتھ نہایت مخلصانہ طریقے سے تعاون کیا ہے۔

آپ سب کی دعاؤں کی خواستگار
رفاقت جاوید

داعلیٰ دروازے کے سامنے والی دیوار پر سنہری حروف سے کندہ اس آیت کو ”وَإِذَا مَرَضْتُ فَبُهِتَ الْيَتِيمُ“ (جب میں بیمار ہوتا ہوں پھر اللہ ہی مجھے شفا دیتا ہے) پڑھ کر سب عقیدت و احترام کے ساتھ آگے بڑھ رہے تھے۔ چہرے پر اُمید لے گہرے سائے اور دل تسلی و تشفی سے لبریز ہو چکا تھا۔

آج ہسپتال میں ہاؤس جاب کے لئے نئے ڈاکٹرز کا نیا گروپ آرہا تھا۔ چند کو یہ سب لحاظ سے ہاسٹل میں جگہ دی گئی۔ دور کے کچھ رہائشی مل جل کر رینٹ پر رہنے لگے۔

ان میں سے ایک ڈاکٹر جس نے کنگ ایڈورڈ سے ایم بی بی ایس کیا تھا، آصف علی (بہی الدین) مسلم تھا۔ جس کا خاندان کئی سالوں سے لندن میں مقیم تھا۔ اسے وہاں کے ہسپتال میں داخلہ ملا تا اس نے انڈیا اور پاکستان میں ایڈمیشن کے لئے ٹرائی کیا۔ ان کے والدین اسے داخلہ مل گیا۔ جبکہ کنگ ایڈورڈ جو ان کرنے کے بعد Amal India Institute of Medical Sciences سے بھی فیل اسٹی۔ اسے اس نے ری نیٹ لے دیا۔ مقصد پاکستانی پطمر کو جاننا اور ان لوگوں میں کس مل لے رہے کا تھا۔

یہاں لے مامول میں بے پناہ اپنائیت کے احساس کے ساتھ مسلم کنٹری میں اداوی سے مائس لینے کے مزے نے اسے یہاں کا گردیدہ کر لیا۔ حالانکہ والدین پاکستان لے جانے پر اتنے مطمئن تو نہ تھے مگر بیٹے کی خوشی میں راضی برضا ہونے میں ہی مصالحت جانی۔

ایک سال ہسٹل میں گزارنے کے بعد اس نے کالج کے قریب ہی دو بیڈ روم کا مہونا ما گھر والدین سے ضد کر کے خرید لیا اور بمعہ ایک ملازم کے گھر میں شفٹ ہو گیا اور اپنے ہی اشائل سے گھر کو اتنا آرام دہ اور خوب صورت بنا لیا تھا کہ اس گھر کو

دلہ لہ اندرونِ شہر لے مکے کا گمان تک نہ ہوتا تھا۔

یہاں رہتے ہوئے اسے اس قدر اپنائیت اور لگاؤ کا احساس ہوا تھا کہ فخر سے پاکستانی کہہ کر دوسروں کے لئے اہم ہو جاتا۔ والدین اُس کے اظہارِ عقیدت و پسندیدگی کو ابا بالی اور جذباتی پن کا نام دے کر مذاق میں اڑا دیتے۔

وہ والدین کے ساتھ وکیشنز گزارنے کی نیند اگیا ہوا تھا، جب اُسے اپنے رزلٹ کا مژدہ فرحت سنایا گیا۔ اُس کا دل چاہا کہ اُڑ کر پاکستان پہنچ جائے۔ مگر فوری طور پر ایسا کرنا ممکن نہ تھا۔ والدین کی اکلوتی اولاد ہونے کی وجہ سے اس پر ان گنت ذمہ داریاں بھی عائد تھیں۔ وہ انہیں تنہا چھوڑ کر واپس آنے کا تصور بھی نہ کر سکتا تھا۔ مگر والدین کو اس کے مزاج کو سمجھنے میں دیر نہ لگی۔ انہوں نے اس کی خوشی کی خاطر چند دنوں میں ہی لندن مراجعت کرنے کا پروگرام بنالیا۔ اور یوں آصف لندن سے ہوتا ہوا پاکستان آگیا۔

اس کے پہنچنے تک ملازم نے گھر کو چکا دیا تھا۔ مالی نے گملوں کو رنگ کر موسیٰ پھول لگا دیئے تھے۔ چھوٹے سے صحن میں تمام گملوں کو سجانے سے اک زندگی کا احساس ہوتا تھا۔ ملازم نے فریج میں اس کی پسند کا کھانا اور بیکری کا سامان بھر دیا تھا۔ اپنی اس چھوٹی سی آزاد دنیا میں آکر اس نے آزادی و تسکین سے بھرپور ایک طویل سانس لیا اور سکون سے بھرپور انگڑائی لی۔ چھوٹے سے گھر میں پھرتے ہوئے وہ مسلسل سوچے جا رہا تھا کہ پاکستانی تو بہت مخلص اور ہمدرد لوگ ہیں۔ سب سے خوبصورت بات یہ کہ اسلامی ملک ہے۔ مذہبی اور شخصی آزادی ہی تو زندگی ہے۔ گھٹ گھٹ کر سانس لینا اپنی عیدوں کو خاموشی سے گزارنا اور اپنی ہر عبادت میں ان کی دخل اندازی، نفرت و حقارت کو صرف اس لئے ہنس کر برداشت کر لینا کہ کہیں انہیں در بدر ہی نہ کر دیا جائے، ان کی جوان بہنوں اور بیٹیوں کی بے حرمتی نہ ہو جائے، ان کے بچوں کو کوئی اٹھا کر نہ لے جائے۔ یہی سوچتے ہوئے وہ صوفے پر لیٹ کر اپنے دوستوں کو فون پر واپس آنے کی اطلاع خوشی خوشی دینے لگا۔

دوسرے موبائل پر ڈیڈی کی طرف سے آنے والی رنگ ٹون نے اسے چونکا دیا۔ خود کو کوستے ہوئے دوستوں کو خدا حافظ کہہ کر دوسرا فون اٹینڈ کرتے ہوئے ندامت سے بھرپور لہجہ میں بولا۔

”آئی ایم سوری ڈیڈی! آپ کو خیریت سے پہنچنے کی اطلاع ہی نہ دے سکا۔

دیے مجھے گھر پہنچے گھنٹہ ہی تو ہوا ہے۔ ابھی تو اپنے گھر کا معائنہ ہی کر رہا تھا۔ ملازم نے تو امپریس ہی کر ڈالا۔ کھانا تک تو تیار ہے۔ نمک حلال ہیں یہ سب لوگ۔“ اس کے لہجے میں خوشی عود کر آئی تھی۔

”نیور مائنڈ بیٹا! آئی نو کہ تمہیں پہنچے زیادہ دیر نہیں ہوئی۔ بس کیا بتاؤں بیٹا! اب تو مجھے بھی یاد آنے لگے ہو۔ مگر کروں گا وہی، جس میں میرے بچے کی بہتری ہے۔“ وہ ایک دم مستحکم لہجے میں بولے تو وہ تشکر آمیز لہجے میں بولا۔

”یو آر ٹو گریٹ ڈیڈی! آئی نو یو..... ہاں تو مئی کیسی ہیں؟ مسٹ بی ویری سیڈ۔“ ”ہاں بیٹا! تم اسے تو جانتے ہوتا۔ خاموش ہو جاتی ہے، جب بے بسی کی فیلنگ ہو۔ خاموش حسینہ بنی بیٹھی ہے محترمہ۔“ وہ مزاحیہ انداز میں بولے۔ ”تمہاری آواز سنتے ہی اس کا من ہنسنے لگے گا، تمہیں ملنے کو۔ ماں کے دل کو تم اور میں تو جاننے سے رہے۔ نجانے بیٹے کی جدائی میں کیا عالم ہوتا ہے ان کے دل کا۔“

”ڈیڈی! بات کر دیجئے۔“ وہ بھی اُداس ہو کر بولا تو ڈیڈی نے فون ماں کو پکڑا دیا۔

”مئی! اگر آپ اُداس ہیں تو میں واپس آ جاتا ہوں۔ مجھے آپ کی خوشی عزیز ہے۔ میرا کیا ہے، میں تو ہر حال میں خوش رہنے والا انسان ہوں۔ مجھے تو فقط اپنی ماں کی دعا اور تسلی کی ضرورت ہے۔ آپ حکم کریں مئی! بسر و چشم۔“

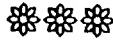
وہ بیٹے کی باتوں پر رونے لگی۔ خود پر قابو پا کر آواز کو شکستہ بناتے ہوئے بولی۔ ”ایسی بھی اُداس نہیں ہوں۔ بس انتظار ضرور ہے۔ اس پر تو اپنا اختیار ہی نہیں بیٹا! یہ دل ہی تو ہے۔“ لہجے کی بے بسی سے وہ چونک گیا۔ ”سچ سچ ماں تو اُداس ہے۔ میں بھی تو حد ہی کرتا ہوں۔ اپنے ہی مراق میں خود مرکزیت کا مارا ہوا انسان ہوں۔ دیے ہوں کافی حد تک خود غرض۔ ایک دم سے چغند، اُس نے دل میں بیزاری سے سوچا۔

”جی مئی! آپ اُداس نہ ہوں۔“ وہ پُر مسرت اور کیف آگئیں لہجے میں بولا۔ ”آپ فکر نہ کریں۔ بس دعا دیں۔ آخر کار میں نے آپ کے پاس ہی تو واپس آنا ہے۔“ ”بس بیٹا! جلد ہی وہاں سے نکلنے کی کوشش کرو۔ ہمارا کیا رکھا ہے پاکستان میں؟ ہر وقت خوف زدہ ہی رہنے لگی ہوں۔ کہیں تم اُدھر کے ہی ہو کر نہ رہ جاؤ۔ بیچو گھر کو۔ خواہ تم نے وہاں پر اپنی خرید لی۔ مجھے لگتا ہے، اب تمہارا وہاں دل لگ گیا ہے۔“

وہ فکر مندی سے بولی۔

”آپ فکر نہ کریں۔ واسنڈ اپ کرنا بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔ چٹکی بجاتے پڑ جاؤں گا۔ ذرا دیکھیں تو سہی۔ میں بھی تو آپ کے بغیر اُداس ہو جاتا ہوں۔“ وہ ماں خوش کرنے کے انداز میں بولا تو وہ آنسو صاف کرتے ہوئے ہنستے ہوئے بولی۔

”ذرا مسکھ کم۔ میں تمہیں جانتی ہوں۔ شریر کہیں کا۔“



آصف علی نے آج ڈنر پر اپنے قریبی دوستوں کو گھر پر مدعو کیا ہوا تھا۔ جس میں میمونہ اور سائرہ بھی موجود تھیں۔ جن کے گھروں میں اس کا آنا جانا معمول تھا۔ دونوں کے پیرنٹس اسے پیار بھی کرتے تھے اور پاکستانی میزبان ہونے کی حیثیت سے ان کا مذمہ داری کو احسن طریقے سے نبھا بھی رہے تھے۔

کھانے کے دوران سب آصف علی کو یہاں ہی ہاؤس جاب لینے پر آمادہ کر۔ کی کوشش کر رہے تھے۔ وہ عالم تذبذب میں گھرا ہوا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ پیرنٹس ہاؤس جاب پاکستان میں کرنے کی اجازت ہرگز نہیں دیں گے۔ پھر بھی سب اصرار پر اس نے می سے بات کی۔ سب کان لگائے ان کی گفتگو سن رہے تھے۔

”ممی! ایک سال کی تو بات ہے، پلک جھپکتے گزر جائے گا۔ میرے کیریئر لئے بھی تو مفید ہے۔“ وہ ہر طریقے سے سمجھائے جا رہا تھا۔ مگر می اپنی ہی ضد پر اڑ ہوئی تھی۔

”ایشین یہاں آ کر اپنی ایجوکیشن کمپلیٹ کرتے ہیں۔ بھلا پاکستان تمہیں کیا فائدہ پہنچا سکتا ہے۔“

”ممی! میری پیاری می! آپ ایسی ضدی بچی تو کبھی نہ تھیں۔“ وہ پیار سے! رہا تھا۔

”تمہاری می تمہارے پیار میں ضدی تو کیا، بہت ظالم بھی ہو گئی ہے۔ بس تم واپس پہنچو۔ میری آنکھیں تمہاری راہ دیکھتے ہوئے تھک گئی ہیں۔“ وہ ہنستے ہو رہا ہوا ہو گئی۔

”ممی! ہاؤس جاب شروع ہونے سے پہلے ملنے آ جاؤں گا۔ بریو بچے رو نہیں، ضد نہیں کرتے۔“ وہ ہنستے ہوئے چھیڑنے لگا۔ ”ممی! بزدل ماں کی اولاد! ہو کر کیا بنتی ہے، جانتی ہیں نا۔ تو بس وہی بن جاؤں گا۔ پھر نہ رونا۔“

”مامتا بہت بزدل ہوتی ہے آصو!“ وہ رو پڑی تھیں۔ ”تم نہیں جانتے میرے بچے! میں نے پانچ سال کا عرصہ تمہاری جدائی میں کیسے گزارا ہے۔ میں نے کبھی اظہار نہیں کیا تو اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ تمہیں.....“ ایک توقف کے بعد بولی۔ ”اب تمہاری دُوری کا تصور بھی نہیں کر سکتی۔“

”اب میں کیا کر سکتا ہوں؟ ممی کو بیٹے سے عشق جو ہو گیا ہے، جو چھپائے نہیں چھپ رہا۔ ٹھیک ہے ممی! چند ہفتوں میں ہی آ جاؤں گا۔“ وہ اُداسی و مایوسی بھرے لہجے میں بولا۔

”یہ ہوئی نا فرمانبرداری بچوں والی بات۔ تم پر میری ہر سانس قربان۔ آئی تو یو۔ بس تمہارے آتے ہی اپنی ذات برادری سے لڑکی دیکھتی ہوں۔ بہت حسرت ہے کہ تمہارے سرسرا سجا ہوا دیکھوں۔ اپنے پوتے اور پوتیاں کھیلاؤں۔“ وہ پیار سے بول رہی تھی۔

”ابھی تو شادی کا سوچنا پھوڑ دیں۔ پہلے تعلیم تو مکمل کر لوں۔ یہاں مجھے میرٹ ہاؤس جا ب آمانی سے مل جاتی۔ میرے کیریئر کے لئے بہت بہتر ہوتا۔ وہاں انگریز بھیانہ جانے یہاں کی ڈگری کو کیا میرٹ دیتا ہے۔ مسئلہ اتنا سا ہے۔ ورنہ کبھی آپ سے دُور رہنے کا خیال بھی ذہن میں نہ آنے دوں۔“ وہ سنجیدگی سے بولا۔

”یہ تمہارے ڈیڈی آگئے ہیں۔ خدا کے لئے ان سے مشورہ مت لیتا۔ وہ میری امانت پر عمل کرنا چاہتے ہیں، میری ایک نہیں سنیں گے۔ اپنی ہی منوا کر چھوڑیں۔“ وہ امانت پر عمل کرنا چاہتے ہیں، میری ایک نہیں سنیں گے۔ اپنی ہی منوا کر چھوڑیں۔

”اب وہاں پہنچے۔ اب وہ تو تمنا پوری ہو گئی۔“ وہ سنجیدگی سے بولی۔

”اب ہمارا ازداری چل رہی ہے؟ ذرا میں بھی سنوں۔“ وہ قریب آ کر بیگم سے مسکرا

”الو! مناس نہیں۔“ اس نے ٹالتے ہوئے فون بند کر دیا۔ لیکن فوراً آصف کی

”الو! فون آ گیا۔ ڈیڈی نے ممی کے ہاتھ سے فون لے کر کان کو لگایا اور

”الو! مناس نہیں؟ تمہاری ماں بتانا نہیں چاہ رہی۔ فوراً ہی فون

”الو! مناس نہیں! ادھر ادھر کی کن سوئیاں لے رہی تھیں ممی۔ اور آپ

لے ہارے میں کوئی اچھی رپورٹ نہیں دے رہیں۔ یعنی آپ ان کا خیال نہیں رکھتے۔
راتوں کو گھر دیر سے آنے لگے ہیں۔ ڈیڈی! کیا چکر ہے؟ مجھے بھی تو بتا دیجئے نا۔ ذرا
انجوائے ہی کر لوں گا سن کر۔“ وہ چھیڑتے ہوئے بولا۔

”یہ تو عورتوں کی خاص الخاص خصلت ہوتی ہے۔ مگر تمہاری ماں تو ایسی نہیں۔ یہ
تمہاری اپنی ہی اختراعات ہیں۔ ہاں تو یہ بتاؤ، کب آرہے ہو؟ اکیلا پن تنگ کرنے
لگا ہے اب۔ اگر گھر سیل ہونے میں دیر ہے تو کرائے پر ہی دے دو۔“ وہ شگفتہ لہجے
میں کہہ رہے تھے۔

”ڈیڈی! کرائے پر کیوں؟ آپ جانتے تو ہیں کہ یہاں غیر موجودگی میں گھر
اپنے نہیں رہتے۔ سیل کرنا ہی ضروری ہے۔ دراصل ابھی میں خود بھی اتنا سیریس
نہیں۔ سوچ رہا ہوں کہ کیوں نہ ہاؤس جاب یہیں کر لوں۔ لوگ بھی خوب ہیں۔
بہت عزت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ دوست بھی بے مثال ہیں۔ ان کے گھروں میں
میرا آنا جانا رہتا ہے۔ ان کے پیرش جس تپاک سے مجھے دیکھ کہتے ہیں، میں حیران
ہی ہو جاتا ہوں۔ بہت اچھا وقت گزرا ہے میرا۔ لندن میں اتنے سال رہنے کے
باوجود بھی ہم ان کے لئے اور وہ ہمارے لئے اجنبی ہیں۔ نہ باؤنڈنگ ہے، نہ کسی قسم
کی ایچ منٹ۔ بس نفسا نفسی کا عالم ہے وہاں۔ عجیب سی زندگی ہے وہاں کی۔“ وہ
سنجیدگی سے بولا۔

”بیٹے! ماں کو یہی تو خدشہ ہے۔ دن رات پریشان رہنے لگی ہے کہ کہیں تم وہیں
کے ہو کہ نہ رہ جاؤ، وہاں شادی نہ کر لو۔ پھر تو تم ادھر آنے سے رہے۔ بیٹا! ماں کے
ذہن میں عام لوگوں سے ہٹ کر ایک ایکسٹرا حس ہوتی ہے اولاد کے لئے۔ وہ اولاد
کے من کو خوب پہچانتی ہے۔ آج تمہاری باتیں سن کر مجھے یقین ہونے لگا کہ تم ماں
سے کہاں تک چھپ سکتے ہو۔ اب تم بچے نہیں رہے۔ بیٹے! سوچ سمجھ کر قدم اٹھانا
سیکھو۔ اس وقت تمہیں نہایت دانش مندی سے فیصلہ کرنا ہے۔ باقی وہاں کے دوستوں
کی خاطر اپنا گھر اور والدین تو نہیں چھوڑ سکتے۔ بیٹا! جب پریکٹیکل لائف میں آ جاؤ
گے تو دور کے دوست دل سے بھی دور ہو جائیں گے۔ کیونکہ طالب علمی کے زمانے کی
تمام باتیں ہی فرق ہوتی ہیں۔ تمام فیلنگو بہت عارضی اور غیر معیاری ہوتی ہیں۔ ہمارا
پاکستان سے بھلا کیا واسطہ کہ تم وہیں سیٹل ہو جاؤ اور ہم یہاں تڑپ تڑپ کر جان
دے دیں؟“

”آپ کی کسی بات سے انکار نہیں۔ میں ویسے ہی آپ کو بتا رہا تھا کہ ان لوگوں میں محبتوں کا خیر شامل ہے۔ اپنے اپنے سے لگتے ہیں۔“ وہ ہنستے ہوئے بولا۔

”تمہاری ممی نے سنا تو ہارٹ اٹیک ہو جائے گا۔ ذرا سوچ سمجھ کر بولو یا ر! میں حیران ہوں اس بات پر کہ وہ اپنی سوچ میں کتنی سچی نکلی۔ لیکن میں یہ سب کچھ لڑوں ہونے دوں گا۔ تم جلد از جلد واپس آؤ۔ بس بہت ہو گئی۔“ وہ اضطرابی کیفیت سے بولے۔

”میں جانتا ہوں ڈیڈی! ایک ہونے کا یہی تو نقصان ہے۔ پیرنٹس بھٹکنے دیں، سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔“ وہ ہنستے ہوئے بولا۔ ”ذرا ممی سے تو بات کرا دیجئے۔ وہ میرے مسئلے کو ضرور سمجھ پائیں گی۔ آخر ماں ہیں۔“

”ہاں تو بولو بیٹا! کیا پھر وہی بات کہو گے؟“ وہ سنجیدگی سے بولی۔

”ہرگز نہیں۔ آپ کی طرف سے اجازت نہیں۔ بس سن لیا، مان لیا اور آ گیا۔“ وہ پیار بھرے لہجے میں بولا۔ اسے ماں سے ہر بات منوانے کا طریقہ آتا تھا۔ اس نے ضد ہارٹ دھرمی دھماکے بجائے ان کی بات مان لینے کی ایکٹنگ کی جو کافی حد تک کامیاب ہوتی نظر آئی۔ ماں ایک دم سے ٹپ کر بولی۔

”ہائے میرا بچہ!..... سچ بتاؤ کہ کیا تمہارے فوج کے لئے وہاں کا ہاؤس جاب بہتر ہے؟ کیا یہاں تمہیں مشکلات کا سامنا کرنا پڑے گا؟“ ماں نے ایک دم سے نرم پڑ کر لبیدگی سے پوچھا تو میاں اپنی شریسی مسکراہٹ دباتے ہوئے وہاں سے اٹھ گئے۔

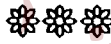
”جی ممی! لیکن میں بھی تو آپ کے بغیر بہت اُداس ہو جاتا ہوں۔ اور آپ تو اگلیوں پر دن گننے بیٹھ جاتی ہیں۔ فوج کو گولی ماریں۔ ماں بیٹا مل کر خوب عیاشی کریں گے۔ یہ ضروری ہے۔ ہمارے پاس پیسے کی کمی تو ہے نہیں کہ میں ضرور ہی نوکری کروں۔ آپ میرے گھر بیٹھنے پر خوش ہیں تو مجھے اور کیا چاہئے؟ تینوں سب سے پہلے ورلڈ ٹور پر نکلیں گے۔“ وہ پُر جوش لہجے میں بولا۔

”اللہ نہ کرے کہ تمہارا فوج میری خود غرضی کی نذر ہو جائے۔“ وہ چونک کر بولی۔ ”تم اپنی زندگی بے کار کیونکر گزارو بیٹا! دولت ہر کمی کو پورا نہیں کر سکتی۔“

”ایسی بات نہیں ممی! مجھے تو آپ کی خواہش کو ہر صورت اور ہر حال میں پورا کرنا ہے۔“ وہ دوستوں کو آنکھ مار کر بولا۔ ”آپ کی خوشی کی خاطر سب کچھ چھوڑ سکتا ہوں۔ یہ تو ایسی خاص قربانی نہیں کہ کل مجھے پچھتانا پڑے۔“

”میرے بچے! تمہاری یہی فرمانبرداری تو میرے حوصلے بلند کر دیتی ہے۔ کیا یاد کرو گے کہ کس ماں سے پالا پڑا تھا۔ تمہیں ہم دونوں کی طرف سے وہاں ہاؤس جاب کرنے کی اجازت ہے۔ کیوں جی، میں نے غلط فیصلہ تو نہیں کر دیا؟“ ماں نے ڈیڑی کی طرف دیکھ کر مسکرا کر کہا تو وہ اُسے پُرستائش نظروں سے دیکھنے لگے۔

”ہپ ہپ ہرے.....“ اُس نے فون بند کیا اور خوشی سے لبریز نعرہ ڈرانگ روم میں گونجنے لگا۔ تمام دوست گانا گانے لگے، ڈانس کرنے لگے۔ اور آصف اپنی ماں کی مدح سرائی میں زمین و آسمان کے قلابے ملانے لگا۔ بات بھی سچ تھی کہ اُس نے بچے کی خوشی کی خاطر اپنے دل پر منوں بھاری پتھر کی سل رکھ لی تھی اور اپنے اس فیصلے پر اپ سیٹ ہونے کے بجائے وہ مستی میں جموم گئی تھی۔ اگلیوں پر مہینوں کا حساب کرنے لگی۔



ٹریننگ کے بعد صدیقہ سسٹر کا ہاسپٹل میں پہلا دن تھا۔ آصف علی زیدی بھی اپنے سینئر ڈاکٹر کی ہدایات کے بعد ہر پشٹ کی فائل کھول کر ہسٹری پر غور کر رہا تھا۔ صدیقہ سسٹر نے الیکٹرک کیبل میں پانی اُبال کر دو مگنوں میں چائے دم کی اور میز پر اس کے سامنے رکھ کر نہایت ملائمت سے گویا ہوئی۔

”سر! بسکٹ لیجیے۔“ اُس نے ڈبہ کھول کر بسکٹ پلیٹ میں رکھتے ہوئے کہا۔ ”تھینک یو۔ ویسے اس وقت چائے کی طلب ہو رہی تھی۔“ وہ بسکٹ پلیٹ سے اٹھاتے ہوئے بولا۔ ”رات کی ڈیوٹی تو اسی کی مرہون منت ہے۔ ورنہ رات بھر جاگنا مشکل ہو جاتا ہے۔“

”لیس سر!“ وہ مودبانہ انداز میں سر اثبات میں ہلا کر بولی۔ ”انگریز کو دعا دینی چاہئے، جس نے اسے ڈسکور کیا۔“

”انگریز کے پاس چائے، چائے سے طویل مسافت طے کر کے پہنچی تھی۔ دعا کا اصل حق دار تو چینی بھائی ٹھہرا۔“ وہ چائے کی چسکی لیتے ہوئے بولا۔ ”ہم ہر بات میں انگریز کو کیوں گھسیٹ لیتے ہیں؟ وہ تو یہاں سے رخصت ہو گیا مگر اپنے چیلے اکھوں کی تعداد میں یہاں چھوڑ گیا۔“

ہائے، کیسا سر پھرا انسان ہے۔ ایک بات میں نے کی، دس باتوں میں اس نے جان ڈال دی۔

ڈیوٹی کا دورانیہ، صدیقہ کی خاموشی اور ڈاکٹر آصف کی بال کی کھال نکالنے میں گزارا۔ جاتے وقت اُس نے مسکرا کر سسٹر سے پوچھا۔
”فرسٹ ڈے کیسا رہا؟“

وہ سوچنے لگی کہ اس کی دلچسپ باتوں میں رات گزرنے کا احساس ہی نہ ہوا تھا۔
”سر! آپ کی وجہ سے بہت اچھا گزرا۔ آپ نے میرے confidence میں اضافہ کیا ہے، بہت خوب رہا۔“ وہ مسکرا کر بولی۔ ”وقت گزرنے کا احساس ہی نہیں ہوا۔“

”ابھی میں کچھ مہینے اسی جگہ پر ہوں۔“ وہ ذومعنی سی بات کہہ کر کوریڈور میں نکل آیا۔

”سر! میں اپنی ڈیوٹی آپ کے ساتھ ہی کرنا چاہتی ہوں۔“ وہ بھی باہر نکل کر بولی۔
”وائے ناٹ۔“ وہ لیب کوٹ کو درست کرتے ہوئے بولا۔

”سر! میں آپ کے ساتھ بہت کمفرٹبل ہوں۔“ وہ سنجیدگی سے بولی۔
”آئی ایم آسو ویری کمفرٹبل و دیو۔“ وہ ہنستے ہوئے بولا۔ ”ویسے میں تو ہر پالستانی کے ساتھ بہت کمفرٹبل ہی رہتا ہوں۔ دے آرنٹ کمپلیکسڈ پیپل۔“
”سر! کیا آپ کا تعلق پاکستان سے نہیں ہے؟“ وہ حیرت سے بولی۔
”میرا تعلق.....“ وہ توقف کے بعد مسکرا کر بولا۔ ”کئی ملکوں سے ہے۔“
کوریڈور میں اُسے میمونہ مل گئی۔ وہ وہیں رک گیا اور سسٹر آگے نکل گئی۔

آج دونوں کی نائٹ ڈیوٹی تھی۔ دن بھر کی تھکن اُتارنے دونوں اپنی اپنی جائے پناہ چلے گئے۔ کیونکہ شام سات بجے سے پھر انہیں ہاسپٹل ڈیوٹی پر پہنچنا تھا۔

سردی کا موسم تھا۔ باہر کی ہوا میں خاصی ٹھنڈک تھی۔ صدیقہ جو کمبل میں دبک کر لیٹی تو ایسی گہری آنکھ لگی کہ شام سات بجے روم میٹ سسٹر ٹمینہ کی آواز پر کھلی۔ تیزی سے تیار ہو کر وہ باہر نکلی اور سرد ہوا میں لمبے لمبے سانس لینے لگی۔ دائیں بائیں سے گزرنے والے لوگ ولیز میں بھی ٹھہر رہے تھے۔ گاڑیوں میں بھی ہیٹر آن تھے۔

لیکن صدیقہ حسب معمول دودھ کی مانند چمکتے ہوئے یونیفارم میں تیزی سے چلتی ہوئی گرد و پیش کے ماحول سے بے خبر ہاسپٹل کی طرف بڑھ رہی تھی کہ یک دم بادل گر جا، بجلی چمکی اور تھمے ہوئے انداز میں بارش ہونے لگی۔

اُس نے پرس کو ٹولا، والٹ نکال کر نقدی کا جائزہ لیا۔ مہینے کے آخری چند دن

رہ گئے تھے۔ اس کے پاس اتنے پیسے نہیں تھے کہ رکشہ پکڑے اور ٹائم سے اپنی ڈیوٹی پر پہنچ سکے۔ اب اس کے چلنے میں تیزی بدرجہ بڑھنے لگی۔ اچانک اس کے قریب کالی ٹیوٹا کرولا آ کر رکی۔ ہارن کی آواز پر وہ چونکی اور مڑ کر دیکھا تو آصف علی، ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا مسکرا رہا تھا۔ اس کا سانولا رنگ اس دھندلکے میں اور بھی سیاہ لگ رہا تھا۔ دانت خاصے نمایاں ہو گئے تھے۔ اس کی حیرت پر وہ دوسری جانب کا دروازہ کھولتے ہوئے بولا۔

”سنسز صدیقہ! آجائے۔ اس وقت اس سردی میں یہاں کیا کر رہی ہیں؟ نمونیہ کرانے کا ارادہ ہے کیا؟ ایک تو ان لڑکیوں کو اللہ ہی سمجھے۔ لگتا ہے مٹی سے نہیں، کس دھات سے بنی ہیں۔“

وہ بغیر سوچے سمجھے دوسری طرف آ کر سیٹ پر بیٹھ گئی اور بالوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولی۔

”سر! آج میری ٹائٹ ہے۔ دوپہر کو جو سوتی تو سوتی ہی چلی گئی۔ آنکھ کھلی تو صبح کا گمان ہونے لگا۔ کتنی ہی دیر بعد ذہن بیدار ہوا تو وقت دیکھا اور بھاگ پڑی۔“

”کوئی ٹیکسی، رکشہ ہی منگوا لیا ہوتا۔“ وہ اسٹیرنگ گھماتے ہوئے بولا۔ ”اتنی سردی میں کیا ضرورت ہے سپر گرل بننے کی؟ پیار بڑ گئی نا تو چھٹی ہو جائے گی پکی۔“

”جی۔“ وہ آہستگی سے بولی۔ اُسے حقیقت کیسے بتاتی کہ پرس خاصا ہلکا ہو چکا ہے۔ ان امیروں کو کیا خبر کہ ہم پہلی تاریخ کا انتظار دس تاریخ کے بعد ہی شروع کر دیتے ہیں۔

”چلو اچھا ہوا کہ آج میں بھی لیٹ ہوں۔ ورنہ تم صبح معنوں میں بھگی ملی کی صورت میں ہاسپٹل نمودار ہوتیں۔“ وہ چھیڑنے کے انداز میں بولا۔

’توبہ، کتنا باتونی انسان ہے۔ ایک بات کرو اور پھر کان لپیٹ کر بیٹھ جاؤ۔ لیکن ہے انٹرسٹنگ بندہ۔ بے تکلف اور مانوس سا۔ وہ خاموشی سے اس کی باتیں سنتی رہی۔ آصف نے اس کی طرف مڑ کر دیکھا۔ اس کی گوری رنگت، سردی کی وجہ سے ایسے لگ رہی تھی جیسے میدے میں سیندور کی آمیزش کر ڈالی ہو۔ ماتھے پر پھیکے ہوئے بالوں کی سیاہ لٹیں اور سیاہ آنکھوں میں بلا کی سوچ۔ اسے آج پہلی بار سنسز صدیقہ، خُسن کا مجسمہ ہی تو لگی تھی۔ شاید آج کی تنہائی اور ایسے موسم کا فسوس تھا کہ وہ جھوم اٹھا۔ وہ بالکل خاموش تھی۔ بار بار موبائل آن کرتی اور ٹائم دیکھ کر باہر دیکھنے لگتی۔ وہ

جانتا تھا کہ وہ اس وقت لیٹ ہو جانے پر فکرمند ہے۔

”پریشانی کی بات نہیں۔ آپ کی ڈیوٹی میرے ساتھ ہی تو ہے۔ آج تو بیچ جاؤ گی آئندہ کے لئے بی کیئر فل۔“ وہ نسل دیتے ہوئے ہاسپٹل کی پارکنگ میں پہنچ گیا۔ جونہی گاڑی پارک کر کے باہر نکلا، میمونہ اپنی ڈیوٹی سے واپس جانے کے لئے ساتھ والی گاڑی میں بیٹھ رہی تھی۔ وہ صدیقہ کو آصف کے ساتھ دیکھ کر چونک گئی اور صدیقہ کے چہرے پر نظریں گاڑ دیں۔ وہ جھینپ کر دوپٹہ درست کرتی ہوئی وہاں سے غائب ہو گئی۔ آصف بھی میمونہ کو ہاتھ سے خدا حافظ کہتا ہوا اس کے پیچھے چل دیا۔ اگلے دن یہ خبر ہاسپٹل میں کام کرنے والے ہر فرد کی زبان پر تھی۔ تمام سسٹرز اسے حسرت اور بغض و عناد سے دیکھتی رہ گئیں۔

یہ روز کا معمول بن گیا کہ آصف، صدیقہ کو ہوسٹل سے پک کرتا ہوا ہاسپٹل آنے لگا۔ صدیقہ نے بھی احتجاج کرنا مناسب نہ سمجھا۔ اس کے رد عمل میں مکمل طمانیت تھی۔ وہ ہر موضوع پر بات کرتا اور یہ بہترین سامع کا ثبوت دیتی۔ اب کافی مانوسیت ہو چکی تھی۔

ایک شام واپسی پر آصف اسے ایک ریسٹورنٹ میں ڈنر کے لئے لے گیا تو اس نے احتجاج نہ کیا۔ زندگی میں ایسی تبدیلی کا اس نے کبھی خواب بھی نہ دیکھا تھا۔ حاجت مند والدین کی بیٹی تھی۔ پوری لگن اور ہمدردی سے ان کا ساتھ دے رہی تھی۔ آصف کے ساتھ ریسٹورنٹ میں خاموشی سے بیٹھی سوچے جا رہی تھی۔ آصف نے میو کارڈ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے اپنائیت سے کہا۔

”آج آپ کے سر، آپ کی پسند کا ڈنر کریں گے۔“

وہ چونک کر اس کی طرف دیکھنے لگی اور تذبذب کے عالم میں بولی۔

”مجھے نہیں معلوم۔“

”میری پسند کہ اپنی پسند؟“ وہ مسکرایا۔

”دونوں کی۔“ وہ سوچتے ہوئے بولی۔ ”سر! میں یہ سب نہیں جانتی۔ بالکل ہی

ناواقف ہوں۔ یہ سب کچھ ہم جیسے لوگوں کے لئے نہیں بنا۔“

”کیسے؟“ حیرت اس کی آنکھوں میں پھیل گئی۔

”سر! سہیل سی بات ہے۔ میرے حالات اجازت نہیں دیتے کہ فائو اسٹار ہوٹلز

میں لچ اور ڈنر کرتی پھروں۔ میرا تعلق اس طبقے سے ہے جو ریڈھی پر کھڑے ہو کر دی

بڑے اور گول گپے کھا کر خوش ہو جاتے ہیں..... جبکہ میرے ساتھ رہنے والی تمام سسٹرز مجھ سے بہت مختلف ہیں۔ ہو سکتا ہے، ان کے حالات مجھ سے سازگار ہوں۔“

”میں جانتا ہوں صدیقہ! یہی وجہ ہے کہ تمہارا انتخاب کرنے میں دقت کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔“ وہ قریب ہو کر آہستگی سے بولا۔

”میں سمجھی نہیں۔“ وہ اچنبھے سے بولی۔

”اٹ مینز کہ.....“ وہ خاموش ہو گیا۔ سوچنے لگا کہ اسے کیا کہے اور کیسے کہے۔

”بتائیے نا۔“ وہ بے چینی سے بولی۔ جیسے وہ کچھ بھلا سننے کی خواہش مند ہو۔

”یہی کہ تمہاری کمپنی میں رہنا مجھے بھلا لگنے لگا ہے۔ اپنے بارے میں تم خود ہی بتا دو کہ تمہیں میرے ساتھ کام کرنا کیسا لگ رہا ہے؟ کہیں بوریت تو نہیں ہوئی میری کمپنی میں؟“ وہ اتنا سنجیدہ کبھی نہ تھا۔ وہ یہ سن کر چونک اٹھی۔

”سوچنا پڑے گا۔“ وہ بے ساختہ بولی اور میو کارڈ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے جھجک سی گئی۔

”کھانا تم آرڈر کر دو گی۔“ وہ اپنا میو کارڈ بند کرتے ہوئے بولا۔

”نہیں، آپ۔“ وہ غیر اعتمادی سے بولی۔

”تم آج ہمیں دال روٹی ہی کھلا دو۔“ وہ شکفتہ لہجے میں بولا۔ ”یہاں وہ بھی available ہے۔“ می دال مکھنی بناتی ہیں تو اور اینٹنگ کر جاتا ہوں۔“

”ٹھیک ہے..... میرے گھر میں جو پکتا ہے، اُسی کا آرڈر دیتی ہوں۔ پھر تو اگلے کئی دن آپ کو کھانے کی ضرورت محسوس نہیں ہوگی۔ ایسی اور اینٹنگ کر بیٹھیں گے۔“

وہ ہنستے ہوئے بولی تو آصف اُس کی ہنسی میں گم ہوتا چلا گیا۔

”دیکھئے گا، ہو گا دیسی اور مزے دار۔“ وہ اُس کی طرف دیکھ کر پھر کھل کر ہنسی۔

مکروہ کچھ نہ بولا۔

صدیقہ نے سرسوں کا ساگ، مکئی کی روٹی اور تازہ مکھن اور ساتھ دہی مرغ کا قورمہ، نان، کھیر اور سوچی کا حلہ آرڈر کر دیا۔

”اب مجھ پر چھوڑا ہے تو کھانا پڑے گا۔“ وہ ہنس رہی تھی۔

”ضرور..... ضرور.....“ وہ چونک کر مسکرایا۔

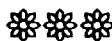
کھانا آیا تو آصف نے خوب انجوائے کیا۔ اور پھر وہ اشتیاق سے اس کے گاؤں

پھوٹے زمیندار ہیں۔ پانچ ایکڑ زمین سے بچت کر کے اسے میٹرک کرایا اور نرسنگ کی ٹریننگ کے لئے اپنوں کی مخالفت کے باوجود شہر بھیج دیا۔

”میرے پیرنس کا تو جواب نہیں ڈاکٹر صاحب! بہت غریب ہیں وہ۔ لیکن غیرت مند ایسے کہ جب بھی اپنی تنخواہ بھیجتی ہوں تو مانڈ کر جاتے ہیں۔ اب میں بہنوں کے ہاتھ میں ان کی سکول فیس پکڑاتی ہوں اور ماں کے صندوق میں چپکے سے باقی رقم رکھ آتی ہوں۔“ وہ ایک دم سے رو پڑی۔

”یہ خوشی کے آنسو ہیں نا؟“ وہ اُس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے ہنس کر بولا۔
 ”دکھ اور خوشی میں بہنے والے آنسو ایک ہی طرح کے ہوتے ہیں۔“ وہ آنسو صاف کرتے ہوئے بولی۔ ”خوش قسمتی سے جونہی میرے والدین کا خواب پورا ہوا تو میں والدین کے لئے آزمائش بن گئی۔ پھپھو نے مجھے بہو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ بچپن کی مشکل ہل بھر میں ٹوٹ گئی۔“ وہ آنسو پیتے ہوئے بولی۔ ”بے چارے ابا خاندان بھر میں زسوا ہو گئے۔“

”اس میں رسوائی کیوں؟ سب کو اپنی شخصی آزادی کا حق ہے۔ اب تمہارا رشتہ بہت اچھے اور پڑھے لکھے لڑکے سے ملے چلا جائے گا۔ گاؤں کے رشتے کا ٹوٹ جانا عذاب نہیں، رحمت ہے اللہ کی طرف سے۔ شکر کرو کہ تمہاری بچت ہو گئی۔ ورنہ زندگی بھر حسرت و یاس کی تصویر بنے زندگی گزار دیتی۔“ وہ اسے سمجھانے کے بعد سوچ میں گم ہو گیا۔ اُس پر بے پناہ ترس آنے لگا تھا۔ اُس کی معصومیت پر ٹوٹ کر پیار آنے لگا اور وہ اسے گہری نظروں سے دیکھتا چلا گیا۔



کئی راتوں سے وہ جاگ رہی تھی۔

اُسے آصف کی لگاؤ اور چاشنی سے لبریز باتیں آکاش کی رفعتوں میں سیر کراتی رہتیں۔ کیسی عجیب بات ہے کہ کھودینے کا کرب بھی چین سے سونے نہیں دیتا اور کچھ پالینے کی آس میں بھی بے قراری عود کرتی ہے اور نیندیں حرام ہو جاتی ہیں۔ اُس نے یہ سوچ کر کروٹ بدلی کہ میں ڈاکٹر تو نہ بن سکی، اتنی اونچی اڑان کے لئے میرے ونگز بہت کمزور جو تھے تو ایک ڈاکٹر کی بیوی بننے میں کیا مضائقہ ہے؟ اُس نے بڑبڑاتے ہوئے پھر کروٹ بدلی تو اُس کی روم میٹ سسٹر ٹمپن نے خفگی سے کہا۔

”نہیں نہیں آرہی۔ چکروں سے نکلتا بھی چاہتی ہوں۔ لیکن اس گولڈن چانس کو ضائع بھی نہیں کرنا چاہتی۔“ وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔ ”آئی فیل، ہی لوزی۔“

”ہنگی! اُس بندے کا نہ کوئی حدودِ اربعہ ہے، نہ ہی کوئی اتہ پتہ، نہ ہی کوئی ٹھکانہ۔ ہمیں کچھ بھی معلوم نہیں۔ کس بل بوتے پر نیندیں حرام کر بیٹھی ہو؟“ ثمنینہ نیم غنودگی میں بولی۔ ”خدا کے لئے دل سے بے ہودہ خیالات نکالو اور سو جاؤ۔“

”ثمنینہ! ڈاکٹر آصف باتوں اور عادتوں سے کسی اونچے گھرانے کا معلوم ہوتا ہے۔ والدین کا اکلوتا بیٹا اور بہت دولت مند خاندان سے تعلق رکھتا ہے۔ اگر وہ مجھ سے شادی کا خواہش مند ہے تو یوں سمجھو، لائری نکل آئی۔“ وہ اُس کے پلنگ پر بیٹھ کر مسرت آگئیں لہجے میں بولی۔

”بے وقوف! جاؤ، سو جاؤ اس وقت۔ اپنی زندگی برباد کرنے پر کیوں ٹل گئی ہو؟ تمہارے والدین تمہیں اس کی اجازت نہیں دیں گے۔ انہوں نے زندگی کے بے شمار روپ دیکھے ہیں، اک پر دیسی انجانے پر کیونکر بھروسہ کریں گے؟“ ثمنینہ تاسف سے اسے دیکھ کر بولی۔ ”احتم مت بنو۔ اپنی ڈیوٹی چھیچ کرالو اور اُس کے ساتھ گھومنا پھرنا چھوڑ دو۔ اب ہر ایک کی زبان پر تمہارا نام ہے۔“

”ثمنینہ! اگر مجھے اسٹیشن ہانی کرنے کا چانس مل گیا تو میں پیچھے نہیں ہٹوں گی۔ سب جائیں جہنم میں۔“ وہ مستحکم لہجے میں بولتی ہوئی اپنے بستر پر چلی گئی۔

”مثلاً کیا کرو گی؟ اُس کالیے کے ساتھ بھاگ جاؤ گی؟“ ثمنینہ چونک کر بیٹھتے ہوئے بولی۔

”ہاں۔ اماں اور ابا کو بتانے کی ضرورت کیا ہے؟ یہاں اُس کا اپنا گھر ہے، پاکستان اُسے پسند ہے۔ سب ٹھیک رہے گا۔ بس تم میرا راز اپنے تک ہی رکھنا۔“ وہ سوچتے ہوئے طمانیت سے بولی۔ ”ایک دن انہیں بھی منالوں گی۔ جب اپنی بیٹی کو ملکہ کے روپ میں دیکھیں گے تو غلطی کی معافی ہو ہی جائے گی۔“

”میرے کانوں اور میرے دل و دماغ کو یہ سب کچھ بھلا نہیں لگ رہا صدیقہ! تم غریب والدین کی بیٹی ہو، ہوش میں آ جاؤ۔ ایسی شادیاں خوشی سے شروع ہوتی ہیں لیکن عمر بھر کے پچھتاوے پر ان کا اعتقاد ہوتا ہے۔ ہم اتنی ہی خوش قسمت ہوتیں تو ہمارے ساتھ کب کا معجزہ ہو چکا ہوتا۔ ہم سسٹرن نہیں، ڈاکٹر زین چکی ہوتیں۔“

”یہ معجزہ ہی تو ہونے جا رہا ہے ثمنینہ!“ وہ سنجیدگی سے بولی اور لیٹ گئی۔

”ان خاردار راہوں سے پلٹ آؤ صدیقہ! یہ مرد تمہیں دھوکا دے گیا تو کیا کرو گی؟ اسے کہاں ڈھونڈو گی؟ اور اپنا کالا چہرہ لے کر اپنوں میں کیسے جاؤ گی؟ وہ تمہیں قطعاً قبول نہیں کریں گے صدیقہ! گاؤں کے لوگ بہت غیرت مند ہوتے ہیں۔ کیوں بھول گئی ہو؟ گاؤں کے اصول اور قانون تمہیں مار دیں گے، کسی کو خبر تک نہ ہونے دیں گے۔ سوچ لو! کیونکہ معاملہ فشی فشی ہے۔“ وہ پریشانی سے بولی۔

”ثمینہ! تم میری بات کا یقین کرو۔ آصف نے اپنی زبان سے محبت کا اظہار نہیں کیا لیکن عملاً ہی لوزی ویری مچ۔“ صدیقہ نے تسلی دینے کے انداز میں کہا۔

”یعنی کہ تم میری بات نہیں مانو گی۔ تم نے اس آگ میں کودنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔“ وہ افسردگی سے بولی۔ ”میری بات پر غور تو کرو۔“

”ہرگز نہیں۔ میں نے اُس کی نظروں میں پسندیدگی دیکھی ہے۔ اُس کی باتوں میں محبت کی گھلاوٹ محسوس کی ہے ثمینہ! تم یقین کرو، میری غربت کی داستان سن کر وہ تڑپ اٹھتا ہے۔ وہ میرے لئے کچھ کرنا چاہتا ہے۔“ صدیقہ سوچتے ہوئے بولی۔

”مثلاً..... میں بھی تو سنوں۔“ ثمینہ نے پریشانی سے کہا۔

”یہی تو معلوم نہیں ثمینہ! ہو سکتا ہے شادی کے لئے پرپوز کرے۔“ وہ یقین سے بولی۔ ”اگر یہ معجزہ رونما ہو گیا تو سمجھو پانچوں انگلیاں گہمی میں اور سر کڑا ہی میں۔“

”اللہ کرے ایسا ہو۔ چلو آنکھیں بند کرو اور سو جاؤ۔“ وہ افسوس سے بڑبڑائی۔ ”تمہاری تو عقل گھاس چرنے جا چکی ہے۔ آنکھوں پر اُس کے اسٹیش کی پٹی بندھ چکی ہے۔ اب تم کام سے گئی۔“ وہ تلخی سے بولی اور کروٹ بدل لی۔

”نہ سوؤں گی اور نہ ہی تمہیں سونے دوں گی۔ میری بات تو سنو۔“ وہ اٹھ کر اُس کے قریب بیٹھ کر بولی۔

”ہاں سناؤ۔ اپنی بربادی و تباہی کے لئے کیا پروگرام بنایا ہے تم نے؟ اگر تمہارے جیسی سٹرانگ کیریئر کی لڑکی پر دولت اور اسٹیش اثر انداز ہو سکتا ہے تو باقی یہ جو ہر دوسرے دن ڈیٹ پر گئی ہوئی ہیں، ان کا کیا حشر ہوتا ہو گا؟ ان کی نہ تو عصمت محفوظ نہ ہی مستقبل روشن۔ تم کسی اور چکر میں نہ پڑ جانا۔ ایسے لڑکے شادی کا جھانہ دے کر لڑکی کی معصومیت اور پاکیزگی کی دھجیاں اڑا کر غائب ہو جاتے ہیں اور میجورٹی تو اس دھوکے اور سراپ سے نکل ہی نہیں پاتیں۔ کیونکہ عورت طبعاً ایک کی ہو کر رہنا چاہتی ہے۔“ وہ اُسے گہرے دکھ سے سمجھاتے ہوئے بولی تو صدیقہ سنجیدگی

سے بولی۔

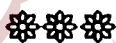
”مجھ پر تمہاری کسی بات کا کوئی اثر نہیں ہو رہا۔ کیونکہ تمہاری منطق ہی فضول ہے۔ کہیں تم جیلس تو نہیں ہو گئی؟ بس سن لو کہ میں عمر بھر دال روٹی کے حساب کتاب میں پڑنے والی نہیں۔ میں نے غربت میں ماں کو سسکتے دیکھا ہے، بہنوں کے چہروں پر حسرت کی چھاپ دیکھی ہے۔

”نادان لڑکی! میں جیلس کیوں ہونے لگی؟ مجھے تو تم پر ترس آ رہا ہے کہ کن اُلجھنوں میں پڑ گئی ہو۔ دل تو چاہتا ہے کہ تمہارے پیرنس کو خبردار کر دوں۔ ہو سکتا ہے، تمہیں ڈوبنے سے بچالیں۔“ وہ افسردگی سے بولی۔ ”تم پتا پھینکو غربت کا اور وہ پتا پھینکے ہمدردی کا۔ اُسے جیت تو ہو کر ہی رہے گی۔ مگر یاد رکھو! اُس کی جیت تمہاری ہار ہے۔ میری مانو اور سنبھل جاؤ۔ اُس نامراد کا لیے میں کیا رکھا ہے؟ قسم سے نیکرو لگتا ہے۔ کہاں وہ اور کہاں تم۔“

”اُس میں رکھا ہے میرا روشن مستقبل، اعلیٰ اسٹیٹس۔ دیکھو شمینہ! ایک ہفتے بعد پہلی تاریخ کا انتظار ہوگا، نہ ہی ہر وقت نوکری چھوٹنے کا دھڑکا ہوگا۔“

شمینہ نے کوئی جواب نہ دیا اور آنکھیں بند کر لیں۔

”تمہاری مشکلیں کتنے والی ہیں صدیقہ! چلو گھوڑے بچ کر سو جاؤ۔“ وہ خود کلامی کرتی ہوئی آنکھیں بند کر کے سہانے سپنوں میں کھو گئی۔



ہاؤس جاب ختم ہوتے ہی آصف کا لندن سے بلاوا آ گیا۔ یہ سن کر صدیقہ مضطرب ہو گئی۔ اس نے جو سپنے دیکھے تھے اور پوپزل کے انتظار میں اس کے دن رات کا چین عارت ہوا تھا، وہ سب رائیگاں ہوتا نظر آیا۔

بہار کی آمد آمد تھی۔ چار سو رنگ برنگے، شوخ و شنگ پھولوں کی بھرمار تھی۔ ہاسپٹل کے وسیع و عریض لان میں گھاس، گرین ویلوٹ کی ماند لگ رہی تھی۔ صدیقہ چمچی کے بعد باہر نکل کر بیچ پر بیٹھ گئی۔ بالکل ہی تنہا۔ اسی جگہ وہ گھنٹوں آصف کے ساتھ بیٹھا کرتی تھی۔ مگر اب تو وہ جانے کی تیاری میں تھا۔ ہاسپٹل اس کا چکر بہت کم لگتا تھا۔ اپنے کونیکٹر کو ملنے آتا یا اسے ڈنر پر لے جانے کے لئے آیا کرتا تھا۔

وہ اسی سوچ میں تھی کہ آصف کی گاڑی سامنے سے آتی ہوئی نظر آئی۔ دل بلیوں اُچھلا۔ فوراً کھڑی ہو کر ہاتھ ہلانے لگی۔ وہ گاڑی پارک کر کے اس کے قریب آ گیا

اور سرخ گلاب کی ادھ کلی کیوں کا خوبصورت گلدستہ اُسے تھماتے ہوئے بولا۔
 ”آج میں بہت خوش ہوں۔“

”ضرور آپ نے واپسی کی سیٹ بک کرا لی ہوگی۔“ وہ پھولوں کو سونگھتے ہوئے بولی۔

”تمہارا اگیس بالکل ہی غلط نکلا۔ چلو کہیں چل کر بیٹھتے ہیں۔ جانے سے پہلے کچھ ضروری باتیں کرنی ہیں۔“ وہ سنجیدگی سے بولا تو اس کا دل جیسے دھڑکنے لگا بھول گیا ہو۔
 ذہن جو پچھلے ایک مہینے سے ماؤف سارہنے لگا تھا، اس نے بھی انگڑائی لی۔ وہ خاموشی سے اس کے پیچھے چلتی ہوئی کارٹک آگئی اور اس کی طرف دیکھ کر بولی۔

”سر! آپ نے تو میری عادات ہی بگاڑ کر رکھ دی ہیں۔ اب گاؤں جانا میرے لئے کسی عذاب سے کم نہیں رہا۔ ہوٹل کا کھانا حلق سے نیچے نہیں اُترتا۔ سر! آپ نے میرے ساتھ اچھا نہیں کیا۔“

”یہ جو مجھ سے انجانے میں تم پر ظلم ہوا ہے، اسی کی تلافی کرنا چاہتا ہوں۔“
 دونوں گاڑی میں بیٹھ کر شہر کی سڑکوں پر بے مقصد گھومتے ہوئے ادھر ادھر کی باتیں کرتے رہے۔ آصف کی باجیس کھلی ہوئی تھیں جبکہ صدیقہ بہت اُداس اور غم زدہ لگ رہی تھی۔ اُسے آصف کے چہرے کی خوشی دیکھ کر حیرت کے ساتھ غصہ بھی آ رہا تھا۔ اپنے جذبات پر قابو رکھنے کے باوجود اس کی نگاہوں میں غم کی سی تھی۔
 آخر میں وہ ڈنر کے لئے پی سی چلے گئے۔ کھانے کے دوران وہ اپنی ماں کی باتیں کرتا رہا اور صدیقہ غور سے سنتی رہی۔

اُس کریم کھانے کے بعد آصف نے بریف کیس کھولا اور کالے رنگ کی مینلیں ڈبیرے کو کھول کر اندر سے ہیرے کی چمکتی دھمتی انگلیوں نکالی اور اُس کا ہاتھ پکڑ کر انگلیوں اُس کی مخروطی انگلی میں ڈال کر پیار سے مغلوب ہو کر بولا۔
 ”آئی ہو پتم انکار نہیں کرو گی۔“

حیرت سے وہ منہ کھولے اسے دیکھے جا رہی تھی۔ وہ اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لئے مسرت و انبساط سے جھوم اٹھا۔ صدیقہ تھوڑی دیر بعد حیرت کے سمندر سے باہر نکلی تو ایک پُر تسکین سی مسکراہٹ لبوں پر پھیل گئی۔ اُسے اپنے تمام خوابوں کی تعبیر انگلیوں کے سلسلر میں لکھی ہوئی نظر آرہی تھی۔ سب اتنی جلد ہوگا، اس نے تو کبھی سوچا نہ تھا۔

”تم خوش ہونا؟“ وہ قریب ہو کر بولا۔ مگر وہ کچھ شرم و حیا سے اور کچھ بے پناہ خوشی سے جواب نہ دے سکی۔

”کچھ تو بولو۔“ وہ بے قرار سا ہو گیا۔ اُس نے موہوم سے کہا۔

”آپ نے اپنی می سے اجازت لے کر یہ فیصلہ کیا ہے؟“ وہ آہستگی سے بولی۔

”اس کی ضرورت نہیں سمجھی۔ کیونکہ میری می ایسی بے مثال خاتون ہیں کہ جب تمہیں اپنے بیٹے کے ساتھ دیکھیں گی تو ہلکی سی ناراضگی کے بعد تم پر جان نثار کرنے سے دریغ نہیں کریں گی۔ تم اپنے پیرنٹس کا ہتاؤ، کیا ری ایکشن ہوگا اُن کا؟“

”ڈیڈلی۔ اس لئے بہتر یہی ہے کہ ابھی ہم دونوں اس فیصلے کو صیغہ راز میں ہی رکھیں۔“ وہ نظریں جھکاتے ہوئے بولی۔

”یہ مشورہ پسند آیا۔ لیکن نکاح کرنے میں کیا قباحت ہے؟“ وہ سنجیدگی سے بولا۔

”سوچنے تو دیجئے مجھے۔ آپ سے شادی کا فیصلہ پیرنٹس کو انفارم کئے بغیر کرنا بہت عجیب لگ رہا ہے۔“ وہ بہت سنجیدہ ہو گئی تھی۔ ”اگر ان سے مشورہ لینے کی غلطی کی تو وہ گھٹنے میں ہی کسی جاہل، ان پڑھ کزن سے نکاح پڑھوا کر مجھے رخصت کر دیں گے۔ کیا کروں؟ عجیب ہی محضے میں گھر گئی ہوں۔“

”ایسا کرتے ہیں، جلد از جلد کورٹ میرج کر لیتے ہیں۔ بعد میں سوچا جائے گا کہ اپنے پیرنٹس کو کیسے انفارم کیا جائے۔“ وہ مسکراتے ہوئے بولا۔

”آپ تو واپس جا رہے ہیں۔ یہ سب کیسے ممکن ہے؟“ وہ تذبذب سے بولی۔

”میں واپس نہیں جا رہا۔ مجھے آغا خان ہسپتال میں جاب مل گئی ہے۔ میں نے پیرنٹس کو اطلاع دے دی ہے۔ رونے دھونے کے بعد دونوں ہی نارمل ہو گئے ہیں۔“

”مجھے یقین نہیں آ رہا۔“ اس کے چہرے پر خوشی ہو رہی تھی۔ مگر خود پر مکمل کنٹرول تھا، جسے آصف نے بھی محسوس کیا۔

وہ اُس کے چہرے کے خوبصورت خدوخال میں کھویا سوچے جا رہا تھا ایسی حسینہ میرے نصیب میں کہاں؟ میں دھان پان سا، کالا کلونا، اُن امپریو پر سٹیٹی کا ساؤتھ انڈین باشندہ۔ اور یہ ہارٹ آف پنجاب کے بھرپور جمال و جوبن کی منہ بولتی تصویر۔ اور اعلیٰ درجے کے نسوانی وقار و کروفہ کی مثال۔ اس نے چھ مہینوں کی شب و روز کی رفاقت میں ایک بار بھی اظہارِ محبت کیا، نہ ہی عشق میں مر جانے کے دعوے کئے۔ آج انکوٹھی پہنائی تو ہلکا سا احتجاج بھی نہ کیا، نہ ہی خوشی سے پاگل ہوتی نظر آئی۔ ڈٹ آ

گرل۔ میرا فیصلہ میرے والدین کو شاق تو دے گا لیکن ابھی سے بنا دیکھے روڑے اٹکانا مجھے قطعاً ایکسپٹ اہل نہیں لگ رہا۔

وہ اُس کی نظروں کی تپش سے پچھلے جا رہی تھی۔ جھینپ کر ساتھ والے نیبل پر بیٹھے افراد کی طرف دیکھنے لگی اور آہ بھر کر سوچنے لگی۔ کس قدر حسین و اسارٹ کپل دو عدد چمکتے ہوئے کلوں اور غلافی آنکھوں والے بچوں کے ساتھ بیٹھا کھانا کھا رہا تھا۔ اُس نے سامنے بیٹھے ڈاکٹر آصف کی طرف سرسری نظر دوڑائی اور نیبل پر پڑے گلاب کے پھولوں سے کھیلتے ہوئے سوچنے لگی۔ میرا احسن میرے پیرنس کے لئے کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔ تعلیم کی وقعت مہینے کی پہلی تاریخ کے بعد ٹوٹلی بے معنی ہو جاتی ہے۔ انہیں میرے جوڑ کا لڑکا ڈھونڈنے کی ضرورت ہے، نہ ہی ان کی اتنی اوپرنس ہے۔ کسی بھی وقت ان کی طرف سے میری شادی کا بلاوا آ سکتا ہے۔ اور میں پھر اتنی بے بس اور مجبور ہو جاؤں گی کہ نکاح نامے پر دستخط کر کے تاحیات قفس کو سینے سے لگا لوں گی۔ مجھے اپنے ہونے والے اُن پڑھ اور ٹونٹھ قسم کے مردانہ وجاہت سے بھرپور کزن کا کیا فائدہ کہ جو میری تنخواہ پر بسر اوقات کرتے ہوئے صبح و شام میری ڈرگت بھی بنائے گا۔ اپنے خاندان کو مضبوط قوی بنانے کے لئے درجن بچے بھی پیدا کروائے گا اور اپنی اتنا اور غیرت کی تسکین کی خاطر سب کے سامنے مجھے ذلیل کرتے ہوئے کبر و پندار کے نشے میں مست بھی رہے گا۔ اگر مجھے اپنی زندگی کو بہتر بنانے کا چانس مل رہا ہے تو بھول جاؤ اپنی روایات اور رواجوں کو۔ بھول جاؤ والدین کی ضروریات اور پیار کو۔ بھول جاؤ اپنے گاؤں کو جہاں سوائے گندگی، مچھر اور مکھیوں کے اور کچھ نہیں۔

”کیا سوچ رہی ہو؟ آئی ایم آفریڈ کہ تم مجھے ری جیکٹ نہ کر دو۔“ وہ اُسے سوچتے دیکھ کر اضطراری کیفیت میں بولا۔

وہ آواز پر چونک گئی اور ناقدانہ انداز میں اسے دیکھنے لگی۔

”صدیقہ! کیا بات ہے؟ کچھ مضطرب سی لگنے لگی ہو۔“ وہ اُس کا ہاتھ پکڑ کر بولا۔

”فیصلہ دو زندگیوں اور دو خاندانوں کا ایک دوسرے سے مختلف سیٹ اپ کا

ہے۔ کیا ان کا ملاپ درست رہے گا؟“ وہ استہزائیہ لہجے میں بولی۔

”صدیقہ! ہم دونوں کی نئی زندگی کی بنیاد پسند، محبت اور وفا کے اصولوں پر رکھی

جا رہی ہے جن میں پنجابی اور مدراسی قوانین کا دخل ہے، نہ ہی میں ان پر بی لیو کرتا

ہوں۔“ وہ لگاؤ سے بولا۔

”یہ یاد رکھئے گا کہ میں اور آپ، عمر بھر کے لئے اپنوں سے دُور ہو جائیں گے۔“
وہ سوچتے ہوئے بولی۔

”میں جانتا ہوں۔“ وہ سر جھکا کر بولا۔ ”ڈی زاسٹر تو ہو گا۔ اس لئے تیار رہنا پڑے گا۔“

”تو پھر مجھ سے وعدہ کیجئے کہ آپ مجھے والدین کے اعتراض و انکار پر ری جیکٹ نہیں کریں گے۔ کیونکہ مجھے آپ کو اپنانے کے بعد اپنے گاؤں کی جانب جانے والے تمام راستوں پر بند باندھنا ہوں گے۔“ وہ سنجیدگی سے بولی۔ اور دل میں ہی بولی۔ صدیقہ ملک! ابھی وقت ہے، اپنے تمام خدشات کا اظہار کرو اور اپنی ہر بات منوالو۔ تاکہ بعد میں یاد دہانی نہ کرا سکو۔

”ایسی سوچ بھی گناہ ہے صدیقہ! گو کہ میری ماں کا مجھ سے پیار، عشقِ حقیقی سے کم نہیں۔ بے شک میری فرمانبرداری اور لگن میں عبادت کی جھلک نظر آتی ہے۔ اس کے باوجود آئی لو یو۔ کیونکہ یہ میرے حقوق کے زمرے میں آتا ہے۔ جہاں تک میرا خیال ہے، ماما ہمیشہ کی طرح اولاد کے سامنے ہتھیار ڈالنے پر مجبور ہو کر رہ جاتی ہے۔“ وہ مستحکم لہجے میں بولا۔

”اگر ایسا نہ ہوا تو؟“ وہ آنکھیں جھکائے ہی گویا ہوئی۔

”تمہارا ساتھ نہیں چھوڑوں گا۔ صدیقہ! تم میری زندگی ہو، مجھ پر اعتماد رکھو۔ دھوکا نہیں دوں گا۔ میں تمہیں اس وقت تک لندن لے کر نہیں جاؤں گا، جب تک ہمارے پیرئس رضامند ہو کر ہمیں قبول نہیں کر لیتے۔ میں نہیں چاہتا کہ تم میرے والدین کی نظروں میں اُمڈنے والی نفرت کا نشانہ بنو اور مجھے خدا تعالیٰ کے سامنے جوابدہ ہونا پڑے۔“ وہ سنجیدگی سے بولا۔

”لیکن سر! میرے والدین مجھے کسی قیمت پر معاف نہیں کریں گے۔ ہمارے خاندان میں آج تک ایسا نہیں ہوا۔ میرا یہ انقلابی قدم مجھے اپنے خاندان کے ہر فرد سے دُور کر دے گا۔ آپ مجھے اپنے گھر، اپنوں میں لے چلیں۔ تاکہ میں کسی خاندان کی باسی بن کر ایک باعزت زندگی گزار سکوں۔“ وہ سوچتے ہوئے بولی۔

”میرے والدین..... فی الحال.....“ وہ ابھی بات مکمل بھی نہ کر پایا تھا کہ وہ

بول پڑی۔

”مجھے اُن کی نفرت و حقارت منظور ہے۔ ایک دن جیت میری ہی ہوگی۔“ وہ

خود اعتمادی سے بولی۔

”یکے بعد دیگرے ہمارے مسائل حل ہوتے چلے جائیں گے۔ اس کی فکر نہ کرو۔ فوری طور پر نکاح ضروری ہے۔ نہ کہ والدین کو بتا کر ہارٹ اٹیک دینا۔“

”بائی دی اینڈ آف دی ڈے تم نے جانا تو لندن ہی ہے۔ رہتا تو میرے ہی ساتھ ہے۔“ وہ تسلی دینے کے انداز میں بولا۔

”اگر میں اپنوں کو بھلا نہ سکی تو؟“ وہ روہانی ہو گئی۔

”اری شوہر، جو رو کا غلام بن کر رہے گا تو وہ دل و دماغ سے کیسے فوچکر نہ ہوں گے۔ میری جان! تمہاری اتنی پوجا کروں گا کہ تم اپنوں کو کیا، دنیا ہی بھول جاؤ گی۔“

اس نے ہاتھ آگے بڑھا کر بہت لگاؤ اور اپنائیت سے اپنا ہاتھ بڑھایا۔ مگر صدیقہ نے ہاتھ تو نہ بڑھایا، مسکرا کر رہ گئی۔

”ہم شادی کے بعد کراچی چلے جائیں گے۔ وہاں ایک بڑا سا بنگلہ خریدوں گا۔“ وہ مسکرا کر بولا تو اس کا دل جیسے اُچھل کر حلق میں آ گیا۔ مگر تاسف بھرے لہجے میں بولی۔

”سر! جب میرے والدین کو میری شادی کی اڑتی ہوئی خبر پہنچے گی تو وہ گاؤں میں اپنے رشتے داروں کے طعنوں سے چھلنی ہو جائیں گے۔ سر! یہ سوچ کر میرا دل ڈوبنے لگا ہے۔“ وہ روہانی ہو گئی۔ ”میں ایسا نہیں کر سکتی سر! مجھے معاف کیجئے۔“

”میں ان سے ملنے کو تیار ہوں۔“ وہ ایک دم سے پریشان ہو گیا۔

”یہ تو ناممکن ہے سر!“ وہ نفی میں سر ہلا کر بولی۔

”تو پھر کیا کیا جائے؟ تم ہی بتاؤ۔“ وہ افسردہ ہو گیا۔

”آپ کو بھی اپنے والدین چھوڑنا ہوں گے۔ کیونکہ میں اُن واٹھ بہو بن کر آپ کے گھر کا فرد کیسے بن سکتی ہوں؟ یہ سراسر ذلالت اور عنادامت ہے میرے لئے۔ آپ نے درست فرمایا ہے کہ میں ان کی نفرت برداشت نہیں کر پاؤں گی، نہ ہی انہیں جیتنا آسان ہے۔ تو میں نے سوچا ہے کہ میں اپنی اچھی بھلی زندگی کو کیونکر داغ دوں۔“

”میں نے تمہیں یہی تو سمجھانے کی کوشش کی ہے کہ ہم پاکستان میں ہی اپنی نئی زندگی کا ہر لمحہ گزاریں گے۔ چھ مہینے بعد والدین سے مل آیا کروں گا۔ اس کی اجازت تو دے ڈالو۔ اپنے والدین کا اٹھوتا بیٹا ہوں۔“ وہ سنجیدگی سے بولا۔

”اگر انہوں نے آپ کی شادی کر دی تو میرا کیا بنے گا؟“ وہ ڈر کر بولی۔

”یہ کیسے ممکن ہے؟ وہ مجھ پر زبردستی نہیں کریں گے۔“ وہ اعتماد سے بولا۔
 ”پھر بھی..... آپ میری خاطر ہی سہی.....“ وہ نظریں جھکا کر بولی۔
 ”محبتیں، شرائط کی محتاج نہیں ہوتیں صدیقہ! میں تم سے دل و جان سے پیار کرتا
 دوں۔ اور تم بھی تو مجھ سے بے پناہ محبت کرتی ہو۔“ وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر انگوٹھی دیکھنے لگا
 تو وہ شرما کر مسکرا پڑی۔

”تم اتنے ہمدرد اور مضبوط کیریئر کے انسان ہو کہ شکل و صورت، بیک گراؤنڈ میں
 جا چھپی ہے۔ مجھے تم سے والہانہ پیار تو نہیں مگر پسندیدگی کا لیول بہت ہائی ہے۔ میں
 دل و جان سے تمہاری عزت کرتی ہوں۔ بے شک میرا انٹرسٹ اپنی جگہ بہت اہم
 ہے۔“ وہ اپنے گورے ہاتھ کو اس کے سیاہ ہاتھ میں دیکھتے ہوئے سوچنے لگی۔
 ”کل میرے گھر کی ڈیل بھی ہو گئی ہے۔ تمہارے انکار پر میں یہ ملک ہمیشہ کے
 لئے چھوڑ جاتا۔ اب میں اس ملک کا باشندہ بن کر رہوں گا۔ آئی ایم سوچی۔“ وہ اُس
 کی خاموشی کو محسوس کر کے بولا۔

”ہم فوراً کراچی شفٹ ہو جائیں گے۔ میں اپنے والدین کا سامنا نہیں کر سکوں
 گی۔“ وہ سوچتے ہوئے بولی۔ ”کیونکہ ثمنینہ انہیں فوراً بتا دے گی۔ اور وہ مجھے آپ
 کے پاس نکاح ہونے کے باوجود نہیں چھوڑیں گے، چھین کر لے جائیں گے۔ اپنی
 ناک کی خاطر۔“

”وہی ہو گا جو تم چاہو گی۔ کل تمہارے برائیڈل ڈریس اور جیولری کی شاپنگ ہو
 گی، پرسوں ہمارا نکاح ہو گا اور ہم سیدھے ہوٹل چلے جائیں گے۔ اگلے دن کراچی
 کے لئے روانگی ہو گی۔“ وہ تیزی سے پروگرام بتا رہا تھا۔

”سوچ لیں کہ والدین کو چھوڑنے کے بعد آپ کی انکم کا ذریعہ کیا ہو گا؟ یہ دولت
 ایسی چیز ہے سر! ہاتھ میں نہ ہو تو سراسر حسرت اور درد سہی ہے۔“ وہ آہستگی سے
 بولی۔ ”والدین کو چھوڑنا گویا تمام آسائشات کو چھوڑنا ہے۔ ایک معمولی ڈاکٹر بن کر
 زندگی بسر کر لیں گے؟ کہیں مجھے پانے کا پچھتاوا تو نہیں ہو گا؟“ وہ کریدنے کے انداز
 میں بولی۔

”اب تم صحیح راستے پر آئی ہو پنگی! بھلا میں انہیں چھوڑ دوں ہی کیوں؟“ وہ مسکرا
 کر بولا۔ ”تم اور میں یہاں خوش و خرم رہیں اور پیرنٹس اپنی جگہ مطمئن رہیں۔ اس
 لئے مجھے بیلنس کرنا ہو گا۔“ وہ سنجیدہ تھا۔

”زیر و بڑھانے کے چکر میں لوگ اپنے پیاروں کو بھول جاتے ہیں۔ بیوی اور بچوں کے لئے وقت نہیں ملتا۔ اور پیار بھی سینڈری ہو جاتا ہے۔ ابھی بھی وقت ہے، سوچ لیں کہ کہیں مجھے چھوڑ تو نہ دیں گے؟“ وہ سوچ کر سہم گئی۔

”ڈر اور اندیشوں سے باہر نکل آؤ صدیقہ!“ وہ سنجیدہ سا ہو گیا۔

”آپ مائنڈ کر گئے؟“ وہ مسکرا کر بولی۔

”ڈر، خوف اور اندیشے شک کی ہی قسم ہیں۔ ہم اپنی ازدواجی زندگی شکوک و شبہات میں کیونکر گزاریں؟ ہم دونوں ایک دوسرے کے لئے قربانی دینے جا رہے ہیں۔ پھر دوسرے اور وہم کیوں؟“ وہ سنجیدگی سے بولا۔

”سرا! جب کسی کو پالینے کی خواہش کو تسکین ملتی ہے تو کھو جانے والے تمام رشتوں کی یاد اک پچھتاوا بن جاتی ہے۔ اور پچھتاوے کبھی پیچھا نہیں چھوڑتے۔ اس حسرت میں گزرنے والے شب و روز عذاب بن جاتے ہیں۔ دل کی دھڑکن اپنے پیاروں کے نام پر چلتی ہے۔ ذہن ماضی کے دھندلکوں کو کلیئر کرنے لگتا ہے۔ رشتوں کی قربانی گناہ کبیرہ بن کر ہوش و حواس پر چھا جاتی ہے اور یوں تمام وعدے و وعید پس پشت ڈالنے میں ہی عافیت محسوس ہونے لگتی ہے۔ آپ مرد ہیں، پھر سے اپنی نئی زندگی کا آغاز کر سکتے ہیں۔ میرے لئے زندگی اور دنیا بہت تنگ ہو جائے گی۔ ایک بار پھر سوچ لیں۔“ وہ سنجیدگی سے بولی۔ کیونکہ اسے تسلی بخش جواب کی توقع تھی۔ وہ اس وقت اس سے ہر طرح کے عہد و پیمان لینا چاہتی تھی۔ سراب میں خود کو برباد نہیں کرنا چاہتی تھی۔

”بھئی میں تم سے محبت کرتا ہوں۔ میرا دل و دماغ اس کی گواہی دیتا ہے۔ تم بھروسہ تو کر کے دیکھو، کبھی پچھتاوا نہیں ہو گا تمہیں۔“ وہ چونک کر بولا۔

اتنی دیر میں ویٹر بل لے کر آ گیا۔ وہ اس کی ادائیگی کر کے کھڑا ہو گیا۔ وہ بھی چہرے پر مسکان سجائے کھڑی ہو گئی اور اس کے بڑھے ہوئے ہاتھ میں اپنا ہاتھ دے کر شرماسی گئی۔

”کل صبح تمہارا پہلا کام ریزائن دینا اور شام شاپنگ میں۔“ وہ ہنستے ہوئے بولا تو وہ جھومتی ہوئی، گاڑی میں بیٹھ گئی۔

’اسے کہتے ہیں قسمت کا دھنی ہونا۔ اس نے دل ہی دل میں سرگوشی کی۔



وہ کا لے برقعے میں لمبوس، آصف کے پیچھے چلتی ہوئی اندر تک لرز گئی تھی۔ اُسے لگا جیسے اُس کی مہار آصف پکڑے جہاں چاہے اسے لے جانے کے تمام اختیارات حاصل کر چکا ہے۔ دل میں خوشی سے زیادہ بے تحاشا کرب سمایا ہوا تھا۔ اسے سکیورٹی سے زیادہ کم مائیگی کا احساس ہو رہا تھا۔ والدین پر زیادتی کرتے اور ان کی تکلیف کو محسوس کرتے ہوئے وہ برقعے کے اندر زار و قطار رونے لگی تھی۔

اُس کی خاموشی پر آصف نے پُر جوش لہجے میں کہا۔

”کانگریجو لیسنرز حدیقہ! آج سے تم میری حدیقہ ہو۔ آئی لائک دس نیم۔ تمہیں اعتراض تو نہیں؟ حدیقہ از گڈ نیم۔ اس کے میٹنگ بھی بہت اچھے ہیں۔“
’اب ماں کے رکھے ہوئے نام سے سبکدوش ہو جاؤ صدیقہ!‘ اُس نے تلخی سے دل میں سوچا اور آنسو صاف کرنے لگی۔

”سر! میرا دل گھبرا رہا ہے۔ میں نے کہیں غلط فیصلہ تو نہیں کر دیا؟“ وہ روئے جا رہی تھی۔

”آج سر کی گردان بھی ختم ہو جانی چاہئے۔ تمہارا سرتاج ہوں۔ شوہر نامدار ہوں۔ اور تم سے بے پناہ پیار کرنے والا تمہارا دوست ہوں۔ پھر فیصلہ غلط کیسے ہو سکتا ہے؟“ وہ خوشی سے چپک رہا تھا۔ وہ سر جھکائے بیٹھی تھی۔

دونوں گاڑی سے اترے، ٹرائی پر اپنا سامان رکھ کر لفٹ کی طرف بڑھ گئے۔
کمرہ ڈہن کی طرح سجا ہوا تھا۔ مگر ڈہن تو ابھی تک سفید یونیفارم اور کالے برقعے میں تھی۔

آصف نے اسپورٹنگ بیگ میں باڈی لوشنز اور اسپرے، کولڈ کریم، میک اپ کا سامان، ہیئر اسپرے اور کلونز رکھیں اور بیگ اٹھا کر بولا۔
”خدا کے لئے اب یہ برقعہ تو اُتار دو۔ یہاں تمہیں کوئی نہیں دیکھے گا۔ صرف اور صرف میں دیکھوں گا۔“ وہ ہنستے ہوئے بولا۔

وہ اُس کا ہاتھ پکڑ کر لفٹ کی طرف چل دیا۔ گراؤنڈ فلور پر پارلر میں اُسے چھوڑ کر پیار سے بولا۔

”نیگم صاحبہ! جب تیار ہو جائیں گی تو موبائل پر میسج کر دیجئے گا۔ بندہ چند منٹ میں حاضر ہو جائے گا۔“



وہ پارلر کے باہر کھڑا اُس کا انتظار کر رہا تھا کہ صدیقہ، پارلر کی اور کے ساتھ باہر نکلی۔ وہ آصف کو دیکھ کر چونکی اور صدیقہ کی طرف حیرت و افسوس سے دیکھ کر آصف سے مخاطب ہوئی۔

”یو آر سو کلی۔“

وہ مطلب سمجھ کر کھسیانی سی ہنسی سے صدیقہ کی طرف اچنتی نظر ڈال کر بولا۔ ”آپ نے درست فرمایا۔“ لجاجت سے بھرپور لہجے کو صدیقہ نے بھی محسوس کیا۔ مگر وہ اُس کے حُسن میں کھو گیا۔ پانچ فٹ دس انچ کے قد میں اس قدر نزاکت اور میروں اور گرے کلر کے غرارے میں وہ کسی پرستان کی مخلوق لگ رہی تھی۔ اُس نے اُسے آج تک سفید یونیفارم میں ہی دیکھا تھا۔ آج فرسٹ ٹائم اُس کا حُسن و جمال کھل کر اُس کے سامنے آیا تھا۔

وہ عالم فِسون میں اُس کے قریب گیا اور اُس کا ہاتھ پکڑ کر کبر و پندار میں اکڑ کر چلتا ہوا لفٹ کی طرف بڑھا۔ لفٹ میں ہی اُس نے اُسے سینے سے لگا لیا۔ وہ شرمائی، لجائی۔ مگر پہلے سے اُس کا مزاج بہتر ہو گیا تھا۔ خوشی نمایاں تھی۔ راستے میں جس نے بھی اس جوڑے کو دیکھا، آصف کی تقدیر پر رشک کئے بغیر نہ رہ سکا۔ جبکہ یہ الگ بات تھی کہ سسٹرز نے دانتوں کے نیچے انگلیاں دبالی تھیں کہ صدیقہ نے خوب لمبا ہاتھ مارا ہے۔

کمرہ، ڈلہن کے سامنے ماند پڑ گیا۔ اور ڈلہن، کمرے کا جائزہ لیتے ہوئے اپنی قسمت پر نازاں و فرحاں ہونے لگی کہ اللہ تعالیٰ نے اُسے خاک کے ذرے سے آسمان کا چمکتا دمکتا ستارہ بنا دیا تھا۔ اُس کی مسرت و تسکین دیدنی تھی۔ اگلی صبح وہ تیار ہو کر آئینے کے سامنے کھڑی خود کو دیکھتے ہوئے بڑبڑائی۔ ”یہ صدیقہ تو کسی طرح سے نہیں لگ رہی۔ اُس کی تو مرگ ہو چکی ہے۔ یہ تو ڈاکٹر آصف علی زیدی کی حدیقہ ہے۔“

وہ پنک کلر کے لہنگے میں غضب ہی تو ڈھا رہی تھی۔ آج انہوں نے کراچی کے لئے رخصت ہونا تھا۔ شام کی فلائٹ تھی۔

لہجے پر اسی ہوٹل میں آصف نے اپنے تمام دوستوں کو دعوت پر مدعو کر کے سنت

مگر ازدواجی رشتے میں یہ دونوں اتنی جلدی منسلک ہو جائیں گے، اس کا اندازہ نہ تھا۔ سب بظاہر خوش و خرم نظر آ رہے تھے۔ لیکن دل، صدیقہ کی اس حرکت پر سر تسلیم خم کرنے کو تیار نہ تھے۔

لنچ کے بعد چائے کا دور چل پڑا۔ اور یوں پانچ بجے سب چہ گویاں کرتے ہوئے واپس چلے گئے۔

صدیقہ اور آصف نے کپڑے تبدیل کئے اور اگلے سفر نو کے لئے تیار ہو کر سامان سمیت ایئرپورٹ کی طرف روانہ ہو گئے۔ آصف کی دوست میمونہ نے انہیں ایئرپورٹ پر خدا حافظ کہا اور اگلے ہی دن گاڑی کی بکنگ کرانے کا وعدہ کر کے بجھے ہوئے دل کے ساتھ اپنے گھر آ کر ماں کو اس شادی کی کچھ سچی، کچھ من گھڑت کہانی سنانے لگی۔



لاہور کو خیر باد کہہ کر آصف نے ایک ہفتے بعد آغا خان ہاسپٹل جوائن کر لیا۔ صدیقہ کی زندگی گھر تک محدود ہو کر رہ گئی۔ زندگی میں اتنا آرام و سکون بھی ہوگا، یہ تو اس نے کبھی تصور بھی نہ کیا تھا۔

صبح آصف کو ہاسپٹل رخصت کر کے وہ خواب خرگوش کے مزے لوٹی، اپنی مرضی سے اٹھتی، تیار ہو کر آصف کا لنچ پر انتظار کرتی۔ اسے یہ سب بہت بھلا لگ رہا تھا۔ کبھی کبھار والدین اور بہن بھائیوں کی یاد ستاتی تو اسے فوری طور پر قلب و ذہن سے نکال دیتی اور خود کلامی کرتی۔ میں نے جرم نہیں کیا۔ اپنی پسند کی شادی گناہ نہیں۔ یہ میرا حق تھا۔ میں نے اپنی روایات سے ٹکر لے کر نسوانی حقوق کو حاصل کرنے کی ایک مثال قائم کی ہے۔ میں غریب خاندانوں میں پیدا ہونے والی لڑکیوں کے لئے ایک خوش آئند پیغام ہوں۔ اور ایک کامیاب زندگی گزارنے کا بہترین آزمودہ سبق ہوں۔

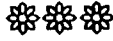
بقیہ رہے والدین کے مسائل تو انشاء اللہ اُن کو اُس جھوپڑی سے اٹھا کر لاہور کے پوش علاقے کے باعزت رہائشی بنانے میں اڑی چوٹی کا زور لگا دوں گی۔ فی الحال وہ اس چونکا دینے والی خبر کو ہضم تو کر لیں گے۔ غم و غصہ اور ناراضگی پر گزرتے وقت کی دھول تو جم جائے۔ تب تک میں بھی سیٹل ہو جاؤں گی۔ ایک آدھ بچہ میرے اسٹیشن کو مزید اعلیٰ اور شاندار بنا دے گا۔ پھر پوچھوں گی شمینہ سسٹر سے کہ تم نے زندگی میں کیا کھویا؟ اور میں نے کیا پایا؟ وقت کی بات ہے، اسی معاشرے میں پروان

چڑھنے والے میرے رشتے دار میری اس معمولی سی نافرمانی کو دُور اندیشی اور دانش مندی کا نام دے کر میری ایک جھلک دیکھنے کو بے تاب ہوا کریں گے۔ آہا، کیا مزہ آئے گا، جب گاؤں میں میری گاڑی داخل ہوگی اور گلیوں میں گلی ڈنڈا کھیلنے والے بچے بھاگ کر گھروں میں میرے آنے کی اطلاع دیں گے۔ میرے والدین خوشی سے بے قابو ہو کر گلی میں ہی مجھے خوش آمدید کہنے کو نکل آئیں گے۔ بھائی بہن مجھے اپنے حصار میں لے کر مجھ پر بوسوں کی بارش کر دیں گے۔ اور پھر میں ان کو قیمتی تحائف دے کر ان کے چہروں پر مچلنے والی خوشی کو ان آنکھوں میں اتار کر خود کو سیراب کرتی نہال ہو جاؤں گی۔ لیکن ابھی مجھے اس وقت کی آمد کا انتظار کرنا ہو گا۔ وہ خود بخود میرے روبرو آ کر مجھ سے گفت و شنید کرے گا۔ صبر و تحمل کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑنا صدیقہ!..... آصف مجھ سے پیار کرتا ہے اور میں بھی اس سے پیار تو کیا، عشق کرنے لگی ہوں۔ دولت اور اسٹیٹس کی چاہ اک طویل مسافت طے کرتی ہوئی محبت میں گرفتار ہو کر دیوانگی و جنون کا روپ دھار چکی ہے۔ اس میں کمال میرا نہیں، آصف! آپ کی بے پناہ چاہت اور اُن گنت خوبیوں کا ہے۔ میں آپ سے وعدہ کرتی ہوں اُس پاک ذات کو حاضر و ناظر جان کر۔ کبھی دغا نہیں دوں گی۔ آپ کے نام پر قیامت کے دن اٹھائی جاؤں گی۔ لیکن آپ کے رزق میں میرے والدین کی حصے داری نہ ہوئی تو مجھے جاب کر کے اُن کی ضروریات زندگی کو پورا کرنا پڑے گا۔ اُن کا آرام اور انہیں ایک باعزت زندگی سے انتر وڈیوس کرانا میرا مقصدِ حیات ہے۔

میری ماں! میں آپ کے دُکھوں کو بھول نہیں پائی۔ میرے ابا! میں آپ کی مشقت میں بہتے ہوئے پسینے کے قطروں میں ڈوب ڈوب جاتی ہوں۔ میری بہنو! میں تمہارے لبوں پر بکھرنے والی آہوں کو خوش آئند مسکراہٹ میں بدلنے کے لئے بے تاب ہوں۔ میرے بھائیو! وہ دن دور نہیں جب تم دونوں پراڈو میں فخر سے گھومتے ہوئے گاؤں کے سب سے بڑے زمیندار سے ملنے جاؤ گے۔ میری ایک غلطی، دس زندگیوں کے لئے خوشی کا سندیہ لاتی ہے تو پھر ایسی غلطیاں ہر روز سرزد ہونی چاہئیں۔

یہ نیولی میر ڈکیل جس وسیع بنگلے میں آ کر رہائش پذیر ہوا تھا، وہ ریٹ پر لیا گیا تھا۔ صدیقہ باتوں باتوں میں کتنی ہی بار اپنی اس خواہش کا اظہار کر چکی تھی کہ اپنے لئے ایک خوب صورت سا گھر ہم خود تعمیر کروائیں گے۔ جسے وہ سنی ان سنی کر دیتا تھا۔

اور وہ بھی خاموشی پر اکتفا کرتی تھی۔
دن ہنستے مسکراتے گزرتے جا رہے تھے۔ لیکن صدیقہ کا دل مطمئن نہ تھا۔ ایک
دھڑکا سا مضطرب رکھنے لگا تھا۔ کیونکہ اس کے پاس اپنا گھر تھا، نہ ہی جاب اور نہ ہی
کوئی اور سکیورٹی۔



وہ شان بے نیازی سے لان میں چہل قدمی کرتے ہوئے رنگ برنگے پھولوں
سے محفوظ ہو رہی تھی کہ پورچ میں آصف کی کار آ کر رُکی۔

وہ اپنے تلے قدموں سے چلتی ہوئی اس کے قریب چلی گئی۔ وہ اسے پیار سے
مکھورتے ہوئے سوچنے لگا۔ زندگی کی آسائشات کا بھی اپنا ہی مزاج ہے۔ زیبائش سر
چڑھ کر بولنے لگتی ہے۔ نزاکت ہر ادا سے چھلکنے لگتی ہے۔ صدیقہ کیا تھی۔ ڈرپوک،
احق اور خود اعتمادی سے عاری، ہر بات پر لیس سر کہنے والی۔

”کہاں کھو گئے جناب؟“ وہ کار کا دروازہ کھولتے ہوئے اپنائیت سے بولی تو
آصف چونک اٹھا اور دھیمے لہجے میں بولا۔

”سرکار کے خُسن میں کھونے کے بجائے اور کیا کر سکتا ہوں؟ تمہارا ظلم دن بہ
دن بڑھتا جا رہا ہے۔ بندہ رحم کی اپیل کرتا ہے۔“

”ایسی بھی بات نہیں۔ آپ کی نظر کا کمال ہے۔ یہ جو خُسن ہوتا ہے نا، دیکھنے
والے کی اندرونی کیفیت کا نام ہے۔“ وہ قدرے شرما کر بولی اور دونوں ایک
دوسرے کے ہاتھ میں ہاتھ دیئے خراماں خراماں چلتے کوریڈور کو عبور کرتے ہوئے اپنے
کمرے میں آ گئے۔

صدیقہ نے اس کا کوٹ اتار کر بینکر پر ڈالا۔ ٹائی کی گرہ ڈھیلا کر رہی تھی کہ آصف
نے اسے اپنی ہانہوں کے حصار میں لے کر سمجھنے لیا اور مسرت آگئیں لہجے میں بولا۔

”خدمت گار بیوی، اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطا کردہ انمول تحفہ ہے۔ اور پھر پیار
بھی کرتی ہو۔ مگر ابھی تک ہم دونوں کپلیٹ نہیں ہوئے۔“

وہ اُس کی ہانہوں سے نکل کر اُسے دیکھنے لگی۔ وہ قہقہہ لگا اٹھا۔

”ڈرگنی میری بزدل حسینہ۔“

”جی۔ آج سے پہلے آپ نے اس کا احساس ہی نہیں ہونے دیا۔ میں آپ کی
رفاقت کے نشے سے ابھی تک باہر نہیں نکلی۔ ابھی تک مدہوش ہوں۔ مجھے اسی حالت

میں رہنے دیں آصف!“ وہ جھومتے ہوئے بولی۔
 ”آئی تھنک طویل نشہ اپنی ذمہ داریوں سے کنارہ کشی کا دوسرا نام ہے۔ میڈم!
 اب فینٹسی سے باہر تشریف لے آئیے اور اپنی ذمہ داریوں کو پہچانئے۔“
 لہجہ کی سختی پر وہ چونک کر اُس کی آنکھوں میں جھانکنے لگی۔ آج اُس کے دیکھنے
 اور بولنے کے انداز میں ہی فرق تھا۔ دل کو دھڑکا تو لگا ہی رہتا تھا، ایک دم سے جیسے
 ڈوبنے لگا۔

”یہ بتاؤ کہ کبھی والدین کی یاد ستائی ہوگی۔ آنکھیں بھی نم ہوئی ہوں گی۔ ملنے کو
 دل بھی بے تاب ہوا ہوگا۔“ وہ سنجیدگی سے بولا۔ ”کیونکہ ایک ایسے بندے کی خاطر
 جس سے واسطہ اور تعلق فقط چند مہینوں کا ہے، ان خونی رشتوں کو کیسے بھلایا جاسکتا ہے
 جن سے آپ کا رشتہ قائم ہوئے سالہا سال بیتے ہوں۔ مدوجزر اور نشیب و فراز میں
 ساتھ ساتھ گزرے ہوں۔ اُن کو میں تو فراموش کرنے میں ناکام رہا ہوں۔ تم کیسی
 بے جس، بے فیض اور بے مروت بیٹی ہو کہ اپنے والدین کی غربت کا احساس تک نہ
 رہا۔ جبکہ تم جانتی تھی کہ والدین کی بسراوقات تمہاری ہی تنخواہ پر ہے۔ تم نے مجھ سے
 کبھی فکر مندی کا اظہار تک نہ کیا۔ مجھ سے غیریت کیوں برتی؟ کیا وقت گزاری کر
 رہی ہو میرے ساتھ؟ جیسے تم نے والدین کے ساتھ کیا، اسی کیلگری میں مجھے بھی لا کر
 کھڑا کر دیا۔“ لہجہ میں حد درجے کی خفگی تھی۔

”آپ کی یہ بے تکی باتیں میری سمجھ سے بالاتر ہیں۔ پلیز مجھے اول فول سننے کی
 عادت نہیں۔ مسئلہ کیا ہے؟ کھل کر بتائیں۔ پہیلیاں بوجھوانے کی کوئی تک نہیں بنتی۔“
 وہ تیزی سے بولی۔ ”فرمائیے، کس غلط فہمی نے آن گھیرا ہے کہ مجھ سے تیور تو کیا انداز
 گفتگو ہی بدل گیا ہے۔“

”تم ہو ہی اس قابل۔ میں کئی دنوں سے یہ سوچ کر پریشان ہی رہنے لگا ہوں
 کہ تم تو میرے ساتھ بھی وفا کرنے والی نہیں ہو۔“
 وہ چپل اُس کے پاؤں کے قریب رکھ کر شوز اور ساکس اٹھاتے ہوئے بولی۔
 ”قسم سے میں آپ کی ناراضگی کی وجہ نہیں جانتی۔“

”مجھے سسٹر ٹمینیہ کا فون آیا تھا۔ بتا رہی تھی کہ تمہارے والدین کو شادی کی خبر پہنچ
 چکی ہے اور وہ دونوں بستر سے لگ چکے ہیں۔ ڈاکٹر کے پاس جانے کے لئے نہ پیسہ
 ہے نہ ہی ہمت ہے۔“ وہ کرسی پر بیٹھ گیا۔

”خبر رساں ثمنیہ خود ہے۔ بھلا وہ جل نکلی اتنی بڑی خبر کو کیسے ہضم کر سکتی ہے؟
چسکے لے کر بتایا ہوگا۔ حالانکہ ایسی انہونی اور ہلا دینے والی خبریں کبھی چھپتی تو ہیں نہیں۔
وہ نہ بتاتی تو بھی پتہ چل ہی جاتا۔“ وہ غصے میں بول رہی تھی۔

”تمہارے والدین کی حالت کا سن کر میں خاصا پریشان ہو گیا ہوں۔ میری ماں
کو سنتے ہی ہارٹ اٹیک ہو جائے گا اور میں خود کو کبھی معاف نہیں کروں گا۔ تم سخت
دل بیٹی ہو، سہہ جاؤ گی۔ اپنی لطافت بھری زندگی میں مگن ہو جاؤ گی۔ مگر میں اپنے
والدین کی وہ اولاد ہوں جو اُن کے اشاروں پر تاجتھی ہے۔“ وہ اکھڑے ہوئے لہجے
میں بول رہا تھا۔ وہ ششدر ہو کر اسے دیکھنے جا رہی تھی۔

”میرا دل چاہ رہا ہے، فوراً اُن کے پاس چلا جاؤں۔ موقع محل دیکھ کر اپنی اس
غلطی کا اعتراف کر لوں۔“ وہ سوچتے ہوئے بولا۔

”آصف! میرا دل ڈر رہا ہے۔ مجھے ایسا محسوس ہو رہا ہے، جیسے ہم دونوں ایک
بہت بڑے طوفان کی زد میں آنے والے ہیں۔ کیونکہ نیا بے مہار ہو کر ڈولنے لگی
ہے۔ آصف! ہمارا بتا بٹایا گھر ڈوب جائے گا۔ آپ ہوش میں آجائیں۔ آپ کو کیا ہو
گیا ہے؟ پلیز آصف!“ وہ اُس کے گھٹنوں پر سر رکھ کر رودی۔

”سویا ہوا ضمیر جاگ اٹھا ہے حدیث! آج سسٹر ثمنیہ کی باتوں نے ہلا کر رکھ دیا
ہے۔ ہم نے اپنے والدین پر ایسی زیادتی کر ڈالی ہے، جس کا ازالہ مشکل ہے۔ ہمیں
ایک دن تو اس طوفان کا سامنا کرنا ہی تھا، سو وہ وقت آ ہی گیا۔“ وہ سنجیدہ تھا۔ ”سب
سے پہلے یہ چیک اپنے مجبور اور لاچار والدین کو پہنچاؤ۔ تم نے بھی تو حد ہی کر دی
ہے۔ ذرا سوچو، اتنے مہینے انہوں نے کیسے گزارے ہوں گے؟ خود غرضی اور لا پرواہی
کی بھی انتہا ہوتی ہے۔ مجھے تم سے یہ اُمید نہ تھی۔ مجھے سوچ کر ہی افسوس ہونے لگا
ہے کہ تم والدین کو اتنی جلدی بھلا سکتی ہو تو میں کس زمرے میں آتا ہوں؟“

وہ قریب ہی کارپٹ پر اس کے گھٹنوں سے سر اٹھا کر بے بسی سے دیکھنے لگی۔
”ٹسوے بہانے سے تم اپنے والدین کے درد کو دھونیں سکتی۔ تم نے اُن کی خبر
ہی لی ہوتی کہ کس حال میں ہیں۔ میں نے اُن سے ناطہ توڑنے کا نہیں کہا تھا، شادی
کو صیغہ راز میں رکھنے کی تلقین کی تھی۔ وہ بھی تھوڑی مدت کے لئے۔“ وہ قدرے خشکی
سے بولا۔

وہ حیرت سے اسے دیکھنے لگی کہ وہ مورد الزام فقط اسے ہی ٹھہرا رہا تھا۔ اپنی

پارسی اور بے گناہی کے کلمات اُس کی زبان پر تھے۔
 ”میں غلط بیانی سے کام نہیں لے رہا، حقیقت سے تمہیں روشناس کرنا چاہتا ہوں
 کہ شادی کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہوتا کہ والدین سے عمر بھر کے لئے کنارہ کشی اختیار
 کر لیں۔ کم از کم میں تو ایسا گناہ نہیں کر سکتا۔“ وہ تلخی سے بول رہا تھا۔

”آپ کھل کر کیوں نہیں کہہ دیتے کہ آپ کو اب پچھتاؤں نے گھیر لیا ہے۔
 میں آپ کی نظروں سے گر گئی ہوں۔ کیونکہ میں نے آپ کی خواہش کو اولیت دی۔
 آج آپ مکمل طور پر ہوش میں آچکے ہیں۔ کیونکہ رات بیت چکی ہے۔ طلوعِ سحر نے
 نشہ توڑ دیا ہے۔ اب سابقہ غلطی کا سرا حاس سر اٹھانے لگا ہے۔ اور میں آپ کے دل
 و دماغ سے نکل کر بہت دُور جا چکی ہوں۔ لیکن یاد رکھئے، میں نے آپ کے ساتھ
 جینے مرنے کا عہد کیا تھا اور ہمیشہ مجھے اسی پر قائم پائیں گے۔ یہی تو فرق ہے آپ میں
 اور مجھ میں۔“ وہ مری ہوئی آواز میں بولے جا رہی تھی۔

”تمہیں چھوڑنے کا کب کہہ رہا ہوں؟ والدین سے ملنے کی بات ہو رہی ہے۔“

وہ نرمی سے بولا۔

”میں ان کا سامنا نہیں کر سکتی آصف! اگر آپ یہ باتیں شادی سے پہلے کرتے
 تو کتنا ہی اچھا ہوتا۔ پہلے والدین کی آمادگی ہوتی، پھر ان کی دعاؤں کے سائے میں
 ہم نئی زندگی کا آغاز کرتے۔ نارمل طریقہ تو یہی تھا۔“ وہ اپنی خوشیوں میں تو رونا بھول
 گئی تھی۔ مگر آج آصف کے طعنوں اور تشنوں نے پرانی تمام تلخ یادوں کو جگا دیا تھا۔
 اُس کی آنکھوں میں ساون بھادوں کی جھڑی لگ گئی تھی جس کا آصف پر رتی بھر اثر نہ
 ہو رہا تھا۔

”میرا فیصلہ تو نہایت جذباتی تھا۔ کاش تم نے اپنی روایات کی قدر دانی کی ہوتی۔
 ہم دونوں کے ملاپ کا اس سے بہتر طریقہ ڈھونڈ لیا ہوتا۔ تم بھی عاقبت نااندیش ہی
 نکلی۔ مرد اور عورت میں یہی تو فرق ہے۔ جو عورت کو بیٹمبروں اور رسولوں کی ماں بننے
 کا شرف بخشتا ہے۔ تم کیسی عورت ہو۔ دعا باز بیٹی اور خود غرض بیوی۔ جسے فقط اپنی
 خوشیوں سے غرض ہے۔“ وہ تاسف بھرے لہجے میں بولا۔

”آپ درست فرما رہے ہیں۔ میں جلد ہی والدین سے ملنے گاؤں جاؤں گی۔
 اگر انہوں نے مجھے قبول کرنے سے انکار کر دیا تو پھر میرے لئے کون سا راستہ بہتر
 رہے گا۔ آپ ہی بتا دیجئے۔“ وہ پریشانی میں کانپ اٹھی تھی۔ ”واپس آ جاؤں یا انہی

”کیوں کی دھول بن جاؤں؟“

”تم اپنے حالات سے بخوبی واقف ہو۔ میں کسی راستے کا تعین نہیں کر سکتا۔“
 لہجے کی رکھائی پر وہ اسے حیرت سے دیکھتے ہوئے سوچنے لگی کہ کیا شوہر اتنی تیزی
 سے بے لحاظ اور بے مروت ہو سکتا ہے؟ میں نے تو کبھی سوچا بھی نہ تھا۔ اور پھر
 آصف جیسا مرد لگتا ہے ثمنینہ نے کچھ لگائی بھائی سے کام لیا ہے۔ وہ میری لکڑی
 لائف سے ٹپکس تو پہلے دن سے ہی تھی۔

”کیا سوچ رہی ہو؟“ وہ سنجیدگی سے بولا۔

”آپ اتنی جلدی بدل جائیں گے، کاش میں پہلے جان پاتی۔“ وہ روہانسی ہو گئی۔
 ”میں رتی بھر نہیں بدلا میری جان! ثمنینہ سسر نے تمہارے والدین کی عداوت
 اور پشیمانی کا جو نقشہ کھینچا ہے اور مالی حالات ناگفتہ بہ۔ میں تو نہیں جانتا تھا یہ سب
 کچھ۔“ وہ تلملا کر بولا۔

”میں نے آپ کو تفصیلاً سب کچھ بتایا تھا۔ آپ نے ترس کھا کر مجھ سے شادی کی
 تھی نا؟ یہی بات ہے۔ میں ہی نا سمجھ تھی۔ آصف! کھن سیدھی انگلیوں سے نکل جاتا
 تو پھر آپ میرے حالات پر ترس کھا کر شادی نہ کرتے، آسانی سے حاصل کر کے
 مجھے خود غرض اور بے وفا کا لقب دے کر مجھ سے جان چھڑانا چاہتے ہیں۔ میں ایسا
 نہیں ہونے دوں گی۔“ وہ تڑپ کر بولی۔

”مجھے جیل میں ڈلوادو گی؟..... تم ایسا بھی کر سکتی ہو صدیقہ! مجھے تم پر رتی بھر
 اعتبار نہیں رہا۔“ وہ چیخ کر بولا۔

”آپ خواہ مخواہ بات بڑھا رہے ہیں۔ میری بات تو سنیں۔ میں اُن کی بہتر
 لائف کے بارے میں ہر وقت سوچتی رہی ہوں، منصوبے بناتی رہی۔ مگر آپ سے شیر
 کرنے کی جرأت نہ کر سکی۔ آپ اس معاشرے کو تو جانتے ہیں۔ بھلا یہ کیسے ہو سکتا
 ہے کہ ان کی مجبوریوں اور مشکلات کو نظر انداز کر کے میں اپنی زندگی میں مگن اور خوش
 ہوں۔ کاش! میرے دل میں چھپے ہوئے کانٹے کو کبھی محسوس ہی کیا ہوتا تو آج اتنی
 سننے کو نہ ملتیں۔ میں نے آپ کے رزق کی حفاظت کی، آپ کی عزت کا پاس رکھا۔
 پھر گلہ کیوں؟“

”تم نے مجھ سے غیریت کیوں برتی؟“ وہ سنجیدہ تھا۔ ”مجھے جواب چاہئے۔“

”غیریت نہیں آصف! میری غیرت اڑے آتی رہی۔“ وہ نظریں جھکائے ہوئے

تھی۔

”صدیقہ! مجھے اس حقیقت کا اندازہ تو ہو ہی گیا ہے کہ جو بیٹی اپنے والدین کو دھوکا دے سکتی ہے، وہ اپنے شوہر کی وفادار کیسے ہو سکتی ہے؟“ وہ سچی سے بولا۔
 ”اومائی گاڈ!..... جس کے لئے اپنی دنیا تنگ کر لی، وہ بار بار جتا رہا ہے۔“ وہ تڑپ کر بولی۔

”میری دنیا کہاں سے وسیع ہے؟“ وہ برجستہ بولا۔
 ”تو یہ سوچ پہلے آنی چاہئے تھی۔ میں نے آپ کو سمجھانے کی کوشش کی تھی۔“ وہ آہستہ سے بولی۔

”میں جان گیا ہوں، وہ سب فراڈ تھا۔ تم نے مجھ سے پیار نہیں کیا صدیقہ! تمہیں محض اپنا اسٹیٹس بدلنے کی چاہ تھی۔ ایک ڈاکٹر کی بیوی بن کر بنگلے، گاڑی کا لالچ تھا۔ میں یہ سن کر دہل گیا ہوں۔ زمین میرے پاؤں کے نیچے سے سرک گئی ہے۔ میں لڑکھڑا گیا ہوں۔ مجھے تم سے یہ اُمید نہ تھی۔“ وہ دُکھ میں بول رہا تھا۔
 ”ثمنینہ سراسر غلط کہہ رہی ہے آصف! میرے پیار پر بھروسہ کیجئے۔“ وہ تڑپنے لگی تھی۔

”بھروسہ اور تم پر..... اٹ اِز آگ جوگ۔“ وہ طنزیہ مسکرایا۔
 ”ہاں ٹھیک ہی تو کہہ رہے ہیں آپ۔ جنہوں نے اپنا پیٹ کاٹ کر دنیا کی شد بد سکھائی، میں نے انہیں چھوڑ کر اس کو اپنایا، جس نے میرے لئے کچھ نہ کیا۔ بلکہ مجھے اپنی نظروں میں ذلیل و رسوا کر دیا۔ نہ دین کی رہی، نہ دنیا کی۔ آپ کے اس ظلم کو پیار سمجھ کر آپ کی ہو گئی۔“ وہ رو رہی تھی۔

”مرد بہت جذباتی واقع ہوا ہے صدیقہ! تم اپنے ارادوں میں مستحکم رہتیں۔ میرے اس ظلم پر تم نے سر تسلیم خم کیوں کر لیا؟ مجھے اس گناہ کبیرہ کا مرتکب کیوں ہونے دیا؟“ وہ افسردگی سے بولا۔

”مجھے اس غلطی پر معاف کر دیجئے۔“ وہ ہاتھ جوڑ کر بولی۔ ”میں جان گئی ہوں کہ آپ مجھے چھوڑ کر جانے کے لئے تیار کھڑے ہیں۔ میں بھی آپ کے ساتھ ہی جاؤں گی۔ میں ہر حال میں آپ کے والدین کے ساتھ رہنے کو تیار ہوں۔ ان کی خدمت گزاری اور فرمانبرداری ہی میری بخشش کا ذریعہ بن سکتی ہے۔ میرے والدین تو میری شکل بھی دیکھنے کے روادار نہیں ہوں گے۔ آپ کی باتیں درست ہیں۔ مگر میں آپ

کے حق میں بری ہرگز نہیں۔“

”میرے والدین.....“ وہ طنزیہ ہنستے ہوئے توقف کے بعد بولا۔ ”ایسی لڑکی کو کیسے سینے سے لگائیں گے، جس کے سینے میں دل نہیں دھڑکتا بلکہ فقط بے حس گوشت کا لوٹھرا۔“

”میرے خدا! میں یہ کیا سن رہی ہوں؟..... آصف! کیا میری خوشیوں کی مدت چند مہینے ہی تھی؟..... کاش میں پہلے جان پاتی کہ مرد کی وفا اور پیار پر یقین رکھنے والی عورت پر لے درجے کی ناعاقبت اندیش گردانی جاتی ہے۔ مجھ سے بہت بڑی غلطی ہو گئی..... کاش بیٹا ہوا وقت واپس آجائے اور میں آپ کی میٹھی، چڑی باتوں کا جواب نفی میں دے کر آپ سے اتنی دُور چلی جاؤں، جہاں تک آپ کی رسائی ناممکن ہو۔“ وہ بھی قدرے زور سے بولی۔ ”مجھے جواب چاہئے اس سوال کا کہ میری غربت اور کمزوری کو دیکھ کر آپ نے مجھے بزر باغ کیوں دکھائے تھے؟ مجھے اپنانے کا ڈھونگ رچانے والا با وفا کیسے ہو سکتا ہے؟ بتائیے کہ دعا باز کون ہے؟..... میں کہ آپ؟..... بیچ منجھار میں چھوڑ کر بھاگنے لگے ہیں بہانہ بنا کر۔ مجھے گناہگار اور قصور وار ٹھہرا کر۔ جبکہ اس ضمن میں پہل آپ نے کی تھی۔ میں نے بار بار سوچنے کا کہا تھا۔ میں مانتی ہوں کہ آپ کی دولت کی چندھیا دیئے والی روشنی اور پیسوں کی جھنکار نے میری سماعت اور بینائی کو مفلوج کر دیا تھا لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ میں کل آپ کو چھوڑ کر کسی اور کی تجوری پر قابض ہو جاؤں گی۔ یہ سب مجھے چھوڑنے کے بہانے ہیں۔“

”اب اس کا سدِ باب کر لو۔“ وہ لا پرواہی سے بولا۔

”مثلاً.... تفصیل سے بتائیے۔ میں نادان اور احمق لڑکی ذو معنی باتوں کو کیا جانوں؟“ وہ رُکھائی سے بولی۔

”میں کالیا، مدراسی تمہارے قابل نہ تھا۔ آئی ایم ایکسٹریملی سوری جناب!“ وہ غصے سے بولا۔

”ثمینہ آپ کو اس نام سے پکارا کرتی تھی آصف! اُس نے مجھ پر تھوپ دیا۔“ وہ رونے لگی۔

”میں تمہاری کسی بات پر یقین نہیں کرؤں گا۔ کیونکہ تم ایک ایچونٹ لڑکی ہو۔ کل کسی اور طرف چل پڑو گی۔“ وہ زچ ہو کر بولا۔

”ان تمام خدشات کا وقت بیت چکا ہے آصف! میں نے اپنی تمام زندگی آپ

کے نام لکھ دی ہے۔ میں نے آپ کو اپنا محترم سر اور ایک ہمدرد سمجھ کر آپ کی طرف دوستانہ قدم اٹھایا ہے، آپ کی تنہائی دُور کرنے کی کوشش کی تھی۔ یہی میرا قصور ہے جس کی سزا مجھے دے ڈالئے۔“ وہ نرمی سے بولی۔ مگر وہ خاموش ہی رہا۔

”مگر یہ بات یاد رکھئے گا کہ میرے گناہ کی سزا میں انصاف ضرور کیجئے گا۔ میرے قصور سے بڑھ کر سزا تجویز کی تو آپ کی پکڑ دونوں جہانوں میں عبرت ناک ہوگی۔ کیونکہ انصاف کرنے والا ہمیں دیکھ رہا ہے۔“ وہ بے بسی سے بولی۔ اور وہ اُسے نظر انداز کرتا باہر نکل گیا۔



ادھ مائی گاڈ..... یہ کل نما گھر، یہ وسیع و عریض لان اور آگے پیچھے بھاگتے دوڑتے ملازمین، جنہوں نے مجھے خود اعتمادی اور تفاخر کا درس دیا، سب ہی فریب دے گئے۔ کاٹ کھانے کو دوڑنے لگے ہیں۔ میری مجروح انا اور خود داری چیخ چیخ کر مجھ سے سکون و اطمینان کی بھیک مانگ رہی ہے..... اس کرب نے مجھے ادھ موا کر دیا ہے۔ کاش میں مر جاؤں۔ کیا کروں؟..... کہاں جاؤں؟..... کوئی ہے پرسانِ حال؟ کوئی ہے میرا ہم راز؟..... سوچتے ہوئے اس نے کروٹ بدلی۔ نیند کو سوں دُور تھی۔

آصف نے گھر میں جو آگ لگا دی تھی، وہ اس کی حدت و تپش سے محفوظ خواب خرگوش کے مزے لوٹ رہا تھا۔ اور یہ اس کی لگائی ہوئی آگ میں بھسم ہو کر رہ گئی تھی۔ وہ آہستہ سے اُٹھی اور کچن میں آ کر قدِ آدم ریفریجریٹر کو کھول کر خالی الذہنی سے اس کے اندر ہاتھ مارنے لگی۔ اور تھوڑی دیر بعد وہ قدرے ہوش میں آئی اور پانی کی بوتل نکال کر منہ کو لگا کر غٹا غٹ پانی پینے لگی۔ سینے کی جلن میں رتی بھر کمی نہ آنے پر وہ باہر لاؤنج کے دبیز صوفے پر گر گئی۔ حاجت مند والدین روتے بلکتے اس کی آنکھوں کے سامنے گھوم رہے تھے۔ ان کا پیار و دُلا ر اُسے کسی بل چین نہ لینے دے رہا تھا۔ وہ باہر برآمدے میں لٹکتے ہوئے جھولے پر بیٹھ گئی اور دھیرے دھیرے وہ جھولے پر بے سدھ ہوتی چلی گئی اور آنکھ لگ گئی۔

رات کے پچھلے پہر آصف نے اُس کی غیر موجودگی کو محسوس کیا تو اُس نے نیبل لیمپ آن کر کے وال کلاک کی جانب نیم وا آنکھوں سے دیکھا اور غیر ارادی طور پر ہی کمرے سے باہر نکل کر صدیقہ کو پکارا۔ جواب نہ ملنے پر وہ گھر کا کونہ کونہ چھانٹتے ہوئے بڑبڑا رہا تھا۔

”جس نے اپنے والدین کو بل بھر میں چھوڑتے ہوئے کچھ نہ سوچا، اس کے لئے میں کیسے اہم ہو سکتا ہوں؟ فاضلی آج مدراسی کا لیے کو بھی دعا دے گئی۔“
مین ڈور کھول کر وہ باہر نکل آیا۔ برآمدے میں اُسے جھولے پر سوتا دیکھ کر اچنبھے میں اُسے جھنجھوڑنے لگا۔

وہ تیزی سے ہڑبڑا کر آنکھیں ملتی ہوئی اٹھی۔ چند لمحوں میں درد نے پورے وجود میں انگڑائی لی۔ اور وہ آصف کے سینے سے لگ کر دھاڑیں مار کر رونے لگی۔ وہ اُسے سہارا دے کر کمرے میں لے آیا۔ اُسے بیڈ پر لٹا کر اُس کے قریب بیٹھ کر اُس کے بالوں میں انگلیاں پھیرنے لگا۔

صدیقہ کے وجود میں سکون و طمانیت کی لہر دوڑ گئی اور وہ اس کا دوسرا ہاتھ اپنے ہونٹوں پر رکھ کر چومنے لگی۔

”آئی ایم سوری حدیقہ!“ لہجے میں ندامت تھی۔

وہ پھر پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

”آئی لو یو حدیقہ! اس کا تو تمہیں یقین ہے نا؟“ وہ اُس کی سرخ اور درم شدہ آنکھوں میں جھانک کر بولا۔

”جی۔“ اُس نے معصومیت سے اثبات میں سر ہلایا۔

”در اصل حدیقہ! اسی وجود میں ایک ضمیر نام کا جھوٹا سا پی بھی بھیرا کرتا ہے، وقتاً فوقتاً اپنے ہونے کا احساس ضرور دلاتا ہے۔ آج کل میں اسی پجوشن سے گزر رہا ہوں۔“ وہ جمائی لیتے ہوئے بولا۔ ”اور غیرت و مردانگی کو ٹھیس پہنچے تو مر جانے کو دل چاہتا ہے۔“

”آپ سو جائیے۔“ وہ اس کی طرف پیار سے دیکھ کر بولی۔ ”میری وجہ سے آپ کی نیند خراب ہو گئی۔ ویری سوری۔“

وہ اُس کے پہلو میں لیٹ گیا اور اسے گلے لگا کر کمر پر ہاتھ پھیر کر اسے سہلانے کی کوشش کرتے ہوئے اپنے آنسو ضبط کرنے لگا۔ اور صدیقہ نیند میں کھتی چلی گئی۔



جب صبح دونوں اُٹھے تو ان کے موڈ خوشگوار اور پُر تسکین تھے۔ وہ آصف کے لئے نوٹس پر مکھن لگاتے ہوئے سوچ رہی تھی۔ چند دن دوزخ میں کتنے اذیت ناک تھے۔ یہ شوہر بھی کیسی عجیب مخلوق ہے کہ ہنس دے تو مکمل و گلزار مہک اُٹھیں۔ اور اس

کی خفگی اور خاموشی میں موت جیسی بے بسی اور مایوسی۔

”کیا سوچ رہی ہو؟“ وہ چائے کا سپ لیتے ہوئے بولا۔

”آصف! میری ریکویسٹ ہے، آئندہ مجھے جہنم میں پھینکنے سے پہلے سوچ لیجئے گا کہ اس بھری دنیا میں میرا آپ کے بغیر کوئی نہیں رہا۔ میں آپ کے قدموں کی خاک بن کر یہ زندگی گزارنے میں اپنی عزت و تکریم قائم رکھ سکتی ہوں۔ ورنہ دنیا مجھ پر تھوکے گی۔ آصف! مجھ سے جہنم کی آگ برداشت نہیں ہوگی۔ میرا شمار نہ تو زندہ لوگوں میں ہوگا، نہ ہی مردہ لوگوں میں۔ عالم برزخ بن جائے گا یہ گھر۔“

”تم درست کہہ رہی ہو۔ میں نے تو اپنے گھر کو جنت بنانے کا عہد کیا تھا۔ تم میری باتوں کو بھول جاؤ۔ دراصل ثمنینہ نے تمہارے والدین کا جو نقشہ کھینچا ہے، میں اس کا خود کو ذمہ دار ٹھہرانے لگا ہوں۔ اور پھر کچھ ایسی باتیں جن کا میں نے تصور بھی نہ کیا تھا، سن کر سب سے پہلے ہونا لازم تھا۔ میں تو یہی سمجھتا رہا کہ تمہیں بھی مجھ سے پیار ہے۔ خیر، تم اپنے والدین سے ملنے کا پروگرام بناؤ تاکہ اپنی سیٹ بگ کرالوں۔“

”آصف! میرے دل کی کیا حالت ہے، آپ نہیں جانتے۔ لیکن میں وہاں جانے سے مجبور ہوں۔ میرے خونی رشتے دار میری رگوں میں سرایت کرنے والا خون چوس لیں گے۔ آصف! مجھے اس ذلالت سے بچا لیجئے۔ میرا باپ اور میرے بھائی مجھے زندہ درگور کر دیں گے۔ آپ میری بات کا یقین کر لیں۔“ وہ ملتتی نظروں سے دیکھتے ہوئے بولی۔

”ٹھیک ہے۔ کم از کم انہیں چیک تو بھیج دو۔“ وہ سنجیدگی سے بولا۔

”چیک واپس آ جائے گا آصف! آپ میرے خاندان کی غیرت اور اکڑ سے آشنا نہیں ہیں۔ وہ غریب اور مفلس ضرور ہیں، لیکن کبھی کسی کی احسان مندی میں نہیں آتے۔ اور پھر وہ بھی ایک بھاگی ہوئی بیٹی کے بھیجے ہوئے پیسوں کو ایکسپنڈ کر لیں، یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ آپ اپنی ضد چھوڑ دیں۔ اگر آپ اپنے والدین سے ملنا چاہتے ہیں تو سو بسم اللہ۔ میں چند دن اکیلی رہ لوں گی۔“ وہ سنجیدگی سے بولی۔ مگر دل سے ہوک سی اٹھتی محسوس ہوئی۔

”یہاں تمہیں اکیلا کیسے چھوڑ سکتا ہوں؟ بہتر تو یہی تھا کہ والدین کے گھر کا راستہ تمہارے لئے آسان ہو جاتا۔ اس گھر کے در تمہارے لئے وا ہو جاتے۔“ وہ حسرت بھرے لہجے میں بولا تو صدیقہ نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

”آپ مجھ سے جان چھڑانا چاہتے ہیں آصف؟ ایسا سوچئے گا بھی نہیں۔ ورنہ میں خودکشی کر لوں گی۔“ وہ رونے لگی۔

”ایسی بات تو ہرگز نہیں۔ دراصل جب سے تمہارے والدین کی بچوبش کا سنا ہے، مجھے بھی مٹی اور ڈیڈی بہت یاد آنے لگے ہیں۔ اب تو وہ فون پر رونے لگتے ہیں۔ مجھے لگتا ہے، اب اُن کے صبر کا پیمانہ بھی لبریز ہو گیا ہے۔“ وہ کھڑا ہوتے ہوئے بولا۔

”میں بھی ساتھ ہی چلوں گی آصف! میں اُن کے پاؤں پڑ جاؤں گی۔ وہ ویل ایجوکیٹڈ لوگ ہیں، ہمیں معاف کر کے سینے سے لگا لیں گے۔“ وہ بھی یہ کہتے ہوئے کھڑی ہو گئی۔

”نیگم! والدین چاہے اُن پڑھ ہوں یا غریب، ڈگریوں والے ہوں یا پیسے والے اُن کے جذبات اور احساسات ایک جیسے ہی ہوتے ہیں۔ ان کا پیار، ان کی پھٹکار کا سائل ایک جیسا ہی ہوتا ہے۔ اس لئے کبھی ان کے سامنے جانے کا تصور بھی نہ کرنا۔ میں ان کی اکلوتی اولاد ہوں۔ وہ بہت پوزیسو ہیں۔ میری اس نافرمانی، دیدہ دلیری اور بے باکی کو کبھی معاف نہیں کریں گے اور مورد الزام تمہیں ٹھہرائیں گے۔“

”تو پھر کیا، ہم عمر بھر اسی گھٹ کے ساتھ جنیں گے؟..... ایسے تو آپ کے اور میرے درمیان ناقابل عبور دیواریں کھڑی ہو جائیں گی۔ کیونکہ میں محسوس کر رہی ہوں کہ مجھے پانے کی خواہش اور جذبہ دھیمہ پڑ چکا ہے۔ پچھتاوے کے سیاہ بادل منڈلا رہے ہیں۔ راستہ بھٹائی نہیں دے رہا۔“ وہ اُس کے شانے سے سر ٹکا کر تاسف بھرے لہجے میں بولی۔

”محببتوں میں کئے جانے والے جذباتی فیصلوں کا انجام یہی ہوتا ہے۔ مجھے اب سمجھ آئی ہے کہ مرد کبھی اپنی روئش کے بغیر نہ تو مکمل ہوتا ہے، نہ ہی ان کے بغیر اپنی نظروں میں عزت رہتی ہے۔ تم ہی بتاؤ کہ اس سے بڑی مردانگی پر اور کیا ضرب لگ سکتی ہے؟“ وہ دکھی ہو گیا تھا۔ ”اور جس سے پیار کیا، وہ بھی اصلی اور کھری نہ نکلی۔ اس سے بھی اعتبار اٹھ گیا۔ میں کالیا مدراسی، تمہارے ساتھ زیب نہیں دیتا۔ تم سچ ہی ذکرتی ہو۔ اس مسئلے کا حل تو ڈھونڈنا ہی پڑے گا۔“

”آپ ایسا کیوں سوچتے ہیں آصف؟..... مجھے آپ سے بے پناہ محبت ہے۔ نمینہ نے جو بھی کہا ہے، سراسر جھوٹ ہے آصف!..... وہ میرا گھر برباد کرنا چاہتی ہے۔ وہ یہ سب برداشت ہی نہیں کر سکی۔ اُس کی باتوں کو بھول جائیں۔ وہ آپ کے

اور میرے درمیان ایک شیطان کی حیثیت سے براجمان ہوئی ہے۔ کاش! میں اس سے اپنے دل کی باتیں نہ کرتی۔“ وہ ہاتھ ملتے ہوئے افسردگی سے بولی۔ ”میرے پیار میں تمہیں بھی کھوٹ نہیں۔ میری وفا آپ کے لئے ہے۔ بھروسہ تو کریں۔“

”تمہیں اس کا اندازہ ہونا بہت مشکل ہے۔ خدا تعالیٰ نے عورت کو طبعاً ہی بے وفا بنایا ہے۔ جس گھر میں اس کی پیدائش ہوئی ہے، جس گود میں بل کر جوان ہوئی ہے، اسے چھوڑتے ہوئے رتی بھر تکلیف نہیں ہوئی۔ پھر شوہر سے طوطا چشمی، بیٹے کے پروان چڑھنے کے ساتھ ساتھ بڑھتی چلی جاتی ہے۔ یہ ہے ایک عورت کی اصلیت۔ اپنا موازنہ کرو، مثال تمہارے سامنے ہے کہ تم ہر لمحہ گرگٹ کی مانند اپنا رنگ بدلتی گئی۔“ وہ صوفے پر بیٹھ کر بوٹ پہننے لگا۔ اور وہ ساکت و جامد اس بدلے ہوئے آصف کو دیکھتی رہ گئی۔

وہ آفس چلا گیا۔ اور صدیقہ بولائی بولائی گھر کے کبھی ایک کونے میں تو کبھی دوسرے کونے میں پھرتی رہی۔ دل کا چین و سکون غارت ہو چکا تھا۔ اسے یہ گھر پرایا سا لگ کر اسے بے کل کر رہا تھا۔ اُسے یقین ہو چلا تھا کہ اُس کی بادشاہت کا سورج ڈھلنے والا ہے۔ اور وہ بے دست و پا اس بھری دنیا میں تنہا، رات کی تاریکیوں میں بھٹکتی ہوئی دوسروں کے لئے ایک عبرت ناک داستان بن جائے گی۔ وہ سر تا پا لرز گئی اور لاؤنچ کے صوفے پر ڈھس گئی۔

”نیگم صاحبہ! طبیعت ناساز ہے تو صاحب کو فون کر کے بتاؤں؟ اگر آپ کی طرف سے اجازت ہو۔“ خانساں نے ہمدردی سے کہا تو وہ سیدھی ہو کر بیٹھ گئی اور اچنبھے سے بولی۔

”تم یہاں کیا کر رہے ہو؟ کچن میں اپنا کام کرو۔ جاؤ، میں بالکل ٹھیک ہوں۔“

”جی میں آپ کو پریشان دیکھ کر فکر مند ہو گیا ہوں۔ آپ دل چھوٹا نہ کریں۔ میاں بیوی میں تھوڑی بہت اونچ نیچ تو ہو ہی جاتی ہے۔“ وہ اپنی ٹوپی درست کرتے ہوئے بولا۔ ”ابھی نئی شادی ہے نا۔ ایک دوسرے کو سمجھنے کے لئے وقت تو چاہئے ہوتا ہے۔“

”ہاں۔“ وہ ناگواری سے بولی۔ ”اب تم جاؤ۔“

”آپ کے لئے دودھ لے کر آتا ہوں۔ دو چار دن میں ہی پیلی پڑ گئی ہیں۔“ وہ ہمدردی سے بولا۔ ”صحت ایک دفعہ خراب ہو جائے تو پھر ٹھیک نہیں ہوتی۔ بس روں

روں کرتی رہتی ہے۔“

”میں ٹھیک ہوں۔ تم میری فکر نہ کرو۔“ وہ ذرا نرمی سے بولی۔

”بیگم صاحبہ! غیروں سے رشتہ جوڑنا سراسر بے وقوفی ہے جی۔ تنہائی قبر کے دھانے تک پہنچا کر بھی نہیں چھوڑتی۔ دیکھیں نا، نہ آپ کے قریب کوئی بہن ہے نہ بھائی۔ نہ ہی ماں باپ اور عزیز رشتہ دار۔ ایسے ہی وقت وہ سہارا بن کر دلا سے دیتے ہیں، ہمت بڑھاتے ہیں اور زندگی گزارنے کے گر سکھاتے ہیں۔ آپ کسی بہن بھائی کو اپنے پاس بلا لیں۔ دل بہل جائے گا۔“ وہ سنجیدگی سے کہہ رہا تھا۔

”سن لیا ہے چاچا! کیا جان نہیں چھوڑو گئے؟“ وہ ناگواری سے بولی۔

”چلا جاتا ہوں۔“ وہ نادم سا ہوتے ہوئے بولا۔ ”رونے کے لئے اپنوں کا کندھا بہت ضروری ہوتا ہے۔ آدھا دکھ تو سوچ کر ہی رفو چکر ہو جاتا ہے۔ زندگی اپنوں کے بغیر مجبوری اور ناقابل برداشت بوجھ ہے۔“

”ہاں۔ اب تم رفو چکر ہو جاؤ تو مہربانی ہوگی۔“ وہ خفگی سے بولی۔

”ناراض مت ہوں بیگم صاحبہ! میں غریب ضرور ہوں مگر دل کا مفلس نہیں ہوں۔ آپ بخوشی اپنا دکھ درد میری جھولی میں ڈال کر ہلکی چھلکی ہو سکتی ہیں۔“ وہ دکھ بھرے لہجے میں بولا تو صدیقہ نے چونک کر اُس کی نظروں کا جائزہ لیا۔ آنکھوں میں سچائی کی جھلک نمایاں تھی۔

”شکریہ چاچا! آپ میرے لئے دودھ نہیں، چائے لاد دیجئے۔“ وہ اپنی پیشانی پر ہاتھ پھیر کر آنسو ضبط کرتے ہوئے بولی۔

”بیگم صاحبہ! گرم گرم دودھ پی کر سونے کی کوشش کریں۔ طبیعت بہتر ہو جائے گی۔ چائے کم بخت تو آئی ہوئی نیند اڑا دیتی ہے۔“ وہ ذرا سا مسکرایا۔

”اچھا چلو، جو مرضی ہے تمہاری وہی کرو۔“ وہ بھی قدرے مسکرائی تو وہ تیزی سے کچن کی طرف چل پڑا۔

وہ اُسے جاتے ہوئے دیکھ کر سوچنے لگی۔ دریا دلی کے لئے رزق کی فراخی درکار نہیں۔ اُس کے رویے اور توجہ نے جسم میں جیسے جان ڈال دی ہو۔

سچ ہی تو کہتا ہے چاچا۔ زندگی اپنوں کے بغیر مجبوری بن جاتی ہے اور ناقابل برداشت بوجھ بن کر ہر پل اپنے دکھوں اور محرومیوں کا احساس دلاتی ہے۔ یہ اس کا تجربہ بول رہا ہے۔ میری کم عمری کا یہ فیصلہ مجھے سراسر رسوائی اور پشیمانی کی جانب

دھکیلے جا رہا ہے۔ آج اسے بھی میری کم عقلی کا اندازہ ہو گیا ہے۔ آصف ایک پڑھا لکھا، دولت مند خاندان کا پروردہ میری عزت کا پاس کب تک رکھ سکتا ہے؟ میں نے جو بویا ہے، فصل اسی بیج سے پروان چڑھی ہوئی کانٹوں کی۔ اس لئے خوش فہمیوں کی دنیا سے باہر نکل کر دیکھو۔ چار سو بھیڑیے تمہارے انتظار میں منہ کھولے بیٹھے ہیں، تم پر حملہ آور ہونے کی مکمل تیاری کئے ہوئے ہیں۔ ان سے بیج کر کہاں جاؤ گی؟ کون ہے جو تمہیں ان سے بچا کر اپنے سائے کا تحفظ دینے کی جرأت کرے گا؟ تمہارا کوئی نہیں۔ اتنے بڑے خاندان میں سے ایک بھی نہیں۔ کتنی بد قسمت ہو تم۔ یہ کیا کر دیا تم نے....؟ وہ کانٹوں پر ہاتھ رکھ کر سسک اٹھی۔

چاچا خانساں دودھ کا گلاس لے کر پہنچ گیا۔ اُسے دیکھ کر پلک اٹھا۔
 ”نیگم صاحبہ! میرے ہوتے ہوئے کسی پریشانی یا فکر کی ضرورت نہیں۔ میں آپ کے گاؤں جاؤں گا۔ معاملہ سلجھانے کی کوشش کروں گا۔“
 ”تو مطلب یہ کہ اس نے ہماری تمام گفتگو سن لی ہے۔ اُس نے افسردگی سے سوچا۔“

”چاچا! میرے معاملات میں آپ کی دخل اندازی درست نہیں۔ آپ اپنا کام کریں۔ اللہ بہتر کرے گا۔ ہر مسئلہ وقت کے ساتھ ہی حل ہوتا چلا جائے گا۔ میری فکر کرنا چھوڑ دیں۔“

”فکر مند ہونا یا نہ ہونا اپنے اختیار میں ہوتا تو آپ اتنی فکر مند کیوں ہوتیں؟ قابو پا لیا ہوتا۔ اللہ تعالیٰ بہت بڑا رحیم و کریم ہے۔ خطائیں بھی وہی معاف کرتا ہے۔ توبہ کرنے والوں اور صبر کرنے والوں کا ساتھ بھی وہی دیتا ہے۔“ وہ عقیدت بھرے لہجے میں بولا۔

”میرے لئے دعا کیجئے گا چاچا!“ وہ دودھ کا گلاس پکڑتے ہوئے بولی۔ ”آپ کو علم تو ہو ہی گیا ہے کہ میں نے اپنی نا اہلی اور بے وقوفی سے بہت بڑا دھوکا کھایا ہے۔“
 ”نیگم صاحبہ! انسان خطا کا پتلا ہے۔ پینمبروں سے بھی انجانے میں غلطیاں سرزد ہوئی ہیں، ہم تو بہت حقیر ہیں۔ میں ایک بات کہوں اگر اجازت ہو تو؟“ وہ جھجکتے ہوئے بولا۔

”بولیے چاچا!“ وہ دودھ پیتے ہوئے بولی۔
 ”اپنا قتل بھی کرے گا تو لاش کو سائے میں ہی پھینکے گا۔ ڈاکٹر صاحب تو ہر لحاظ

سے ہی غیر اور بیگانے ہیں۔“ وہ جھجکتے ہوئے بولا۔
وہ خاموشی سے اُس کا منہ تکتے ہوئے دودھ پینے لگی۔ اور چاچا ایک لمبی آہ بھرتا
ہوا وہاں سے چلا گیا۔



”آج پھر شمیمہ کا فون آیا تھا۔“ آصف نے پلیٹ میں کھانا نکالتے ہوئے کہا تو
صدیقہ سرتا پالرز گئی۔

”کیا کہہ رہی تھی؟“

”سن نہیں پاؤ گی۔“ وہ سنجیدگی سے بولا۔

”ظاہر ہے، کوئی بکواس اوٹ پٹانگ ماری ہو گی۔ سٹوڈنٹ، ایڈیٹ ہر بار آپ کو
ہی فون کیوں کرتی ہے؟“ وہ غصے میں بولی۔

”وجہ تم خود ہی اس سے پوچھ لینا۔“ وہ سنجیدگی سے بولا۔

”مجھے لگتا ہے، وہ میرا گھر برباد کر کے چھوڑے گی۔“ وہ غصے سے بولی۔

”ایسی غلط فہمیوں میں مت پڑو۔ وہ تو تمہارے والدین کے حالات کے سوا مجھ
سے کوئی اور بات نہیں کرتی۔ وہ بہت مخلص اور ہمدرد لڑکی ہے۔ وہ چاہتی ہے کہ ہم
دونوں وہ طریقہ ڈھونڈیں کہ والدین کے قریب ہو جائیں۔ اب دیکھو نا، تمہاری ماں تو
تمہیں یاد کرتے کرتے ہی اس دار فانی سے چل بسی۔“ وہ دکھ بھرے لہجے میں بولا۔

”یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟“ وہ تڑپ اٹھی۔

”وہ تو ہمیں تمام حالات سے باخبر رکھنا چاہتی ہے۔ مجھے فون کرنے کا اس کا

کوئی اور مقصد مجھے نظر نہیں آتا۔“ وہ پانی گلاس میں ڈالتے ہوئے بولا۔

”ہائے..... ماں چلی گئی آصف!..... مجھ سے خفا ہی چلی گئی۔“ وہ چیخ اٹھی۔ آنسو

رُکے ہوئے تھے، چہرہ فق تھا اور پشیمانی انگ انگ سے پھوٹ رہی تھی۔

”حدیقہ! میں نہیں چاہتا کہ کل میری ماں بھی مجھ سے ناراضگی کی حالت میں

سدھار جائے۔ میں خود کو معاف نہیں کروں گا۔ میں ان کے پاس جانا چاہتا ہوں۔“

وہ تڑپ کر بولا۔ ”انہیں سمجھانے کی کوشش کروں گا۔ ہو سکتا ہے مجھے گالی گلوچ اور بد

دعائیں دے کر نارل بھی ہو جائیں۔ والدین ہیں، بچوں سے کتنے دن ناراض رہ سکتے

ہیں۔ میں تمہیں یہی تو سمجھانا چاہ رہا تھا کہ گاؤں جا کر انہیں منالو۔ مگر تم نے میری

ایک نہ سنی۔ اپنے ہی ڈر اور خوف کے جال میں پھنسی رہی۔“ وہ رنجیدہ ہو گیا تھا۔

”اب بھی دیر نہیں ہوئی۔ چلی جاؤ، ماں کا منہ دیکھ لو اور باپ سے معافی مانگ لو۔“
 ”اب جانے کا کیا فائدہ آصف!..... ماں، جس سے مجھے درگزر کی اُمید تھی، وہ
 ہی چلی گئی۔ اب مجھے وہاں کوئی تحفظ نہیں دے سکتا۔“ وہ رو پڑی۔

”سوچ لو۔ میں نے تو اپنی کل کی سیٹ بک کرائی ہے۔ بہتر تھا کہ تم بھی چلی
 جاتی۔ شاید تمہارا ضمیر مطمئن ہو جاتا۔“ وہ سنجیدگی سے بولا۔
 ”آپ کل چلے جائیں گے مجھے اس رنج و الم میں تنہا چھوڑ کر؟“ وہ حیرت سے

بولی۔

”میرے ضمیر کے اطمینان کے لئے جانا بہت ضروری ہو گیا ہے۔“
 ”دعا کرو والدین آنے کی اجازت دے دیں۔“ وہ سوچتے ہوئے بولا۔
 ”یعنی اگر اجازت نہ ملی تو آپ واپس نہیں آئیں گے؟“ وہ ایک دم سے دہل
 گئی۔

”ہاں۔ انہیں روتا بلکتا چھوڑ کر کیسے آ سکتا ہوں؟“ وہ لاپرواہی سے بولا۔ ”اُن
 کی آہیں مجھے برباد کر دیں گی۔ میں اپنی زندگی کا ہر لمحہ اُن کے چہنوں میں گزارنا
 چاہوں گا۔“

”آپ مجھے تنہا کس کے سہارے چھوڑ کر جا رہے ہیں؟ یہ تمام باتیں سوچنے کا
 وقت گزر گیا ہے۔ آپ نے مجھ سے جو وعدے کئے تھے، وہ بھول گئے ہیں۔ میں بھلا
 اکیلی کیسے رہ سکتی ہوں؟“ وہ تڑپ اُٹھی۔

”اس لئے تو کہتا ہوں اپنوں میں چلی جاؤ۔ اگر میں واپس آ گیا تو تمہیں بلا لوں
 گا۔ نہ آیا تو طلاق بھیج دوں گا۔ شادی کر لینا۔ میرے انتظار میں اپنی جوانی کو گالی نہ
 بنا لینا۔“ وہ نارمل ہی بول رہا تھا۔

”نہیں آصف! میں اپنے گھر سے ہرگز نہیں جاؤں گی۔ یہاں اکیلے رہ کر زندگی
 گزارنا زیادہ بہتر ہے وہاں کی ذلالت سے۔ اپنے اس کالے منہ کو لے کر ان کا سامنا
 کرنے کی مجھ میں ہمت نہیں۔“ وہ روئے جا رہی تھی۔

”جیسے تمہاری مرضی ہے کرو۔ یہ گھر تو کرائے پر ہے۔ اگر میں بروقت نہ پہنچ سکا
 تو یہ گھر ہر صورت میں چھوڑنا پڑے گا۔ اور پھر اتنے بڑے شہر میں تمہارا تنہا رہنا سیف
 بھی تو نہیں۔ لاہور کے چپے چپے سے تم واقف ہو۔ وہاں چلے جانا بہتر ہے۔ تم بہت
 ضدی عورت ہو اور بے وقوف بھی۔ میری بات سمجھنے کی کوشش کرو۔“ وہ غصے میں بولا۔

وہ ڈانٹنگ چیئر سے اٹھ کر لڑکھڑاتی ہوئی باہر نکل آئی۔ اُسے اپنا دم گھٹتا ہوا محسوس ہوا تھا۔ سر چکرا رہا تھا۔ جب تک وہ اپنے کمرے تک پہنچی، وہ بے ہوش ہو کر گر گئی۔ چاچا دُور کھڑا تمام سین دیکھ کر تڑپ رہا تھا۔ بھاگتا ہوا ڈانٹنگ روم میں گیا اور بیگم صاحبہ کے بے ہوش ہونے کی اطلاع دی تو آصف طنزیہ مسکرایا۔

”ان عورتوں کی مکاریوں اور چالاکیوں سے اللہ بچائے۔ چاچا! پانی لے کر آؤ۔ ابھی ٹھیک ہو جائے گی۔ ماں کے جانے کے صدمے کے وقتی اثرات ہیں۔ وہ اٹھ کر کمرے میں آیا، اُس کے قریب بیٹھ کر بلڈ پریشر چیک کرنے لگا۔ چاچا تیزی سے پانی لے کر پہنچا ہی تھا کہ اُس نے حرکت کی۔

”اللہ تیرا شکر ہے۔ بیگم صاحبہ ہوش میں آگئیں۔“ وہ بے ساختہ بولا۔
 ”بلڈ پریشر لو ہو گیا ہے۔ ابھی ٹھیک ہو جائے گا۔“ آصف سنجیدگی سے بولا اور اس کے ہاتھ سے پانی کا گلاس پکڑ کر اسے جانے کا اشارہ کیا۔ صدیقہ کو پکڑ کر اٹھایا اور بستر پر لٹا دیا۔

”حد یقہ! میری جان! کیا ہو گیا ہے؟“ وہ اُسے رحم سے دیکھ کر بولا۔
 آخر اُس نے اُسے پیار بھی تو بے انتہا کیا تھا۔ اُسے اپنا تے وقت وہی اُس کے حواس پر سوار تھی۔

”میں آپ کے بغیر مر جاؤں گی۔ مجھے ساتھ لے جائیے۔ میں بہت اکیلی ہوں یہاں۔ آپ کے بغیر میرا کوئی نہیں آصف!“ وہ تڑپ کر بولی۔ ”میرا دل گواہی دے رہا ہے، آپ واپس نہیں آئیں گے۔“

”بھلی! میں بھی تو تمہارے بغیر خوش نہیں رہ سکتا۔ اگر مجبوری آڑے آگئی تو کچھ نہیں کر سکوں گا۔ میرے بوڑھے والدین میرے لئے بہت پریشان رہنے لگے ہیں۔ میں ان کا انجام تمہارے والدین جیسا نہیں چاہتا۔ انہوں نے مجھے اس دن کے لئے پیدا نہیں کیا تھا کہ انہیں بے سہارا کر دوں۔ تم اپنا دل بڑا کرو۔ مضبوط ہو جاؤ۔ بالکل اسی طرح جیسے والدین کو چھوڑتے ہوئے تم نے خود کو سیسہ پلائی ہوئی دیوار بنا لیا تھا۔“ وہ پھر طنز کر کے اُسے تڑپا گیا تھا۔

”آصف! آپ کو کیا کہوں اور کیا نہ کہوں؟ سب کچھ تو میں نے بھی بولا اور آپ نے بھی سنا۔ جس کا کچھ اثر نہیں ہوا۔ اوپر والا میری نیت سے بخوبی واقف ہے۔ میں والدین اور بہن بھائیوں کے لئے کیا سوچتی رہی، آپ تو یقین نہیں کریں گے۔ کیونکہ

سسر شمینہ نے جو عینک آپ کو پہنا دی ہے، وہ اُترنا مشکل ہے۔ لیکن میری ایک بات یاد رکھئے گا، جسے آپ بے وفا کہہ رہے ہیں، ایک دن اس کی وفا آپ کو میرے قریب لے آئے گی۔ اگر آپ نہیں آسکتے تو طلاق کی تکلیف مت کیجئے گا۔ مجھے آپ کے نام پر بیٹھنے میں فخر ہوگا۔ اور مرتے دم تک اس نام کی عزت و شان کی نگہداشت کرنا میرا فرض ہوگا۔ لیکن انتظار ہر دم کروں گی۔“

”کبھی کبھار بھروسہ جیون پتانے کا سبب بن جاتا ہے۔ اچھی بات ہے کہ آس اور انتظار میں ہی دن پتالوں کی۔ کیا معلوم آپ کو میرا پیار واپس ہی لے آئے۔ آہ! کس قدر خوش رہنے لگی تھی۔ میری تمام قربانیاں ہی اکارت ہو گئیں۔ صرف چند دن رک جائے۔ وقت کا مرہم میرے وجود کا ہر درد ختم تو کر دے گا مگر اس وقت ماں کا ناراض چلے جانا اور شوہر کا بھی خفا ہو کر ہمیشہ کے لئے چھوڑ جانا مجھے پاگل ہی نہ کر دے۔“ وہ التجائیہ انداز میں بولی۔ ”صرف چند دن۔ مجھے اس گھر سے اپنے ہاتھوں سے رخصت کر کے چلے جائے گا۔“

”دراصل حدیقہ! اتنا بڑا سانحہ مجھے سبق سکھا گیا۔ سوچا کہ کہیں میں بھی دیر نہ کر دوں۔ اڑتی ہوئی خبر سننے کا اور خود بتانے کے امپیکٹ میں فرق ہوتا ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ ان کی سماعتوں میں کسی اور کی طرف سے خبر پہنچے۔ اس لئے میں ہی جانا چاہتا ہوں۔ مجھے روکنے کی کوشش مت کرنا۔ کیونکہ میں نے فیصلہ کر لیا ہے۔ ہر صورت کل۔“ وہ سنجیدگی سے بولا۔ ”تم دو دن میں ہی سنبھل جاؤ گی۔ میں تمہیں بہت اچھی طرح جاننے کے بعد گارنٹی سے کہہ رہا ہوں۔ مجھے بھول کر نئی راہ کا چناؤ تمہارے لئے ہرگز مشکل نہیں۔ تم بہت مضبوط اور سخت دل کی لڑکی ہو۔ اس لئے تمہاری طرف سے میں بے فکر ہوں۔“ وہ طنز سے بول رہا تھا۔

”ہاں، آپ سچ ہی تو کہہ رہے ہیں۔ کیونکہ میں نے سنگدلی کی مثال خود ہی تو قائم کی ہے۔ آپ میری اصلیت بتا رہے ہیں، کوئی جھوٹ تو نہیں بول رہے۔ میں جانتی ہوں کہ آپ سچائی پر ہیں آصف! اور والدین کو دعا دینے کا جو قدم میں نے اٹھایا تھا، اس کی سزا دینے میں آپ کا انصاف بے مثال ہے۔ میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کے ساتھ بھی انصاف کا سلوک روا رکھے۔ اور جس سے آپ محبت کریں وہ آپ کے سائے سے بھی دور بھاگے۔ شاید پھر میری یاد آ جائے، میری بے گناہی کا احساس جاگ اُٹھے۔“ وہ دھاڑیں مار کر رونے لگی۔

وہ ایک دم پریشان ہوا اور پھر سنبھل کر بیٹھ گیا۔ خاموش اور بے پردا۔
چاچا نے تمام باتیں سماعتوں میں ڈالیں اور وہاں سے آنسو صاف کرتا ہوا ہٹ گیا۔



”شب بیداری میں تم نے کیا فیصلہ کیا ہے؟“ وہ کپڑے اٹیچی میں رکھتے ہوئے
بولا۔ وہ اُس کے کپڑے بینگر سے اتارتے ہوئے دل آزرہ اور پڑمردہ نظروں سے
اُسے دیکھتی جا رہی تھی۔

”جیسے آپ کا فیصلہ اٹل اور مستحکم ہے، اسی طرح میرا بھی۔ ہمارے بیچ چلنے والے
تمام ایٹھو کی اہمیت کے حامل نہ تھے۔ لیکن آپ انہیں کوہ ہمالیہ کی طرح بلند و وسیع بنا
کر مجھ سے جان چھڑانا چاہ رہے ہیں۔ میں بے وقوف نہیں۔ آپ قوی ہونے کے
باوجود اس قدر بے بس ولا چار کیوں نظر آنے لگے ہیں؟ اپنے والدین کو شادی کے
بارے میں اسی وقت بتانے کی ہمت کریں۔ میں تو ہوں ہی کمزور و ناتواں ہستی۔
والدین سے چھپانے میں ہی عافیت جانی کہ کہیں ان کے عتاب میں آپ بھی گرفتار
نہ ہو جائیں۔ آپ نہیں جانتے کہ جس کے پیٹ میں بھوک سے نقاہت اور لاغر پن
ہو، وہ نہ تو کسی کی جان کی پروا کرتے ہیں نہ ہی انہیں اپنی جان کا ڈر یا خوف ہوتا
ہے۔ لیکن آپ نے میری خاموشی کو غلط رنگ دے ڈالا۔ اور مجھے کس قدر تنہا کر کے
آپ جا رہے ہیں۔ یہ سوچ کر آپ نہ تو مجھے تنہائی کا خوف ہے، نہ ہی آپ کے بغیر
جینے کا اندیشہ ہے۔ اور نہ ہی اپنی بد قسمتی کا رونا ہے۔ مگر یاد رکھئے گا کہ آپ جس عمل کو
کارِ ثواب سمجھ رہے ہیں، اس کی بنیاد میری دبی ہوئی آہوں اور گھٹی ہوئی سسکیوں پر
رکھ کر آپ کو دلی سکون اور ذہنی اطمینان نصیب نہیں ہو گا۔ مجھ سے آپ پر بھروسہ
کرنے میں جو غلطی سرزد ہوئی ہے، اللہ تعالیٰ نے مجھے تو میرے کئے کی سزا بہت جلد
سنادی، محفوظ آپ بھی نہیں رہیں گے۔ وقت آپ کے ساتھ بھی ایسا ہی انصاف کرے
گا، جیسا آپ نے مجھ سے کیا ہے۔“

”یار! بد دعائیں تو نہ دو۔ بندہ خاکی تم سے کبھی بے انصافی نہیں کرے گا۔ آخر کو
تم میرا پیار ہو، میری بیوی ہو۔ ہو سکتا ہے واپس بھی آ جاؤں اگر ایک مہینے میں واپس
نہ پہنچ سکا تو پھر بھی انعام کر دوں گا۔“ اُس کے چہرے پر ڈھٹائی اور بے لحاظی تھی۔
جبکہ صدیقہ کا چہرہ مظلومیت کی داستان بن چکا تھا۔

”آپ مجھ سے تعلق اور رشتہ کیونکر نبھائیں گے؟ مجھے حاصل کرنے کے بعد آپ نے جس کمی کو محسوس کیا تھا، اس کے حصول کی خاطر اب نہ تو میں آپ کی مجبوری بن سکتی ہوں، نہ ہی ضرورت اور نہ ہی آپ کے پاؤں کی زنجیر۔“

”صدیقہ! میں پابندیوں اور قید و بند میں گھٹ گھٹ کر جینے کے سخت خلاف ہوں۔ اسی لئے تو تمہارے لئے بھی ایسے ہی خیالات رکھتا ہوں۔“ وہ سرد مہری سے بولا۔

”ایسے مت کہئے۔ میں تاحیات آپ کے انتظار میں رہوں گی۔ آپ کے ساتھ بیٹے ہوئے ان حسین لمحوں کی یادوں کے دیے روشن رکھوں گی۔ زندگی کے کسی نہ کسی موڑ پر پھر سے ایک دوسرے سے سامنا ہو گیا تو مجھے اپنا مطیع ہی پائیں گے۔“

”ہاں۔ ریڈ کوئین کی آس میں گوئیں بڑھاتی جاؤ۔ تم نہیں سمجھو گی۔“ لہجے کی اس تلخی اور ذمہ داری نے صدیقہ کی نگاہوں میں بجز پین اور بڑھا دیا۔ دل غم کے پھکولوں سے لرز اٹھا تھا۔

”آج میں جیتی ہوئی بازی ہار گئی۔ میں نے جوا کھیلنا تھا آصف زیدی! حرام کی آمیزش میں مزا ضرور ہے مگر اسے ڈائجسٹ کرنا بہت ہی اذیت ناک اور عبرت ناک ہے۔ انتزیاں کٹ کٹ کر منہ کو آتی ہے۔ باہر پھینکو تو ذلالت، ننگو تو ہلاکت۔ میرے ساتھ تو کچھ ایسا ہی معاملہ ہوا ہے۔“ وہ تڑپ کر اُسے سرد نگاہوں سے دیکھنے لگی۔

وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے بیڈ تک لے آیا اور اسے گلے لگا کر بیڈ پر لیٹ گیا۔

”جاتے جاتے تمہیں اپنی محبت کا یقین تو دلانا جاؤں۔“

وہ ایک دم بیڈ سے نیچے اتر گئی اور چیخ کر بولی۔ ”بس یہی ہے آپ کی محبت۔ اس بے ہودگی کے سوا اور کچھ نہ تھا۔“

”یار! اب تو شادی قدرے پرانی ہو گئی ہے۔ اس کو نیا پن دینے کے لئے کچھ عرصے کی دوری بہت اہم ہوتی ہے۔ میری بات یاد رکھنا، جب ہم پھر ملیں گے تو یوں لگے گا جیسے ہماری قربت میں چاشنی اور محبت میں صداقت کا لیول بہت ہائی ہو گیا ہے۔ جب سے ہم ازدواجی رشتے میں منسلک ہوئے ہیں، ایک رات کے لئے بھی الگ نہیں رہے۔ بھلا شادی میں چارم کیسے برقرار رہ سکتا ہے؟ صبح و شام، دن اور رات ایک ہی شکل دیکھ کر بندہ اکتا جاتا ہے۔“ وہ اکتاہٹ سے اُس کی طرف دیکھ کر بولا۔ اُس کی گول مول، چٹنی سی آنکھوں کی چمک اُسے شیطانی اور مکروہ لگ رہی

تھی۔ اُس کی شخصیت کا یہ دوہرا روپ اُسے لال بھبھوکا کر گیا۔ وہ اُس کے قریب آ گیا اور گرفت کو مضبوط کرتے ہوئے بولا۔

”آئی لُوئے جانم!..... ادھر آؤ تو۔ میری باتوں پر نہ جاؤ، میرے اعمال دیکھو۔ کالیا مدراسی سہی، تمہارے حقوق ادا کرنے میں تو بے مثال ہی رہا ہوں۔“

صدیقہ نے اُسے کھا جانے والی نظروں سے گھورا۔ دل چاہا کہ اُس کے منہ پر تھپڑوں کی بارش کر دے اور اس سے نفرت ہونے کا ڈھنڈورا پیٹا دے، جس نے اسے اپنی ہوس کی خاطر اپنایا تھا۔ معصومیت اور کسپری کا ناجائز فائدہ اٹھا کر مدح سرائی میں زمین و آسمان کا فرق نہ چھوڑا تھا۔ اور یوں اس نادان کو خونی رشتوں سے دُور کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ اُس کی چال بازی کا یہ بھید منکشف ہونے پر اسے تاسف بھرا احساس تو ہوا ہی تھا، مگر حقیقت کو اپنے سامنے حالتِ برہنگی میں دیکھ کر اپنی کم مائیگی اور ناہنجی پر بھی ماتم کناں ہونے کو دل چاہ رہا تھا۔

”مجھے چھوڑ دیجئے آصف! میں آپ کی رکھیل نہیں، بیوی ہوں۔ مگر افسوس ہے، آپ کی ذہنیت نے مجھے اسلامی نقطہ نظر سے خود پر حلال تو کر لیا مگر میرا اسٹیٹس آپ کی نظروں میں رکھیل سے بڑھ کر نہیں تھا۔ آپ کو میرے ساتھ پیار کا ڈھونگ رچاتے ہوئے ترس بھی نہ آیا۔ چند مہینوں کے لئے اپنانے کا سوچ کر دل میں خوفِ خدا بھی نہ آیا۔ آپ انسانیت کے دائرے سے نکلنے ہوئے لرز کیوں نہ گئے؟ میں نے کیا باگڑا تھا آپ کا؟ میرے خاندان سے کیا دشمنی تھی آپ کی؟ مجھے اس کا جواب دیں آصف! ایک تماشائی بن کر تمام دنیا کا ساتھ کیوں دینا چاہتے ہیں؟ میرا قصور بتائیں۔“ وہ چیخ رہی تھی۔

”ایسی بات ہرگز نہیں۔ میں تمہارے بغیر بالکل ادھورا ہوں جان! مگر والدین کے بغیر ٹوٹلی اپانچ اور لاوارث۔“ وہ بیڈ سے نیچے اتر کر نرمی سے اس کے غصے کو دُور کرنے کی کوشش کرنے لگا کہ کہیں اس ظلم کی آگ گھر سے باہر نہ نکل پڑے۔ اس کا دل دہل گیا تھا۔

”ان نشیب و فراز کی خبر پہلے ہونی چاہئے تھی۔ میری زندگی برباد کرنے کا آپ کو کیا حق پہنچتا تھا؟ مجھے جواب دیجئے، کس گناہ کی پاداش میں آپ نے دنیا مجھ پر تنگ کر دی؟ آپ کو کوئی پوچھنے والا نہیں۔ اور نہ ہی میری کہیں شنوائی ہونے والی ہے۔ یہی سمجھ کر آپ نے میرے ساتھ پیار کا ٹانک کھینچا تھا۔ اب چھوڑ جانے کا بہانہ ڈھونڈ

کر ہر بات پر میں قصور وار ٹھہرائی جانے لگی۔ والدین کی یاد ستانے لگی۔ آپ میری ماں کے قاتل ہیں۔ ذرا اپنی ماں کو تڑپتے ہوئے مرتا دیکھیں تو پھر احساس ہو گا کہ آپ نے مجھے کتنا بڑا دکھ دیا ہے اور لگے ہیں مجھے پھر بہلانے کہ والدین کو چیک بھیج دو۔ تمہارے رزق کی ایک پائی بھی ان پر صرف کرنا حرام ہے آصف! میں نے تو دھوکا کھالیا، اپنی زندگی کو داؤ پر لگا دیا۔ لیکن کتنی ہی معصوم لڑکیوں کو ایک سبق ضرور دیا ہے میں نے کہ باعزت طریقے سے والدین کے گھر سے رخصت ہونے والی بیٹی کی اس معاشرے کا شوہر قدر کرتا ہے، نہ ہی باعزت مقام بخشتا ہے تو ایک گھر سے بھاگی ہوئی لڑکی ملکہ بننے کا تصور کیوں کر بیٹھتی ہے؟ نادان اور احمق کہیں کی۔“ وہ غصے میں بولے جا رہی تھی۔

وہ اندر سے خوف زدہ ہو گیا کہ وہ شور شرابا کر کے آس پاس کے لوگوں کو جمع کر کے اسے ذلیل و رسوا کرنے کی ہمت رکھتی ہے۔ مگر خود پر قابو پا کر گرج دار لہجے میں بولا۔ ایکسٹر تو وہ خوب تھا۔

”کیا کر لو گی تم؟ کیا بگاڑ لو گی میرا؟..... مجھے انڈین کہہ کر جیل میں ڈلوادو گی؟ تم تو اپنا بنانا بنایا گھر اور تعلق خود ہی تار تار کرنے پر اتر آئی ہو۔ خدا نے مجھ پر بہت رحم و فضل کیا ہے کہ تم سے اولاد نہیں ہوئی۔ میں تمہیں کتنی بار کہہ چکا ہوں کہ والدین کو راضی کر کے ضرور آؤں گا۔ ایک دن آئے گا کہ تمہیں ساتھ بھی لے جاؤں گا۔“ وہ پھر اُس کی زبان پر بھروسہ کر کے قدرے دھیمی پڑ گئی اور وہ تیزی سے اپنی میں اپنے کپڑے ٹھونسنے لگا۔

باہر شام کے دھندلکے، رات کی تاریکی میں ڈوبتے جا رہے تھے۔ چوکیدار نے پورچ اور گیٹ کی لائٹیں آن کر دی تھیں۔ مگر گھر تاریکی میں گھرا ہوا تھا۔ اس کے کمرے کی لائٹ میں آصف اپنی پینٹنگ کمپلیٹ کر کے ہاتھ روم جا چکا تھا۔ صدیقہ نہ جانے اپنی تقدیر کو کوستی، گھر کے کس کونے میں ڈھائی دے رہی تھی۔

تیار ہو کر آصف نے صدیقہ کو آواز دی مگر جواب نہ پا کر چاچا کو بلایا اور اُس کے ہاتھ میں چیک دے کر لا پرواہی سے کہنے لگا۔

”مہینے کے آخر میں تمام بلز اور اس گھر کا کرایہ ادا کر دیتا۔ اور اپنی نوکری آج سے ہی ڈھونڈنا شروع کر دو۔“

”اور بیگم صاحبہ؟“ وہ حیرت و تجسس سے بولا۔

”وہ میرے آنے تک اپنے والدین کے پاس رہے گی۔ بھلا اتنے بڑے گھر میں وہ تنہا کیسے رہ سکتی ہے؟“ وہ اُلجھ کر بولا۔ ”یہاں اکیلے رہنا خطرے سے خالی نہیں۔“

”ہم اُن کے ہاتھ بندھے غلام ہیں صاحب! آپ فکر نہ کریں۔“ وہ ہاتھ جوڑ کر افسردگی سے بولا۔

”میں بہتر جانتا ہوں چاچا! میں نے جو کہا ہے، اس پر عمل کرو۔ میرا سامان گاڑی میں رکھ دو۔ بعد میں ڈرائیور گاڑی شوروم پہنچا دے گا۔ واپس آ کر نئی گاڑی خرید لوں گا۔ فی الحال اس کی ضرورت نہیں۔ سامان گاڑی میں رکھو۔ مجھے دیر ہو رہی ہے۔ اور اپنی بیگم صاحبہ کو بتا دینا کہ میں جلد ہی آنے کی کوشش کروں گا اور سیدھا اس کے گھاؤں ہی پہنچ جاؤں گا۔ نہ جانے اس وقت کہاں چلی گئی ہے۔ کہیں فلائٹ ہی نہ نکل جائے۔“ وہ گھڑی کی طرف دیکھ کر بولا۔

”گاڑی کی بیگم صاحبہ کو ضرورت پڑے گی آپ کے بعد۔“ وہ مردنی آواز میں بولا اور سامان گاڑی میں رکھنے لگا۔

”اُسے اپنے والدین کے پاس رہ کر اس کی ضرورت کیونکر پڑے گی؟ کیا ساری زندگی وہ کاروں میں ہی گھومی ہے؟ دو نکلے کے لوگ۔ ذرا سامنہ لگاؤ تو کھانے کو دوڑتے ہیں۔ بھول جاتے ہیں اپنی اوقات اور اُتر آتے ہیں مقابلے پر۔“

وہ غصے سے بول رہا تھا اور صدیقہ کے کانوں کو اُس کی آواز کس قدر اذیت دے رہی تھی۔ وہ مجھے قصور وار ٹھہرائے بغیر بھی روپوش ہو سکتا تھا۔ اُس نے ایسا کیوں نہیں کیا؟ وہ سوچے جا رہی تھی۔ اُس کی نیت میں فتور تھا جو آج تک مجھے اپنے گھر کا ایڈریس اور اپنے کسی رشتے دار کا نمبر تک نہیں دیا۔ اُف! کتنا بڑا دھوکے باز نکلا۔

دو ہفتوں میں ہی آنا فانا اس کی کایا ہی پلٹ گئی تھی۔ وہ آکاش کی رفعتوں سے دھرتی کی پستیوں اور گہری کھائیوں میں منہ کے بل گر گئی تھی۔ اس شمیمہ کا جو بھی رول تھا، آصف ہی کانوں کا کچا اور فیصلے میں جلد باز نکلا تھا۔ اس نے صدیقہ کو بے وقوف بنانے کے بعد چھوڑنے کا فیصلہ تو کر لیا تھا، مگر اتنی جلدی وہ انجام تک پہنچ گیا، وہ خود بھی حیران تھا۔



”بیگم صاحبہ! کچھ تو کھا پی لیں۔ صاحب کے جانے کا کب تک سوگ منائیں گی؟ وہ تو اپنوں میں جا کر ماضی میں گزرے ہوئے دن اور راتیں بھلا کر کسی نئے

شکار کی تلاش میں ادھر ادھر پھر رہے ہوں گے۔ آپ یہاں خوانخواہ ہلکان ہوئے جا رہی ہیں۔“ اُس نے لاؤنچ میں صوفے پر آنکھیں بند کئے صدیقہ کو دکھ سے دیکھ کر سمجھانے کی کوشش کی۔ مگر وہ اضطرابی کیفیت میں لیٹی رہی۔

”بیگم صاحبہ! آنکھیں تو کھولیں۔ میری بات غور سے سنیں۔ یوں سوگوار رہنے اور آہ و بکا کرنے کا مقصد؟ آپ یہ مت بھولیں کہ آپ نے اکیلے ہی حالات سے مقابلہ کرنا ہے۔ کوئی اپنا، ہمدردی کرنے آئے گا، نہ ہی دلا سہ دینے پہنچے گا۔ آپ نے ڈاکٹر صاحب کو اپنے پاؤں پر کھڑا کر دکھانا ہے، ہم دونوں ہی مل کر اس مسئلے کا حل ڈھونڈیں گے۔“ وہ بے اختیاری میں کہہ گیا تھا۔

صدیقہ نے اچنبھے سے اُس کی طرف آنکھیں کھول کر دیکھا۔ وہ سر جھکائے احتراماً کھڑا تھا۔ چاچا اپنے حُسن کردار سے کسی اچھے خاندان کا معلوم ہوتا تھا۔ اُس کا حسب و نسب، ساکھ اور پیشہ، اُس کی وضع داری سے وہ بہت گرد و لگتا تھا۔ میٹرک پاس کر کے فوج میں بھرتی ہوا اور اسے ایک بنگلے پر آیا گیری کے لئے رکھ لیا گیا۔ اور تمام زندگی وہ ایک ہی افسر کے ساتھ کبھی ایک جگہ تو کبھی دوسری جگہ شفٹ ہوتا رہا۔ وہ اپنے ملک کی خدمت کرنے گھر سے نکلا تھا مگر بد قسمتی سے صاحب کی بیگم اور بچوں کی خدمت کرتے ریٹائر ہو گیا۔ جس کا اسے ہمیشہ افسوس رہتا تھا کہ گاؤں میں اپنے بچوں کو گود اٹھانے میں سبکی محسوس کی تھی۔ اُنھ کو پانی پینے کو مردانگی کے خلاف سمجھتا تھا۔ یہاں اس بری طرح قابو آیا کہ ریٹائرمنٹ کے بعد بھی اس کے صاحب اسے چھوڑنے کے لئے رضامند نہ ہو رہے تھے۔ مگر وہ تو آزاد ہو چکا تھا، اپنی گھریلو مجبوریوں کو مد نظر رکھتے ہوئے ان سے اجازت لینے میں کامیاب ہو گیا۔ نمک حلال تو وہ تھا ہی، باعزت طریقے سے رخصت ہو کر پرائیویٹ نوکری کرنے لگا۔

اپنے گاؤں میں وہ ایک فوجی سپاہی تھا۔ بیرا گیری اور آیا گیری کی کسی کو کانوں کان خبر نہ تھی۔ کراچی اپنوں سے دُور نوکری کرنے لگا تھا۔ لیکن اب اس نے اپنے گاؤں کے قریبی شہر میں نوکری پکڑنے کا پروگرام بنا رکھا تھا۔ عمر اور گھریلو حالات کا تقاضا یہی تھا کہ اب گاؤں والوں کے سامنے گاڑی کی ڈیوٹی پکڑ کر ہمیشہ کے لئے ان کے قریب رہنا چاہتا تھا۔ وہ اُس کے سامنے سر جھکائے مؤدبانہ انداز میں کھڑا تھا۔ صدیقہ کی نظروں کا مطلب سمجھ کر آہستگی سے بولا۔

”بیگم صاحبہ! آپ میری بیٹی کے برابر ہیں۔ ایک باپ اپنی بیٹی پر ہونے والی

زیادتی کو کیسے برداشت کر سکتا ہے؟ مجھے غلط نہیں سمجھے گا۔ سوری!“
 ”سوری کی کوئی بات نہیں چاچا!“ وہ بیٹھتے ہوئے بولی۔ ”آپ کیا کہنا چاہتے
 ہیں؟ آپ کا عمر بھر کا تجربہ ہے، مشاہدات ہیں۔ آپ مجھے بہتر مشورہ ہی دیں گے۔“
 وہ سوچتے ہوئے بولا۔

”آپ کو میرے ساتھ ایک بار گاؤں جانا ہوگا۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ آپ کو قدم قدم
 پر پچھتاوؤں کا سامنا کرنا پڑے کہ انہوں سے مل لیا ہوتا تو بہتر ہوتا۔“ وہ پرے ہٹ کر
 قالین پر بیٹھ گیا۔

”چاچا! میں ملک خاندان کی بیٹی ہوں۔ وہ میری جدائی میں مرتے مرجائیں گے
 مگر مجھے معاف نہیں کریں گے۔ مجھ سے انجانے اور ناشکھی میں ان پر بہت بڑی
 زیادتی ہوئی ہے۔ آپ خود اعزازہ لگائیں اللہ تعالیٰ کی شان اور قہر کا کہ جو نبی ماں کی
 دعاؤں کا دروازہ بند ہوا، میں آسمان سے فرش پر گری ہوں۔ بد قسمتی سے تخت
 تختے تک کا سفر چند لمحوں میں ہی طے کر لیا۔“ وہ آہ بھرتے ہوئے بولی۔ ”اگر آج ماں
 زعمہ ہوتی تو میرے لئے ڈھال بن جاتی۔ چاہے اسے اس کی قیمت ہی کیوں نہ ادا
 کرنا پڑتی۔ اب میں بہت لیٹ ہو گئی ہوں۔ سوچتی ہی رہ گئی کہ انہیں وہاں کے
 عذاب سے ایک دن نکال کر لے آؤں گی۔ مگر وہ خواب ہی ادھورا رہ گیا۔“

”یہ گھر تو ہمیں لامحالہ چھوڑنا ہی ہے۔ میں آپ کو اکیلا نہیں چھوڑ سکتا۔ آپ
 میرے غریب خانہ کو عزت افزائی بخش دیں۔ اوکھے سوکھے دو چار دن کی تکلیف سہی
 بڑے گی۔ میں خود ملک صاحب سے مل کر بات کرتا ہوں۔ آپ کی معصومیت میں کی
 غمنی غلطی کو وہ ضرور معاف کر دیں گے۔ آپ کو ان کے حوالے کر کے شہر میں ہی
 نوکری ڈھونڈ لوں گا۔ مگر پہلے آپ کو ٹھکانے پر پہنچا دوں، بعد میں میرا کام ہوتا رہے
 گا۔ بیگم صاحبہ! یہ دنیا بڑی ظالم ہے۔ میں آپ کو تنہا نہیں چھوڑ سکتا۔ ڈاکٹر صاحب
 نے پھینک دیا تو کیا۔ باب تو پنم پوٹی نہیں کر سکتا۔“ وہ تاسف بھرے لہجے میں بولا۔
 ”اگر انہوں نے مجھے ٹھکرا دیا تو؟“ وہ خوف زدہ ہو کر لرز اٹھی۔

”تو دنیا بہت وسیع ہے بیگم صاحبہ! آپ پڑھی لکھی ہیں، جاب کی کوشش کریں۔
 تب تک کے لئے میرا غریب خانہ حاضر ہے۔ میں جانتا ہوں، انسان سہل پسندی کی
 طرف بہت جلد مائل ہو جاتا ہے۔ آپ کو ایسی شاہانہ زندگی گزارنے کے بعد کافی
 مشکلات کا سامنا کرنا پڑے گا۔ آپ ایک بات یاد رکھیں، میں آپ کو گرنے نہیں دوں

کا بلکہ آپ کو گری ہوئی، بے بس اور مجبور عورتوں کو اٹھا کر سینے سے لگانے کے قابل بننا ہوگا۔ اور اپنے اس تلخ تجربے سے جو آپ نے سبق سیکھا ہے، اسے ہر معصوم کے گوش گزارنا ہوگا۔“

”آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں چاچا! اپنی غلطی پر پچھتاوا، ناکامی پر دنیا والوں کے سامنے ندامت، بے یار و مددگار ہونے کا جان لیوا احساس اور لٹ جانے کا کرب۔ یہ ایسا دکھ ہے کہ زندگی کی ہر مشکل اور آزمائش آسان لگنے لگی ہے۔ میں جمو پڑی میں زندگی گزار سکتی ہوں، کھنپا پر گہری اور پُرسکون نیند لے سکتی ہوں، اچار چٹنی اور سوکھی روٹی سے محظوظ ہو سکتی ہوں، ان تھمیلیں اور کخواب کے لمبوسات کی جگہ پیوند لگے کپڑے پہن سکتی ہوں۔ بشرطیکہ فریب اور جھوٹ کی ہلکی سی رفق کا گزر میری زندگی میں نہ ہو۔ جہاں صرف سچائی ہو اور عزت نفس کو کوئی بھی مجروح کرنے والا نہ ہو۔ مجھے نفرت ہو گئی ہے ایسی دولت سے، جس کے سامنے میں خاک کے ذرے سے بھی کمتر ہو گئی۔“ وہ پچھتاووں میں گہری گونگی کیفیت میں بولے جا رہی تھی۔



آصف راستے بھر اضطرابی کیفیت سے جان چھڑانے کی کوشش کرتا رہا۔ خود کو کبھی میگزین کی ورق گردانی کرنے، کبھی سامنے لگے ٹی وی پر مودی دیکھنے کی طرف مائل کرنے میں کوشاں تھا۔ مگر لمحہ بہ لمحہ اعصابی تناؤ بڑھتا جا رہا تھا۔

اس سے جو زیادتی صدیقہ پہ ہوئی تھی، اسے اس کے اس ری ایکشن کا اندازہ نہ تھا۔ آصف نے جلد یا بدیر اس سے کنارہ کشی تو کرنا ہی تھی، مگر سب اتنی جلدی اور آسانی سے ہو جائے گا، اس نے سوچا ہی نہ تھا۔ ٹمینہ کی باتیں تو ایک بہانہ تھا، اُس نے الائیٹی کو ہی مسئلہ بنا کر اُس کے سامنے رکھ دیا تھا، جس پر وہ انکار کر سکتی تھی نہ ہی اس کے دلائل کام کر سکتے تھے۔ ملی بھر میں صدیقہ کا حُسن و جمال، اُس کا پیار، اُس کی حد درجہ کی توجہ اور اس رشتے کی لگن و چاہت پس پر وہ جا چھپی تھی۔ اُس سے کئے گئے عہد و بیان اس وقت بھی بے معنی اور بے وقعت تھے، اب تو ان کی اہمیت کے اظہار کا سنہری موقع اس کے ہاتھ میں آ گیا تھا۔ صدیقہ کی بچے کی ڈیمانڈ سے وہ دل ہی دل میں تملتا جاتا تھا۔ گھر سے بھاگی ہوئی بیوی کے بطن سے وہ اپنی نسل بڑھانے کا سوچ کر دہل جاتا تھا۔ کیونکہ یہ اس کی پلاننگ میں نہیں تھا۔

حالانکہ وہ ماڈرن دور کا جیتا جاگتا نمائندہ بھی تھا اور کئی سال لندن میں گزارنے

کی وجہ سے خود مختاری اور آزادی کو بہت فوقیت بھی دیتا تھا۔ عشق کا ڈھونگ رچانا، انجوائے کرنا اور چھوڑ دینا اس کے لئے بہت معمولی بات تھی۔ لیکن افزائشِ نسل کے تمام اصولوں پر پابند رہنا اُس کی تربیت کا حصہ تھا۔ اُس کے خیالات ساؤتھ انڈین مسلمانوں کے طور و اطوار، رسم و رواج کے خاکے میں ڈھلے ہوئے تھے جنہیں وہ ذہن کے کسی گوشے میں چھپا دیتا تھا لیکن کبھی صدیقہ سے ذکر نہ کرتا۔ صدیقہ کی ماں کے انتقال پر مکمل طور پر اُسے سیلنش اور ڈس لائیل کا خطاب دے کر کنارہ کشی کا فیصلہ کر لیا تھا۔ صدیقہ کا خُسن ایک تھرہٹ بن کر سامنے آ گیا۔

بقولِ شمیمہ کے اس شادی میں پیار کا دخل نہ ہونے کے برابر تھا۔ فظِ خود غرضی اور لالچ پوشیدہ تھا۔ یہ باتیں اُس کے ذہن پر ہتھوڑے برسانے لگی تھیں۔ جلد بازی اُس کی فطرت کا حصہ تو تھی ہی، طبعاً جذباتی اور لا اُبالی تو تھا ہی، بل میں تولہ اور پل میں ماشہ ہو جانا اُس کے لئے ایک عام سی بات تھی۔ یہی وجہ تھی کہ جمالِ ہم نشین کے تمام اثرات بھی مدہم پڑنے میں زیادہ دیر نہ لگی تھی۔ والدین کے لاڈ پیار سے اُس کی طبیعت میں پالنے کی خواہش ایسی مجبوری بن چکی تھی، جس سے گلو خلاصی کرنا ناممکن ہو گیا تھا۔ اس غلطی کا اعتراف اور شادی کا انکشاف کر کے والدین کو پریشان نہیں کرنا چاہتا تھا۔ ورنہ انہیں یہ مژدہ کب کا سنا دیا ہوتا۔

وہ راستے بھر مضطرب رہا اور سوچتا رہا کہ کہیں پہلے فیصلے کی طرح اب بھی فیصلہ جلد بازی میں تو نہیں کر گیا۔ لیکن والدین کے پیار کے سامنے ہر زیادتی جائز تھی۔ صدیقہ کی قربت کے فسوس سے نکلتا بھی ایک فطری امر تھا۔ اگر رانجھے کو ہیر اور پنوں کو سسی مل گئی ہوتی تو ان کی بھی تمام محبتیں اور قربانیاں، وقت کے دھارے میں بہہ چکی ہوتیں اور دونوں سوچتے کہ ہم بھی کس عشق میں دیوانے اور پاگل ہو رہے تھے، جس کی لطافت کی مدت کتنی کم ہے۔

والدین سے ملنے کے بعد وہ اپنے کمرے میں چلا گیا۔ کاٹ کھانے والی تنہائی کا احساس رگوں میں سرایت کر گیا تھا۔ صدیقہ کی زندگی کو دکھوں کی آماجگاہ میں دھکیلنے کا کرب اور ندامت سر چڑھ کر بولنے لگی تھی۔ مگر خود کو یہ کہہ کر تسلی و تسفی دے دیتا کہ میرا فیصلہ درست ہے۔ ایسی لڑکیوں کے ساتھ عشق تو لڑایا جاسکتا ہے، ان سے نسل چلانا سراسر نادانی ہے۔ ان کے ساتھ چند راتوں کا ساتھ تو درست ہے لیکن عمر بتانے کا تصور بھی حماقت ہے۔

مگر کب تک ضمیر کی لعنت ملامت اور چیخ و پکار کو دبائے رکھتا۔ ہنسنے بولنے والا آصف چند دنوں میں ہی ڈپریشن میں چلا گیا۔ والدین کے ان گنت سوالات کے باوجود وہ منہ سے ایک لفظ نہ پھوٹا کہ اس کے دل میں جو کائنات چھ گیا ہے، وہ اس کے وجود سے خون کے آخری قطرے کو بھی نکال سکتا ہے۔ مگر خاموش تھا۔ کچھ بھی بتانا نہیں چاہتا تھا۔



صدیقہ نے اپنا سامان پیک کیا۔ کپڑے، جوتے، پرس اور جیولری کے علاوہ اس بنگلے کی ریٹ شدہ اشیاء پر اس کا حق نہ تھا۔ پھر بھی وہ پُر ملال اور الوداعی نظروں سے ایک ایک چیز کا جائزہ لے کر آصف کے ساتھ گزرا ہوا حسین وقت یاد کرنے لگی۔ اب آنکھوں سے ساون بھادوں کی جھڑی رک گئی تھی۔ اب طبیعت میں سکوت تھا۔ اگلے سفر کا خوف تھا۔

ٹیکسی باہر اس کا انتظار کر رہی تھی۔ چاچا سامان ٹیکسی میں رکھ چکا تھا۔ اس کا انتظار کرنے کے بعد وہ اندر آیا۔ صدیقہ کو اپنے بیڈ پر ہارے ہوئے جواری کی طرح پشیمان اور حسرت زدہ دیکھ کر بے اختیار ہو کر بولا۔

”بیگم صاحبہ! ایسے تو زندگی گزرنے سے رہی۔ ہمت اور حوصلے سے کام لیں۔“

”چاچا! تم تو جانتے ہو، نیا اور تازہ زخم کتنا پین فل ہوتا ہے۔ وقت کے ساتھ گھٹا بھرتا جائے گا، طبیعت سنبھلتی جائے گی۔“ وہ اپنا پرس اٹھا کر بولی۔ ”ابھی آصف سے پچھڑے دو ہفتے ہی تو ہوئے ہیں۔ نہ جانے وہ کس حال میں ہوں گے۔ چاچا! انہیں تو مجھ سے والہانہ محبت تھی۔ یہ سب کیوں اور کیسے ہو گیا؟ میں نے تو کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ اس کھری اور سچی محبت کا انجام اتنا عبرت ناک ہو گا۔ جس کی خاطر سب رشتوں کو چھوڑ دیا، اس کی خوشی کی خاطر اس کے گھر کی باندی بن کر رہ گئی، وہ ہی روٹھ کر چلا گیا۔ اس بات پر جو میرے لئے قربانی تھی، ایثار تھا۔ اس نے میری قدر کرنے کے بجائے مجھے کن کن خطابات سے نوازا۔ چاچا! کیا محبت ایسی ہی ہوتی ہے؟ وقت کے تقاضوں میں مقید، حالات و واقعات کی غلام؟“ وہ آنسو صاف کرنے لگی۔

بیگم صاحبہ! یہ تقدیر کے فیصلے ہیں۔ آپ کو دوش دینا تو ایمان کی کمزوری ہے۔ آصف صاحب کو آپ سے کبھی پیار تھا ہی نہیں۔ آپ جب تک اس حقیقت کو تسلیم نہیں کریں گی، آپ کی زندگی کا سفر مشکل سے مشکل تر ہوتا جائے گا۔“ وہ اپنائیت

سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولا۔ اور وہ اپنا پرس اٹھا کر گھر کو الوداعی نظروں سے دیکھتی ہوئی چاچا کے پیچھے باہر نکل گئی۔

جہاز میں بیٹھتے ہی وہ ماضی کے ان لمحوں میں کھو گئی، جب وہ آصف کے ساتھ کھلکھلاتی ہوئی کراچی آئی تھی۔ اسے کراچی کی روشنیوں اور گہما گہمی میں اپنوں کو بے دردی سے چھوڑنے کا قلق لمبا میٹ ہوتا محسوس ہوا تھا۔ اور آج واپسی میں چاچا ساتھ تھا۔ پیچھے کسی سیٹ پر بیٹھا اس کے درد کو محسوس کرتے ہوئے اندر ہی اندر کراہ رہا تھا اور اس کے فوج کے بارے میں سوچے جا رہا تھا۔

جونہی جہاز نے لاہور کے ایئر پورٹ پر لینڈ کیا، صدیقہ کو ایک لمبی قے آئی اور یکے بعد دیگرے یہ سلسلہ بتدریج بڑھتا چلا گیا۔ اسے وہیل چیئر پر بٹھا کر لاؤنج میں لے جایا گیا اور نیم غنودگی میں وہ چاچا کی سرپرستی میں ہسپتال ایڈمٹ ہو گئی۔ رات بھر وقتاً فوقتاً وہ وامٹ کرتی رہی۔ مگر ڈرپ اس کی کمزوری اور نقاہت پر قابو پانے کا کام کرتی رہی۔

ہاسپٹل کی صبح بھی کس قدر کڑوی اور کیلی ہوتی ہے۔ یوں لگتا ہے، جیسے جہاں بحر کی بیازیاں وجود میں سما گئی ہوں۔ وہ نرس کی مدد سے بیڈ سے اٹھی اور دھیمے قدموں سے ہاتھ روم تک چلی گئی۔ منہ ہاتھ دھو کر باہر نکلی ہی تھی کہ نرس وہیل چیئر لئے کھڑی ملی۔ وہ اسے لیب لے گئی اور ہر طرح کے ٹیسٹ کے بعد واپس کمرے میں چھوڑ گئی۔ چاچا دروازے کے باہر ہی کھڑا انتظار کر رہا تھا۔ اس نے آہستہ سے گاؤں کا ایڈریس مانگا۔ کیونکہ وہ آج ہی وہاں جانا چاہتا تھا۔ صدیقہ نے لرزش زدہ ہاتھوں سے ایڈریس لکھ کر اسے تھماتے ہوئے کہا۔

”آپ کو وہاں جا کر پچھتاوا ہی ہو گا۔“

”مجھے بھلے کی امید ہے بیگم صاحبہ! اولاد سے منہ موڑنا اتنا آسان نہیں، جتنا آپ نے سمجھ رکھا ہے۔“ وہ سرگوشی کے انداز میں بولا۔

’اُف..... اولاد کے لئے کس قدر آسان ہے ایسا کرنا۔ میں بھی تو ایسی بے وفا اور نامراد نکلی ہوں۔ آصف اولاد ہو کر لا جواب نکلے۔ بات تو سچ ہے۔ میں چاہے کتنے ہی دلائل دے کر خود کو بے وقوف کیوں نہ بنالوں، حقیقت کو کب تک جھٹلاؤں گی؟‘ وہ دل میں ہی سوچتی رہ گئی اور چاچا اس وقت اسے اک میسا اور آسان سے نازل ہونے والا فرشتہ لگا۔

’کبھی کبھار اللہ تعالیٰ انسانوں کی شکل میں فرشتے بھیج کر غم زدہ اور رنجیدہ لوگوں کی مدد فرماتے ہیں۔ ورنہ یہ دنیا تو آہوں، سسکیوں اور آنسوؤں کی آماجگاہ بن جائے۔‘ اس نے چاچا کے مضطرب چہرے کی طرف دیکھ کر سوچا۔

رات بھر جاگنے کی وجہ سے اس کی طبیعت میں کسلندی کے ساتھ لاغر پن بھی حد درجے کا تھا۔ ڈاکٹر راؤنڈ پر آئی تو اس کا لوبی بی دیکھ کر گھبرا گئی۔ پھر سے ڈرپ لگانے کی ضرورت محسوس ہوئی اور ساتھ ہی اسے انجکشن دے کر سلا دیا۔ نیند میں وہ بڑبڑا رہی تھی۔ کبھی آصف کو پکارتی، کبھی ماں کو آواز دیتی، کبھی اپنی بے گناہی پر سسکیاں بھرنے لگتی۔ اسی عالم میں شام ہو گئی۔ نرس نے اس کے چہرے پر ہلکی سی تھپکی دے کر اسے جگانا چاہا تو وہ کروٹ بدلتے ہوئے ٹولے پھوٹے الفاظ میں بمشکل اتنا کہہ پائی۔

”مجھے سونا ہے۔“

نرس یہ سن کر ذرا سا مسکرائی اور اس کا بلڈ پریشر اور ٹمپریچر چیک کر کے باہر نکل گئی۔



”کم آن صدیقہ!“ لیڈی ڈاکٹر حشر نے صدیقہ کو آفس میں آتے دیکھ کر مسکراتے ہوئے کہا۔ ”تمہارے لئے گڈ نیوز ہے۔“

صدیقہ نے اچنبھے سے اسے دیکھ کر دل میں ہی سرگوشی کی۔ ’گڈ نیوز میرے لئے..... اٹ ازا مپا سبل۔‘

”آپ ماں بننے والی ہیں۔“ صدیقہ کے کانوں میں آواز گونجتی ہوئی دور ہوتی چلی گئی اور سنبھلنے کے باوجود کرسی پر لڑھک گئی۔ اسے وہیں انسپکشن ٹیمیل پر لٹا دیا گیا۔ پانچ منٹ بعد ہی وہ آنکھیں کھول کر حیرت سے گرد و پیش کا جائزہ لیتے ہوئے مکمل طور پر ہوش میں آ گئی۔

’میں ماں بننے والی ہوں.....‘ وہ بڑبڑائی۔ ’بات تو خوشی کی ہے۔ لیکن اتنی بڑی ذمہ داری کیسے نبھاؤں گی؟..... مائی گاڈ!‘ وہ کانوں پر ہاتھ رکھ کر بے بسی سے سامنے کھڑی ڈاکٹر کو دیکھنے لگی۔

”صدیقہ! فرسٹ بے بی کی خوشی کا تو جواب ہی نہیں ہوتا۔ مگر میں نے آج تک ایسی عورت نہیں دیکھی جو یہ خبر سن کر مارے مسرت کے اپنے ہوش و حواس ہی کھو بیٹھے۔“ وہ مسکرا کر اس کا بلڈ پریشر چیک کرنے لگی۔

”ڈاکٹر صاحبہ! مجھے بچہ نہیں چاہئے تھا۔ ابھی تو ہم سیٹل بھی نہیں ہوئے۔“ وہ بمشکل بول پائی۔ ”نہ جانے اس کے والد کو واپس آنے میں کتنا ٹائم لگے۔ میں اکیلی کیسے سردائیوں کروں گی اس کے ساتھ؟“

”جواب پکڑو اور اپنی ماں یا چھوٹی بہن کو اپنے پاس رکھو، جب تک میاں نہیں آتا۔“ وہ لاپرواہی سے بولی۔ ”خود کو مصروف رکھو گی تو نو مہینے گزرنے کا پتہ بھی نہیں چلے گا۔“

”ماں کا انتقال ہو چکا ہے۔ یہ سفر مجھے تنہا ہی طے کرنا پڑے گا۔“ وہ روہانسی ہو گئی۔

”اس میں پریشانی کی کوئی بات نہیں۔ ہمت کرو۔ اسی ہسپتال میں اس وقت دیکھنی بھی ہے۔ دو کمروں کا فلیٹ تمہارے لئے کافی رہے گا، با آسانی مل جائے گا۔“ اس کے لہجے میں اتنی ہمدردی تھی کہ وہ زار و قطار رونے لگی۔ اور اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنی ٹریجک روداد سنا کر آنکھیں موند لیں۔ جیسے ندامت سے وہ اس سے نظریں ملانے سے قاصر ہو۔

”صدیقہ! میں نے تمہیں پہچان بھی لیا تھا اور تمہارے چہرے پر پچھتاؤں کی پرچھائیوں کو بھانپ بھی لیا تھا۔ مگر میں اپنے وہم اور سوچ کو غلط قرار دیتی ہوئی قدرے مطمئن تو ہو گئی تھی۔ مگر تمہاری آنکھوں کی پشیمردگی اور سیاہی مجھے ہر بار اک سندیسہ دے جاتی۔ صدیقہ! اس نے تم سے دستبرداری کا بہانہ ڈھونڈا ہے۔ اس نے تم سے کبھی پیار کیا ہی نہ تھا۔ اس کے سر پر ہوس کا وقتی بھوت سوار تھا، وہ اتر گیا اور وہ تمہیں تڑپتا، بلکتا تنہا چھوڑ کر چلتا بنا۔ تم اسے بھول جاؤ۔ وہ واپس نہیں آئے گا۔ اور یہ بچہ تمہارے لئے باعثِ رحمت اور مقصدِ حیات ہو گا۔“ وہ دکھ بھرے لہجے میں بولی۔

”ڈاکٹر سحرش! اسے مجھ سے والہانہ محبت تھی۔ سب کچھ اچانک ہی ہو گیا۔ میں حیران و پریشان اسی بات پر ہوں کہ اتنا کچھ ہو جانے کے باوجود مجھے اس سچائی پر یقین کیوں نہیں آ رہا؟ ان کانوں نے کیا کچھ نہیں سنا۔ سب کچھ کیونکر جھٹلائے جا رہی ہوں۔“ وہ بھرائی آواز میں بولی۔

”مرد کے پیار کی پہلی نشانی جانتی ہو؟“ وہ نرمی سے بولی۔

”نہیں! ڈاکٹر سحرش! میں کچھ نہیں جانتی۔ میں تو صرف اس کی زبان کی چاشنی میں ہی کھلتی چلی گئی۔ اسی کو محبت کا نام دیتی، اس کی پوجا کرتی رہی۔ کتنی احمق ہوں۔“ وہ

پچھتاوے میں گھری ہوئی بولی۔

”محبت کرنے والا شوہر، عورت کی بے حرمتی نہیں کرتا۔ بلکہ اس کے نسوانی وقار اور کردار کا پاس رکھتے ہوئے ہمارے رسم و رواج کے مطابق اسے اپنانے کی تنگ دود کرتا ہے۔ نہ کہ اسے بہلا پھسلا کر اپنے جال میں پھانس کر معاشرے کے قوانین توڑ کر اپنا بنانے کو محبت کا نام دیتا ہو۔ یہ تو محبت نہ ہوئی۔ اس کجخت نامراد نے تمہاری معصومیت کو آسانی سے خرید کر تمہیں اپنوں اور غیروں میں ذلیل و رسوا کر دیا، تمہیں کہیں کا نہ چھوڑا۔ اس نے تمہاری ہی نہیں بلکہ اس ذات کی بے حرمتی کی ہے صدیقہ! خود کو سنبھالو اور بہادر بن کر کھڑی ہو جاؤ۔“ ڈاکٹر سحرش اسے نرمی اور پیار سے سمجھانے لگی۔

”میں آپ کی تمام باتوں سے اتفاق کرتی ہوں۔ اس نے مجھے بے عزت طریقے سے اپنایا تھا، مجھ سے نہ جانے اسے کیا دشمنی تھی؟ کس ستم کا بدلہ لیا ہے اس نے؟“

”دشمنی نہیں تھی، اس کے سر پر ہوس کا بھوت سوار تھا۔ اگر وہ شادی کے بغیر اتر جاتا تو وہ تم سے شادی کرنے کو اہم نہ سمجھتا۔ مگر تم تھیں ایک نیک اور پاکیزہ لڑکی..... خیر، جو ہونا تھا وہ تو ہو چکا۔ وہ ماضی تھا، بیت گیا۔ اب اپنے حال اور اس معصوم کے مستقبل کی فکر کرو۔ اس ننھی جان کا کیا قصور ہے کہ اسے اس دنیا میں آنے سے ہی روک دیا جائے؟ یہ قتل ہے اور اس کی سزا تمہیں اٹھنے نہیں دے گی۔ کیونکہ تمہاری یہ سزا، انسانوں کی نہیں، خدا تعالیٰ کی تجویز کردہ ہو گی۔ اس سے پناہ مانگو اور توبہ کرو اور آئندہ اس گناہ کبیرہ کے بارے میں کبھی سوچ بھی ذہن میں نہ لانا۔“ وہ سنجیدگی اور سختی سے بولی۔

”تھینک یو ڈاکٹر سحرش!“ وہ آنسو صاف کرتے ہوئے بولی۔ ”مگر یہ سب کیسے

بچ ہو گا؟“

”تم اس کی فکر نہ کرو۔ میں تمہاری جاب کا انتظام کرتی ہوں اور رہائش اور سیوریج کا بھی۔“ وہ مسکرا کر بولی۔ ”بس تمہیں صرف اس ٹینشن سے مکمل طور پر آؤٹ ہونا ہے اور اپنی نئی زندگی کو فخر اور حوصلے کے ساتھ دیکھ کر کہنا ہے اور اس معاشرے کو ندامت اور پچھتاوؤں کے بغیر بے باکی اور دلیری سے فیس کرنا ہے۔ یہی ہے تمہاری اور آنے والے بچے کی سیوریج..... ضمیر کی بھڑکتی ہوئی آگ میں ڈاکٹر آصف ہر بل جیسے گا اور مرے گا۔ کیونکہ وہ پاپی نکلا، دھوکے باز اور بے حس نکلا۔ تم نے تو اسے

پیار کیا تھا۔ نہ اسے دعا دیا، نہ ہی اس کے رزق کو اپنوں کے مصرف میں لانے کی سوچ کو پایہ تکمیل تک پہنچایا۔ اور آج اس کے بچے کو اپنے وجود میں پروان چڑھانے کے لئے تیار ہو۔ لائیلی اسے ہی کہتے ہیں صدیقہ!..... پھر تمہیں پچھتاوا کیونکر ہو؟ تم نے پسند کی شادی کر لی۔ تمہیں اپنے کئے پر پشیمان نہیں ہونا چاہئے۔ تم نے جو بھی کیا، اسے غلط رنگ دے کر خود کو اذیت میں مبتلا کرنا چھوڑ دو۔ یہ اس بچے کے لئے درست نہیں ہوگا۔ تم تو جانتی ہو کہ ماں کے مزاج کا بچے کے ذہن پر کیسا اثر پڑتا ہے۔“ وہ مسکرا پڑی۔

”ابھی بھاگنے دوڑنے کی ضرورت نہیں۔ ایک مہینہ بند ریٹ اسی کمرے میں گزارو۔ تب تک تمہارے لئے زندگی کے بہترین راستے کھل جائیں گے جن پر گامزن ہوتے ہوئے پیچھے مڑ کر دیکھنے کی کوشش نہ کرنا۔ راستے کی حد نگاہ تک پہنچنے کی کاوش میں کمی نہیں آنی چاہئے۔ سن رہی ہوتا؟“ ڈاکٹر حشر پیار بھرے اور مستحکم لہجے میں بولے جا رہی تھی۔

”جی!“ وہ اثبات میں سر ہلا کر بولی۔ ”اللہ تعالیٰ کسی حاجت مند کو تنہا نہیں چھوڑتا۔ اس لئے کہیں نہ کہیں سے غیبی مدد ضرور پہنچتی ہے۔“ وہ عقیدت بھرے لہجے میں بولی۔

”اللہ تعالیٰ کا رد عمل بھی شرائط پر مبنی ہوتا ہے۔ وہ بھی بے گناہ، صبر کرنے والوں اور ہر حال میں شکر کرنے والوں کو اولیت دیتا ہے۔ تم بے گناہ ضرور ہو۔ اب اسے صابر و شاکر ہونے کا یقین دلانا ضروری ہے۔“ ڈاکٹر حشر مسکراتے ہوئے کہہ رہی تھی۔ اس کے چہرے پر فرشتوں جیسی معصومیت اور سچائی تھی۔ وہ کسی صورت پچاس سال کی نہیں لگ رہی تھی۔ اس کی اندرونی کیفیت اس کے اند، انگ سے پھوٹ رہی تھی۔ آج وہ ایک بھگی ہوئی ناعاقبت اندیش لڑکی کو راہ راست پر لے آئی تھی۔ اس نے اس میں ہمت و حوصلے کی روح پھونک کر زندگی کی ڈگر پر چلنا سکھ دیا تھا۔ وہ دانستہ اس کی طرف دیکھ کر بولی۔

”آئی ایم گیٹنگ لیٹ سویٹ ہارٹ! تم اپنے کمرے میں جاؤ۔ اور ذرا احتیاط سے..... سابقہ لائف اس کمرے سے باہر تمہارے ساتھ نہیں جائے گی۔ تمہاری خوش آئند زندگی کی شروعات ہو چکی ہے۔ بیٹ آف لک۔“ اس نے ہاتھ آگے بڑھایا تو صدیقہ نے اپنا سر دھاتھا اس کے ہاتھ میں دے کر کہا۔

”آپ کا یہ احسان زندگی بھر نہیں بھولوں گی۔ سچ ہے کہ ڈاکٹر زندگی بخشا ہے، لیتا نہیں۔ اس کے سر پر نیلی چھت والے کا ہاتھ ہوتا ہے۔“

”تمہارا تعلق بھی اسی کینگری سے ہے، یہ مت بھولنا۔“ وہ ذومعنی بات بول کر اپنا لیب کوٹ درست کرتی آپریشن تھیر کی طرف بڑھ گئی۔

وہ آیا کے ساتھ اپنے کمرے کی طرف چل پڑی۔ کمرے سے باہر دروازے پر چاچا کا جھکا ہوا سر دیکھ کر اس کا دل بیٹھنے لگا۔ مگر فوراً ہی خود پر قابو پا کر قریب ہی کرسی پر بیٹھ گئی۔

چاچا خاموش تھا۔ اس کی آنکھوں میں بے پناہ اُداسی اور مایوسی کی پرچھائیاں دیکھ کر وہ ہمت سے بولی۔

”اچھا ہوا چاچا! آپ نے اپنی خواہش پوری کر لی۔ کیا فرمایا ہے انہوں نے؟“
 ”بتانے کے قابل نہیں۔ سن کر کیا کریں گی بیگم صاحبہ! پہلے کیا کم دکھی ہیں آپ؟ بس اتنا سا تانا ضروری ہے، انہوں نے گاؤں میں سب کو یہ کہہ کر خاموش کر دیا تھا کہ آپ کی جاب دہی ہو گئی تھی، وہیں روڈ ایکسیڈنٹ میں انتقال ہو گیا۔ ان کے وسائل آپ کی باڈی یہاں لانے کی اجازت نہیں دیتے تھے، اس لئے وہیں دفن کر دیا۔“ وہ مری ہوئی آواز میں بول رہا تھا۔

”چاچا! میں جانتی تھی کہ میں ان کے لئے مر گئی ہوں۔ بات بھی سچ ہے۔ میں نے ان کے ساتھ کون سا اچھا سلوک کیا ہے؟ میں خود ان کا سامنا نہیں کرنا چاہتی، اس کا لے اور بھینک چہرے کے ساتھ۔“ وہ کرسی سے کھڑی ہو گئی اور اپنائیت سے بولی۔ ”آپ اپنے بیوی بچوں سے مل کر میرے پاس آ جائیں۔ امید ہے، مجھے اسی ہسپتال میں نوکری اور رہنے کو جگہ مل جائے گی۔ آپ کے لئے بھی ہسپتال میں گارڈ کی نوکری کی درخواست دے دیتی ہوں۔ آپ کا سایہ میرے لئے بہت ضروری ہے چاچا! آپ کو بتانا بھول گئی، خیر سے آپ نانا بننے والے ہیں۔“

”بیگم صاحبہ! یہ کیا کہہ رہی ہیں آپ؟“ وہ چونک کر بولا۔

”ہاں چاچا!“ وہ قدرے شرمائی لجائی اور مسکرائی۔

”بیگم صاحبہ! اس بچے کے آنے کا اعلان کر دیجئے۔ یہ بڑا ضروری ہے۔ ورنہ بچے کی آمد کے ساتھ ہی ایک پہاڑ جیسی بڑی تہمت آپ کو اور آنے والے بچے کو عمر بھر کے لئے ناممکن کر دے گی۔ دنیا اسی کا نام ہے۔ اس کے ساتھ چلنا بڑا ہی مشکل کام

ہے جی۔“

وہ جو قدرے قبولیت کے موڈ میں آچکی تھی، اس پر گھڑوں پانی پڑ گیا۔ حیرت و تاسف سے اسے دیکھنے لگی۔ ”میں نے تو یہ نہ سوچا تھا چاچا!“

”کہیں آپ نے برا تو نہیں منالیا؟“ وہ ہاتھ جوڑ کر مؤدبانہ انداز میں کھڑا تھا۔
 ”چاچا! کیسی بات کرتے ہیں؟ میں اپنے ہمدرد اور محسن کی بات پر کیونکر شک کروں گی؟ آپ جو کر رہے ہیں اور جو کہہ رہے ہیں، اسی میں میرے لئے بھلائی ہے۔ اپنے تو منہ موڑ گئے۔ آپ ہی تو میرے لئے سب کچھ ہیں۔“ وہ روہانسی ہو گئی۔
 ”میری عزت افزائی ہے جی۔“ وہ منہ دوسری طرف پھیر کر بولا۔ ”نیگم صاحبہ! ہو سکتا ہے یہ بچہ ڈاکٹر صاحب کو آپ کے قریب لے آئے۔ یہ اولاد بڑی ظالم شے ہے۔ بڑے بڑے پھنے خان اس کے سامنے جھک جاتے ہیں۔“

”چاچا! مجھے چھوڑ کر جانے کا طریقہ تو آپ نے دیکھ ہی لیا ہے۔ نہ اپنا اپڈریس نہ کنٹیکٹ نمبر۔ کچھ بھی تو نہ بتایا۔ جاتے وقت مل کر بھی نہ گئے۔ میں مزید خوش فہموں کی دنیا میں رہ کر خود کو بے وقوف نہیں بناؤں گی۔ میں نے بھی فیصلہ کر لیا ہے، اب وہ میرے پاؤں پڑ کر اپنی غلطیوں اور کوتاہیوں کی معافی بھی مانگیں گے تو مجھ پر رتی بھر اثر نہیں ہوگا۔ دوسرا طلاق کی ڈیمانڈ اس لئے نہیں کروں گی کہ میں نے دوسری شادی کرنی ہے، نہ ہی ڈائیو سی کہلانے کو اچھا سمجھتی ہوں۔ اور اب اپنی اولاد کی خاطر ایسا ہرگز نہیں ہونے دوں گی۔ دراصل وہ کشتیاں جلا کر نہیں گئے۔ کیا سمجھتے ہیں خود کو؟“ وہ سوچتے ہوئے بے تحاشا مضبوطی سے بول رہی تھی اور چاچا اسے حیرت سے دیکھ رہا تھا کہ ماں بننے کی خبر نے ہی اس لڑکی کے شعور کو کس قدر توانا اور مستحکم بنا دیا تھا۔ اس کی منور آنکھیں نئی زندگی کا پیغام دے رہی تھیں اور چہرے پر بلا کی طمانیت اور تسکین رچی بسی تھی۔ وہ مسکرا کر بولا۔

”نیگم صاحبہ! اب میں تسلی سے بیوی بچوں کے ساتھ اپنی چھٹی گزاریوں گا۔ اوپر والے کا بھی کیا کہنا کہ دلوں کو سکون دینا چاہے تو انسان کے اپنے ہی ارادوں کو بدل ڈالتا ہے۔“

”چاچا! آپ بہت سمجھ دار باتیں کرتے ہیں۔ امپریس کر دیا ہے مجھے۔“ وہ اپنائیت سے بولی۔

”نیگم صاحبہ! افروں میں رہ کر بہت کچھ سیکھا۔ تھوڑی بہت انگریزی میں کٹ مٹ

بھی کر ہی لیتا ہوں۔ گاؤں میں ہوتا تو نرا جاہل کا جاہل ہی رہتا۔“ وہ فخر سے بولا۔
اپنی تعریف سن کر آج اس کی عاجزی و انکساری پر تفاخر کی چھاپ دیکھ کر صدیقہ مسرور ہو کر رہ گئی۔

”بیگم صاحبہ! آپ آرام فرمائیں۔ میں چلتا ہوں۔ یہ ہے میرے گھر کا پتہ اور ٹیلی فون کی سہولت تو ہمارے گاؤں میں نہیں ہے۔ کوئی بھی مشکل آن پڑی تو مجھے خط یا تار کے ذریعے بتا دیجئے گا، فوراً حاضر ہو جاؤں گا۔ بیگم صاحبہ! میں نے آپ کا نمک کھایا ہے۔ کبھی نمک حرامی نہ کروں گا۔ وعدہ اس لئے نہیں کروں گا کیونکہ ہم اخلاقی طور پر اتنے گر چکے ہیں کہ وعدہ اک لطیفہ بن کر رہ گیا ہے۔ کوشش کروں گا کہ آپ کا ساتھ کبھی نہ چھوڑوں۔“ وہ نگاہیں جھکائے بول رہا تھا۔ وہ اسے عقیدت سے دیکھنے لگی اور وہ خدا حافظ کہہ کر باہر نکل گیا۔

’آصف! دیکھا تم نے۔ ایک اوسط طبقے کا انسان ہر طرح کے لالچ و طمع سے پاک، بے لوث اور بے غرض نکلا۔ تمہارے اعلیٰ و ارفع اسٹیشن اور اس شان و شوکت کا کیا فائدہ کہ شخصیت میں اخلاقیات کا ہلکا سا گزر بھی نہیں۔ تصور تمہارا نہیں۔ تم ٹھہرے جوائنٹین دھوکے باز مسلم۔ جنہوں نے عین ٹائم پر اپنا فیصلہ بدل کر غلامی میں رہنے کو فوقیت دی تھی۔ آزادی کی خاطر ایثار دینے والوں کا تم ہی جیسے لوگوں نے تمسخر اڑا کر خود کو دُور اندیش اور دانش مند قرار دیا تھا۔ بھلا تم مجھ سے وفا کیسے کر سکتے تھے؟ اپنے کئے گئے فیصلے پر کیسے قائم رہ سکتے تھے؟ جبکہ تمہارے خون میں عہد شکنی کی آمیزش ہے۔ تم سمجھتے ہو کہ تم نے اپنی چالبازی اور عیاریوں کی بدولت مجھ سے جان چھڑا لی ہے۔ بہت خوب..... دیکھنا، ایک دن تمہیں اپنی شکست خوردگی کا احساس جینے دے گا، نہ مرنے دے گا۔ بتاؤ کہ تم عالم برزخ میں، شکست و ریخت میں، احساسِ ندامت و احساسِ جرم میں اپنی زندگی کیسے پُر سکون بنا سکتے ہو؟ تمہیں آج والدین سے چیلنگ کرنے کے احساس نے جھنجھوڑ دیا تو کل مجھ پر ڈھائے گئے ظلم کو کیسے ایکسپٹ کرو گے؟..... احمق کہیں کی، میں پھر خوش فہمی کی طرف جا رہی ہوں۔ جس مٹی سے تمہارا خمیر اٹھا ہے، اس میں بے حسی کے سوا اور کچھ نہیں آصف! تم نے اس کی مثال تو قائم کر ہی دی۔ وہ طنزیہ مسکرائی اور نفرت انگیز لہجے میں بڑبڑائی۔

”شکل چڑیلوں کی، مزاج پریوں کا..... واہ بھی واہ! کیا کہنے تمہارے۔“
وہ تکیے پر سر رکھ کر لیٹ گئی اور اپنی نئی زندگی کو دیکھنے کے منصوبے بنانے لگی۔

چہرہ فتح مندی کے احساس میں روشن تھا۔ فتح مندی اس نے حاصل کی تھی، اپنی قوتِ آشفۃ کو یکجا کرنے میں اور اس کی اولاد پیدا کرنے میں، جس نے اسے نفرت و حقارت سے کہا تھا کہ تمہارے بطن سے اپنی نسل نہیں چلاؤں گا۔

”کیا تم خدا کی دی ہوئی نعمتوں کا شکر ادا کرنے کے بجائے نعوذ باللہ خود کو خدا سمجھ بیٹھے؟..... تم پر خدا کی مار ہو۔“ وہ نیم غنودگی میں تنفر سے بڑبڑاتی ہوئی، نیند کی آغوش میں چلی گئی۔ آج مہینوں بعد اسے ایسی پرسکون اور اطمینان سے بھرپور نیند نصیب ہوئی تھی۔ بغیر ٹراکولائیز کے۔



”سسٹر صدیقہ! بیٹی چاند کا ٹکڑا ہے۔ ہو، ہو تمہاری کاہلی۔“ ڈاکٹر سحرش نے آ کر خبر سنائی تو وہ کچھ اداس سی ہو کر اسے دیکھنے لگی۔

”کیا تم بھی جاہلانہ سوچ رکھتے والی عورتوں کی طرح بیٹے کی خواہش مند تھی؟“ وہ اس کے چہرے پر اداسی اور خاموشی کے سائے دیکھ کر بولی۔

”ڈاکٹر صاحبہ! میں اپنی قسمت کو نہ بدل سکی۔ یہ صدمہ ہی میرے لئے ناقابلِ برداشت تھا۔ اب تنہا اس کی عزت و تکریم کی نگہداشت کیسے کروں گی؟..... اس کو دنیا کی ریا کاریوں اور مکاریوں سے کیسے محفوظ رکھوں گی؟ اور اس کی تقدیر کی سختی پر اس کی مرضی کے مطابق کیسے اس کا نصیب لکھ پاؤں گی؟ مجھے آج اس بات کا احساس ہوا ہے کہ ہر ماں، بیٹی کی پیدائش پر بے تسکین ہو کر اپنی نظریں کیوں جھکا لیتی ہے؟ ایسی ماؤں کو میں ڈانٹ دیا کرتی تھی۔ اُن کو اس تخلیق پر فخر و مسرت کا لیکچر دیے لگتی تھی۔ لیکن ان کی زبان تو گنگ ہی رہا کرتی تھی۔ جیسے قوت گویائی کسی نے سلب کر لی ہو۔“ اسی اثناء میں نرس، بچی کو تولیے میں لپیٹے اس کے قریب آ گئی۔

اس نے بے چینی سے سر اوپر اٹھا کر اس کو دیکھا۔ اس کی کھلی آنکھوں کو دیکھتے ہی وہ ماما کی بے لوث محبت میں مقید ہوتی چلی گئی۔ الم ناک سوچیں اور انجانے خدشے ہولے ہولے اس کے ذہن سے دور ہوتے چلے گئے اور اس نے اسے بازوؤں میں بھر کر سینے سے لگا لیا۔

وہ ہاسپٹل سے ڈسچارج ہو کر اپنے دو کمروں کے فلیٹ میں آ گئی تھی، جو ہاسپٹل کے عقب سے ہی ملحقہ تھا۔ تمام میریڈن سز انہی فلیٹس میں رہائش پذیر تھیں۔ رات تک اس کے پاس انہی پڑوسیوں کا آنا جانا رہا۔ کسی نے بخنی پلائی تو کوئی دودھ بادام

لے کر آگئی۔

اکلی صبح طلوع ہوئے کئی گھنٹے گزر گئے تھے لیکن ابھی تک ماں بیٹی سوئی ہوئی تھیں۔ رات بھر بچی نے اسے سونے نہ دیا تھا۔ اسے چپ کرانے کے تمام دیسی ٹونکے ناکام رہے تو وہ اسے گود میں اٹھائے، کمرے میں تختہ پٹائی ہوئی مترنم آواز میں اسے لوری سناتے لگی۔ ”سو جا راج دلا ری! سو جا۔“

بچی لوری کی مدھر لے میں رونا بھول گئی اور سونے لگی۔ دیسی ٹونکوں کا کمال بھی شامل حال ضرور تھا۔

معا دروازے پر نیل کی گونجتی ہوئی آواز سے صدیقہ ہڑپڑا کر اٹھی۔ وال کلاک پر نظر دوڑائی، حیرت سے پلنگ سے اتری۔ دوپٹہ درست کر رہی تھی کہ پھر سے تیل ہوئی۔ ”نہ جانے کون بے صبر انسان ہے۔ احسب کہیں کا۔ سمجھتا ہے، میں دروازے کے پاس ہی تو بستر بچھائے بیٹھی ہوں۔“ وہ بڑبڑاتی ہوئی دروازے تک پہنچ گئی۔ دروازہ کھولا تو یہ دیکھ کر حیران ہو گئی کہ چاچا ایک عمر رسیدہ خاتون کے ساتھ کھڑا تھا اور خاتون اس کو سر سے لے کر پاؤں تک گھورے جا رہی تھی۔

”السلام علیکم یگم صاحبہ! یہ میری ہمیشہ ہیں۔ آپ اکیلی ہیں۔ سوچا کہ چھلہ ہی کٹوا جائے۔“ وہ اپنائیت سے کہہ رہا تھا۔ ”آپ کی چاچی، بیٹیوں کو اکیلا چھوڑنے پر راضی نہ ہوئی تو میں ان کو لے آیا۔ ان کے سر پر ایسی کوئی خانگی ذمہ داری نہیں۔“

”بہت اچھا کیا آپ نے۔ ماسی! آپ اعدر آجائیں۔“ وہ جمائی لیتے ہوئے بولی۔

”رات بھر سونے نہیں دیا۔ ہاسپٹل میں تو آیا کی مدد ملتی رہی، آج گھر کی پہلی رات نے چاروں طبق روشن کر دیئے ہیں۔“

”اب آپ بے فکر ہو جائیں۔“ وہ جاتے ہوئے مڑ کر وضع داری سے بولا۔

”ہمیشہ کے کھانے پینے کا بندوبست ہو چکا ہے۔ اس کی آپ فکر نہ کیجئے گا۔“

”کہاں سے چاچا؟“ وہ حیرت سے بولی۔

”یگم صاحبہ! باورچی بادشاہ ہوتا ہے۔ دوسروں کو جیسا تیسرا کھلا کر خوش رکھتا ہے اور اپنی پسند کا کھانا خود کھاتا ہے۔ ہسپتال کے کچن کا تو اپنا ہی مزا ہے۔ بقیہ کھانا سب بانٹ کر اپنے گھروں کو لے جاتے ہیں۔ اب میرا حصہ بھی نکل آیا کرے گا۔ کیونکہ باورچی میرے گاؤں کا ہے اور بہت اچھا انسان ہے۔“ وہ ہنستے ہوئے بولا۔

”ویسے اس کی ضرورت تو نہ تھی۔ خواجواہ تکلیف کریں گے آپ۔“ وہ خفیف سی

ہوتی ہوئی بولی۔ ”یہ خدمت میری کریں گی اور کھانا آپ پہنچائیں گے۔ دل کو پسند نہیں آئی یہ اریخ منٹ۔“

”بی بی! عالم دین ٹھیک کہہ رہا ہے۔ تو بہت نا سوچ۔ جا کے آرام کر۔“ وہ اپنی زبان میں جھجکتے ہوئے بولی۔ چاچا خدا حافظ کہہ کر جا چکا تھا۔

صدیقہ، ماسی کو اپنے چھوٹے سے گھر کے بارے میں بتانے لگی۔ دوسرے کمرے میں جو اس نے آنے والے بچے کے لئے سیٹ کیا تھا، وہاں اس کے لئے چار پائی بچھوائی اور اسے آرام کرنے کا کہہ کر اپنے کمرے میں آکر بچی کو اٹھا کر گود میں ڈالا اور فیڈ کراتے ہوئے بچی کے نام کے بارے میں سوچنے لگی۔

”کاش! تم میرے پاس ہوتے اور اپنی بیٹی کا نام اپنی پسند سے رکھتے ہوئے تم شاداں و فرحاں ہو کر اسے اپنے سینے سے لگا لیتے۔ میں تو اپنے نصیب جیسے بھی لکھوا کر لائی تھی، خوش نصیب تو تم بھی نہ ٹھہرے۔ اللہ تعالیٰ کی جانب سے بخشے ہوئے اس خوب صورت تحفے سے تم محروم ہوئے ہو۔ میں تو اس کا پل بلی انجوائے کروں گی۔ بولو، بد قسمت کون ہوا؟“ وہ خود کلامی کرتے ہوئے بچی کو دودھ پیتے دیکھ رہی تھی کہ ایک دم سے پھر گویا ہوئی۔

”میری گزیا کا نام اس کے ابا کی پسند کا ہونا چاہئے۔ تاکہ میں اس کو بتا سکوں کہ تم ایک ایسے باپ کی اولاد ہو، جس نے تمہاری پیدائش سے پہلے ہی اپنی پسند کا نام تمہیں سوئپ دیا تھا۔ حدیقہ زیدی۔“

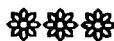
اس کے کانوں میں آصف کی چاشنی سے بھر پور باتیں گونجنے لگیں۔

”آج سے تم میری حدیقہ ہو..... آئی لائک دس نیم۔“

’میں تو تمہاری فیک حدیقہ تھی۔ تمہاری بے آمیزش حدیقہ تو آگئی۔‘

آنسو اس کے رخساروں پر پھسل آئے۔

’باپ کی شفقت اور توجہ نہ سہی، باپ کی پسند کا نام ہی سہی..... کیوں میری رانی! میری گزیا! وہ دادیلا کرتی ہوئی آنکھوں سے اسے بب دلاتے ہوئے بے اختیار ہو کر چومنے لگی۔



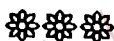
گو کہ ماسی عمر رسیدہ خاتون تھی۔ مگر ہمت و طاقت میں جوان لڑکیوں کو بھی مات دے جائے۔ گاؤں کی خالص غذا اور تازہ آب و ہوا کے اثرات اس کی شخصیت میں

خاصے نمایاں تھے۔ اس نے صدیقہ اور حدیقہ کو ہتھیلی کا چھالہ بنا رکھا تھا۔ ماں بیٹی چند دنوں میں ہی ہشاش بشاش نظر آنے لگی تھیں۔

چاچا اپنی ڈیوٹی کے بعد صدیقہ کے لئے اپنے ہاتھ سے کھانا پکا جاتا۔ کئی بار اس نے چاچا کو تنخواہ دینا چاہی مگر ہر بار وہ ماسنڈ کر جاتا۔

پچھلے نہانے کے بعد ماسی نے واپس جانے کا پروگرام بنایا تو صدیقہ پریشان ہو اٹھی۔ کیونکہ وہ اپنی چاب، حدیقہ کے ساتھ کلٹی نیو کیسے رکھ سکتی تھی؟ چاب چھوڑنے کا وہ تصور بھی نہ کر سکتی تھی۔ ورنہ ضروریاتِ زندگی کی گاڑی کیسے چلتی۔

ماسی قابلِ اعتبار عورت تھی، اس نے اسے اپنے پاس ہی روک لیا۔ اس کی موجودگی سے بچن بھی حسبِ معمول چلتا رہا۔ صدیقہ بھی واپس اپنی پرانی روٹین پر چل پڑی۔ اس کے اکیلے پن کا درد اور ڈر اور خوف کا احساس سکون و اطمینان میں بدل گیا۔ اور اتنے بڑے باپ کی بیٹی، چھوٹے سے فلیٹ اور ایک نا تجربہ کار عورت کے ہاتھوں میں پلنے لگی۔



پچھلے دو سال سے حدیقہ نے سکول جوائن کر لیا تھا۔ اس کے لئے وہاں ایڈجسٹ ہونا خاصا مشکل تھا۔ ہر وقت کی شکایتیں سرگرم رہتیں۔ مگر وہ کسی ٹیچر کی سنتی، نہ ہی ماں کی۔ باپ کی محرومی اور اکیلے پن کی وجہ سے وہ گھر میں تو پرنسز تھی۔ جو دل میں آتا کرتی۔ کسی کی ایک نہ سنتی۔ دن بھر ماسی اس کی ہاں میں ہاں ملاتی رہتی۔ جبکہ صدیقہ کے ساتھ گزرے ہوئے چند گھنٹے اس کے لئے کافی بھاری ہو جاتے تھے۔ کیونکہ اسے کسی بات میں نہ سننے کی عادت تھی، نہ ہی اس سے زبردستی کوئی کام کرایا جا سکتا تھا۔ Stethoscope سے کبھی اڑوس پڑوس کے بچوں کا معائنہ کرتی، تھرمامیٹر منہ میں دبا کر ٹمپرچر لیتی اور نیڈل کے بغیر سرخج میں پانی بھر کر سب کو انجکشن لگاتی۔ ڈاکٹروں کی زبان بولتی۔ مریضوں کو نصیحتیں کرتی، ڈانٹ ڈپٹ کرتی اور ہر وقت ڈاکٹر کے موڈ میں رہتی۔ لیکن پڑھائی کی طرف رجحان نہ ہونے کے برابر تھا۔

ماں اسے ہزاروں بار سمجھا چکی تھی کہ ڈاکٹر بننے کے لئے ایجوکیشن لینا مسٹ ہے۔ مگر کم عمری کی وجہ سے ایسی نصیحتیں اس پر کام نہ کرتیں۔ اگیزامز سے چند دن پہلے وہ کتابوں میں کھب کر بشکلِ پانسگ مارکس لے کر کرنی کلاس میں چلی جاتی۔ اس کی پڑھائی کا یہی پیٹرن اس کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔

وقت کے ساتھ ماسی کی عمر بھی اتنی بڑھ چکی تھی کہ اس سے گھر سنبھالنا دو بھر ہو گیا تھا۔ جوان بچی کی ذمہ داری مشکل لگنے لگی۔ اقمری تو وہ باپ جیسی ہی تھی۔ بل میں خفگی اور اگلے بل میں شیر و شکر اُس کی فطرت کا خاص الخاص حصہ تھی۔ پڑھائی میں بھی لگاؤ نہ ہونے کے برابر تھا۔ ماسی جہانمیدہ عورت تھی، اس ڈیڈلی کمبیشن کو دیکھ کر ہر وقت خائف رہتی۔ مترحم نگاہوں سے صدیقہ کو گھنٹوں دیکھا کرتی مگر منہ سے کچھ نہ بولتی۔ کیونکہ ہر ماں کے لئے اس کا بچہ لا جواب اور بے مثال ہوتا ہے۔

جب ماسی نے صدیقہ کو اپنی بڑھتی ہوئی عمر کے تقاضے بتائے تو وہ چونک اٹھی۔ اسے لگا جیسے وہ اور حدیقہ ننگے سر، کھلے آسمان کے نیچے پتی دھوپ میں کھڑی ہیں اور چیلیں ان کے جسم کے گوشت پوست کو نوچ رہی ہیں۔ کوئی مددگار نہیں، ہمدرد نہیں۔ بس وہ ہے اور اس کی جوان حسین و جمیل بیٹی۔

”ماسی! مجھے آپ نے اکیلا چھوڑنے کا کیسے سوچ لیا؟ آپ حدیقہ کی طبیعت سے اچھی طرح باخبر ہیں۔ حد درجہ کی جذباتی اور جلد باز بچی ہے۔ میں اس کی رکھوالی کیسے کروں گی؟“ وہ روہانسی ہو گئی تھی۔

”بی بی! میں سب جانتی ہوں۔ اکیلی عورت کے لئے جوان بچی کو سنبھالنا آسان نہیں۔ باہر شکرے ایسی بچیوں کو ہتھیانے کے چکروں میں تاک لگائے بیٹھے ہوتے ہیں۔ میری مائیں تو اس کی شادی کر دیں۔“ وہ اپنی عقل کے مطابق بولی۔

”شادی..... وہ توقف کے بعد بولی۔ ”بہت چھوٹی ہے۔ عقل، مت نام کی چیز تو اس میں ہے نہیں۔ دوسرے دن سب سے لڑ جھگڑ کر واپس آجائے گی۔ میرے ماضی کی وجہ سے اسے رشتہ بھی تو ڈھنگ کا نہیں ملے گا۔“

”جی بی بی! دنیا کا حافظہ بڑا تیز ہوتا ہے جی۔“ وہ افسردگی سے بولی۔

”پھر کیا کروں؟ باپ کے بغیر اداد کو پالنا کتنا مشکل ہے۔ اس کمبخت نے بھی پلٹ کے نہ دیکھا، نہ پوچھا۔“ وہ عینک اتار کر آنکھیں صاف کرتی ہوئی بولی۔ ”میں بھی کام کر کے تھک چکی ہوں۔ ماسی! میری ہمت جواب دے گئی ہے۔ اوپر سے حدیقہ کا غم کھائے جا رہا ہے، اب آپ جانے کو تیار ہو بیٹھی ہیں۔“

”مجبوری ہے بی بی! میں بھی اپنی آل اولاد میں آرام کرنا چاہتی ہوں۔ تمام زندگی ان کے لئے محنت مزدوری کی ہے بی بی! اب ان کا فرض بنتا ہے کہ مجھے بڑھاپے میں سنبھال لیں۔ ورنہ وہ بالکل ہی بے مہار ہو جائیں گے۔ بہتر ہے، ان

کے پاس چلتی پھرتی ہی چلی جاؤں۔“ اس کے خدشات درست تھے۔ صدیقہ سوچ میں پڑ گئی اور پھر مردنی سی آواز میں بولی۔

”ماسی! میں حدیقہ کو ڈاکٹر بنانا چاہتی تھی جو کہ مجھے نظر آرہا ہے، میرا یہ خواب پورا نہیں ہوگا۔ آج تک تو کوئی خواب پورا نہ ہوا، یہ کیا ہوگا؟ میٹرک میں اس کی کمپارٹ آچکی ہے۔ کیا کروں ماسی! کچھ سمجھ نہیں آرہا۔ آخر والدین کے ساتھ کی گئی زیادتی اور نافرمانی کے کچھ تو حساب کتاب مجھے دینے ہوں گے۔“

”بی بی! حدیقہ کا باپ بھی تو اسی کیرے میں ہی ہوگا۔ ہم اسے دیکھ نہیں رہے تو یہ مطلب ہرگز نہیں کہ وہ خوش بیٹھا ہوگا۔ اللہ اس کا بیڑا غرق کر دے بی بی! میں ہر وقت اس کو بد دعائیں دیتی ہوں۔“ وہ نفرت سے بولے جا رہی تھی۔ جبکہ صدیقہ کو اسے بد دعائیں دینا ناگوار گزر رہا تھا۔ مگر خاموش ہی رہی۔

”بی بی! مجھے خوشی خوشی اجازت دے دو۔“

”ماسی! آپ گھر کے کام کو ہاتھ نہ لگائیں، آرام کریں۔ مجھے یہ بھی منظور ہے۔ ماسی! آپ تو میرے گھر کا تالا ہیں۔ آپ کی وجہ سے میری جوانی کے ماہ و سال بغیر کسی تہمت کے بیت گئے۔ اب مجھے نہیں، حدیقہ کو آپ کی ضرورت ہے۔“ وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنائیت سے بولی۔

”بی بی! مجھے مجبور نہ کریں، خوشی سے رخصت کر دیں۔“ وہ پیار سے بولی۔

”تمہارا چاچا ہے نا۔ پورا خیال رکھے گا۔“

”ماسی! ہے تو مرد۔ دنیا والے نہیں بخشیں گے۔“ وہ سوچتے ہوئے بولی۔

”تمہارے باپ کے برابر ہے بی بی! لوگوں کے منہ میں خاک۔“ وہ اچنبھے

سے بولی۔

”لیکن بد قسمتی سے باپ تو نہیں ہے میرا۔ اس عمر میں بھی الزام لگانے سے اڑوس پڑوس والے باز نہ آئیں گے۔ آپ لگیں تو سمجھو میرا وہ سہارا بھی گیا۔“

”اوہو..... یہ تو غضب ہو جائے گا۔“ وہ پریشان ہو گئی۔

”ماسی! اگر مجھ پر مہربانی کریں تو چند مہینوں کے لئے رک جائیے۔“ وہ طویل توقف کے بعد سوچتے ہوئے بولی۔ ”حدیقہ اپنا ایگزام کلیئر کر لے۔ اسے ڈاکٹر نہ سہی، نرسنگ کی سائیڈ پر لے آتی ہوں۔ اسی جاب نے مجھے دال روٹی دی ہے، عزت دی ہے۔ کیوں نہ میں اس کے بارے میں سوچوں۔ اونچی اڑان میرے مقدر میں

کہاں۔“ وہ آہ بھر کر بولی۔

”یہ ٹھیک سوچا ہے۔ میں رک جاتی ہوں چند مہینے۔“ وہ تسلی بخش لہجے میں بولی۔
 ”یہ ٹریننگ کے لئے ہاسٹل چلی جائے گی تو آپ بھی چلی جائیں۔“ وہ تسلی سے

بولی۔

”بی بی! میری تسلی بھی تو ضروری ہے۔ میں نے حدیقہ کو اپنی بیٹی سمجھ کر پالا پوسا ہے۔“ وہ آنسو صاف کرنے لگی۔ صدیقہ اپنے دکھوں پر رو پڑی۔

”اب تمہارے دکھ اور غم ختم ہونے کے دن آگئے ہیں۔“ وہ اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بولی۔ ”بھلا تمہیں اور حدیقہ کو کیسے بھول سکتی ہوں؟“ وہ پیار سے بولی۔

”جانتی ہوں ماسی! اسے انگلی پکڑ کر چلنا کس نے سکھایا، گھنٹوں اسے کھانا کھلانے کی محنت کس نے کی۔ راتوں کو اس کے ساتھ کون جاگا۔ ہر وقت اس کے پیچھے بھاگتا، پارک لے جاتا کس نے کیا۔ مجھے وہ منظر کبھی نہیں بھولتا، جب روٹی پک رہی ہوتی تھی تو آپ اس کے ہاتھ میں آٹے کا بیڑا دے دیا کرتی تھیں۔ وہ پیڑے سے ننھے ننھے ہاتھوں سے میٹھی میٹھی روٹی بنایا کرتی تھی اور آپ نہال ہو جاتی تھیں۔ اس کی مٹی کھانے کی عادت چھڑانے کے لئے آپ نے اس پر محنت کی۔ آپ نے حدیقہ کو اس کے نام کا مطلب دے دیا۔ وہ سرسبز و شاداب باغ ہے اور آپ ہیں اس کی چار دیواری اور تحفظ۔“ اس نے ماسی کے ہاتھ چوم لئے۔

”لیکن اب وہ بڑی ہو گئی ہے تو میری چوکیداری پر بہت خفا ہوتی ہے۔ اسے چار دیواری سے چڑھنے لگی ہے بی بی! وہ ہواؤں میں اڑتے ہوئے اس پنچھی کی مانند ہے۔“ وہ آسمان پر فضاؤں میں اڑتے ہوئے پرندوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی تو صدیقہ کھڑکی سے آسمان کو دیکھنے لگی۔ ہوا کی تندی اور تیزی سے پرندے خود پر قابو پانے سے قاصر تھے اور ہوا کے دوش پر کبھی اوپر کبھی نیچے، کبھی دائیں اور کبھی بائیں ہچکولے کھاتے ہوئے سنبھلنے کی کوشش کر رہے تھے۔

”اللہ تجھے زمانے کے تیز و تند طوفانوں سے بچائے میری بیٹی! ٹو سدا بہار، شگفتہ رہنے والا باغ ثابت ہو، اپنے نام کی طرح۔“ وہ بڑبڑائی اور پرندوں کی بے بسی کو دیکھتی رہ گئی۔ اسٹرانگ ونگز والے برڈز کوشش سے دوسری سمت نکل گئے۔ چھوٹے اور کمزور وہیں ہوا کے تھپڑوں میں الجھ کر رہ گئے تھے۔ اس کے ذہن میں اپنا تلخ ماضی گھوم گیا۔ ماسی نے کافی دیر بعد محسوس کیا کہ صدیقہ حال میں نہیں ہے۔ وہ پلک جھپکے بغیر

آسمان کی بے کراں وسعتوں میں کسے ڈھونڈنے کی کوشش کر رہی ہے؟ خود کو کہ اپنے بے وفا ہر جانی کو؟..... وہ آگے بڑھی اور اپنے ناتواں ہاتھوں سے اسے پکڑ کر پلنگ پر بٹھا دیا اور اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولی۔

”بی بی! میں جانتی ہوں تم کس سوچ میں پڑ گئی۔“

”مائی! ماں کے دل میں ایک دھڑکا سا لگ گیا ہے۔“ اس نے گھڑی کی طرف دیکھا۔ ”دوپہر کے دو بج رہے ہیں، حدیقہ ابھی تک نہیں جاگی۔ بھوکی پیاسی سوئی ہوئی ہے۔ جا کر جگائیں۔ آج اس کے لئے ناشتہ نہیں بناؤں گی۔ آپ آرام کریں۔“

”وہ رات بھر جاگی رہی ہے۔“ مائی نے آہستگی سے کہا۔

”ایگزرام جو ہیں۔ پڑھ رہی ہوگی۔“ صدیقہ نے اٹھتے ہوئے کہا۔

”کتا ہیں تو سامنے کھلی ہوئی تھیں۔ مگر موبائل پر کبھی ایک سے بات تو کبھی دوسری سہیلی سے بات۔ کیسے پاس ہوگی؟“ وہ فکر مندی سے بولی۔

”آپ نے پہلے نہیں بتایا۔“ وہ حیرت سے بولی۔

”سہیلیوں سے بات کرنا بھی تو ضروری ہے۔ تازہ دم ہو جاتی ہے۔“ وہ سنجیدگی سے بولی۔

”ہاں، بہت ضروری ہے۔ بدتمیز اسی لئے تو فیل پر فیل ہو رہی ہے۔“ وہ غصے سے بولی۔

”اس کے باپ کا کہیں سے اتہ پتہ مل جائے تو اس کی حدود اسے ہی سوئپ دوں۔ کیا کیا سوچا تھا میں نے اس کے لئے۔“

”بی بی! غصہ چھوڑیں۔ اسے کچھ نہیں کہنا۔ یہ اولاد جب جوان ہو جائے تو اس سے ڈر کر ہی رہنا چاہئے۔ پل بھر میں آپ کا کیا کرایا کھوہ کھاتے ڈال دیتے ہیں۔“ وہ نرمی سے سمجھاتے ہوئے بولی۔

”مائی! میں تو ایسی نہ تھی۔ والدین کے سامنے آنکھ اٹھا کر بات کرنا تو کجا، ڈر کے مارے چھپ جایا کرتی تھی۔ وہ ہوتا ہے نا، اناج کا پڑولا۔ اس میں دبک کر بیٹھ کر ان لے غصے کے کم ہونے کا انتظار کرتی تھی۔“ وہ سنجیدگی سے بولی۔

”تمہاری بیٹن کی عادت نے ہی تم کو والدین کے سامنے جانے سے روک رکھا۔ اب میں تمہی۔“ وہ سر ہلا کر بولی اور کمرے میں خاموشی چھا گئی۔



”اللہ! تیرا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ فائنلی میری حدیقہ نرس بننے پر رضامند ہو گئی۔ بگلی

کہیں کی۔ سمجھتی ہے، ڈاکٹری بڑی آسان ہے۔“ صدیقہ جانماز پر بیٹھی بڑبڑاتی تھی۔
 ”ممی! بس جلدی سے۔ مجھے ہوسٹل جانے کا شوق بھی ہے اور آپ سے بچھڑنے کا دکھ بھی ہے۔ ممی! زندگی میں دونوں طرح کے احساسات ساتھ ساتھ کیوں چلتے ہیں؟“ وہ پاس آکر بے قراری سے بولی۔

”بیٹا! انسان کو اللہ تعالیٰ نے اسی طرح کا بنایا ہے۔ جو اس کی عطا کردہ کسی نعمت پر خوش نہیں ہوتا، اگلی نعمت کے حصول کے لئے فکر مند ہو جاتا ہے۔ ایک کو پانے کی فتح مندی کا احساس اور دوسرے کے کھونے پر شکستگی کا احساس۔ دونوں ہی ایک دوسرے کے ہم سفر ہیں۔“ وہ جاء نماز سے اٹھ کر پلنگ پر بیٹھ گئی۔

”تو پھر جلدی کیجئے نا۔ کب ہو گا میرا ایڈمیشن؟“ اس کے اندر جوش نے غلبہ پا لیا تھا۔

”جلد بازی اچھی نہیں ہوتی۔ یہ انسان سے غلط فیصلے کروا کے زندگی کو تباہ و برباد کر دیتی ہے۔“ وہ سمجھانے کے انداز میں بولی۔

”ممی! یہ سب آپ کے دور کی باتیں ہیں۔ اب کمپیوٹر کا زمانہ ہے۔ تیزی اور ترقی کا۔ اس کے ساتھ قدم اٹھانے والے ہی کامیاب ہیں۔ ہر بات میں سوچ بچار کرنا، ارادوں میں ڈبل ماسنڈ ہونا، فیصلوں میں کوتاہی اور دیری، اسے ہی تو کہتے ہیں بزدلی اور کم ہمتی۔“ وہ ماں سے الجھ کر بات کر رہی تھی۔

”تمہارے باپ کی انہی خصلتوں نے تو آج ہمیں اس مقام پر لا کھڑا کیا ہے۔ مگر تم نہ سمجھو گی، نہ سیکھو گی۔“ وہ تملتا کر اکٹا ہٹ سے بولی۔ ”ہر وقت ہوا کے گھوڑے پر سوار۔ حیران ہوں کہ باپ کے ایک نطفے میں ہر وہ بات پوشیدہ ہے، جو میں کسی صورت نہیں چاہتی تھی کہ میری اولاد میں ہو۔“

”ممی! وہ زمانے کے ساتھ چلنے والے انسان تھے تو ڈاکٹر بنے۔ آپ میں سستی تھی، لیک آف کنفی ڈینس تھا جس کی وجہ سے مار کھا گئیں۔ قصور ان کا نہیں، ڈرپوک اور بزدل آپ نکلیں۔ یہ کوئی بات ہے کہ ایک شخص نے آپ کے ساتھ شادی کی، چند مہینے ساتھ گزار کر ایک دم غائب ہو گیا۔ سب افسانوی اور فلمی باتیں ہیں ممی! نہ جانے اندر کی سنواری کیا ہے؟ آپ کو آپ کا خاندان کیوں چھوڑ گیا؟ یہ معمہ تو حل ہونے سے رہا۔ جب تک آپ مجھ سے کھل کر بات نہیں کریں گی۔“ وہ آج فرسٹ ٹائم ماں کی بتائی ہوئی من گھڑت کہانی پر شک کا اظہار کر رہی تھی۔

صدیقہ خاموشی سے اس کے چہرے کے اتار چڑھاؤ کا جائزہ لینے لگی۔ جلد ہی اسے اپنی نافرمانی کا احساس ہوا۔ مگر ماں کو چوم کر پھر بے قابو ہو گئی۔

”آئی ایم سوری می! کاش میں اپنے ڈیڈی کو دیکھ پاتی، ان کے پیار کو محسوس کر سکتی۔ می! میں کتنی ان لگی ہوں۔ میری تمام سہیلیوں کے ڈیڈی ان کے ناز و نخرے اٹھاتے نہیں تھکتے۔ میرے لاڈ پیار اور چاؤ چونچلے تو آپ ماں ہو کر بھی نہ اٹھا سکیں۔ ایک گنوار عورت کے ہاتھ میں دینے سے پہلے سوچ لیا ہوتا کہ میرا قصور کیا تھا؟ اس دنیا میں لانے کے لئے میں نے درخواست تو نہیں بھیجی تھی آپ کو۔ آپ گناہگار ہیں می! مجھے ڈیڈی کی شفقت کے بنا کیوں پیدا کیا؟ مجھے گٹر میں ہی پھینک دیا ہوتا۔“ وہ زہر انگل رہی تھی۔ آج سے پہلے اس نے ایسے طعنے و تشنئے تو کبھی نہ دیئے تھے۔ یہ یکدم اسے کیا ہو گیا؟ صدیقہ حواس باختہ سی، منہ کھولے اسے دیکھے جا رہی تھی۔

”میری باتوں کا آپ کے پاس کوئی جواب نہیں ہے۔“ وہ پھر نچی سے بولی۔ ”مجھے نہیں چاہئے تنہائی۔ مجھے اپنے خونی رشتوں کی چاہ ہے۔ سب کہاں ہیں می؟ کیا سب ہی مر چکے ہیں؟ تو بتائیے، ان کی قبریں کہاں ہیں؟ میں قبرستان میں ہی ان سے ملاقات کر لیتی ہوں۔“

”حدیقہ! تم پاگل ہو گئی ہو۔ کیسی فضول باتیں کر رہی ہو؟“ وہ قدرے نرمی سے

بولی۔

”ایک ڈاکٹر کی بیٹی، بننے چلی ہے نس۔“ وہ تنفر سے بولی۔ ”ہوں، پاگل میں

ہوں کہ آپ؟“

”تم سچ کہتی ہو کہ تمہیں گٹر میں ہی پھینک دیا ہوتا۔ کاش مجھے معلوم ہوتا کہ جسے میں اپنا سہارا سمجھ رہی ہوں، بیساکھی بنانے کے خواب دیکھ رہی ہوں، اُف وہ سب میری سوچ تک ہی محدود تھا۔ جس کی تم اولاد ہو، جس کا تم گندا خون ہو، وہ میرا نہ بن سکا تو تم میری ایک فرمانبردار بیٹی کیسے بن سکتی ہو؟..... اُف! میں نے نا سنجی اور کم عقلی میں کیا کیا امیدیں باندھ کر اس کوکھ میں تمہیں پیار سے پالا۔ محنت مزدوری کر کے تمہیں کسی چیز کی کمی نہ آنے دی، تمہیں شہزادی والی لائف دی۔ اور اپنی بساط سے بڑھ کر امیر کبیر بچوں کے ساتھ تمہیں تعلیم دلوائی۔ بتاؤ، میں کہاں پر غلط ہوں؟ باپ کی طرح دھاندلی مچانا تمہارے خون میں شامل ہے۔ اس میں تمہارا کوئی قصور نہیں۔“ وہ دکھ بھرے لہجے میں بولی۔

”آپ ہر طریقے اور ہر لحاظ سے اپنی مثال آپ ہیں۔ میں بڑے باپ کی بری بیٹی ہوں۔ مان لیا میں نے۔ اچھا ہی ہوا کہ میں آپ کی جان چھوڑ کر ہوشل جا رہی ہوں۔ اب خوش ہو جائیے۔ میں، جو ایک جو تک بن کر آپ کو چپک گئی تھی، آپ کا خون چوس کر آپ کو ڈستی رہی، اب میں بھی سرخرو ہو جاؤں گی۔ آپ نے مجھے گلٹ کے سوا دیا ہی کیا ہے؟“ وہ کاٹ دار لہجے میں بولی اور رونے لگی۔

”بیٹی! میری جان! تم پہلے ایسی تو نہ تھیں۔ کیا نرس بننا ایری ٹیٹ کر رہا ہے؟“ وہ اسے پچکارتے ہوئے بولی۔ ”اگر تمہارا دل نہیں مان رہا تو چھوڑ دو۔ رہنے دو۔ فرسٹ ایئر میں ایڈمیشن لے لو۔ مجھے تم تو اپنی جان سے بڑھ کر عزیز ہو۔ نہ تم جو تک ہو، نہ ہی مجھ پر بوجھ ہو۔ میرا سب کچھ تم ہی تو ہو۔“

”ممی! پڑھنا بھی تو پسند نہیں۔ میرے اندر کی حدیقہ دن میں کتنی دفعہ مرتی اور جیتی ہے۔ ممی! ہماری زندگی نارمل کیوں نہیں ہو سکتی؟ ایک گھر بڑا سا، اس میں میری ماں کوئین، میرا باپ کنگ اور حدیقہ پرنسز بن کر کیوں نہیں رہ سکتی؟ جیسی میری فرینڈز کی زندگی ہے ماما! میں نے اس زندگی کو حسرت و یاس کی نظر سے دیکھا ہے۔ تنہائی میں ڈیڈی کو اپنا راز داں بنا کر فریادیں کی ہیں، ان کے واپس لوٹ آنے کی دعائیں کی ہیں۔ ماما! ہم جیسے لوگوں کی نہ تو دعائیں قبول ہوتی ہیں، نہ ہی کوئی معجزہ ہماری زندگیوں کو روشن بناتا ہے۔ کیا اللہ تعالیٰ صرف امیروں کے حراج اور خواہش کے مطابق چلتا ہے؟ ایسا کیوں ہے ماما؟“ وہ پڑمرہ لہجے میں بولتی ہوئی سسکیاں بھرنے لگی۔

ماں نے اسے گلے لگا لیا اور اسے پیار کرتے ہوئے بولی۔

”بیٹا! میں تمہارے باپ کی بے وفائی اور مکاری کو تمہاری قربت میں ہنس کر سہہ گئی تھی، اب تمہارے درد کو کیسے برداشت کروں گی؟ میں تو تمہیں ہمیشہ لا اُبا لی، من موجی اور لا پرواہی کی تصور کر کے مطمئن رہی۔ مگر..... مگر تم تو مجھ سے بھی چار ہاتھ آگے نکلی۔ حد درجہ حساس اور احساس محرومی کے شکنجے میں مقید اور معجزات کے رونما ہونے کی منتظر۔ میرے دل کے ٹکڑے! ان تمام احساسات کو خیر باد کہہ کر اپنے حالات سے سمجھوتہ کر لو۔ میں نے تو تمہارے دل کی دھڑکن کے ساتھ سانس لینا سیکھا تھا، تم ہی دل چھوٹا کر بیٹھی تو میں کیسے جی پاؤں گی؟“

دونوں کا غصہ بھک سے اڑ چکا تھا۔ دونوں بے بسی سے روئے جا رہی تھیں۔ آخر

ماں نے خود کو سنبھال کر اسے تسلی دینا چاہی تو وہ دکھ سے بولی۔ ”ممی! آج مجھے بھی جی بھر کر رو لینے دیں۔ شاید میرا دل ہلکا ہو جائے۔ بد قسمت ماں کی بیٹی کیسے قسمت کی دھنی ہو سکتی ہے؟ آپ نے میرے لئے جو فیصلہ کیا ہے، درست ہے۔ یہ آپ کی بہت بڑی اچو منٹ ہے۔ مجھے معاف کر دیجئے گا ممی! میں نے آپ کو وہ کچھ کہہ دیا، جو نہیں کہنا چاہئے تھا۔ لگتا ہے، دماغ خراب ہو گیا تھا۔“ وہ پُر ملال لہجے میں بولی اور ماں کے گلے لگ کر دھاڑیں مارنے لگی تھی۔ صدیقہ ایک بار پھر پچھتاؤں میں گھر گئی تھی کہ اسے اپنی حیثیت کے مطابق پروان چڑھانی تو آج یہ دن دیکھنا نصیب نہ ہوتا۔



صدیقہ ہارے ہوئے جواری کی طرح سر جھکائے اپنے فلیٹ میں واپس پہنچی۔ ماسی اپنا سامان باندھے جانے کو تیار بیٹھی تھی۔ وہ چھوٹے سے برآمدے میں سٹول پر ہی بیٹھ گئی۔ باہر کی گرمی نے اسے جھلسا کر رکھ دیا تھا۔ دیکھو اور بسوں میں دھکے کھاتی، حدیقہ کو ٹریننگ کے لئے ہوشل چھوڑ کر آئی تھی۔ دل تھا کہ اس کی جدائی اور اس کی حسرتوں کے کرب کے گرداب میں الجھا ہوا۔ ماسی فوراً پانی کا گلاس لے آئی۔

”آپ جا رہی ہیں..... اب کون میری شدت کی پیاس اور بجلتی ہوئی بھوک کو محسوس کرے گا ماسی؟“ وہ گلاس پکڑتے ہوئے آزر دگی سے بولی۔

”بی بی! تمہیں اکیلا ہرگز نہ چھوڑتی مگر مجبور ہوں۔ تمہارا چاچا چکر لگاتا رہے گا۔“ وہ بے ساختگی سے بولی۔

”آج کے بعد چاچا یہاں نہیں آ سکتا۔ میں جس کمیونٹی میں رہتی ہوں، وہاں اسکینڈلز کے سوا اور کچھ نہیں۔ اکیلی جان ہوں۔ اس گھر میں رات ہی تو گزارنے آتی ہوں۔ اب مجھے کون سا حدیقہ کی اس گھر میں موجودگی کی کشش آنے پر مجبور کرے گی۔“ وہ پانی پی کر دکھی لہجے میں بولی۔

”بات تو ٹھیک ہے۔ مگر بی بی! اپنی صحت و آرام کا خیال رکھنا بہت ضروری ہے۔ ہاں تو یہ تو بتائیں، حدیقہ زیادہ پریشان اور اُداس تو نہیں تھی۔“ وہ سوچتے ہوئے بولی۔

”بہت خوش۔ ہمیشہ کی طرح۔ ایکٹنگ تو اس پر ختم ہے نا۔“ وہ دوپٹہ اتار کر دوسری طرف رکھتے ہوئے بولی۔ ”کتنے سالوں سے مجھے بے وقوف بنا رہی تھی۔ میں سوچتی تھی، باؤلی ہے، نادان ہے۔ بالکل لا پرواہ ہے۔“

”وہ بہت دکھی ہے بی بی!..... وہ مجھ سے بھی کئی بار پوچھ چکی ہے کہ ممی کی شادی

کیوں ٹوٹ گئی جبکہ لڑ میرج تھی۔ کیا لڑا اسے کہتے ہیں؟ وہ مجھے لڑ کے بارے میں لمبی لمبی کہانیاں سنایا کرتی تھی۔“ وہ دکھ بھرے لہجے میں بولی۔
 ”آپ کیا جواب دیتی تھیں؟“ وہ تجسس بھرے لہجے میں بولی۔
 ”بال منول کر دیتی تھی بی بی! وہ پڑھی لکھی اور میں چٹی ان پڑھ۔ اسے کیا جواب دے سکتی تھی؟“

”ماسی! آپ ہی بتاؤ کہ میں اسے اس کا باپ کہاں سے ڈھونڈ کر لا دوں؟.....
 شمیمہ! تم نے میرے ساتھ زیادتی کی۔ تو کیا تم گھر بسائے بیٹھی ہو؟ چار بچوں کے ساتھ بیوہ ہوئی ہو۔“ وہ توقف کے بعد بولی۔ ”میں پھر بھی تمہیں بد دعا نہیں دوں گی۔ ماسی! جب انسان کے دل میں خوف خدا نہیں رہتا تو دوسروں کے حقوق پر ڈاکہ ڈالنے کو نیکی کا نام دینے لگتا ہے۔ ظلم و ستم ڈھا کر اپنی نفرت کی آگ کو ٹھنڈا کر کے سمجھتا ہے کہ اس کے تو دارے نیارے ہی ہو گئے ہیں۔ انسان اس وقت کیوں بھول جاتا ہے کہ مجھے ایک ایک بات کا جواب دہ ہونا پڑے گا۔ اور پھر آپ نے بھی دیکھا ہوگا کہ وہ اسی دنیا میں اللہ کی مخلوق کے سامنے اپنے کئے ہوئے گناہوں کے جواب سک کر، تڑپ کر دے رہا ہوتا ہے۔ اس انجام کو کیوں بھول جاتے ہیں لوگ؟“
 وہ بے بسی دلا چارگی سے بول کر پلنگ پر لیٹ گئی۔ ”میں نے جو بویا، وہی کاٹ رہی ہوں۔ مجھے اپنی تقدیر سے گلہ ہے، نہ ہی اپنے خدا سے۔ میں اسی سزا کی مستحق ہوں ماسی!“

”بی بی! آپ کی جوانی گزر گئی مکھی کی طرح ہاتھ ملتے، دنیا کو جواب دیتے۔ بیٹی نے تو پہلی بار جواب مانگا تھا۔ اس سے سچ چھپا کر آپ نے اچھا نہیں کیا۔“ وہ جھجکتے ہوئے بولی۔

”ماسی! میں اسے کس منہ سے بتاؤں کہ تمہاری ماں، تمہارے باپ کے ساتھ بھاگ گئی تھی۔ کورٹ میرج کر لی تھی۔ اس شادی میں نہ کوئی اپنا گواہ تھا، نہ ہی غیر موجود تھے۔ اور پھر یہ بتاتے ہوئے مرنے جاؤں گی کہ تمہارے باپ نے مجھے ناقابل اعتماد، خود غرض اور وقت شناس کہا۔ اپنی جگہ پر وہ سچا تھا۔ کیونکہ میں نے اپنے ماں باپ کو دغا دیا تھا۔ وہ یہ سن کر مزید مجھ سے دور ہو جائے گی۔ اگر دور نہ ہوئی تو میرے اس گناہ نے کردار سے اسے شبہ ملے گی۔ وہ عمر کے اس حصے میں ہے، جہاں ہر بل شیطانیہ تاک لگائے بیٹھی ہوتی ہے۔“ لہجے میں اتنی بے بسی اور رنجیدگی تھی کہ ماسی

کے آنسو نکل آئے۔ ادھر ادھر دیکھ کر سر پرستانہ انداز میں بولی۔

”جاتے جاتے اپنے ہاتھ کا کھانا ہی کھلا جاؤں۔ کیسے مرجھا گئی ہو؟“

”گرمی نے جھلسا دیا ہے، رش نے تھکا دیا ہے ماسی! کھانا رہنے دیں۔ بھوک

نہیں۔ راستے بھر پانی پیتی آئی ہوں۔ نوشتہ تقدیر نے ہمارے لئے ایسی ہی مشکلات اور

اذیت سے بھر پور زندگی کا انتخاب کیا ہے۔ اللہ کرے حدیقہ پر میرا سایہ بھی نہ پڑے۔“

”اللہ پر بھروسہ رکھو بی بی! وہی تو جم گیا ہے، لسی بنائی ہوں۔ ساتھ تھوڑی سی

تندوری روٹی لے لو۔ ورنہ خالی پیٹ بیمار پڑ جاؤ گی۔“ وہ ہمدردانہ لہجے میں بولی۔

”ماں تجھ پر داری جائے۔ اٹھو نہ! لو۔ طبیعت بہتر ہو جائے گی۔“

وہ نہ چاہتے ہوئے بھی اٹھی اور صندوق سے لون کا جوڑا نکال کر غسل خانے کی

طرف چلی گئی۔ وہ اسے دکھی نظروں سے دیکھتے ہوئے سوچنے لگی۔

’میں تجھ پر قربان۔ تمہیں اس حالت میں چھوڑ کر بھی نہ جاتی۔ کیا کروں؟

بڑھاپے نے جسم میں کچھ نہیں چھوڑا۔ ادھر مر گئی تو تمہیں معصیت ہی پڑ جائے گی۔

کہاں لئے پھر دو کی اس لاش کو۔ بس اب مجھے جانے دو۔ میری دعائیں تمہارے ساتھ

ہوں گی۔ اکیلی جان ہو، سنبھل جاؤ گی۔ وقت بڑا ہی ڈانڈا ہے بی بی! جینے کے

ڈھنگ سکھا دیتا ہے۔‘

اس نے لسی بنا کر جگ میں ڈالی، قریب ہی تندورچی سے روٹی خرید کر اس پر

لمسن کا پیڑا رکھ کر کمرے میں لے آئی۔ وہ بھی نہا کر نکل آئی تھی۔ اس نے پلنگ پر

بیٹھ کر یہ سادہ سا کھانا کھایا اور پیار بھرے لہجے میں بولی۔ ”بی بی! کھانا کھا کر سو

جاؤ۔ اب دعا کے علاوہ اور کچھ نہیں کرنا، ورنہ بیمار پڑ جاؤ گی۔“

”جی ماسی!“ وہ کھانا زہر مار کرنے لگی اور ماسی ادھر ادھر کی باتیں سنانے لگی۔

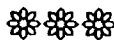
جبکہ صدیقہ کے کان، دل و دماغ اس کی تمام باتوں سے محروم تھے۔ وہ حدیقہ کے

ہارے میں سوچے جا رہی تھی۔ اس کی محرومیوں کا جان لیوا احساس اسے کچوکے لگا کر

زخمی کر رہا تھا۔ مگر بظاہر پرسکون نظر آ رہی تھی۔ کیونکہ ماسی کسی بھی لمحے چلی جائے گی

اور جاتے جاتے وہ پریشان ہو کر کیوں جائے؟ خوشی خوشی انہوں میں جائے۔ وہ تشکر

آميز نظروں سے اسے دیکھنے لگی۔



آصف، ہاسپٹل کے آفس میں علی الصبح پہنچ گیا تھا۔ آنکھیں شب بیداری کی وجہ سے سرخ ہو رہی تھیں۔ بالوں میں چاندی کے تار خاصے نمایاں تھے۔ پیشانی پر گہری تین لائیں اور ان گنت مہینوں کی شکنیں چہرے پر پھیلی ہوئی تھیں۔ اس نے سگار انگلیوں میں دبا کر پل بھر کو سوچا اور واپس بکس میں ڈال دیا۔ کانوں میں صدیقہ کی اپنائیت کی چاشنی سے بھر پور آواز بیٹھارس گھولنے لگی۔

”آصف! نہار منہ یہ سگار پینے والے لوگ کون ہیں؟ آپ کو اس کا علم ہے؟“

”ہاں۔“ وہ قہقہہ لگا اٹھتا۔ ”جانتا ہوں۔ اس مابدولت کو آصف زیدی کہتے ہیں۔“

”یعنی جاہل اور ان پڑھ۔“ وہ قہقہہ لگا کر چھیڑتی۔ ”ڈاکٹر آپ کو نہیں، مجھے ہوتا چاہئے تھا۔“

ایک دم وہ نرس کی آواز پر چونک گیا اور اسے اس وقت اس کی آمد بہت ڈسٹرب کر گئی۔ وہ میز پر کمپیوٹر اور فائلیں درست کر کے باہر چلی گئی۔ وہ آفس سے ملحقہ چھوٹے سے کینٹ میں گیا اور کافی میسر میں کافی بنا کرنگ میں ڈال کر پھر آفس میں آ گیا۔ پہلی سب لی ہی تھی کہ صدیقہ کی کھنکھتی ہوئی آواز ابھری۔

”ہمارے گاؤں میں صبح سویرے دیسی ڈرنک کو بہت اہمیت دی جاتی ہے۔ کیا آپ جانتے ہیں کہ دیسی ڈرنک کسے کہتے ہیں؟“

”مجھے اتنا بھی اسٹوڈنٹ نہ سمجھو۔ دودھ کو کہتے ہیں۔“ وہ ہنستے ہوئے کہتا تو وہ ہنسی سے لوٹ پوٹ ہوتے ہوئے کہتی۔

”لسی پنجاب کے دیسی مشروبات کی ماں ہے۔ ہار گئے نا۔“

”تم سے جیتنا خاصا مشکل ہے۔“ وہ خفیف سا ہو کر بولا۔

”تو پھر یہ کافی مجھے دیں اور ذرا ماں جی کا دیدار کر لیں صبح سویرے۔ دن بہت

خوشگوار گزرے گا۔“ وہ شوخی سے کافی کی پیالی اس کے ہاتھ سے لے لیتی اور لسی کا بڑا سا گلاس اس کے ہاتھ میں تھا دیتی۔ وہ محبت سے مغلوب ہو کر اسے لمبے بالوں سے پکڑ کر اپنی طرف کھینچتا تو وہ درد سے کراہتی۔

آصف نے چونک کر اپنے گرد و پیش کا جائزہ لیا۔ وہ تنہا آفس میں بیٹھا تھا۔ صدیقہ کی یادوں کا معطر جھونکا تھا جو گزر گیا تھا۔

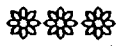
’کاش!..... کاش! یہ میرا بھولا بسرا خیال نہ ہوتا۔ خیر، اپنی دے۔‘ وہ اپنی ہی سوچوں میں ڈوبا بے دلی سے کافی پینے لگا۔

وہ دن بھر بے دلی سے پیشنس دیکھتا رہا۔ شام ہوتے ہی وہ پب میں جا بیٹھا۔ رات گئے تک وہیں اپنی ذہنی کیفیت اور رد و کد سے نجات حاصل کرنے کی کوشش کرتا رہا۔ جب گھر آیا تو نشے میں اتنا دھت تھا کہ ٹی وی کے سامنے کارپٹ پر ہی اوندھے منہ لیٹ گیا اور منہ سے ایک بار ایک ہی نام نوتے ہوئے ادا ہوا۔

”صدیقہ!“

صبح ڈینی نے اسے اپنے جوتے کی نوک سے ہلا کر اٹھانے کی کوشش کی مگر اس کی طرف سے حرکت نہ ہوئی تو وہ گرج دار لہجے میں بولی۔

”یہ دیسی کتا پی پی کر مرتا ہے۔ سٹوپڈ، ایڈیٹ سمجھتا ہائے، واٹر پی رہا پائے۔ نو انجوائے منٹ۔ سکس سے فل ہائے یہ دیسی کتے۔“ وہ ٹک ٹک کرتی، پرس اٹھائے مین ڈور سے باہر نکل گئی۔



ڈینی، آصف کی سائیڈ کاٹرسٹ تھی۔ دونوں ایک ہی ہاسپٹل میں جاب کرتے تھے۔ فریئکٹ، ڈینی کا آبائی شہر تھا۔ اپنے کلچر کے مطابق والدین کے ساتھ رہنے لے بجائے اس نے انڈیپنڈنٹ رہنے کو فوقیت دی تھی۔ ہاسپٹل میں کئی بار ان کا آئنا ماننا ہوتا، کھڑے کھڑے گپ شپ بھی ہو جاتی۔ دھیرے دھیرے معاملہ آگے بڑھا تو باہر ڈھرا کٹھے ہونے لگے۔ ڈنر کے بعد کی ایڈوائس سٹیج آئی تو راتیں اکٹھی گزرنے لگیں۔ یہ سلسلہ تقریباً دو سال تک جاری رہا۔ اور آخر میں انہوں نے شادی کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

آصف کے والدین اپنے بچے کی خوشی کی خاطر ڈینی سے شادی کرنے پر سینے پر ہتھ پڑا کر رکھے آمادہ ہو گئے تھے۔ کیونکہ آصف جب سے پاکستان سے واپس لندن

آیا تھا، ڈپریشن کا شکار ہو گیا تھا۔ وہ مشورے کے لئے ڈینی کے پاس گیا تھا۔ ڈینی ایک تجربہ کار ڈاکٹر تھی۔ عمر میں اس سے بڑی تھی۔ اس نے دو ملاقاتوں کے بعد ہی اس کی ڈپریشن کی وجوہات کو بھانپ لیا تھا۔ یہ اس کا گلٹ تھا جو اسے دن بہ دن زندگی کی دلچسپیوں سے دور کرتا جا رہا تھا، والدین الگ پریشان ہواٹھے تھے۔ وہ حقیقت سے نا آشنا اسے پاکستان جانے کی تلقین کرنے لگے تھے۔ مگر وہ ہر بار والدین کو انکار کر دیتا۔ ڈینی کے کہنے پر اس نے ٹمینہ سسٹر سے رابطہ قائم کرنے کی کوشش کی کہ صدیقہ کا حال احوال معلوم کر سکے۔ مگر وہ ہر بار ناکام ہی رہا۔

اپنے قریبی چار دوستوں سے رابطہ کیا تو وہ چاروں ہی اپنے ملک سے باہر سیلڈ تھے۔ صدیقہ کی کسی کو خبر نہ تھی۔ جب توے صادق میں خدا بھی مل جاتا ہے، ٹمینہ تو ایک بے وقعت سی ہستی تھی۔ ایک دوست نے اسے غیر یقینی سے ٹمینہ کا بدلا ہوا نمبر لکھوا دیا۔ جس پر بیسیوں بار ٹرائی کرنے کے بعد اس کی آواز سننے میں آئی۔ اس سے پہلے کہ فون کٹ جاتا، آصف بے قراری سے بولا۔

”سسٹر ٹمینہ! مجھے صدیقہ کے بارے میں معلوم کرنا ہے۔ وہ خیریت سے تو ہے؟“
”ڈاکٹر صاحب! آپ اس کی فکر نہ کریں۔ وہ اپنے پیرنٹس کے پاس جا چکی ہے۔“ وہ خود اعتمادی سے جھوٹ بول رہی تھی۔

”یہ تو گڈ نیوز ہے۔ اس کا حال کیا ہے؟“ وہ قدرے طمانیت سے بولا۔
”وہ خوش باش ہے ڈاکٹر صاحب! شکر کریں کہ آپ اس ناگن سے بچ گئے۔“
ورنہ وہ ایسا ڈسٹی کہ آپ کو پاکستانیوں سے نفرت ہو جاتی۔“ وہ تلخی سے بولی۔
”سوچتا ہوں کہ کہیں جلد بازی میں غلط فیصلہ تو نہیں کر بیٹھا۔ دل ہر وقت پریشان ہی رہتا ہے۔“ وہ ناقدانہ انداز میں بولا۔

”ذرا آگے تو سنیں۔ پھر آپ کو اپنے کئے ہوئے فیصلے پر نہ پچھتاوا ہوگا، نہ ہی دکھ و غم ستائے گا۔“ وہ تیزی سے بولی اور خاموش ہو گئی۔

”دراصل میں اسے بھول نہیں پایا۔ ڈپریشن میں چلا گیا ہوں۔“ وہ افسردہ لہجے میں بولی۔

بولا۔

”وہ شادی رچا کر بہت خوش ہے۔ اور آپ ہیں کہ عشق میں مجنوں بن گئے ہیں۔“ وہ طنزیہ تہقہ لگا کر بولی۔ ”گاؤں جاتے ہی وہ ایک سکول ٹیچر سے مل جاتی ہیں۔ اس کے پیرنٹس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، اسے فوراً سر سے اتارا۔ کیونکہ بات حد سے

بڑھ چکی تھی۔“

”وہ بھی مزا چکھ لے گا اس دغا باز سے شادی کرنے کا۔ میں نے اسے طلاق نہیں دی تھی ثمنینہ! بے شک ہماری سپریشن ہو گئی ہے، مگر میرے اس پر اور اس کے مجھ پر حقوق ہیں۔ وہ شادی ہرگز نہیں کر سکتی۔“ وہ تمللا کر بے یقینی سے بولا۔

”ڈاکٹر صاحب! آپ کس دنیا میں رہتے ہیں؟ وہ اس کے بچے کو آج کل میں ہی جننے والی ہے۔“ اس نے حقارت اور ذلالت سے بھرپور ایک اور پتھر پھینکا۔

”یہ حرام ہے سسر! وہ میری بیوی ہے۔“ وہ چیخ اٹھا۔

”اس کے والد نے مولوی صاحب سے فتویٰ لے کر پکا کام کیا ہے۔ آپ ادھر آنے کا تصور بھی نہ کریں۔ وہ لوگ آپ کو قتل کر دیں گے۔“ وہ ہمدردانہ لہجے میں بولی۔ ”ایک فاحشہ اور چھنال عورت کی خاطر آپ کی جان کیونکر جائے؟ کیا ایسی ہی سستی ہے آپ کی جان؟..... میری بات پر بھروسہ رکھیں۔ اور اس خاندان سے دور رہنے میں آپ کی بھلائی ہے۔ آپ کو لڑکیوں کی کمی نہیں۔ شادی کر لیجئے۔ ڈونٹ ویسٹ یور ٹائم۔“

”تھینک یو ثمنینہ! میں قدرے ریلیکس ہو گیا ہوں۔ بائے!“ اس نے فون رکھ دیا۔

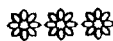
دوسری طرف ثمنینہ نے بند فون پر بوسہ دیا اور تھر آلود لہجے میں بڑبڑائی۔

”راہ چلتی چمارن۔ چلی تھی مہارانی بننے۔“

آصف کی ڈپریشن نے یکدم پلٹا کھایا۔ گلٹ کی جگہ نفرت و حقارت اور غیظ و غضب نے لے لی تھی۔ اس نے ٹیبل پر پڑے ہوئے پھولوں کو کرٹل کے گلدان سمیت فرش پر پٹخ دیا۔ دوسرے کمرے سے ماں بھاگی ہوئی آئی۔ بیٹے کے منہ سے جھاگ اُبل رہا تھا، آنکھیں تھر سے شعلہ بار تھیں۔

”کیا ہوا میرے لعل؟“ وہ گھبرا کر قریب آ گئی۔

”آپ مجھے اکیلا چھوڑ دیں۔ یہاں سے فوراً چلی جائیں۔“ وہ ہاتھ جوڑ کر غصے میں بولا تو ماں فوراً باہر نکل گئی۔ دھان پان سی ماں کانپ رہی تھی کہ اس کا بیٹا پاگل ہو گیا ہے یا کوئی حادثہ پیش آ گیا ہے۔ وہ اس معاملے کی تہہ تک تو کیا، سطح کو بھی نہ پہونچی۔



آصف کے گھر شادی کی تیاریاں شروع ہو گئیں۔

ڈینی بھی اتنی ایکساٹنڈ تھی کہ وہ شادی انڈین رسم و رواج کے مطابق کرنے میں بے تحاشا فخر محسوس کر رہی تھی۔

مایوں کی رسم اسی کے گھر میں انڈین کمیونٹی نے مل کر ادا کی، جن میں شائقین، انگریز ڈاکٹرز اور نرسز بھی شامل تھیں۔ پھر مہندی کی رسم بھی اپنے کلچر کے مطابق سیلبریٹ کی گئی۔ گوروں کے لئے یہ سب کچھ نیا اور انہوتا تھا۔ وہ انڈین مسلم سمارٹ ڈارک جوان لڑکیوں کے ڈانسز اور گانوں پر جھوم اٹھے تھے۔

پھر رخصتی فائیو اسٹار ہوٹل سے ہوئی۔ انڈین بوتیک سے خریدے گئے بھاری بھر کم بیسیوں جوڑے اور ڈیپ ریڈ غرارہ اور ویسے کا سفید اور سلور کام سے مزین لہنگا اور سونے کے ان گنت سیٹ، چوڑیاں، کڑے اور ڈائمنڈ کی انگوٹھیاں ڈینی کو حیران و پریشان کر گئیں۔ ایک رات میں وہ اتنی مال دار ہو جائے گی، اس نے کبھی سوچا بھی نہ تھا۔ یہ مشرقی شادیاں تو خوب ہیں۔ وہ امپریس ہو کر رہ گئی تھی۔

گو کہ وہ آصف سے پانچ سات سال بڑی تھی، مگر گوری چٹی، بلیو آئیز اور گولڈن بالوں والی ڈینی، آصف کے سامنے ایسے لگ رہی تھی، جیسے لنگور کی بغل میں حور۔ اور وہ اسے دیکھ کر غرور و تکبر سے اکڑ گیا تھا۔ صدیقہ بل بھر کو خیالوں میں لہر کی طرح آئی اور روپوش ہو گئی۔

یہ تھی مرد کی اصلیت۔ کھری اور سچی حقیقت۔ اللہ تعالیٰ نے بھی دو پائے میں یہ مخلوق کیسی انوکھی اور نرالی بنائی ہے کہ جس نقطے سے عورت کی شروعات ہوتی ہے، وہاں سے ہی مرد کی محبت اختتام پذیر ہوتی ہے۔ عورت اس کی بے وفائی پر ناالاں ہوتے ہوئے بھی اس کے نام پر اپنی عمر بیتا دیتی ہے۔ یہ کیسا ملن اور کیسی لگن ہے کہ نفرت کے باوجود اس کے انگ انگ سے ساتھی کی مہک اٹھتی ہے۔ اور اس کی یادوں میں وہ آہیں بھرتی، تڑپتی، بلکتی کسی اور کو دل سے قبول نہیں کر پاتی۔ اور کہیں دو ڈیفرنٹ نیچر کے دو ہیومن بینگ ایک دوسرے کی رفاقت کے بندھن میں ذہنی مطابقت اور یکجہائی کی جستجو میں اپنی عمریں گزار کر زندگی کے آخری لمحوں میں فرسٹریشن میں ہی گزار جاتے ہیں۔ کیسا عجیب بھید ہے یہ زندگی کا، جس کی کھوج پختہ مغز حضرات بھی نہ لگا سکے۔



”اٹھو بیٹا!..... تمہیں سمجھاتے ہوئے بہت سکی ہو رہی ہے۔ کیونکہ ماشاء اللہ

دونوں ہی ڈاکٹر ہو۔ اونچ نیچ میں تمیز رکھتے ہو۔ یہ دو سال میں دو بچے، نہایت جاہلانہ اور احمقانہ حرکت ہے۔ اس کے سائیڈ انیکٹس جانتے ہوتا۔ اور یہ بتاؤ کہ ہر رات لڑائی کس بات پر ہو رہی ہے؟“

ماں نے تنقیدی لہجے میں کہا تو آصف مسکرا کر رہ گیا۔

”نہیں بتاؤ گے؟..... ٹھیک ہے، نہ بتاؤ۔ اب ذرا احتیاط رکھنا۔ اللہ تعالیٰ نے ایک بیٹا اور ایک بیٹی عطا کر دی ہے، بہت ہیں ہمیں۔ اس سوسائٹی میں ان کی نگہداشت اپنے اصولوں پر کر لی تو سمجھو پہاڑ کی چوٹی سر کر لی۔“ ماں نے فکرمندی سے کہا۔

”آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں۔“ وہ مودبانہ انداز میں بولا۔

”تمہارے ڈیڈی بھی ان بچوں کی خاطر ہر وقت فکرمند رہتے ہیں۔ بلکہ مجھے کئی بار انڈیا واپس جانے کا کہہ چکے ہیں۔ دراصل وہ اپنی نسل بگاڑنا نہیں جانتے۔ نہ یہاں اللہ رسول کا نام لیا جاتا ہے، نہ نماز، نہ روزہ، نہ زکوٰۃ، نہ خیرات۔ اذان کی آواز کو ہم ترس گئے ہیں۔ درس و تدریس پر صرف میرے جانے سے بھلا کیا فرق پڑتا ہے؟“ وہ فکرمندی سے بولی۔

”ممی! اس معاشرے میں رہ کر اس مسئلے کا حل تلاش کرنا بہت مشکل ہے۔ ہم یہی کر سکتے ہیں کہ بچے جونہی بڑے ہوتے ہیں، ہم انہیں مدرسہ جوائن کرادیں تو بہتر ہے۔ اپنے تمام اسلامی اصولوں سے بھی روشناس ہو جائیں گے اور اپنی مسلم کمیونٹی میں مکمل اپ ہونے میں بھی دشواری نہیں ہوگی۔“ وہ سوچتے ہوئے بولا۔

اسی اثناء میں ڈینی نے ایک سالہ بچے کو اس کی گود میں ڈالتے ہوئے کنکھیوں سے ساس کو دیکھا اور پاؤں پٹختی ہوئی اپنے کمرے میں چلی گئی۔

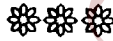
”تم نے نوٹ کیا ہے اس کے طور و اطوار کو؟..... کیا مجال ہم دونوں سے سیدھے منہ بات کر جائے۔ کھانا پکا کر مہارانی کے آگے رکھتی ہوں، پھر بھی غرہ دیکھو اس کرپشن کا۔“ وہ غصے سے بولی۔

”ممی! آہستہ۔ وہ سن لے گی۔“ وہ رازداری سے بولا۔ ”جوڑ کی شادی سے پہلے اپنے والدین کے ساتھ رہنے میں گھٹن محسوس کرتی ہو، وہ سرال میں خوش اور مطمئن کیسے رہ سکتی ہے؟ وہ کتنی بار مجھ سے جھگڑ چکی ہے۔ بیٹی کی پیدائش تو جیسے بہانہ ہی بن گئی ہے۔ میں خود پریشان ہوں ممی!“

ماں نے پوتے کو گود میں لے لیا اور وہ سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔
 ”بیٹا! اس کچھر کی بہو ہمیں کہاں سوٹ کرتی تھی؟ تمہاری خوشی کی خاطر ہم نے اتنی بڑی قربانی دے ڈالی۔ میرے کون سا چار چھ بیٹے تھے۔ تمہاری مان گئی۔ اب ہم بھی پریشان ہیں، تم بھی ناخوش۔ کیا فائدہ ہوا؟“
 ”ممی! زندگی میں، میں نے جو بھی فیصلہ کیا، سراسر غلط اور بے وقوفانہ ہی کیا۔“ وہ منمناتے ہوئے بولا۔

”بیٹا! ایسی بات ہرگز نہیں۔ جوڑے آسمانوں پر بنتے ہیں۔ جن کا انتخاب اوپر والا کرتا ہے، وہ کیسے برا یا غلط ہو سکتا ہے؟ بہت پوتر اور قابلِ فخر ہوتا ہے میاں بیوی کا رشتہ۔ انسان اس میں غلاظت اور شیطانیّت کی آمیزش سے اس کے خُسن اور تقدس کو پامال کرتا ہے۔ یہ میرا مولا نہیں کرتا۔ اس کے خطاوار ہم خود ہیں۔“ وہ پیار سے تسلی دینے لگی۔

”ممی! آپ نے کروڑوں کی بات کر ڈالی۔“ وہ مسکرانے لگا۔ ابراہیم کرا ل کرتا ہوا ماں کے کمرے کی طرف جا رہا تھا۔ دونوں اُس کی اس حرکت پر جھوم اٹھے۔
 ”بھئی ہم اپنی ہی باتیں کرتے رہیں گے تو وہ ہمارے پاس کیوں رکے گا؟ کیسا چالاک ہے۔“ دادی مسرت آگئیں لہجے میں بولی تو آصف مسکراتے ہوئے اس کے پیچھے چل پڑا۔



”ممی! آپ سے ایک بہت ضروری بات کرنی ہے۔“ آصف کے چہرے پر پریشانی کے آثار ہویدا تھے۔ وہ ماں کے کمرے میں ہی گھس گیا۔ ماں نے اسے جھوٹے بچوں کی طرح اپنے سے چمٹا کر پیار سے پوچھا۔
 ”پریشان کیوں ہو؟“

”ممی! ڈینی دو بچوں کے ساتھ اس گھر میں نہیں رہنا چاہتی۔“ وہ بمشکل ہی کہہ

پایا۔

”مطلب یہ ہوا کہ وہ ہمارے ساتھ نہیں رہنا چاہتی۔“ وہ بے اختیاری میں بولی۔
 ”جی ممی!“ اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

”جہاں رہنا چاہتی ہے، ہزار بار جائے۔ مجھے کیوں اعتراض ہوگا؟ لیکن ایک شرط ہے میری طرف سے۔“ وہ سوچتے ہوئے بولی۔ ”تم نہیں جاؤ گے۔ ہم بوڑھے

والدین تمہارے بغیر نہیں رہ سکتے۔ تمہارے ڈیڈی کی طبیعت ایک دم سے خراب ہو جاتی ہے۔ ہارٹ پمپٹ ہیں۔ بروقت طبی امداد نہ ملنے پر کچھ بھی ہو سکتا ہے۔“
 ”آپ کی شرط بسر و چشم۔ لیکن ایسا کسی بھی معاشرے میں نہیں ہوتا۔ گھر آباد ہی میاں بیوی کے اکٹھے رہنے سے ہوتے ہیں۔ ورنہ بربادی منہ کھولے کھڑی ہوتی ہے۔“ وہ فکر مندی سے بولا۔

”بیٹے! بہو چاہے یہاں سے ہو یا ہندوستان سے ہو، ان کی خو ہی نرالی ہے۔ میں اپنی کوتاہی پھر بھی قابو کر لیتی، یہ میرے کہے سننے میں کہاں؟ اب دونوں بچے میں نے پال دیئے ہیں۔ سکول بھی جانے لگے ہیں۔ اب اس بڑھیا کی اسے کیوں ضرورت محسوس ہوگی؟“

”ممی! آپ درست فرما رہی ہیں۔ آپ اطمینان رکھیں۔ بچوں کو چھٹی کے بعد ڈیڈی ہی پک کیا کریں گے۔ انہیں مصروف رہنے کا بہانہ بھی مل جائے گا۔ بچے آپ دونوں سے انچ بھی رہیں گے اور دین کے نزدیک بھی ہوں گے۔ ہم ہاسپٹل سے فارغ ہو کر انہیں گھر سے پک کر لیا کریں گے۔ ڈنر آپ کے ساتھ ہوگا۔ بس یوں سمجھیں کہ ہم دوسرے گھر سونے ہی جائیں گے۔ سانپ بھی مر گیا، لاش بھی سلامت۔“ وہ تسلی دیتے ہوئے نہایت ملائمت سے کہہ رہا تھا۔

”بات تو ٹھیک ہی لگتی ہے۔ لیکن بیٹا! تم اپنی ماں کو تو جانتے ہی ہو۔ صبح تڑکے تمہارا چہرہ نہ دیکھوں تو دن بھر کھوٹی کھوٹی رہتی ہوں۔“ اس کی آنکھیں درد کے مارے نم ہو گئیں۔

”چلیں یوں کر لیتے ہیں، میں ہاسپٹل جانے سے پہلے اپنی ماں کو دیدار کراتا جاؤں گا۔ اب تو اعتراض نہیں ہوگا؟“ وہ سوچتے ہوئے بولا۔

”بیٹا! میں عورت ہوں۔ ڈینی کی خواہش کو ہرگز رد نہیں کر رہی۔ ہر عورت کو اپنا گھر، اپنی آزادی اور خود مختاری چاہئے ہوتی ہے۔ اس کی مہربانی ہے کہ اس نے اتنا غم، ہمارے ساتھ گزاریا۔ مجھے تو ایک دن کی امید نہیں تھی۔ وہ اس معاشرے میں پیہر ہو کر جوان ہوئی ہے، اس کا اپنا ہی کلچر ہے، اپنے ہی اصول اور قانون ہیں۔ مجھے اس سے کوئی گلہ نہیں بیٹا!“ وہ آنسو صاف کرتے ہوئے بولی۔ ”ان پھول جیسے بچوں کو بھی اپنے ماں باپ کے ساتھ وقت چاہئے۔ مجھے آج سمجھ آئی ہے کہ جب ہم یہاں شفٹ ہو رہے تھے تو تمہاری دادی عشی کی حالت میں چلی جاتی تھیں۔ میں اسے

ایکنگ کا نام دے کر دل ہی دل میں ہنستی تھی۔ لیکن آج پتہ چلا ہے کہ کتنا مشکل مرحلہ ہوتا ہے، جب اپنے جسم کے ٹکڑے کو ماں کاٹ کر ایک غیر اور انجان عورت کے جسم کا حصہ بنا دیتی ہے۔ اور پھر اس کی آبادی و خوشحالی کی خاطر اسے اپنی نظروں سے بھی دور کر دیتی ہے۔ یہ ظلم ہی تو ہے۔“ وہ مسلسل آنسو صاف کئے جا رہی تھی۔ آصف، ماں کے سر پر پیار کر کے باہر نکل گیا۔ دل اداسی میں گھرا ہوا تھا، لیکن وہ مجبور تھا، بے بس تھا۔

اسی ویک اینڈ پر ان کے ضروری سامان کی پیکنگ ہونے لگی۔ ان کے کپڑے اور اسی طرح کا دوسرا ذاتی سامان ہی تو تھا۔ نئے گھر میں شام تک شفٹ ہو گئے۔ جب تک گھر سیٹ ہو کر رہنے کے قابل نہ ہوا، سب یہاں آتے جاتے رہے۔ آخر کار ایک لانگ ویک اینڈ پر یہ آباد گھونسل اُداس اور ویران ہو گیا۔ پچھلی تمام تر رونقوں سمیت اپنے نئے آشیانے میں چلے گئے۔



آصف وہ بچہ تھا، جو سکول میں بھی اپنی ماں کو پکار کر رویا کرتا تھا۔ ٹیچر اسے بہلا بہلا کر تنگ آ جاتی تھیں، مگر اس کا منہ بند نہ ہوتا تھا اور آخر وہ میز پر سر رکھ کر ہی سکپاں بھرتے سو جایا کرتا تھا۔ جب ذرا بڑا ہوا تو بریک ٹائم میں وہ ماں کو فون کر کے لُنج سکول منگوا کر ماں کے ہاتھوں سے کھایا کرتا تھا۔

تمام لڑکے اس کا مذاق اُڑاتے۔ کوئی اسے چوخی آفر کرتا تو کوئی فیڈر کا مشورہ دیتا۔ اسے یہ طعنے بالکل بے معنی اور بے وقعت معلوم ہوتے تھے۔ کئی بار باپ نے ڈانٹ پلائی، غیرت دلانے کی کوشش کی۔ مگر سب بے سود تھا۔

جب اس کا پاکستان ایڈمیشن ہو گیا تو باپ بہت خوش تھا لیکن ماں کی رورو کر گھگھکی بندھ جایا کرتی تھی۔ جب وہ چلا گیا تو ماں کو کتنی ہی بیماریوں نے آن گھیرا تھا۔ شوگر، بلڈ پریشر اور ڈپریشن کی میڈیسن ہمیشہ کے لئے ہم سفر بن گئیں۔

وقت نے ایسا تم کیا تھا کہ اسی آصف نے پیرنٹس کو انفارم کئے بغیر صدیقہ سے شادی کر لی۔ جب اندر کا آصف، محبت کے فسون سے نکلا تو اسے چھوڑ کر ماں کے گلے آگے۔ اور مزے کی بات یہ کہ پھر اسی آصف نے اپنی مرضی اور پسند کی دوسری شادی کی۔ اور آج وہ تمام تر مجبوریوں کو سینے سے لگائے نئی دنیا بسائے اپنے بچوں اور بیوی سمیت ان سے دور چلا گیا تھا۔ آج ماں کی آہ و بکا نے رتی بھر کام نہ کیا۔ دل

میں ابراہیم اور آمنہ کو دیکھ کر خود غرضی بھی عود کر آئی تھی۔ بیوی کی خوشی کی خاطر دل میں سنگینی بھی آگئی تھی۔

یہ ایسا سنگین سرکل ہے جو ماضی کو ساتھ لئے چلتا ہے۔ یہ سرکل ہے مکافاتِ عمل کا۔ یہ سرکل ہے، جیسا کرو گے ویسا بھرو گے۔ ازل سے ابد تک کے اس سرکل میں انصاف ہے۔ اپنے اعمال کا حساب کتاب ہے۔ جوان، بڑوں کے تجربات سے سیکھنے کے بجائے جوش کی حدت و تپش میں اپنی ہی لے میں سرشار رواں دواں غیر ارادی اور غیر اختیاری طور پر گزرتے وقت کے اس سرکل کا حصہ بنتے چلے جاتے ہیں۔ یہ قدرتی امر ہے۔ بھلا اسے کون جھٹلا سکتا ہے؟ جس نے اس راز کو پالیا، اس نے اس مقدس اور پاکیزہ ذات کو پہچان لیا۔



آج گھر میں فرسٹ مارننگ کا طلوع ہونا کس قدر مختلف تھا۔ وہ تیار ہو کر تیزی سے ڈائننگ ٹیبل کی طرف بڑھا۔ ٹیبل پر استعمال شدہ گندے برتن، ڈبل روٹی، انڈوں کے تھلکے اور استعمال شدہ ٹشو پیپر زکھرے ہوئے تھے۔

وہ کچن کی طرف بڑھ گیا۔ خاموشی سے ادھر ادھر کا جائزہ لیتے ہوئے باہر نکل آیا اور اپنا بریف کیس اٹھا کر گاڑی کی چابی لئے گھر سے باہر نکل آیا۔

وہ گاڑی ڈرائیو کرتے ہوئے دکھ سے سوچے جا رہا تھا کہ ماں نے آج تک اسے پانی بھی اپنے ہاتھوں سے پلایا تھا، ناشتہ بنانا تو درکنار۔

گاڑی ماں کے گھر کے سامنے رک گئی۔ وہ بجھے دل اور بھاری قدموں کے ساتھ اندر چلا آیا۔ ماں باپ صوفے پر خاموش بیٹھے تھے۔ چہرہ ان کی اندرونی کیفیت کی غمازی کر رہا تھا۔ آنکھوں میں پرلے درجے کی اُداسی و مایوسی تھی۔ اسے دیکھ کر چونک اٹھے۔ دونوں بیک زبان بولے۔

”ہم تمہارے ہی منتظر تھے۔ بچے کہاں ہیں؟“ وہ دروازے کی طرف دیکھنے لگے۔ ”ہم تو سمجھے، تم نہیں آؤ گے۔“

”وہ ڈینی کے ساتھ ہی سکول جا چکے ہیں۔ میں سویا ہی رہ گیا۔ آج تک تو می جگاتی آئی ہیں۔ مجھے علم ہی نہ ہوا کہ ڈینی کب اٹھی، کب تیار ہوئی اور کب ڈیوٹی پر چلی گئی۔“ وہ مصنوعی مسکراہٹ سے بولا۔

”آئندہ میں اپنے بچے کو موبائل پر ٹیل مار دیا کروں گی۔“ وہ اسے پیار کرتے

ہوئے بولی۔ ”تم نے ناشتہ بھی نہیں کیا ہو گا۔ ہم دونوں بھی تمہارا انتظار ہی کر رہے تھے۔“ وہ کچن کی طرف چل پڑی۔ بل بھر میں میز ناشتہ کے لوازمات سے بھر گیا۔ متیوں نے ناشتہ کیا اور آصف خدا حافظ کہہ کر تیزی سے ہاسپٹل کی طرف چل دیا۔ نادانستگی میں وہ بار بار گھڑی دیکھ رہا تھا۔

جب سے ڈینی اس گھر سے رخصت ہوئی تھی، اس نے اس طرف پلٹ کر دیکھا بھی نہ تھا۔ بچے میاں بیوی کی تلخ قیل و قال کے بعد صرف ایک دفعہ دادی اور دادا کو وزٹ کرنے آئے تھے۔ جبکہ آصف بلا ناغہ ناشتہ ماں کے ہاتھ کا کرتا رہا۔ لچ میں فروٹ اور چائے و کافی کے ساتھ اسٹیکس چل جاتے۔ پانچ بجے چھٹی کے بعد والدین کے ساتھ افراتفری میں ارلی ڈزرت کرتا۔ اس کی موجودگی سے گھر کی دیرانی اور جان لیوا سکوت میں مسرت و انبساط کی لہر دوڑ جاتی۔ وہ ذہنی طور پر مطمئن اور پرسکون ہو کر گھر چلا جاتا۔ والدین کے ساتھ ذہنی ہم آہنگی اور جذباتی وابستگی میں کمی تو نہ تھی، مگر حالات کے تقاضوں کو پورا کرنا بھی تو اہم تھا۔

ویک اینڈ گھر پر ہی ایک بہت بڑے طوفان کی نذر ہو جاتا۔ وہ بچوں اور بیوی سمیت ویک اینڈ اپنے ضعیف والدین کے ساتھ گزارنا چاہتا تھا۔ جبکہ ڈینی ہر سنڈے بمعہ بچوں کے چرچ جانے پر بضد ہوتی۔ آصف کو یہ گوارا نہ تھا۔ وہ بچوں کو روکنے کی کوشش کرتا تو ایک ہنگامہ کھڑا ہو جاتا جس میں پار ہمیشہ آصف کی ہوتی رہی۔ کیونکہ زیادتی اور ہاتھ پائی اس کے مفاد میں نہیں جاتی تھی۔ ورنہ عمر بھر برٹش گورنمنٹ کے ہاتھوں خمیازہ بھگتنا پڑتا۔ کیونکہ یہ معاشرہ ہمیشہ سے عورت کی طرف داری کرتا آیا تھا۔ بے شک حقیقت تلخی سے بھر پور تھی۔ معاملہ دن بہ دن بگڑتا نظر آ رہا تھا۔

اسے ہر وقت ایک انجانا سا خوف، ڈر اور خدشہ لاحق رہتا تھا کہ کسی بھی وقت ڈینی کا منفی رویہ اسے کبہرے میں کھڑا کر سکتا تھا۔ وہ خالی الذہنی کیفیت میں ڈانواں ڈول ہوتا گھر کے باہر چھوٹے سے لان میں کھڑا ہو گیا۔ آج پھر سے ڈینی بچے لے جانے میں کامیاب ہو گئی تھی اور وہ بے بسی سے اسے دیکھتا رہ گیا تھا۔ والدین سے پردہ داری رکھنے میں ہی مصلحت سمجھ کر یہ اکیلا اندر ہی اندر کڑھتا رہتا تھا۔ بھلا کس سے شیر کرتا کہ اس کی اگلی نسل تو بے دین ہوگی۔ اسلام کے تمام ارکان سے بے خبر اور بے بہرہ۔ یہ قلق اسے مارے جا رہا تھا۔ اپنی اس چوائس پر ماتم کناں ہوتا وہ گاڑی میں جا بیٹھا اور پینرس کے پاس سنڈے گزارنے چل پڑا۔

’اُف زندگی کن کن کرائسز سے گزر رہی ہے۔‘ آگہی کی اذیت اور کرب میں وہ بڑبڑایا۔ ’دنیاوی مسرتوں کے حصول کی خاطر میں نے خود کو پراگندہ کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ اب دل نادان مجروح ہے۔ روح تارتار ہو چکی ہے، ذہن مفلوج ہے اور وجود میں اٹھتے ہوئے آگ کے شعلوں میں، میں بے بس اور لاچار ہوں، مجھے صدیقہ کی بد دعا کھا گئی۔ میں جہاں جاتا ہوں، اس کی ٹپ اور اس کی منتوں اور خوشامدوں کے حصار میں مجھے شائق کیسے مل سکتی ہے؟ میں غیر مذہب کی نجاست اور غلاظت میں بری طرح دھنس چکا ہوں۔ میں نہیں چاہتا میرے رب! کہ میری اولاد بھی بے دین ہو کر بد بودار اور ناپاک کچھڑ کی دلدل میں اُترتی چلی جائے۔ اس پستی اور ذلالت سے انہیں محفوظ کر لے میرے رب! میری ناعاقبت اندیشی میں سرزد ہونے والی غلطی کو معاف کر دے۔ میرے دل کو اطمینان اور سکون بخش دے میرے رب! میں نے صدیقہ کی محبتوں اور چاہتوں کو ٹھکرا کر اس پر ڈس لائٹی کی جو مہر لگائی تھی، کس قدر غیر مناسب اور غیر مہذب تھی۔ اس پر کیا گزری ہوگی، جب وہ اپنے گاؤں لنی لنائی، پیرنس کے سامنے گئی ہوئی۔ اُسے سنگسار کرنے، جھڑکھوپ کر مارنے اور گولی کا نشانہ بنانے کی دھمکیوں نے اس کے حسین و پاکیزہ وجود میں بھونچال برپا کر دیا ہوگا۔ اُف اس کے رواں دواں آنسو اور قلب سے رستا ہوا خون اور ندامت و شرمندگی سے بوجھل التجائیں میری زندگی کی روشن راہوں کو تاریک کر گئیں۔ میرے رب! مجھے فقط اپنا غلام بنا لے اور سکون دے دے۔ اور عزت کی موت دے دے۔ اور مجھے معاف کر دے۔ میں نے تیری حکم عدولی کی۔ تُو حکمت والا ہے۔ بھلا دو مذہبوں کی یکجائی کیسے ممکن تھی؟ میری ہی عقل پر پردہ پڑ گیا تھا۔‘

وہ سسکیاں لینے لگا تھا۔ اسی اثناء میں شفقت سے بھرپور ہاتھ اس کے سر پر رک کر اسے چونکا گیا۔ اس نے گرد و پیش کا جائزہ لیا۔ وہ پیرنس کے گھر کے بجائے مسجد میں جانماز پر سجدے میں گرا گڑگڑا رہا تھا۔

وہ سرعت سے بیٹھ گیا۔ مولانا صاحب اس کے قریب ہی بیٹھے تھے۔ چہرے پر ہمدردانہ بکھری ہوئی مسکراہٹ دیکھ کر آصف نے اپنی آنکھوں کو ہتھیلی سے صاف کیا اور عقیدت سے سر جھکا لیا۔

”ناامیدی اور مایوسی کفر ہے۔ مسلمان وہ ہے جو اسلام کے قوانین کی حفاظت کرے۔ تم مسجد میں آئے ہو۔ ولیکم نو آور کلب۔ اس کلب کا مقصد جانتے ہو؟“ وہ

خوش مزاجی سے بولے۔

”جی۔“ اُس نے اثبات میں سر ہلایا۔

”محض پانچ وقت کی نمازوں کی ادائیگی ہی مقصد نہیں۔ اس کلب میں ہم اسلامی نقطہ نظر سے ایک دوسرے کے دکھوں اور غموں کا مداوا کرنے کے لئے اکٹھے ہوتے ہیں۔ بولو، کیا مسئلہ ہے؟“ وہ خود اعتمادی سے بولے۔

لیکن آصف کے پچھتاوؤں اور دکھوں کا پیمانہ اتنا لبریز ہو چکا تھا کہ آنکھوں سے خوف اور وحشت ٹپکنے لگی تھی۔

مولانا صاحب وہاں سے اُٹھے اور اسے ٹھنڈا پانی لا کر دیا۔ وہ غٹا غٹ پی کر قدرے سنبھلا۔ ان کی قوتِ فہم کا کمال تھا اور اندازِ گفتگو کا اثر تھا کہ چہرے پر قدرے بھروسے کی لہر ابھری۔

”بیٹا! ادھر ہی لیٹ جاؤ۔ تھوڑا آرام کرو، پھر اپنا مدعا بیان کرنا۔ یہ اعصابی جنگ اکیلے لڑنے سے یہی حال ہوتا ہے جو تمہارا ہے۔“ انہوں نے اتنے پیار سے کہا کہ اس کی آنکھیں پھر سے اشکبار ہو گئیں۔

”رولو بیٹا!..... جی بھر کر رولو۔ تمہارا من ہلکا ہو جائے گا۔“ وہ اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولے۔ ”بیٹا! جس نے اس فانی دنیا سے دل لگا لیا، وہ کبھی پرسکون نہیں رہتا۔ اس دنیا کی لذتوں اور آسائشوں میں مقید انسان کا انجام بہت عبرت ناک ہوتا ہے۔ اپنے پلے ایک بات باندھ لو۔ جذبہ خدمتِ خلق اور ہر رشتے میں فیئرفیس اسلام ہے۔ لاکھوں نفلی اذکار و عبادات سے بڑھ کر اس کا درجہ ہے۔ اور یہی ہے حقیقی اور سچا سکون دل و روح کا اور ذہن و وجود کے ایک ایک انگ کا نور الہی ہے۔“

”جی!“ وہ سر جھکائے احترام سے بیٹھا تھا۔ دل کا غبار قدرے کم ہوا تھا۔

”آپ کی بے لوث مسکراہٹ، دوسروں کی آزر دگی پر تڑپ اٹھنا اور ان کے درد کو دور کرنے کی کاوش خدمتِ خلق ہی تو ہے۔ نیک نیتی سے زبان سے ادا کیا ہوا ایک لفظ، حسنِ سلوک اور بلند اخلاقیات بھی خدمتِ خلق ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ آپ کروڑوں لگا کر خدمتِ خلق کے زمرے میں شامل ہوں۔ ہمارا مذہب آسان ترین اور انسانی فطرت کے عین مطابق ہے۔“ وہ اس کی کمر پر مسلسل ہاتھ پھیرے جا رہے تھے۔ اُس کا ذہن سکون کی طرف مائل ہو رہا تھا۔

”پچھتاؤں سے چھٹکارا کیسے حاصل کیا جائے؟“ وہ بمشکل بولا۔
 ”کامگر پچولیشن..... آج تمہارے ضمیر پر بے حسی کی جمی ہوئی دھول اور غبار چھٹ گیا۔ تم اللہ تعالیٰ کے نزدیک ہو گئے۔“ وہ مسرت آگیاں لہجے میں بولے۔ اس نے سوالیہ نظروں سے انہیں دیکھا۔

”ہاں۔ ازالہ کرنے کی کوشش کرو۔ اللہ تعالیٰ سے مدد مانگو گے تو غم و مصائب کے گرداب سے چھٹکارا حاصل کر لو گے۔“ وہ اس کی نظروں کا مطلب سمجھتے ہوئے بولے۔

”میرے گناہوں کا لیول بہت ہائی ہے مولانا صاحب!..... شیر کرنا چاہتا ہوں۔ مجھے امید ہے، آپ سے ملی ہوئی گائیڈنس میری زندگی کا رخ بدل دے گی۔ مجھے آپ کی کونسلنگ کی ضرورت ہے۔“ وہ ان کے ہاتھوں کو احتراماً پکڑ کر بولا تو وہ مسکرا دیئے۔

”کیوں نہیں سنوں گا؟ میری نیکیوں میں اضافہ کرنے کا شکریہ۔ بولئے۔“ وہ اس کے سامنے اب آلتی پالتی مار کر بیٹھ گئے۔ انہیں اُس سے فوری طور پر ایسے ردِ عمل کی قطعاً توقع نہ تھی۔ کیونکہ ایک انسان کا دوسرے کے سامنے اپنے گناہوں سے پردہ کشائی چھوٹی بات نہ تھی۔ وہ اس کی روداد سننے لگے اور اس کی سچائی سے امپریس ہوتے چلے گئے۔

بجز اندرونی بازگشت کے وہ خاموش بیٹھ گیا۔ مولانا صاحب سوچ میں ڈوبے ہوئے تھے۔ کیونکہ آئے دن ایسے واقعات سننے میں بھی آتے رہتے تھے اور بہت سے کیس یہ خود بھی اپنی دانش مندی سے ہینڈل کیا کرتے تھے۔ لامتناہی سوچوں سے نکل کر وہ خوشگوار لہجے میں بولے۔

”اعترافِ جرم کے معنی ہیں توبہ استغفار۔ بیٹا! اب تم پر اللہ تعالیٰ کی رحمتوں اور فضل و کرم کا سایہ ہے۔ آج سے تمہارا شمار اللہ تعالیٰ کے پیاروں میں ہونے لگا ہے۔ میں تمہیں معطر پھولوں سے بھرپور راستہ اور روشنیوں سے ہمکنار گنبد کیسے دکھا سکتا ہوں؟ جبکہ تم خود اس کا تعین کر چکے ہو۔ دیکھا جائے تو تم قصور وار نہیں ہو۔ تم جس ماحول میں مقیم ہو، تمہیں وہاں اخلاقیات سے گرے ہوئے کیرئیرز قدم قدم پر ملیں گے۔ جنہیں اقبالِ جرم تو کیا، ہلکا سا اپنے گناہوں کا احساس تک نہیں ہوتا۔ مگر تم ایسے طبقے سے تعلق رکھتے ہو، جنہوں نے اپنی نسل کو ایسی ٹریننگ دی کہ اپنے کلچر کے تقاضے

پورے کرنے میں عار نہ سمجھی۔ ماں کی آغوش کی تمازت اور اس کے دودھ کی سفیدی سے ہی بچے کا من ڈھل کر پوتر ہو جاتا ہے۔ تم شیطان کے گھیراؤ میں تھے، ورنہ انسان خوب ہو۔“

”ایک نیک طینت، خلقت اور نفاست پسند انسان کی زبانی اپنی تعریف سن کر اسے یوں محسوس ہوا جیسے وہ اپنی گم شدہ تمکنت اور مردانہ وقار بحال ہونے کی طرف گامزن ہو رہا ہو۔ لندن کی آزاد فضا اور خود مختار کلچر کا پروردہ آصف، حقیقت پسندی پر مبنی شیریں گفتگو کو سماعتوں میں سما رہا تھا۔ ہلکی مسکراہٹ اور بٹاشت اس کے چہرے پر نمایاں تھی۔ مولانا صاحب اپنی طولانی گفتگو کے اثرات پر خود بھی سرشار نظر آرہے تھے۔ نہایت اپنائیت سے بولے۔

”اُٹھو بیٹا! گھر جاؤ۔ جہاں اسلام کا بول بالا ہے۔ تمہارے سامنے فقط ایک ہی راستہ ہے، کوئی چوائس نہیں ہے تمہارے پاس۔“

”مولانا صاحب! اس احسان مندی اور دلجوئی کا کن الفاظ میں شکریہ ادا کروں؟“

اس کے لہجے میں تشکر آمیزی تھی۔

”شکریہ کس بات کا بیٹے؟ میں نے تم پر احسان نہیں کیا۔ بلکہ تم نے مجھ پر احسان کیا ہے۔ مجھے خدمت کا موقع بخشا۔ اور اس کے اجر میں تم کیا جانو مجھے کیا کچھ ملنے والا ہے۔“ لہجے میں کمال کا سکون و اطمینان تھا۔

وہ اس نعمت کو محسوس کرتا ہوا کھڑا ہو گیا اور ان سے مصافحہ کر کے مسجد کے داخلی دروازے سے باہر نکل گیا۔

’فرشتہ خصلت راہبر، مسیحا اور محسن! میں آپ کو کن کن ناموں سے پکاروں؟‘ وہ گاڑی اشارت کرتے ہوئے بڑبڑایا۔



موبائل پر بیل ہوئی تو وہ چونک کر آنکھیں ملتا ہوا بیٹھ گیا۔ ڈینی ہاسپٹل جانے کے لئے تیار کھڑی تھی۔ اسے حقارت سے دیکھ کر بیک اٹھانے لگی تو آصف نے آگے بڑھ کر بازو پکڑ لیا اور پیار سے دیکھتے ہوئے بولا۔

”ادھر آؤ! بہت حسین لگ رہی ہو۔ تھوڑا لیٹ ہو گئے تو کوئی قیامت نہیں ٹوٹ پڑے گی۔“

ڈینی نے ایک جھٹکے سے بازو چھڑایا اور قہر آلود نظروں سے دیکھ کر باہر نکل گئی۔

آصف حیرت سے اسے جاتے ہوئے دیکھنے لگا۔ کس قدر بد مزاج اور گستاخ عورت ہے۔ اس کا ہر وقت خفا رہنا، غصہ دکھانا ہر روز کا شیوہ بن گیا ہے۔ لگتا ہے اب اس کو سائیکائرسٹ کی ضرورت ہے۔ وہ فکر مندی سے سوچنے لگا۔

اٹھ کر باہر آیا تو وہ بچوں کو ناشتہ کر رہی تھی۔

”تمہیں دیر ہو رہی ہے۔ بچوں کو میں چھوڑ دیتا ہوں۔“ وہ قریب آ کر نرمی سے بولا تو اس نے اسے گھور کر دیکھا اور بچوں کو ناشتہ سے اٹھا کر ان کے بیک اٹھاتی ہوئی باہر نکل گئی۔

وہ غصے سے پاؤں پختا ہوا داش روم کی طرف چلا گیا۔ تیار ہو کر وہ ماں کے گھر کی طرف چل دیا، ایک آخری اور حتمی فیصلے کے ساتھ۔

”ممی! میں آپ کے پاس ہمیشہ کے لئے شفٹ ہونا چاہتا ہوں۔“ وہ تسلی بخش لہجے میں بولا۔

”خیر تو ہے؟“ وہ اس کے سامنے چائے رکھتے ہوئے بولی۔ ”اپنے بچوں میں آباد، خوش و خرم رہو۔ یہی ہماری خوشی ہے بیٹا! یہی ہماری دعا ہے تمہارے لئے۔“

”ممی! اٹ! از امپاسیل۔“ وہ چائے پیتے ہوئے بولا۔

”نہیں بیٹا! ایسا نہیں کہتے۔ بچے ہیں تمہارے۔ تم جانتے ہو کہ بروکن فیملیز کے بچے ہمیشہ ہی نامکمل اور ادھوری شخصیت کے حامل ہوتے ہیں اور اپنی زندگی میں ناکام اور متذبذب۔ آج کے بعد یہ مت سوچنا۔“ وہ خفگی سے بولی۔

”ممی! ڈیجی سے پیدا ہونے والی اولاد آپ کی اور میری نہیں ہوسکتی۔ وہ بہت خود سر اور بد تمیز عورت ہے۔ اسے میری کوئی بات سمجھ نہیں آتی۔ میں جب بھی ابراہیم کو اپنے ساتھ نماز جمعہ کے لئے تیار کرتا ہوں تو گھر میں ایک ہنگامہ کھڑا ہو جاتا ہے۔ جبکہ وہ ہر سنڈے انہیں باقاعدگی سے چرچ لے جاتی ہے، کبھی آپ سے ملنے کی ضرورت محسوس کرتی ہے نہ ہی سیدھے منہ مجھ سے بات کرتی ہے۔ بتائیے، کب تک اسے برداشت کر سکتا ہوں؟ اب میرے صبر کا پیمانہ بھی لبریز ہو گیا ہے۔ میں ایسی عورت کے ساتھ نہیں رہ سکتا۔“ وہ مستحکم لہجے میں بولا۔

”سوچ لو بیٹا!..... بیوی اور گھر تو جائے گا ہی، بچے بھی ہاتھ سے نکل جائیں گے۔“ وہ خوف سے لرز اٹھی تھی۔

”ممی! بچے آج میرے ہیں نہ ہی کل میرے ہوں گے۔ آپ بھی انہیں بھول

جائیں۔ باقی رہی بات ڈینی کی تو میں جانتا ہوں کہ سراسر دنیاوی خسارہ ہمارا ہی ہوگا۔ مُمی! اللہ تعالیٰ بہتری کرے گا۔ مجھے ان دنیاوی، عارضی اور وقتی آسائشات کا قطعاً لالچ نہیں رہا۔ وہ جو لینا چاہتی ہے، حاضر ہے۔ اس کا حق بنتا ہے۔ میں اسے دینی اصول کے مطابق احسن طریقے سے رخصت کروں گا۔ وہ ماں ہے، بچے اس کے دل کا سکون اور آنکھوں کا نور ہیں۔ حالانکہ میں بچوں کو لے کر روپوش ہو سکتا ہوں، انہیں انڈین نیشنلسٹی دلا کر وہاں سیٹل کر سکتا ہوں۔ لیکن میں ایسا نہیں کروں گا۔ یہ زیادتی اور ظلم جہاں اسے گھائل کرے گا، وہاں میں بھی سر تا پا زخموں سے شرابور ہو جاؤں گا۔ مُمی! ہمارے مذہب نے تمام مشکلات میں آسانیاں پیدا کی ہیں۔“ وہ نہایت طمانیت بھرے لہجے میں بول رہا تھا۔

”تمہاری باتیں سن کر میرا دل بیٹھا جا رہا ہے۔“ وہ سینے پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ گئی۔
 ”اتنی بڑی تبدیلی کیسے؟ ہم اپنی اولاد نہیں چھوڑیں گے آصف!“
 ”مُمی! حوصلہ اور ہمت، اولاد ماں سے ہی لیتی ہے۔ مجھے اس کی اس وقت اشد ضرورت ہے۔“ وہ ماں کا سر سینے سے لگا کر بولا۔ اتنے میں پایا کمرے سے باہر نکل آئے۔

”ارے یہ صبح سویرے رونا دھونا کیسا؟“
 ”مُمی! تمام پجوشن پایا کو بتا دیجئے گا۔ مجھے ہاسپٹل سے دیر ہو رہی ہے۔ اور پایا کو میرا صبر و تحمل کا دامن تھا۔ نہایت سوچ بچار سے کیا ہوا فیصلہ بھی سنا دیجئے گا۔“ وہ ناشتے کی ٹیبل سے اٹھ گیا۔
 ”میں خود تم سے بات کرنا چاہ رہا تھا۔“ وہ قریب آ کر بولے۔ ”میری طبیعت درست نہیں رہتی۔“

”اس وقت نہیں پایا!“ وہ گھڑی کی طرف دیکھ کر بولا۔ ”سی یو لیٹر پایا! بائے۔“
 آئی ایم گیٹنگ لیٹ۔ آپ کی صحت کے بارے میں شام کو تفصیلاً گفتگو ہوگی۔ ذرا تمام رپورٹیں نکال کر تیار رکھیں۔ کل صبح آپ کے تمام چیک اپس کروائے دیتا ہوں۔“ یہ کہہ کر وہ باہر نکل گیا۔

ماں کی آنکھیں ابھی تک بھیگی ہوئی تھیں۔
 ”سوئی! کچھ بتاؤ گی کہ روتی ہی جاؤ گی؟“ پایا پیار سے بیگم کے قریب ڈانگ چیر پر بیٹھ گئے۔

”اللہ نے ایک ہی بیٹا دیا تھا۔ مگر افسوس کہ وہ بھی اچھے نصیبوں والا نہ نکلا۔“ وہ آنسو صاف کرتے ہوئے بولی۔

”ناشکری مت کرو۔ ذرا سوچو کہ ہمارے خاندان کا کون سا بچہ اس جیسی پوش لائف گزار رہا ہے؟ اسے حسرت سے دیکھتے ہیں سب۔ اور جنابہ محترمہ فرماتی ہیں کہ بد نصیب ہے۔ توبہ کرو اور اللہ سے معافی مانگو۔“ وہ الجھ کر بولے۔

”کیا آپ کو اس کی یہ لائف بہتر لگتی ہے؟..... مجھے کیا سمجھانا چاہتے ہیں؟ پیسہ ہی دین و ایمان نہیں ہوتا، میاں بیوی کا اتفاق اصلی دوست ہے۔ مگر حسبِ عادت آپ میری کسی بات پر دھیان ہی نہیں دیں گے۔“ وہ سینے کو مسلتے ہوئے بولی۔ ”آج تو جیسے نوک دار کا ٹاٹا ہی دل کے آر پار ہو گیا ہے۔“

”اچھے بھلے ایک ساتھ رہ رہے ہیں۔ اب تم کیا چاہتی ہو کہ انڈین بہو کی طرح تمہاری ہر وقت مٹھی چالی کرے؟ اب تو وہ زمانہ ہے کہ اپنے خاندان سے لائی ہوئی بہو بھی ہمیں گھاس نہیں ڈالے گی۔ آج بچیاں پڑھ لکھ کر میاں کے ساتھ کھڑی ہیں۔ ان لی دوہری ڈیوٹی ہے کہ گھر بھی سنبھالو، بچے بھی پالو۔ ان کی مہربانی ہے بھی۔ تم نہ جانے کیا ڈیمانڈ کرتی ہو اس سے۔ یہ تو ہے بھی فرنگیوں کی اولاد۔“ وہ نرمی سے سمجھانے کی کوشش کر رہے تھے۔

”اس کی چٹی چمڑی ہی تو باپ بیٹے کو بھاگئی۔ اگر آپ پہلے میرا ساتھ دیتے تو میں دیکھتی کہ وہ میری بہو بن کر اس گھر میں کیسے تشریف لائی۔ قصور آپ کا ہے۔ اب جھگڑیں جو ہونے والا ہے۔“ وہ تلخ لہجے میں بولی اور ٹیبل سے برتن اٹھانے لگی۔

”کیا ہونے والا ہے؟ آسمان گرنے والا ہے کیا؟ یا آتش فشاں پہاڑ پھٹنے والا ہے؟“ وہ گرج کر بولے۔ ”انڈین ساس مت بنو۔“

”آپ کے بیٹے کا گھر اجڑنے والا ہے۔ کیا یہ ناگہانی آفات سے کم توڑ پھوڑ ہے؟ ہماری نسل فرنگیوں سے اٹھے گی۔ بے دین اور پلید۔ سب آپ کی نرم مزاجی کے نتائج ہیں۔ آئے عقل مند اور دور اندیش کہیں کے۔“ وہ بھی چیخ کر بول رہی تھی۔ مگر مارے نقاہت کے سانس پھول گیا اور وہ سینے پر ہاتھ رکھ کر کرسی پر بیٹھ گئی۔

”سوئی! کیا ہو گیا ہے؟ پانی پیو۔“ وہ جلدی سے گلاس اس کے لبوں کو لگا کر ہانپتے ہوئے بولے۔ وہ بھی تیزی اور غصے میں چکرانے لگے تھے۔

”آپ فکر نہ کریں۔“ وہ بمشکل بولی۔ کیونکہ میاں تو تھے ہی ہارٹ پیڈنٹ۔ وہ

بھی قریبی کرسی پر بیٹھ کر پانی پینے لگے۔ مگر جونہی گلاس ٹیبل پر رکھا، ساتھ ہی کرسی سے لڑھک کر فرش پر گر گئے۔

اُن کی سوئی ہمت کر کے لڑکھڑاتی ہوئی اُٹھی اور فون ڈھونڈتی ہوئی واپس میاں کے پاس پہنچی۔ ان کے سانس کی آواز کمرے میں منتشر ہو رہی تھی۔ یہ موت کی آواز تھی۔ بے ہنگم، زنگ آلود اور ڈراؤنی۔ وہ ان پر جھک کر بولی۔

”آنکھیں کھولئے۔ آپ کی سوئی سدا سہاگن رہنا چاہتی ہے۔“
جواب نہ پا کر وہ چکر اُٹھی اور انہی کے قریب ڈھلے غمی اور منہ سے جھاگ نکلنے لگی۔

آہ..... کبھی کبھار ایک معمولی سی جھڑپ، ذرا سی بحث تباہ کاریوں کا سبب بن جاتی ہے۔ اور کئی بار مار دھاڑ سے بھی فرق نہیں پڑتا۔
آج ضعیف العمری نے ان کو شکنجے میں جکڑ کر تمام کلفتوں اور آزمائشوں سے نجات دلا دی تھی۔ اور وہ آنے والے ہولناک وقت کی خوفناک چیخ و پکار سے دُور، بہت دُور خالقِ حقیقی سے جا ملے تھے۔

باہر ہوا میں جھومتے ہوئے خزاں رسیدہ درختوں سے سوکھے پتوں کی بارش اور سڑک پر اڑتے ہوئے پتوں کی چرچہاٹ موت کا سماں پیش کر رہی تھی۔ ماحول میں پھیلکی ہوئی غیریت، نفسا نفسی اور اجنبیت اپنے ہونے کا احساس دلا رہی تھی۔ نالہ و فغاں اور ماتم کناں درو دیوار نے انہیں اپنے حصار میں لے لیا تھا۔ اس دیارِ غیر میں اپنوں سے دُور وہ لاچار و بے بس، لاوارثوں کی طرح اوندھے منہ پڑے تھے۔ شاید بروقت طبی امداد مل جانے پر سر وایو کر جاتے۔ مگر نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی قسموں کو مان لیا تھا۔ عہد و پیمان کی لاج رکھ لی تھی۔ ساتھ جنیں گے، ساتھ مریں گے، جسے مذاق ہی کہا جاتا ہے، آج باری تعالیٰ نے اس پر سچائی کی مہر لگا کر انہیں سرخروئی سے نوازا تھا۔

پیدائش اک تحفہ ہے۔ زندگی آزمائش اور امتحان کا نام ہے اور موت اک انعام ہے ان لوگوں کے لئے، جنہوں نے اس دار فانی سے جانے کے تمام انتظامات کر لئے ہوں۔ اگلی دنیا کے مفادات و تحفظات کی خاطر فیئر لائف گزاری ہو۔ کسی کے بارے میں فیصلہ کرنے والے کہ یہ جہنمی ہے اور فلاں جنتی ہے، ہم کون ہیں؟ حج کرنے والا

وہ ہے۔ ہماری Judgemental پاور ہماری کمزوری اور خامی کی غمازی کرتی ہے۔



دونوں گھرانے اسٹیٹس کے لحاظ سے ایک دوسرے سے خاصی مطابقت رکھتے تھے۔ جبکہ رسم و رواج اور لیوگ اسٹائل میں فرق نمایاں نظر آتا تھا۔ کیونکہ ملک گلزار پنجابی فیملی کے پروردہ اور انہی اصولوں پر کاربند تھے اور ٹکلیل رانا کا تعلق لکھنؤ سے تھا۔ اس خاندان نے اپنے لکھنؤ کے کلچر کی یاد میں گھر کا سیٹ اپ، اٹھنا بیٹھنا، زبان و پہناوا اسی طرز پر رکھنے کو اذیت دی تھی۔

ملک صاحب کی بیگم شازیہ کم تعلیم یافتہ ہونے کے باوجود طرز رہائش اور میل جول میں خوب تھی۔ مختصر اور صاف ستھری سی اولاد اس کا جیتا جاگتا ثبوت تھی۔ عموماً کہا کرتی تھی، ایک آنکھ شیریں اور دوسری آنکھ خرم۔ دونوں بڑی قیمتی ہیں۔ اللہ سلامت رکھے ان کا نور کہ دنیا کا حسن دیکھوں۔

رانا صاحب کی بیگم ثروت آرا بھی تعلیمی میدان میں کافی پیچھے تو تھیں مگر ہر وقت لکھنؤ کی تعلیم کا پرچار کرتے ہوئے خود کو بہت تعلیم یافتہ گردانا کرتی تھیں۔ ان کا پان دان پرس کی طرح ان کے ساتھ ساتھ ہوتا۔ لٹھے کا غرارہ اور اوپر پرغذ میض اور شیغون کے دوپٹے میں دھان پان سی کسی گڑیا کی مانند لگتیں۔ لمبے بالوں کا جوڑا جب کھلتا تو رانا صاحب آہستہ سے چھیڑے بنا نہ رہتے۔ اری حسینہ عالم! بال سمیٹو۔ ورنہ اس کالی گھٹا میں راستہ بھٹائی نہ دے گا۔

ان کے چار بچے تھے۔ ابھی تو چار عدد اور بھی تشریف فرما ہو چکے ہوتے اگر ثروت نے شور شرابا نہ ڈالا ہوتا۔ ان کے تین بیٹے ہمایوں، جہانگیر اور ہارون تھے۔ امرت ناز و نعم میں پل کر ان کے لئے ہمیشہ آبِ حیات کا رول پلے کرتی رہی۔

دونوں گھرانوں میں وقت ساتھ ساتھ گزارنے کی وجہ سے آپس کے تعلقات میں ایسا توازن قائم ہوا تھا کہ ان کی بے نظیر محبت اور بے لوث لگن کی مثال دی جاتی تھی۔ بچے ایک ساتھ کھیل کود کر جوان ہوئے تھے۔ سکول سے لے کر یونیورسٹی تک کا تعلق و ربط انہیں ہر وقت شاداں و فرحاں رکھا کرتا تھا۔ بچے، عورتیں اور بزرگ ایک دوسرے کی قربت میں خود کو خاصا سٹرونگ سمجھا کرتے تھے۔ ایک دوسرے کے دکھ اور سکھ کے رازداں، خانگی مسائل اور پریشانیوں میں محسن اور ہمدرد، ہمیشہ خوشی سے ایک خون اور ایک خاندان کا دعویٰ کیا کرتے تھے۔

اس انٹ دوستی اور یگانگت میں کسی نے رشتوں کے رد و بدل کی موہوم سی سوچ کو ابھرنے ہی نہ دیا۔ مانوسیت اور اپنائیت کا پیمانہ اتنا وسیع اور گہرا ہونے کے باوجود بچوں کی طرف سے کبھی اشارتاً باہمی انٹرسٹ کا اظہار نہ ہوا تھا۔ اسی لئے تو دونوں گھرانوں میں گردش کرنے والی یہ خبر حیران کن تھی کہ ہارون نے شیریں سے شادی کرنے کا پُرپوزل بھیجا تھا۔

ہارون کے والد رانا صاحب نے جب اپنے بیٹے کے منہ سے شیریں سے پسندیدگی کا اظہار سنا تو وہ خوش ہوئے مگر دوستی اور یارانے کے رکھ رکھاؤ اور لحاظ میں کچھ کہہ نہ پا رہے تھے۔ ان کے جذبات کی قدر و منزلت کا پاس رکھتے ہوئے کہ وہ نسلوں سے رشتے اپنی ہی ذات برادری میں کرنے کو اولیت دیتے آئے تھے۔ انکار و اعتراض کی صورت میں کہیں دلوں میں میل آنے سے مدتوں کی دوستی داغ دار نہ ہو جائے۔ اسی خدشے کی وجہ سے بات چلنا مشکل ہو گئی تھی۔

ادھر ہارون اور شیریں کا عشق عروج پر تھا۔ ایک ساتھ جینے مرنے کے وعدے و وعید سرگرم عمل تھے۔ دو جوان مخالف جنس میں محبت و عشق کا ایک دم رونما ہو جانا کوئی انہوتا حادثہ تو نہیں تھا۔ ہارون اور شیریں کی دن رات کی ملاقاتوں نے جس چاہت کا بیج ان کے دلوں میں بو دیا تھا، وہ غیر ارادی طور پر چپکے سے کوئلیں نکالنے لگا تھا۔ یہی وجہ تھی، اب سب کے درمیان مل کر بیٹھنا سخت ناگوار گزرنے لگا۔ خرم سے گہری دوستی اور شطرنج کی بازیوں کا مزا کر کر اسسا ہو گیا۔ اور گھر سے باہر ملاقاتوں کا سلسلہ چل نکلا۔ وہ کالج کی پارکنگ میں اپنی کلاس فیلوز کے ہمراہ کھڑی دین کا انتظار کر رہی تھی کہ ہارون کی بایک گیٹ سے اندر داخل ہوئی تو سب نے ایک دوسرے کو دیکھ کر آنکھ ماری اور ان کی شریر مسکراہٹ کو نظر انداز کرتے ہوئے شیریں بایک پر اس سے چپک کر بیٹھی اور یہ جاوہ جا ہو گئی۔ انہیں دور تک سب کے قہقہے اور نعرے بازی مظلوظ کرتی چلی گئی۔

جب ہارون فردر یعنی اعلیٰ ایجوکیشن کے حصول کی خاطر انگلینڈ چلا گیا تو شیریں کئی دن تک سنبھل نہ سکی۔ ملک صاحب نے شازیہ سے خدشات کا اظہار کرتے ہوئے پوچھا۔

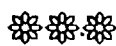
”ہارون کے جانے پر شیریں اس قدر اُداس اور غمگین کیوں ہے؟“

شازیہ تڑپ کر رہ گئی۔ اپنی بیٹی سے ایسی توقع ہرگز نہ تھی۔ اچھی تربیت میں کی

تھی، نہ ہی گھر کے ماحول میں مغربی تہذیب کے اصولوں کی جھلک تھی۔ یہ پیار و محبت اور وہ بھی اس لڑکے سے جو اس گھر میں بیٹوں کی طرح آتا تھا، جس کا بھائیوں جیسا سلوک اور رکھ رکھاؤ تھا۔ اور پھر سب سے بڑا اعتراض یہ کہ شیریں لکھنؤ والوں کی بہو کیونکر بنتی۔ اپنے خاندان میں بیسیوں رشتے اس کے لئے تیار کھڑے تھے۔ اس کی تعلیم کی وجہ سے وہ کسی کوانٹرٹین کرنے کے حق میں ہرگز نہ تھے۔

دوسری طرف لکھنؤ خاندان والے اپنی بہو پنجابی فیملی سے لانے کے لئے تیار نہ تھے۔ مگر بیٹے کے اصرار اور ضد پر رانا صاحب نے حامی بھری کہ لڑکی شریف والدین کی اولاد ہونے کے ساتھ ڈاکٹر بھی ہے۔ شکل و صورت بھی قابل قبول ہے۔ اور سب سے بڑی بات کہ ایک محلے میں دونوں گھرانے اور اسٹراٹنگ ہو جائیں گے۔ یارا نہ اور بھی مضبوط ہو جائے گا۔

جب خرم نے سنا تو وہ کھل اٹھا۔ کیونکہ خرم اور شیریں کا والہانہ لگاؤ اور پیار ایسا تھا کہ انہوں نے زندگی میں ایک دوسرے کے بغیر جینے کا تصور بھی نہ کیا تھا۔ شیریں کی شادی کے لئے ایسے لڑکے کی جستجو تھی جو ان کا گھر داماد بن کر رہ سکے۔ اس رشتے میں یہ مسئلہ حل ہوتا نظر آ رہا تھا۔ کیونکہ ایک ہی شہر اور ایک ہی محلے میں شیریں کی قربت بھی رہے گی۔ اور ہارون چونکہ خرم کا جگہری یار بھی تھا، بہنوئی کے رشتے میں ہزار بار قابل قبول تھا۔ یہ تو تھا بہن بھائی کا ایسا پیار کہ عموماً دونوں کہا کرتے تھے کہ ہم شادی نہیں کریں گے۔ اس سے درمیان میں ناقابل عبور حدیں بتدریج بڑھتی چلی جاتی ہیں۔ اپنی اپنی فیملی لائف میں گن ہو کر ایک دوسرے سے دور ہونے سے بہتر ہے کہ شادی ہی نہ کریں۔ جب والدین دونوں کی کلاس لیتے تو آخری اور حتمی فیصلہ یہ ہوتا کہ گھر داماد ڈھونڈ جائے۔ خرم کی ایک ہی رٹ اور ایک ہی ضد ہوتی۔ آج وہ بہت خوش تھا۔ شیریں کے من میں لڈو تو پھوٹ ہی رہے تھے، بھائی کے قریب رہنے کے احساس نے اسے اور نہال کر دیا۔ اور بھائی اس رشتے کا بہت اہم اور اسٹراٹنگ ووٹ بن گیا۔



ہارون اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے چلا گیا۔ شیریں اُداس تو تھی ہی، لیکن اُمید و بیم میں کبھی مطمئن اور کبھی بے چین ہو جاتی۔ ان کی دُوری کو انٹر میٹ نے قدرے دُور کر دیا تھا۔ دونوں ایک دوسرے سے دُور ہونے کے باوجود بہت قریب تھے۔

دونوں گھروں کے اندر کچھڑی پک رہی تھی لیکن اڑوس پڑوس اور دونوں خاندانوں میں کسی کو خبر نہ تھی۔ حتیٰ کہ بچوں سے بھی اس موضوع پر بات نہ ہوتی۔ دونوں کو گپ شپ، بحث مباحثے اور چوری چھپے کی ملاقاتیں اور قربت کے پُدمسرت اور کیف آگئیں لمحات کی یادستانے لگی تھیں۔ ایک تو مغربی ماحول کی جان لیوا تنہائی کے بھی اثرات تھے کہ اپنے لوگ خوابوں میں ہی بسے رہتے ہیں۔

انٹرنیٹ پر فارغ اوقات میں دونوں کا آزادانہ رابطہ ضرور ہوتا۔ شیریں لڑکی ہونے کے ناطے اپنی کمزوری کو بھلا کیسے پوشیدہ رکھ سکتی تھی۔ ہر بار خدا حافظ کہتے ہی اُس کی آواز بھڑا جاتی۔ ہارون اُسے چھیڑتا ہوا غائب ہو جاتا تھا۔

ہارون ہارَ ایجوکیشن کمپلیٹ کرنے کے بعد واپس اپنے ملک آ گیا۔ شیریں نے بھی ایم بی بی ایس کے بعد ہاؤس جاب شروع کر دی تھی۔ دونوں گھرانے ہارون کی واپسی پر جھوم اٹھے تھے۔ ہر شام سب ایک گھر میں اکٹھے ہو جاتے۔ بزرگ حضرات اپنے ماضی کے تجربات اور آپ بیتی، حالیہ بیماریاں اور سیاست اور مستقبل کے منصوبے اور اندیشے ڈسکس کرتے۔ خواتین کی مخصوص گفتگو میں ملازمین کی چالاکیاں اور اڑوس پڑوس کے مسائل زیر بحث آتے۔ یوتھ کی اپنی ہی ٹائپ کی بات چیت جاری ہوتی۔ گیمز چلتیں، ہار جیت پر ہنگامے ہوتے۔

انہی رونقوں کے ہمراہ دونوں کی دعائے خیر ہوئی اور ساتھ ہی شادی کی ڈیٹ فکس ہو گئی۔

حاسد رشتے داروں نے خوب مزے لے لے کر من گھڑت کہانیوں کو ہوا دی۔ مگر کسی کی شکایت اور اعتراض کی پروا نہ کرتے ہوئے دو خاندانوں کی بچوں کی وساطت سے یکجائی ہو گئی۔ ہارون اور شیریں اپنی محبت و عشق کی کامیابی پر جھوم اٹھے تھے۔ کیونکہ کسی طرف مشکل آڑے نہ آئی تھی۔

ارپ خرم کی شادی کا مسئلہ سر اُبھارنے لگا۔ ماں دن میں بیسیوں گھروں کی مہمان بنتی رہی مگر تاک پر کچھ بیٹھ نہ رہا تھا۔ سرجن بیٹے کے لئے وہ لہبا تھ مارنے کی جستجو میں تھی۔ مگر خرم نے اپنی پسندانہ گوش گزار کر کے گھر کی فضا کو سوغوار بنا دیا تھا۔ شیریں اور ہارون بھی سمجھا کر خاموش ہو گئے تھے۔ والدین نے بھی منٹیں، دھمکیاں اور راتوں کی نیندیں حرام کر لیں مگر خرم اپنی جگہ سے ایک انچ نہ سرکا تھا۔

”میں اس ناگن کو دیکھنا چاہتی ہوں، جس نے ہم سب کو ڈس لیا۔ ہمارے گھر

کے سکون کو نکل گئی۔ بیٹے کے دل سے والدین کے پیار اور تقدس اور ہڑپ کر گئی۔ ایسی اسپیشلسٹی والی لڑکی میرے گھر کی بہو کیسے بن سکتی ہے؟“ ماں چیخ رہی تھی۔ مگر والد صاحب، بیٹے کی ہٹ دھرمی اور ضد کا اندازہ لگا کر قدرے ڈھیلے پڑ چکے تھے۔ بیگم کو رازداری سے سمجھاتے ہوئے بولے۔

”شازی! ایک بات یاد رکھو۔ چھوٹے گھروں سے لائی ہوئی بہو جہیز میں بے پناہ خدمتیں لاتی ہے۔ اس کی غلامانہ ذہنیت کے بل بوتے پر خوب عیش کرنا۔ تمہاری طبیعت بھی خراب رہنے لگی ہے۔ ویسے میں نے نوٹ کیا ہے کہ جب سے گھر میں دولت کی فراوانی ہوئی ہے، تمہیں بیگمات کی پسندیدہ تمام بیماریاں لاحق ہو گئی ہیں۔“ وہ چھیڑتے ہوئے ماحول کو خوشگوار بنانے کی کوشش کرنے لگے۔

”آپ کی کمائی نے تو دال روٹی ہی بخشی۔ فخر کس بات کا ہے؟ یہ سارے خرے تو بیٹے نے اٹھائے ہیں۔“ وہ سختی سے بولی۔

”آف!..... تم نے مل بھر میں میرا پیار و محبت اور چاؤ چو نچلے مٹی میں ملا دیئے۔ جہنم تم جیسی بیویوں سے ہی تو بھرے گی۔“ وہ ہنستے ہوئے بولے۔

”سن لیں کان کھول کر۔ کسی منسٹر کی بیٹی نہ لائی تو ماں کہلانے کے قابل نہیں۔ اس لئے مجھ پر آپ لوگوں کی نرمی اور سختی قطعاً کام نہیں کرے گی۔“ وہ ان کی طرف تنقیدی نظروں سے دیکھنے لگی۔

”میں بھی آپ کو بتائے دیتا ہوں! ماما! شادی میری پسند سے ہو گی۔ یہ میرا حق بنتا ہے۔ ضدی ماں کا ضدی بیٹا آپ کے سامنے جھولی پھیلائے بیٹھا ہے۔“ وہ ماں کو بوسہ دیتے ہوئے بولا۔

”ایک بار اپنی ہونے والی بہو کے دیدار تو کر لو۔ ہو سکتا ہے تمہارے دل میں نرمی آ ہی جائے۔“ والد خوشگوار لہجے میں بولے۔

”بھئی شکل و صورت ہی ہر شے نہیں ہوتی۔ اسٹیش ہونا لازم ہے۔ آپ دونوں کو تو کسی باؤ لے کتے نے کاٹ لیا ہے کہ میری بات سمجھنے سے قاصر ہیں۔“ وہ غصے سے بولی اور اٹھ کر چلی گئی۔



خرم نے گنگناتے ہوئے خود پر ”پولو“ کا اسپرے کیا، ٹائی کی گرہ کو دوسرا قد آدم آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر خود کا جائزہ لینے لگا۔ اس کی پسندیدہ لا

کھر کی شرٹ، اسی کی پسند کے پرفوم میں نہایا ہوا خرم لمبے لمبے قدم بھرتا ہوا لاؤنچ میں آگیا تو ماں نے غصگی سے دیکھا اور منہ دوسری طرف پھیر لیا۔

”ماما! آج آپ تیار رہنے گا۔ آپ کو سیزن کی شاپنگ کرانا چاہتا ہوں۔ ماں بیٹا اس کے بعد دُزر بھی باہر ہی کریں گے۔“ وہ خوشامدی لہجے میں بولا۔

”جب سے لڑکی کے چکر میں پڑے ہو، تمہارے اخراجات میں بے تحاشا اضافہ ہو گیا ہے۔ مجھے شاپنگ کرانے کی تمہاری جیب اجازت نہیں دے گی اب۔“ وہ تنک کر بولی تو وہ قریب آگیا۔

”ماما! فار گاڈ سیک۔ دل دکھانے والی باتیں تو نہ کریں۔ وہ لڑکی غریب سہی، مگر غیرت کا جواب نہیں۔ آج تک ایک پائی جو اس پر خرچ کی ہو۔“ وہ روتھ گیا۔

”میرا مطلب یہ تو نہ تھا۔ ہاں، تمہارے پرفوم کا خرچ بڑھ گیا ہے۔ بڑے ہی افسوس کی بات ہے۔“ وہ آہستگی سے بولی۔ ”لگتا ہے یہ پرفوم اس کی پسند کا ہوگا، جو گھر بھر میں بارش ہو رہی ہے۔“

”آپ نے درست سوچا ہے ماما! آپ یقین کر لیں کہ آئی تو ہر۔ اور شادی کروں گا تو اسی سے۔ ورنہ بیٹلر ہی مر جاؤں گا۔ یعنی کنوارہ رہوں گا زندگی بھر۔ سمجھ جائیں ماما! مجھے وہ بہت پسند ہے۔“

”سب کہنے کی باتیں ہیں۔ نہ تم کنوارے رہو گے، نہ وہ جڑیل کنواری رہے گی۔ لیکن شریک حیات دونوں کے مختلف ہوں گے۔“ وہ غصے سے بولی۔ ”آج کے بعد اس منحوس کا ذکر میرے گھر میں نہیں ہونا چاہئے۔ اس نے کیسی دیدہ دلیری، بے باکی اور بدتمیزی تمہارے اندر بھر دی ہے۔ تم ایسے تو ہرگز نہ تھے۔ شیریں تو کیا، خاندان بھر کی لڑکیوں سے پٹ کر گھر آیا کرتے تھے۔ اب دیکھو، ماں اور بہن کے سامنے زبان درازی۔“

”ماما! میں بڑا ہو گیا ہوں۔ اب مجھے کوئی ہاتھ تو لگا کر دیکھے، مزہ چکھا دوں گا۔ عجیب ہی باتیں کرتی ہیں آپ۔“ وہ ناراضگی سے بولا۔

”تم اب بیوی سے پٹو گے۔ یہ ساری نافرمانیاں اور دھاندلیاں صرف میرے ساتھ چلتی ہیں تمہاری۔ آنے دو بیوی کو۔ ایسا رعب و داب دکھائے گی کہ بولتی بند ہو جائے گی تمہاری۔“ وہ اسے تاؤ دلانے کے انداز میں بولی تو وہ بے اختیار سا ہو کر بولا۔

”یہ ٹھیک رہی۔ سب کے رعب، ناز و انداز دیکھنے کو میں ہی تو رہ گیا ہوں۔
اسے دو دن میں چلتا کروں گا۔“



”حدیقہ! مجھ سے کوئی راز چھپانے کی کوشش مت کرنا۔ صبح اور سچ جواب دیتا۔“
صدیقہ نے حدیقہ کو طویل فون کے بعد اسے اپنی طرف آنے کا اشارہ کیا۔ اس
نے فون بند کیا اور کمرے میں آگئی۔

”بولو! یہ لمبی فون کالز، تمہارا بننا سنو رتا، اکیلے میں مسکرا دیتا۔ اس کے پیچھے کون
ہے؟ میں جاننا چاہوں گی۔“ وہ رازداری سے پوچھنے لگی۔

”ماما! میری فرینڈ ہے۔ اور کون ہو سکتا ہے؟ آپ بھی وہی ہو گئی ہیں۔“ وہ
ٹالتے ہوئے اس سے آنکھیں ملائے بغیر بولی۔

”میری طرف دیکھو۔ اگر کوئی پسند آ گیا ہے تو مجھے کھل کر بتا دو۔ اگر ممکن ہوا اور
مجھے مناسب لگا تو تمہاری شادی اسی سے کر دوں گی۔ تم جوان بھی ہو اور برسر روزگار
بھی ہو۔ اس میں کوئی قباحت نہیں۔“ وہ پیار سے بولی تو وہ خاموشی سے اس کی طرف
دیکھنے لگی۔

”تمہیں یقین نہیں آ رہا میری بات پر؟“ وہ حیرت سے بولی۔
”ماما! پلیز ڈونٹ ڈسٹرب می۔ ایسی کوئی بات ہی نہیں۔“ وہ الجھ کر بولی۔ ”زندگی
میں اور بھی بے شمار دکھ ہیں ماما! محبت کا غم کیونکر پال لوں؟“

”تمہاری آنکھوں میں فریب اور لبوں پر جھوٹ ہے حدیقہ! مجھے بتاؤ کہ وہ کون
ہے؟ میں تمہاری شادی کرانے کو تیار ہوں۔ مجھ سے ڈر اور خوف میں کہیں غلط قدم نہ
اٹھالینا۔“ وہ لرزش زدہ آواز میں بولی۔

”ماما! آپ کو بتائے بغیر نہ تو اس سے نکاح کروں گی، نہ ہی اس کے ساتھ فرار
ہو کر دوسرے شہر جا کر چھپ بیٹھوں گی۔ آپ بے فکر رہیں۔“

وہ طنز کے نشتر چلا رہی تھی۔ صدیقہ چونک گئی۔ عینک درست کر کے اسے غور سے
دیکھنے لگی۔ اتنی بڑی بات اس نے کتنی آسانی سے کہہ دی تھی۔ اور یہ بھید تو مدتوں سے
دبا ہوا تھا۔ اسے ہوا کس نے دی؟ کون ہے ہم دونوں کا دشمن جس نے ہمیں ایک
دوسرے کے سامنے برہنہ کر دیا ہے۔

”آپ کو میری بات سن کر سکتے کیوں ہو گیا ہے؟ آپ یقین جانے، میں اتنی

مضبوط اور مستحکم ہوں کہ آپ کو دھوکا دوں گی، نہ ہی غلط بیانی سے کام لوں گی۔ بے شک بیٹی آپ کی ہی ہوں۔ ماما! مجھے کسی سے پیار ہو گیا ہے۔ اور ہم دونوں شادی کرنا چاہتے ہیں۔“

”والدین کی مرضی اور مشورے کے بغیر؟“ وہ اچنبھے سے بولی۔
 ”ہرگز نہیں۔“ وہ اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولی۔ ”پیار جرم نہیں۔
 دیوانگی اور پاگل پن گناہ ہے ماما!“ وہ پھر طفر سے بولی۔
 ”تم مجھے کیا سمجھانا چاہتی ہو؟ کل کر بولو۔ ماسٹڈ نہیں کروں گی۔ تمہاری دوست اور تمہاری ہمدرد ہوں۔“ وہ بخل سی ہو کر بولی۔

”ہمدرد تو ہیں، اس کا پورا یقین ہے۔ لیکن دوست تو کبھی تھیں، نہ کبھی ہوں گی۔“
 وہ تلخی سے بولی۔ ”لیکن پھر بھی ناجائز قدم اٹھا کر آپ کو سب کے سامنے نام نہیں ہونے دوں گی۔“

”ایک ہی بات کو بار بار دہرانے کا فائدہ؟ مجھے یہ بتاؤ کہ تم نے میرے بارے میں کس سے کیا کچھ سنا ہے؟ سب سراسر غلط بھی تو ہو سکتا ہے۔“ وہ جلع دل سے بولی۔ ”میں تو آستین میں ناگن پالتی رہی، جو مجھے ہی ڈسنے کو تیار کھڑی ہے۔ تم نے ایک دفعہ مجھے کہا تھا کہ مجھے کٹر میں پھینک دیا ہوتا۔ آج مجھے تمہاری بات سے اتفاق ہونے لگا ہے۔“

”آپ کے بارے میں، میں نے آپ کی زبانی بچپن ہی میں سن لیا تھا ماما! آپ مجھے اپنا سمجھتیں تو مجھ سے اپنے درد، غم اور پچھتاوے شیر کر لیتیں۔ ہم ایک دوسرے کی دوست ہیں نہ ہی کسی اور پیارے رشتے میں منسلک ہیں۔ دوسرے خبر جو بحالتِ مجبوری ایک ہی چھت کے نیچے رہ رہے ہیں۔“ وہ دکھی سی ہو گئی تھی۔

”بس کرو یہ طعنے تشنہ۔ میں نے تم سے حقیقت چھپا کر کوئی غلطی یا زیادتی نہیں کی۔ مصلحت اسی میں تھی۔“ وہ زور سے بولی۔

”ماما! ایسی ناگہانی آفت چھپائے نہیں چھپتی۔ آپ کیا سمجھتی ہیں کہ یہاں سب بے وقوف اور نادان لوگ بستے ہیں؟“ وہ سنجیدگی سے بولی۔

”بیٹا! جانتی ہوں سب۔ بس دنیا والوں سے منہ چھپائے بیٹھی ہوں۔ ایک غلطی نے میری زندگی کو داغ دار تو کر دیا، دعا کرتی ہوں کہ کہیں اس کا خمیازہ تمہیں نہ بھگتنا پڑے۔“ اس کی آواز بھرا گئی۔

”اسی لئے تو میں نے اپنے لئے جیون ساتھی ڈھونڈ لیا ہے۔ کیونکہ آپ کی Repute پر میرا رشتہ تو ہونے سے رہا۔ میں آپ جیسی پڑمردہ اور حسرت و یاس سے بھرپور زندگی نہیں گزار سکتی۔“ وہ دُکھی لہجے میں بولی۔

”اللہ نہ کرے کہ تمہارے نصیب میرے جیسے ہوں۔ یہ میری غلطی کے اثرات ہی تو ہیں کہ تم ڈاکٹر نہ بن سکی۔“ وہ غم آنکھوں کو صاف کرتے ہوئے بولی۔

”اس کے علاوہ بھی تو میں ان گنت پیچ و خم کی آماجگاہ کی باسی رہی ہوں۔“ آواز رقت آمیز تھی۔

”یہ تو بتاؤ بیٹی! وہ ذات شریف کون ہے اور کہاں سے ملا؟“ وہ رندھی ہوئی آواز میں بولی۔

”ماما! ڈاکٹر خرم نام ہے ان کا۔ میں ان کے ساتھ ہی کام کرتی ہوں۔ بہترین سرجن اور اپریٹل کلاس سے تعلق ہے ان کا۔“ وہ پورے دورانیے میں پہلی بار نرمی سے بول رہی تھی۔

صدیقہ ایک جھٹکے سے کھڑی ہو گئی۔

”مجھے اسی بات کا خدشہ تھا۔ تم تو اپنی ماں کے نقش قدم پر چل نکلی ہو۔ ماں نے آسمان کی رفعتوں میں پیٹنگیں ڈالنا چاہی تھیں، چاند سے دوستی کر کے گھر کو منور کرنا چاہتی تھی۔ تم نے بھی وہی قدم اٹھایا۔ واپس پلٹ آؤ بیٹا! تباہیوں کو آواز مت دو۔ اپنی ماں کے عبرت ناک انجام کو دیکھو۔ اور اپنے جیسے لوگوں کے خاندان کا ہمیشہ کے لئے حصہ بن جاؤ۔“ وہ شپٹا گئی تھی۔

حدیقہ کو ماں کے اس ردِ عمل کی توقع ہرگز نہ تھی۔ اس نے قہر آلود نظروں سے ماں کو دیکھا۔ وہ ہنوز سر جھکائے ناقدانہ انداز میں کھڑی تھی۔

”ماما! آپ کے اور میرے پیار کی چویشٹن میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ میری سوچ اور فیصلہ درست ہے۔“ وہ باغیانہ انداز میں بولی۔

”بیٹا! نالی کی اینٹ، چوبارے میں نہیں لگ سکتی۔ کیا تم چاہتی ہو کہ بدنمائی کا عمر بھر سامنا کرو؟ شادی سے پہلے ایسی ہی امیدیں دلائی جاتی ہیں، کلاس کو پس پشت ڈال دیا جاتا ہے۔ مگر پریکٹیکلائف میں پردہ کشائی پر کم مائیگی کا احساس جینے نہیں دیتا۔“ وہ رو پڑی تھی۔

”ماما! آپ نہیں جانتیں کہ میں نے اسے حاصل کرنے کے لئے جو پاؤں بیلے

ہیں، ان کے نشانات تاحیات مٹنے نہیں پائیں گے۔“ وہ ماں کا ہاتھ پکڑ کر بولی۔
 ”دل پر لگے ہوئے چوکوں کے زخم بھی کبھی نہیں بھرتے۔“ وہ بر جتہ بولی۔
 ”ماما! میں ڈاکٹر کی بیٹی ہوں۔ ڈاکٹر کی بیوی بننے میں مضائقہ نہیں۔ اور آپ غور
 سے سن لیں! میں کسی ایرے غیرے سے شادی کرنے والی بھی نہیں۔“ وہ سختی سے بولی۔
 ”اُدھنی اڑان کے لئے ہمت اور طاقت چاہئے بیٹا! جس سے ہم عاری ہیں۔“
 وہ نرمی سے بولی۔

”جو بھی ہے، بس مجھے خرم سے ہی شادی کرنی ہے۔ یہ میرا فیصلہ ہے۔“ لہجے
 کے پکے پن سے وہ لرز گئی۔
 ”ایک غریب کی بیٹی بڑے گھر کی بہو بن کر جاتی ہے تو سسرال اسے لونڈی اور
 باندی کا اسٹیشن سوپ کر اس سے خدمت گزاری کا حق عمر بھر کے لئے وصول کرتے
 رہتے ہیں۔ اگر تمہاری قسمت میں یہی لکھا ہے تو میں کون ہوتی ہوں اسے مٹانے
 والی۔“ ماں کے چہرے پر اُداسی پھیل چکی تھی۔
 وہ مضطرب ہوتی، آنسو صاف کرتی سائینڈ ٹیبل کی دراز کھول کر دوئی کھانے لگی۔۔



”جی فرمائیے۔ ہم غریب و مفلس لوگ آپ کی کیا خدمت کر سکتے ہیں؟“ وہ پھر
 گویا ہوئی۔ ”ہاسپٹل کے اس سال خوردہ کوارٹر میں صرف ایک ہی قیمتی اور انمول شے
 ہے میرے پاس۔ کیا وہ چھیننا چاہتے ہیں آپ امیر کبیر لوگ؟..... ایسا نہیں ہوگا۔
 کیونکہ اس پر میرا پورا اختیار اور بھرپور حق ہے۔ وہ میرے اس لاغر و جود کا مضبوط سہارا،
 ان کمزور آنکھوں کا نور ہے۔ اور یہ جو دل ہے نا، اس کا نام جپتا ہے تو دھڑکن بنتی
 ہے۔“ وہ اپنے ہاتھ جوڑے۔ ان کے سامنے خاموش بیٹھ گئی۔
 ”آئی پلزز! ہمیں غلط نہ سمجھیں۔“ خرم بے چینی سے بولا۔
 حدیقہ پشیمان سی ہو کر دروازے سے باہر نکل کر گفتگو سننے لگی۔

”ہم آپ سے آپ کی متاع حیات چھیننے نہیں بلکہ اپنا سرمایہ آپ کو سوچنے کی
 عرضداشت لے کر حاضر ہوئے ہیں۔ ہر طرح کا اختیار آپ کو حاصل ہے۔ زور آور
 اور خود مختار آپ ہیں۔“ خرم کی ماں پہنچ چکی تھی۔ ایک ہم جنس کی کمپری اور بے بسی کو
 برداشت کرنا مشکل ہو گیا تھا۔ حدیقہ کی ماں حیرت اور بے یقینی سے اسے دیکھنے لگی۔
 ”میں نے لوگوں کے معصوم چہروں اور زبان کی مٹھاس پر جب بھی یقین کیا،

دھوکا کھایا۔ میری تربیت کا حدیقہ پر کوئی اثر نہ ہوا۔ یہ جوانی بڑی ہی منہ زور اور اس کے فیصلے انتہائی شعلہ بار ہوتے ہیں۔ بلی بھر میں بھسم کر چھوڑتے ہیں۔ پھر ان دو نینوں سے بہنے والا سمندر بھی بے بس ہو جاتا ہے۔ اور تمام زندگی انہی شعلوں کی نذر ہو جاتی ہے۔“ وہ سنجیدگی سے بولی۔

”آپ کی تسلی و تشفی کیسے کرائی جائے؟ ہمیں سمجھ نہیں آرہی۔ کیونکہ زندگی میں آپ نے جو عینک پہن کر اس دنیا کو دیکھا ہے، اس کی تصویر کو بد لنے کی جسارت ہم نہیں کر سکتے۔ ہاں، اتنا کہنے کی اجازت ضرور چاہوں گی کہ پانچوں انگلیاں ایک جیسی نہیں ہوتیں۔ انسانوں کی مانند چھوٹی، بڑی اور درمیانی ہر ایک اپنی حیثیت اور اہمیت کی حامل ہے۔“ خرم کی ماں شازیہ نے ملائمت سے کہا۔

”مجھے ان مثالوں پر نہ بھروسہ ہے اور نہ ہی مجھے سمجھانے کی کوشش کریں۔ حدیقہ! کہاں گئی؟ مہمانوں کو مزے داری چائے تو پلا دو۔ آج صبح سے کچن میں گھسی مجھے حیران و پریشان کئے ہوئے تھی۔ کیا بجال کہ آپ کے آنے کی بھٹک بھی کان میں پڑنے دی ہو۔ مجھے حالات نے زمانہ شناسی سکھا دی ہے۔ خرم کے ارادوں اور رویے کو پہچانتے ہوئے میں کئی مہینوں سے خائف تھی۔ لیکن مجھے آپ کی رضامندی کی اُمید نہیں تھی۔ کیونکہ کہاں آپ اور کہاں میں اور میری بچی۔“ وہ دُکھی سی ہو کر بولی۔

”خرم بیٹے! حدیقہ کا خیال دل سے نکال دو۔ میں نے اپنے ماضی کی ہلکی سی جھلک بھی اُسے نہیں دکھائی تھی مگر تم سے چھپانا مناسب نہیں۔ تم حدیقہ کے والد کا نام تک تو جانتے نہیں ہو۔ اس وقت حدود اربعہ پوچھنا اور جاننا بیکار لگ رہا ہوگا۔ میں ایسی کیفیات سے بخوبی واقف ہوں۔ اس وقت تو تم آسمان سے تارے بھی توڑ لانے کو تیار ہو جاؤ گے۔ مگر میرے بچے! میری ایک نصیحت پلے باندھ لو۔ بے جوڑ رشتے کا پل اتنا کمزور اور غیر پائیدار ہوتا ہے کہ اس کو پار کر کے جنت الفردوس کا حصول ناممکن اور خود کو بے وقوف بنانے کے مترادف ہے۔ اس کی جیتی جاگتی مثال میں تمہارے سامنے موجود ہوں۔ اس تاریخ کو میں جہنم رسید کر چکی ہوں۔ دوبارہ حیات بخشنے کا تصور بھی نہیں کر سکتی۔ حدیقہ نے جو بھی سوچا، میں جانتی ہوں۔ کیونکہ اس کی ماں نے بھی کھلی آنکھوں سے ہی خواب دیکھا تھا۔ میں اس کی آنکھیں پھوڑ دوں گی تاکہ وہ دوبارہ ایسی غلطی نہ کرے۔“ لہجہ میں کرب اور غصے کی آمیزش تھی۔

”آئی! مہرا خیال ہے، آپ حد درجہ جذباتی ہو گئی ہیں۔“ خرم ہمت کر کے بولا۔

”ہاں، ہو گئی ہوں جذباتی۔ تمہیں علم ہے، جس سیٹ پر آج تم بیٹھے ہو، چند سال پیشتر یہ سیٹ کس کی تھی؟..... ڈاکٹر آصف زیدی، حدیقہ کا باپ اس پر براجمان تھا۔ اور جس ڈیوٹی پر حدیقہ ہے، اس پر اس کی ماں، سسٹر صدیقہ مقرر کی گئی تھی۔ عشق و جنون کا ایسا ہی ڈرامہ ماضی میں بھی کھیلا گیا تھا۔ میں آج تمہیں بتانے پر مجبور ہوں۔ کیونکہ میں تمہاری اور اپنی اس ناقابلِ فہم بیٹی کی زندگی کو تباہی و بربادی سے بچانا چاہتی ہوں۔ یہ عشق کا نشہ، آکاش بیل کی مانند سر پیر کے بغیر ہی ہوتا ہے۔ خرم! میرے اعتراض و انکار اور زبان کی صداقت کو معاف کر دیتا۔ میں اپنی بیٹی کا انجام، اپنے جیسا دیکھ رہی ہوں۔ میں اپنے دل اور دماغ کے ہاتھوں بہت مجبور ہو چکی ہوں۔ میرے قلب و ذہن کی صدا یکجا ہو کر مجھے مستحکم بنا رہی ہے۔ میری بچی کی سوچ سے نکل جاؤ خرم! میں تمہارے آگے ہاتھ جوڑتی ہوں۔ میری زندگی کے اس خزانے پر ڈاکہ مت ڈالو۔ میں حدیقہ کے بغیر بھلا زندہ کیسے رہ سکتی ہوں؟ تم کسی بڑے اور عالیشان گھر کے دروازے پر جاتے بھلے لگتے ہو۔“ وہ روہانسی ہو گئی۔

”یہ در، حرم ہے میرے لئے آنٹی! آپ خدشات سے باہر نکل کر تو دیکھیں۔ میں آپ کے اعتماد کو کبھی نہیں پہنچاؤں گا۔ آپ مجھے ایک بار آزمائیں۔“ خرم مؤدبانہ انداز میں بولا تو ماں کو اس کا یہ انداز چھلنی کر گیا۔ وہ خرم کو قہر آلود نظروں سے گھورتی رہ گئی۔

”اگر اس آزمائش میں تم ناکام ہو گئے تو کیا میری حدیقہ اپنی عزت نفس اور اپنی پاکیزگی کی سلامتی کی چادر اوڑھ کر واپس آ سکتی ہے؟ ایسا ہرگز نہیں ہوتا۔ تم اسے ننگے سر اور ننگے پاؤں، تپتے ہوئے ریگستانوں میں بے یار و مددگار چھوڑ کر اپنی نئی دنیا اپنے اسٹیشن کے مطابق آباد کر لو گے۔ حدیقہ کا کیا تصور کہ وہ اپنی تمام زندگی پشیمانی اور پچھتاؤں کی بھینٹ چڑھا دے۔“ لہجے میں پرلے درجے کی بے لحاظی تھی۔

اس سے پہلے کہ خرم التجا کرتا، اس کی ماں خاموشی سے اُنھی اور باہر نکل گئی۔ خرم بھی پیچھے چل دیا۔

شیریں نے دونوں کو روکنے کی کوشش کی۔ لیکن وہ دونوں گاڑی میں بیٹھ چکے تھے۔ شیریں بھی مجبوراً پچھلی سیٹ پر ڈھس گئی۔



”اما! میں مزید جاب نہیں کرو گی۔ بہت تھک گئی ہوں۔“ حدیقہ نے ماں کو اپنا

غیر متوقع فیصلہ سنایا اور پاؤں بچختی کمرے سے باہر نکل گئی۔
 ”جواب نہیں کروں گی.....“ ماں زور سے چیختی۔ ”تمہارا باپ مجھے منی آرڈر بھیجے گا کیا؟..... نوکری نہیں کرو گی تو یہ کوارٹر بھی چھوڑنا پڑے گا۔ میری پنشن، اخراجات کے لئے کافی نہیں۔“

”اسی لئے تو میری شادی کی مخالفت کر رہی ہیں آپ۔ میں کولہو کا تیل نہیں ہوں جس کی آنکھیں باندھ کر اس کی ہمت سے زیادہ کام لیا جاتا ہے۔ میں حدیقہ ہوں۔ ڈاکٹر آصف کی بیٹی نہیں کرے گی یہ تھرڈ کلاس جواب۔“ وہ بھی چیختی۔

”ایک دو ٹکے کی نرس کی بھی اولاد ہو۔ یہ مت بھولو۔“ وہ غصے سے گرجی۔
 ”ان لوگوں کو ذلیل کر کے گھر سے کیوں نکالا ہے آپ نے؟ غور سے سن لیں، میں ڈاکٹر خرم سے ہی شادی کروں گی۔ چاہے کورٹ میرج ہی کیوں نہ کرنی پڑے۔ یہ میرا فیصلہ ہے۔“

”کیا تمہیں اُس سے اس قدر عشق ہو گیا ہے کہ اپنی لاچار اور بیمار ماں کو چھوڑ جاؤ گی اور میری طرح کورٹ میرج کا دھبہ ماتھے پر جھومر کی صورت میں سجا لو گی؟“ وہ حیرت سے بولی۔

”مجھے خرم سے لگاؤ اور اس کے اسٹینس سے عشق ہے۔ میری خواہش پوری ہونے کو ہے۔ آپ رنگ میں بھنگ مت ڈالیں۔“ وہ اس کے قریب بیٹھ کر اپنے ہڈیات پر کنٹرول کرتے ہوئے بولی۔ ”آپ جانتی ہیں، مجھے ڈاکٹر بننے کا شوق تھا۔ مہر ہی حسرت کو پورا ہونے دیں ماما! میں چائس کو ہاتھ سے نہیں جانے دوں گی۔ خود ایلر نے سہی، ڈاکٹر کی مسز ہی سہی۔“

”اف میرے اللہ!..... اسے ہی تو کہتے ہیں مکافات عمل۔“

”اے ایک بار پھر غور سے میری سرگزشت سن لو۔ شاید تم مکمل طور پر نہیں جانتی تمہارا باپ نے میرے ساتھ کیا، کیا تھا۔ میں نہیں چاہتی کہ مستقبل میں تم بھی ایسی بنو۔ میں نے بھی ڈاکٹر سے شادی کرنے کا ایک خوب صورت سپنا دیکھا تھا۔ میں نے اپنی گلی خالہ کے بیٹے سے ہو چکی تھی۔ میں نے اپنے بلند کردار اور اعلیٰ اساتذہ کی ایلٹی کو جیت لیا تھا۔ یہاں تک تو تمہاری اور میری سوچ اور انداز میں مماثلت اس دھارے کی طرف لے جاتے ہیں، ان پر نہ میرا

میں تمہیں آصف کے بارے میں بتانا ضروری سمجھتی ہوں۔ کئی سال پیشتر ان کے پیرئس ساؤتھ انڈیا سے بزنس کے سلسلے میں لندن آئے اور وہیں کے ہوکر رہ گئے۔ آصف کو پاکستان بہت پسند تھا۔ کنگ ایڈورڈ میں ایڈمشن میرے نصیبوں کی تاریکی کا سبب بن گیا۔ ہاؤس جاب میرے لئے سراسر تباہی ثابت ہوئی۔ چند مہینوں بعد میں بھی نرسنگ کسلیٹ کرنے کے بعد اسی ہسپتال میں مقرر کر دی گئی، جہاں آصف ہاؤس جاب پر متعین تھے۔ تمہارے ڈیڈی بہت شوخ مزاج انسان تھے۔ لیکن میں نے چند دنوں میں ان کی فطرت کو بھانپ لیا کہ وہ ان لڑکیوں کی طرف بہت جلد مائل ہو جاتے تھے جو کم گو اور حد درجہ شرمیلی ہوتی تھیں۔ میں نے انہیں حاصل کرنے کی جوائینٹنگ کی تھی، اس میں مجھے سو فیصدی مارکس ملنے چاہئیں۔ میری خواہش لبوں پر نہ آئی مگر میں آصف پر اجارہ داری جمانے میں کامیاب ہو گئی تھی۔ میں نے اپنی خواہش کا اظہار بے لفظوں میں ماں سے کیا تو ایک قیامت برپا ہو گئی۔ میرے ان پڑھ مگر نہایت دُور اندیش اور جہاندیدہ والدین نے مجھے منع کرنے کے لئے مستقبل کی جو پیشین گوئیاں کی تھیں، وہ حرف بہ حرف درست نکلیں۔ آخر ان کے اعتراض و انکار کے باوجود میں تمہارے ڈیڈی کے ساتھ کورٹ میرج کے بعد کراچی چلی گئی۔ تمہارے مانا، ثانی گاؤں میں کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہ رہے۔ بہت جلدی چل بے۔ بس سڈلی تمہارے ڈیڈی، سرتا پا بدل گئے تھے۔ ثمنہ سنسر نے غلط بیانی سے کام لیا تھا اور وہ ایک ہی بات کی رٹ لگاتے رہے کہ میں والدین کو دھوکا دے سکتی ہوں تو شوہر کی وفادار کیسے ثابت ہو سکتی ہوں۔ مجھے روتا بلکتا چھوڑ کر وہ لندن واپس چلے گئے۔ اس کے بعد ان کا مجھ سے نہ رابطہ رہا، نہ میں نے کوشش کی۔ تم ٹھیک کہتی ہو کہ اس دنیا میں کچھ خفیہ نہیں رہتا۔ جلد یا بدیر ہر ذی روح اپنی تمام تر خوبیوں اور خامیوں کے ساتھ اپنی زندگی کے حقیقی اور یقینی سچ شو پر سب کے سامنے نمودار ہو کر دوسروں کو حیرت و اشتیاق میں ڈال دیتا ہے۔ یہ اٹل سچائی ہے جس سے ہم انکار نہیں کر سکتے۔ تم یوں سمجھو کہ تم ایک گلاس ہاؤس میں مقیم ہو اور تمہاری ہر مودمنٹ پر دنیا والوں کی کڑی نظر ہے۔ اس لئے کبھی چھپ چھپا کر کوئی بھی غیر فطری عمل کرنے کی کوشش نہ کرنا۔“ وہ آنسو صاف کرتے ہوئے بولی۔

”پھر تمہارا ساتھ، میرے پاؤں کی زنجیر بن گیا۔ دال روٹی کے چکر میں ایسی پسی کہ نہ اپنی خبر رہی، نہ تمہاری۔ چاچا میری زندگی میں نہ آتا تو کب کی الزامات کے

ڈھیر کے نیچے دب کر رہ گئی ہوتی۔ ماسی مجھے اکیلا چھوڑنے پر مجبور تھی۔ گاؤں جاتے ہی ایسی بیمار پڑی کہ پھر اٹھ نہ سکی۔ بیٹی! ایسے لوگوں کے دلوں میں خدا بستا ہے۔ اور جس دل میں خدا براجمان ہو، وہ برائی سے پاک اور خوفِ خدا سے ہمنما رہتا ہے۔ مجھے تمہارے لئے ایسے ہی لوگوں کی تلاش ہے۔ اگر زندگی میں عزت اور سکون نہیں تو سمجھو زندگی دوزخ ہے۔ جو غلطی مجھ سے سرزد ہوئی تھی بیٹی! اب ویسی غلطی جس نے مجھے اور تمہیں بے سہارا اور لاوارث بنانے میں زیادہ دیر نہ لگائی تھی، بتاؤ میں آج آنکھوں دیکھا زہر کا پیالہ تمہیں کیسے پلا سکتی ہوں؟“ ماں کے آنسو تو خشک ہو گئے تھے مگر دل سے خون رِس رہا تھا۔

”اما! آپ کیوں نہیں سمجھتیں؟ میرا معاملہ بالکل مختلف ہے۔ خرم کی ماں آپ کے پاس خود چل کر آئی ہیں۔ آپ نے انہیں جس طریقے سے دیکھ لیا ہے، یہ عفت دار لوگوں کا وطیرہ نہیں۔ وہ اب دوبارہ کبھی نہیں آئیں گے۔ اما! میں آپ کے ہاتھوں آپ کی دعاؤں کے سائے میں رخصت ہونا چاہتی ہوں۔ انہیں راضی کرنے کی کوئی سبیل کر لیں۔ میں آپ کی آمادگی اور رضا کے ہمراہ اپنی نئی زندگی کا آغاز فقط خرم سے کرنا چاہتی ہوں۔ اما پلیز! کسی اور سے شادی کا تصور بھی میرے لئے گناہِ عظیم ہے۔ آپ نے بھی تو پیار کیا تھا۔ اس وقت آپ کیسے بھول سکتی ہیں؟ آپ کے والدین اور آپ کی سوچ میں جو بنیادی اختلاف تھا، وہ ہم دونوں میں بھی ہونا چاہئے۔ ہم نے دن رات مردوں میں کام کیا ہے، ان کی سائیکس سے ہم دونوں باخبر ہیں۔ ہمیں اندازہ ہے، خرم ہو یا کوئی بھی دوسرا تیسرا مرد، سب شوہر کے روپ میں، محسوسات و احساسات اور جذبات میں ایک دوسرے سے مشابہت رکھتے ہیں۔ مثال آپ کے ماننے ہے کہ جب مردانہ فطرت غلبہ پا جائے تو پھر دعا بازی اور بے لفاظی و ستم انہیں آہٹ نہیں لگتا۔ پھر پاپا کی لاڈلی صدیقہ بھی صفحہ ہستی سے مٹ جاتی ہے۔“ وہ سسکنے لگی تھی۔

”اب سمجھ آئی کہ میں تمہارا بچپن ایک پیار کرنے والے باپ کی بے وفائی کے آگے میں پتانے کے حق میں کیوں نہیں تھی؟..... حالانکہ میں جانتی تھی کہ کسی بھید کو ہٹا کر اب نہیں ہوتی۔ اب تم اپنے فیصلے خود کرنے کے قابل ہو گئی ہو، مجھے سر تسلیم خم کر لینا چاہئے۔ اس انکشاف کو برداشت کرنا اب مشکل نہیں ہونا چاہئے۔“ ماں اس کو دیکھ کر ہنس پڑی۔ ”لیکن کیا کروں، ماما مجبور ہے۔“

”بٹ! اما! ڈونٹ کمپیئر می۔ ہم دونوں کے حالات میں کچھ بھی کامن نہیں ماسوائے پیٹے کے۔“ وہ سنجیدگی سے بولی۔

”تم نہیں سنو گی، مجھے علم ہے۔ لیکن ماما کے ہاتھوں مجبوراً نشیب و فراز کی علییت تم تک پہنچانا میرا فرض بھی تو بنتا ہے۔ اگر میرے کیریئر کا یہ بھیاںک روپ، خرم کی ماں دیکھ لے تو وہ ایک ایسی عورت کی بیٹی کو کیونکر قبول کرے گی، جس کے رشتے کی بنیاد والدین کی دہی ہوئی آہوں، کھٹی ہوئی سسکیوں اور نہ چاہتے ہوئے زبان سے نکلنے والی بد دعاؤں پر رکھی گئی تھی۔ پھر انہوں نے اسی عالم میں موت کو سینے سے لگا کر اس رشتے کی بنیاد کو ایسا کھوکھلا کیا کہ میں پل بھر میں شوہر کے ہوتے ہوئے بیوہ اور تم ایک مالدار باپ کے ہوتے ہوئے مفلس، غریب اور یتیم ہو گئی۔ اگر میں خود ان کی جگہ پر فیصلہ کرنے کا اختیار رکھتی تو ایسی ماں کی بیٹی کا نام بھی بیٹے کی زبان پر نہ آنے دیتی۔ یہ میری آخری کوشش ہے۔ اگر پھر بھی تم اپنی ضد پر اڑی رہی تو بیٹا! پھر تمہارا اپنا نصیب اور اس کا ٹیڑھا پن تمہاری اپنی عقل دیکھ.....!

میں تمہیں ایک بہت ہی مختصر کہانی سناتی ہوں۔ ایک لڑکا اور لڑکی ایک دوسرے سے دل و جان سے پیار کرتے تھے۔ مگر لڑکی کی سائیڈ سے شادی پر رضامندی نہ ہوئی تو دونوں نے بھاگ جانے کا پروگرام بنا لیا۔ لڑکے کے باپ نے اس کو عملی جامہ پہنانے کے لئے بیٹے کو بے حد خوب صورت اور تندرست و توانا گھوڑی دی اور ساتھ ہی سرسری طور پر اسے گھوڑی کی خصلتیں سمجھاتے ہوئے بولا کہ بیٹا! اس بات کا دھیان رکھنا کہ اس گھوڑی میں لاتعداد خوبیوں کے باوجود ایک بہت بڑا نقص ہے۔ اس گھوڑی کی ماں جب بھی کہیں پانی دیکھتی تھی، آگے بڑھنے کے بجائے پانی میں بیٹھ جایا کرتی تھی۔ یہ گھوڑی بھی کئی بار ایسا کر چکی ہے۔ تم وادی میں سے گزرتے ہوئے محتاط رہنا۔ بیٹے نے اثبات میں سر ہلایا اور باپ کی دعاؤں لے کر رخصت ہو گیا۔ لڑکی کو اپنے ساتھ گھوڑی پر بٹھا کر وہ اپنی منزل کی طرف جا رہا تھا کہ راستے میں وادی کو کراس کرتے ہوئے باپ کی نصیحت پر غور کرنے لگا۔ وہی ہوا کہ گھوڑی نے وادی میں جب بیٹھتے ہوئے نکھرے، اُبلے پانی کو دیکھا تو وہ پانی میں بیٹھ گئی۔ ان کا پیچھا کرنے والے دشمن قریب پہنچ چکے تھے۔ لڑکے نے گھوڑی کو تنقیدی نظروں سے دیکھا، پھر اپنی حسین و جمیل معشوقہ پر نظر ڈالی۔ ذہن میں ایک سوچ نے کروٹ لی۔ دل نے اقرار کیا اور اس نے اپنی بندوق تانی اور پہلے گھوڑی پر، پھر اپنی معشوقہ پر گولی چلا

دی۔ بل بھر میں دونوں وہیں ڈھیر ہو گئیں۔

جب اس سے اس کی وجہ پوچھی گئی تو وہ ہر سکون لہجے میں بولا۔

”میں نے ایک خود سرنسل کا خاتمہ کر کے بہت نیک کام کیا ہے۔ ورنہ اسی گھوڑی کی اگلی نسل عین وقت پر دھوکا دیتی اور میری معشوقہ کے وجود سے جنم لینے والی بیٹی ایک دن اسی طرح ہمیں دغا دے جاتی جیسے اس کی ماں نے اپنے خاندان کے ساتھ کیا تھا۔“

صدیقہ لمبا سانس لے کر خاموش ہو گئی۔

صدیقہ نے انہماک سے کہانی سنی۔ اس کے چہرے پر حسرت کے سائے منڈلا رہے تھے کہ اس کی ماں نے کس عقل مندی سے اس کی سوچ کو بدل ڈالا ہے۔

سوچتے ہوئے اس کا چہرہ آنسوؤں سے بھیگ چکا تھا۔ اس نے ماں کی طرف استہزائیہ انداز میں دیکھا اور دکھ بھرے لہجے میں بولی۔

”مجھے آپ کی کہانی کی تھیم سے قطعاً اتفاق نہیں۔ لیکن پھر بھی آپ کی رضا کو دیکھ کر ایسی نسل کو ختم کرنے کا حق میں آپ کو سونپتی ہوں ماما! بہتر ہے، اپنی غلطی کی سزا آپ اپنے لئے خود تجویز کریں اور اپنے ہاتھوں سے ایسی نسل کا قتل کریں جس سے پھر ایسی نافرمان، خود غرض، بے حیا اور ناقابل فہم بیٹی پیدا ہی نہ ہو۔ مجھے آپ کا ہر فیصلہ منظور ہے ماما! اور میں اس فیصلے کو یہ ثابت کر کے دکھاؤں گی کہ یہ قرآن کا لکھا ہوا ان مٹ حرف نہیں کہ جیسی ماں ویسی بیٹی۔ آج میں نے اپنے خون میں گردش کرنے والی آپ کی ان تمام خصلتوں کو چھان کر نکال دیا جو اس معاشرے کے رسم و رواج کے خلاف جاتی تھیں۔“

اس کے لہجے میں بے بسی کی جگہ مضبوطی نے لے لی تھی۔ ماں اچنبھے سے اسے دیکھتی رہ گئی۔

”تم کیا کہہ رہی ہو، تمہیں علم ہے؟ تم اپنی فطرت کے متبادل نہیں چل سکتی۔ تم میں اتنی ہمت کہاں؟“

”میں ہوش و حواس میں ہوں۔ اس کہانی نے میری انا و خرد پر چھائی ہوئی سیاہی کے دھند لکھوں کو نور و سحر کی پاکیزہ کرنوں کا ہم سفر بنا دیا ہے۔ تھینک یو ویری چیج ماما!..... آئی ٹو یو۔ یو آر گریت لیڈی۔ آپ بے فکر رہیں، تاریخ کو دہرایا نہیں جائے گا۔ ورنہ کل میری بیٹی سینہ تانے میرے سامنے کھڑی ہوگی۔ آپ یہی سمجھنا چاہتی ہیں

تا؟“ وہ ماں کے گلے لگ کر آنسو ضبط کرنے لگی۔



”ماما! ڈاکٹر خرم کے ساتھ کام کرنا میرے لئے خاصا مشکل ہو گیا ہے۔ اس مسئلے کا حل ڈھونڈ رہی ہوں۔“ حدیقہ نے ماں کے پاؤں دباتے ہوئے کہا۔
”کہیں تمہیں تنگ تو نہیں کرتا؟“ ماں فکر مند ہو گئی۔

”ایسی بات نہیں ہے ماما! اتنا بے آدم و اور بے عزت ہونے کے باوجود اس کے پیار میں رتی بھر کی نہیں آئی۔ مجھے اپنے بچکنے کا رتی بھر اندیشہ نہیں۔ میں بدنام بھی تو نہیں ہونا چاہتی۔ آپ نے خود ہی تو کہا تھا کہ ہر انسان، شیشے کے گھر میں مقیم ہوتا ہے۔“ لہجے میں بے پناہ اُداسی تھی۔ اس کے بعد طویل خاموشی چھائی رہی۔

”حادی بیٹا! میں خرم سے ملنا چاہتی ہوں۔ شاید میں اسے اپنی مجبوری سمجھا سکوں۔ تم مجھے اس کا موبائل نمبر دے دو۔ بس تم پریشان رہنا چھوڑ دو۔ اپنی ڈیوٹی گانتی وارڈ میں لگوا لو۔ وہ تمہارا پیچھا چھوڑ دے گا۔ بیٹا! میں تمہیں سچے موتی کی طرح سپی میں محفوظ کر لیتی۔ لیکن کیا کروں؟ یہ ظالم پیٹ تھوڑی ہی دیر بعد کھانے کو مانگنے لگتا ہے۔“ وہ پشمرہ لہجے میں بولی۔ ”بیٹا! مجھے سچ بتاؤ، تمہیں خرم سے کتنا پیار ہے؟“
”ماما! کیا پیار کا ناپ تول ہوتا ہے؟ کیا آپ نے پاپا کے ساتھ پیار کرتے وقت ترازو کا سہارا لے کر اقرار کیا تھا؟“ وہ سوالیہ نشان بن گئی۔

”نہیں بیٹا!..... کیا آج تک آسمان کی بے حد و بے کراں وسعتوں اور سمندر کی گہرائی کا کوئی بشر اندازہ لگا سکا ہے؟“ وہ اس کے لمبے، خوب صورت بالوں میں اپنی انگلیاں پھیرتے ہوئے بولی۔ ”میری جان! تم نے اپنے وجود میں کینسر جیسی مہلک بیماری کا بیج بو ڈالا ہے۔ تمہاری یہ معصوم جان اس بیماری کا مقابلہ کیسے کرے گی؟ یہ تو قبر کی دہلیز تک ساتھ جاتی ہے۔ مجھے دیکھو، آج بائیس سال بعد تمہارے پاپا مجھے صرف ایک بار پکار کر دیکھیں، تمام گلے شکوے دھرے رہ جائیں گے۔ وہ میرے دل، میری روح میں ہر وقت بستے ہیں۔“ لہجے میں انتہا کا کرب تھا۔

”میرے ساتھ ایسا کچھ نہیں ماما! فار گاڈ سیک، آپ ان کی بیوی اور ان کی اولاد کی ماں ہیں۔ بھلا انہیں کیسے فراموش کر سکتی ہیں؟“ حدیقہ نے غیر ارادی طور پر لمبی آہ بھری۔ بعض اوقات من گھڑت، سہانے خوابوں کی تعبیر بھی تاک اور جان لیوا ثابت ہوتی ہے۔ میرا خواب بھی کچھ ایسا ہی تھا۔ نامکمل اور ادھورا۔ لیکن تعبیر ایک اٹل

صدائق۔“ حدیقہ اپنے ہاتھوں کی لکیروں پر غور کرنے لگی۔

”تم سچ کہتی ہو۔ بس تم نے مجھے بھی روگ لگا دیا ہے۔“ ماں روہانی ہو گئی۔

”اما! آج آپ ایسی باتیں کیوں کر رہی ہیں؟ پاپا کی طویل جفا یاد آ رہی ہے یا

چند لمحوں کی وفا؟“ وہ ماں کو چھیڑنے لگی۔

”بس بیٹے! اس سوال کا کیا جواب دوں؟..... میں تو اپنے دکھ یکسر ہی بھول گئی

ہوں۔ تمہارے بارے میں سوچتی رہتی ہوں۔“ وہ اسے پیار کرتے ہوئے بولی۔

”میرے موبائل میں خرم کا نمبر ڈال دو۔“

حدیقہ نے ماں کے موبائل میں اس کا نمبر فیڈ کر دیا۔

”اما! میری طرف سے آپ کو اجازت ہے۔ اس کی وہ فنگ کریں کہ زندگی بھر

یاد ہی رکھے۔ باز آ جائے تو بہتر ہے۔ عاشق بننا کوئی مذاق یا تماشائیں۔ اس میں

پاپڑ بیلنے پڑتے ہیں۔ جہاں بھر میں ذلیل و رسوا ہونا پڑتا ہے، پھر بھی حاصل کچھ نہیں

ہوتا۔ وہ اس ناکامی کو شیر مادر سمجھ کر پی جائے تو بہتر ہے۔ خیر، آپ کو سمجھانے کے

بہترین گرو تو آتے ہیں۔“

حدیقہ، ماں کی طرف دیکھ کر ذومعنی بات کہہ گئی۔ جسے سن کر ماں انجان بن گئی۔

”کیا آج سونے کا ارادہ نہیں ہے؟ صبح تمہیں جلدی اٹھنا ہے۔ چھوٹے بچوں کی

طرح تنگ کرتی ہوا بھی تک۔ کئی بار سوچنے لگ جاتی ہوں، تمہارا شادی کے بعد کیا

بنے گا؟“

”میں ان شادی کے بکھیڑوں میں پڑنے والی نہیں ہوں۔ نا شناسا اور انجان

لوگوں پر ہم کیسے بھروسہ کر سکتے ہیں؟ کیا وہ اس معاشرے کا حصہ نہیں ہوں گے؟ وہ

مجھے کیسے قبول کر سکتے ہیں؟ اما! آپ کے بطن سے پیدا ہونے والی نسل کا خاتمہ نہایت

اہم ہے۔ میں آپ کا حکم بجالائی ہوں۔“ وہ نہایت آہستگی اور نرمی سے بولی۔ ”اب تو

آپ کو خوش رہنا چاہئے۔“

”میں کتنی خوش نصیب ہوں بیٹا! کہ میرے بطن سے تم جیسی تابعدار بیٹی نے جنم

لیا۔ میرے والدین کو سوچو، میری حکم عدولی اور لائقیتی پر انہیں ہر لمحے بد قسمت ہونے

کا احساس ہوتا ہوگا۔ دراصل میں چار لفظ جو پڑھ گئی تھی، ان کو خاطر میں ہی نہ لاتی

تھی۔ بھلا میری اُڑان تک وہ غریب اور مسکین لوگ کیسے پہنچ سکتے تھے؟“ ماں کے

لہجے میں پچھتاوا کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔

”کیا آپ ماضی کو بھول نہیں سکتیں؟“ حدیقہ نے پیار سے کہا۔
 ”جس کو میں جیت سمجھتی تھی، وہ تو میری بہت بڑی شکست تھی۔ ہار کو فراموش کرنے کی کوشش، شکست خوردگی کے اور قریب لے جاتی ہے۔ میں کیا کروں؟“ وہ تڑپ اٹھی۔

”دراصل ماما! آپ نے مجھ سے اپنا ڈکھ تو چھپائے رکھا، لیکن اپنے اندر کے کچھ تاوے بتدریج بڑھتے ہوئے آپ کو کھوکھلا اور کمزور کرتے چلے گئے۔ ماما! میں آپ کی بیٹی اور بہترین دوست ہوں۔ کیا میں ہم راز، محسن اور مربی کا شرف حاصل کرنے کے قابل نہیں؟“ وہ ماں کی حالت پر نالاں ہوئے جا رہی تھی۔

”تم تو میری تنہائیوں کی ساتھی اور میری تاریک زندگی کی راہوں کی وہ مشعلِ راہ ہو، جس نے مجھے جینے پر مجبور رکھا۔ دراصل میں تمہیں اپنا ایسا نازیبا اور منافقت سے بھرپور چہرہ دکھانے کی ہمت نہیں رکھتی تھی۔ میرے ظاہر اور باطن کا تضاد ہمیشہ آڑے آتا رہا۔“ وہ رو پڑی تھی۔

”چلیں چھوڑیں ایسی باتیں۔ آپ پھر اپنی میڈیسن کھانا بھول گئی ہیں نا۔ میلی پالی شی ماں! دوا بچوں کے لئے بہت ضروری ہوتی ہے۔ ورنہ ان کی گردتھ سلو ہو جاتی ہے۔“ حدیقہ نے ماں کا فوراً ہی حراج بدل ڈالا اور دونوں ہی اپنی سوچوں کے دھارے میں بہتی چلی گئیں۔

جب سے اس کی ڈیوٹی گاسٹی وارڈ میں لگی تھی، ہسپتال کی روٹین ہی الجھ کر رہ گئی تھی۔ خرم اپنی جگہ پریشان و حیران تھا۔ انکار کی اسے توقع ہرگز نہ تھی۔ اس میں تو کسی چیز کی کمی نہ تھی۔ اپنی ماں کے سامنے مارے ندامت کے آنکھ اٹھا کر نہ دیکھتا۔ اکیلے بے آبرو ہونا اسے اتنا دکھ نہ دیتا۔

آخر اس نے ماں کو خوش کرنے کے لئے ان کی پسند پر رشتہ کرنے کی حامی بھر لی تھی۔ اور ماں دن میں دو چار لڑکیاں ضرور دیکھ لیتی۔ لڑکی والوں کے گھر جا کر رشتہ دیکھنے اور استعارہ کر کے رشتہ طے کرنے کا جھانسہ دینا اسے ہرگز پسند نہ تھا۔ ماں اپنے گرد و پیش نظر دوڑاتی اور کسی حیلے بہانے سے لڑکی کو نظروں میں اتار کر تمام تفصیل خرم کے گوش گزار کر دیتی۔ مگر دوسری طرف سے کسی دلچسپی یا تجسس کی ہلکی سی رمتی نظر نہ آتی تھی۔

اسی کشمکش میں کئی مہینے بیت گئے۔ خرم کی پیشانی پر ابھرتی ہوئی لکیریں اُس کی

سوچ اور پریشانی کی چٹلی کھا رہی تھیں۔ ماں فکر مند ہو کر رہ گئی۔

آخر ایک دن وہ اکیلی حدیقہ کی ماں سے ملنے چلی گئی۔ حدیقہ کی ماں، بیٹی کی تابعداری اور مدح سرائی کرتی ہوئی تقاضے سے تنی ہوئی تھی۔ آج کی گفتگو ایسی میٹنگ فل نکلی کہ دونوں معنی کی انگلیاں خریدنے چل نکلیں۔ مگر بچوں کو کانوں کان خبر نہ ہونے دی۔ مائیں اپنی فرمانبردار اولاد کو زندگی کا سب سے حسین سرپرائز دینا چاہ رہی تھیں۔



آج نوبیا ہوتا چوڑا، ہنی مون پر جانے کی تیاری کر رہا تھا۔ ان کی شادی کو والدین کی رضامندی نے گل و گلزار بنا دیا تھا۔ یہ سب اتنا جلدی ہو جائے گا، دونوں کو یقین نہیں آ رہا تھا۔

مگر ماں کی نہ کٹنے والی تنہائی، حدیقہ کو مضطرب رکھتی۔ جس کا سرال میں اظہار بھی کرنا اس کے مفاد میں نہیں تھا۔ شیریں بھی بیاہ کر اپنے سرال جا چکی تھی۔ سرال پڑوس میں ہونے کی وجہ سے وہ دن میں کئی بار میکے کا چکر لگاتی، جسے حدیقہ حسرت و یاس سے دیکھ کر رہ جاتی۔ وہ ماں سے فون پر گھنٹوں بات کرتی۔ ہر بار ماں کو بے حد مضبوط اور مستحکم پا کر پُر تسکین ہو جاتی۔ جبکہ ماں کے ڈپریشن میں مزید اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔

ایک دن وہ صبح تیار ہو کر خرم کے ساتھ نکلنے ہی والی تھی کہ ساس نے راستہ روک کر سوال کیا۔

”آج اتنی صبح تم کہاں جا رہی ہو؟“

”ماما کو ملے مہینے بیت گئے ہیں۔ آج خرم مجھے ان کے ساتھ دن گزارنے کے لئے چھوڑ رہے ہیں۔ شام کو واپسی خرم کے ساتھ ہی ہوگی۔“

”تم نے ایسا پروگرام بنانے کی اجازت کس سے لی ہے؟“ وہ تلخی سے بولی۔

”خرم سے۔“ وہ حیران کن لہجے میں بولی۔

”چڑھائی میں ہر سیزم ہی پر قدم رکھا جاتا ہے۔ اگر درمیان سے سیزم ہی اگنور کر کے دوسری پر پاؤں رکھو گی تو انجام جانتی ہو، منہ کے بل گر بھی سکتی ہو۔ میرا اتنا ہی کہنا کافی ہے۔ ذرا اس پر غور و فکر کرنا۔“ اس نے بیٹے کو کھانے والی نظر دے گھورا اور کمرے میں چلی گئی۔

”میرا خیال ہے، ماما گھر میں اکیلی گھبرا جاتی ہیں۔“ خرم نے آہستگی سے حدیقہ کو

کہا اور اس کا بیگ، مین ڈور کے پاس رکھ کر گاڑی میں بیٹھ گیا۔ وہ اس کے قریب جا کر ملائمت سے بولی۔

”خرم! آپ کو اپنی ماں کی تنہائی تو نظر آگئی جبکہ دن میں بیسیوں بار شیریں اپنا دیدار کرا جاتی ہے۔ میری ماں تو بالکل بے سہارا اور بیمار ہیں۔ میرے بغیر اُن کا کوئی نہیں۔ مہینے گزر گئے، کسی کو ان کے اکیلے پن کا خیال نہیں آیا۔ آج ہمت کر کے جانے کا فیصلہ کیا تو وہی ہوا، جس کا مجھے اندیشہ رہتا ہے۔“

”آج کے بعد شیریں کا نام زبان پر مت لانا۔ اس گھر کے دروازے اُس پر ہمیشہ کے لئے کھلے ہیں۔ بیوی کی خاطر میں تمام رشتوں سے دستبردار نہیں ہو سکتا۔ بھلا تمہیں کیا خبر کہ ان خونی رشتوں کی حدت، زندگی کو خوشگوار اور پرسکون بنانے کے لئے کتنی اہم ہے۔“ اس کے لہجے میں غصہ تھا جو پہلی بار ابھر کر اس کو حیران و پشیمان کر گیا۔

”آج تو آپ شوہر کی زبان بول رہے ہیں جان!“ وہ زبردستی مسکرا کر بولی۔
 ”یوں ہی سمجھو۔ جاؤ، ممی کو سوری بول دو۔ میں گھر آؤں تو ماحول خوشگوار ہونا چاہئے۔ مجھے لڑائی جھگڑوں کی عادت نہیں۔ میں اپنے والدین، رشتہ دار، دوست احباب اور اڑوس پڑوس کے پیار اور توجہ میں پروان چڑھا ہوں۔ تم اپنے گھر کے اصول اور طریقے ہم پر لاگو کرنے کی کوشش بھی نہ کرنا۔ میں تو سمجھا تھا کہ تم نے ممی سے اجازت لے کر پروگرام بنایا ہے۔ خاصی کم عقلی کا ثبوت دیا ہے تم نے۔“ وہ بہت سنجیدہ تھا۔

اُس نے اپنا بیگ اٹھایا اور کمرے میں چلی گئی۔ بیڈ پر گر کر وہ زار و قطار روئی ہوئی سوچنے لگی۔ شادی کو چھ مہینے بیت گئے۔ صرف تین دفعہ خرم کے ساتھ ماں کے گھر آدھے گھنٹے کے لئے گئی تھی۔ تنہائی ابھی بچھ نہیں پاتی تھی کہ چلنے کا حکم سنا دیا جاتا تھا اور ماں مسکرا کر الوداع کرتے ہوئے کہتی۔

”شوہر کی حکم عدولی، اللہ تعالیٰ کو ناراض کرنے کے مترادف ہے۔“

خرم بھی دل کھول کر ہنستا اور اسے لے کر واپس آ جاتا۔

آج خرم کی باتیں اس کے سینے کو چھلنی کر گئیں۔ وہ اس کی ماں کے لئے کس قدر بے حس اور لاپرواہ تھا، اس کا اندازہ اس کو پہلے سے ہی ہو چکا تھا۔ مگر آج تو زبانی کلامی کیا جانے والا اظہار ایسا اذیت ناک تھا کہ وہ کوشش کے باوجود سہاس کو سوری نہ

بول سکی نہ ہی دن بھر کمرے سے نکل سکی۔

آخر شیریں نے حدیقہ کو تسلی و تشفی دی۔ مگر اس کا دل سنبھل نہ سکا۔ کیونکہ خرم بدستور اپنے رویے سے ناراضگی کا اظہار کئے جا رہا تھا۔ ساس کی کڑوی کیلی باتیں عروج پر تھیں، جنہیں برداشت کرنے میں ہی مصلحت تھی۔

وقت کے ساتھ گھر کے ماحول کی کشیدگی میں اضافہ ہوتا چلا گیا مگر حدیقہ کی ماں کو خبر تک نہ تھی۔ وہ بیٹی کو آباد و خوش حال دیکھ کر پھولی نہ ساتی تھی۔ اس کی جدائی میں تڑپتی ہوئی بھی مسکراتی رہتی۔ کیونکہ بیٹیاں میکے کی طرف مڑ کر نہیں دیکھتیں جب انہیں سسرال میں باعزت مقام مل جاتا ہے۔



شیریں اور حدیقہ کو اللہ تعالیٰ نے ایک ہی دن بیٹوں جیسی نعمت سے نواز دیا۔ مگر بد قسمتی سے حدیقہ کا بیٹا چند دنوں بعد ہی وفات پا گیا۔ اس ستم ظریفی پر وہ ہر وقت روتی رہتی۔ شیریں کے شوہر ہارون نے خرم کو مشورہ دیا کہ اسے کچھ عرصے کے لئے میکے چھوڑ دے۔ مگر خرم نے ایک نہ سنی۔ آخر ہارون نے شیریں کو سمجھانے کی کوشش کی اور ساتھ ہی دھمکی بھی دے ڈالی کہ حدیقہ کے میکے جانے پر پابندی رہی تو تم بھی اپنے میکے کو بھول جاؤ۔

یہ ایسی دھمکی تھی جس نے سب کو ہلا کر رکھ دیا تھا کہ ہارون کون ہوتا ہے خرم کی ازدواجی زندگی میں دخل اندازی کرنے والا۔ حدیقہ کو بھی برا تو لگتا، مگر ہمدردی پا کر قدرے مطمئن ضرور ہو جاتی۔ وہ جب بھی اس پر زیادتی ہوتے دیکھتا تو سب کے سامنے سیخ پا ہو جاتا۔ غیر ارادی طور پر انسانیت کے ناتے اُس کے دکھے دل پر مرہم رکھنے کی کوشش کرتا۔

آخر حدیقہ کے سمجھانے پر ہارون نے چپ سادھ لی۔ اس نے اعتراضات کرنے پر خود پر قابو پالیا۔ مگر دل اور ذہن میں رحم و ترس کی جنگ جاری رہتی۔ خرم اور ہارون میں بچپن کی دوستی ایسی مضبوط اور پختہ کہ اس میں رتی بھر فرق نہ آیا تھا۔ وہ حیلے بہانوں سے خرم کو حدیقہ کے حقوق میں ذومعنی لیکچر دے ڈالتا جس کا خرم پر کوئی اثر نہ ہوتا تھا۔

شیریں سسرال اور شوہر پر حکمرانی کرتی دوسرے بچے کی ماں بننے والی تھی۔ اس مرثدہ نے حدیقہ کی آغوش اس نعمت سے خالی ہونے کے احساس کو بڑھا دیا تھا۔

کیونکہ خرم کو اولاد کی چاہ ہی نہ تھی۔ نہ جانے اس کے ارادے کیا تھے کہ وہ حدیقہ کے بطن سے اولاد کا خواہش مند نہ رہا تھا۔ جس کا قلق اسے دن رات کھائے چلا جاتا۔ اٹھتے بیٹھتے ساس کے طعنے اسے جینے نہ دیتے۔ کئی بار اس کے ذہن میں فتور نے غلبہ پایا کہ اس کی رضا کے بغیر ہی پریکٹ ہو جائے۔ کچھ اختیارات اللہ تعالیٰ نے اس کے ہاتھ میں بھی تو دیئے تھے۔ استعمال کرنے کا پورا حق رکھتی تھی۔ دل میں کیسے کیسے شیطانی خیالات نے بسرا کیا۔ مگر اپنی فطرت کی صداقت کو وہ کیسے داغ دار کر سکتی تھی۔ مگر کدامن ہاتھ میں تھا مے خوش کن لمحوں کے انتظار میں دن گزار رہی تھی۔

حدیقہ کی ماں، بیٹی کے فرض سے سبکدوش ہو کر ذہبی صہور پر تندرست ہوتی چلی گئی۔ بیٹی کی جدائی اسے خون کے آنسو تو رلاتی مگر اس کی آبادی اسے نہال کر جاتی۔



بہن بھائی شیریں اور خرم ایک ہی ہسپتال میں جاب کر رہے تھے۔ صبح اکٹھے جانا اور شام کو اکٹھے واپس آنا روز کی روٹین تھی۔

ہارون باہر سے ڈگری لے کر آیا تھا، یہاں اسے پسند کی جاب ملنا محال لگ رہا تھا۔ کبھی کبھی اتنا فرسٹرڈ ہو جاتا کہ واپس بھاگ جانے کو دل چاہنے لگتا تھا۔ مگر آج کل چار سو جابز کے مسائل نے سب کو پریشان کر رکھا تھا۔ ڈیفرنٹ کنٹریز میں اپنی C.V بھیج چکا تھا مگر رزق کھلنے کی کہیں سے کال نہ آئی تھی۔ دوسرا بچہ بھی آج کل میں ان کی زندگی اور ذمہ داریوں میں شامل ہونے والا تھا۔ اسے خاصی پریشانی اور ندامت لاحق تھی۔

معاشرہ اتنا لبرل تو ہے نہیں کہ شیریں کی کمائی اور ہارون کی بے بی سینگ ایک طعنہ نہ بنتی۔ آنے جانے والے عزیز رشتہ دار طنز کرنے سے باز نہ آتے تھے جس میں سرفہرست اس کی اپنی بیوی اور ساس تھی۔

حدیقہ نے شادی کے بعد ہی جاب چھوڑ دی تھی۔ اس کی سوچ میں مہارانی بن کر نوکروں پر حکم صادر کرنا تھا۔ بیگم خرم بن کر اس سرکل کا ممبر بننا تھا، جنہیں سوائے ڈیزائنر ملبوسات، برینڈڈ جوتی، پرس اور ڈائمنڈ کے سوا کسی اور دنیا کی خبر نہ تھی۔ لیکن اس کے خواب تو دھرے کے دھرے رہ گئے۔ سر صاحب کو اسٹروک ہو گیا۔ اب نرس گھر میں موجود ہے جو ان کی لک آفر بھی کرے گی۔ ایک سرساز کرانے کا مسئلہ بھی نہ ہوگا۔ فقط پائس اور پیئرز کے استعمال کے لئے ایک ٹوٹا پھوٹا نوکر رکھ لیا گیا تھا جو

اسی کی سپرویزن میں کام کیا کرتا تھا۔

ایک سال گزر جانے کے بعد ان کی ڈیٹھ ہو گئی۔ دل ہی دل میں شکر ادا کیا۔ اتنی بڑی ذمہ داری نبھانے کے بعد اب فراغت ملنے پر اس نے پھر ماں بننے کی خواہش کا اظہار خرم سے کیا، جسے ٹال منول کر دیا گیا کہ اسے فی الحال اتنی بڑی ذمہ داری اٹھانے کا شوق ہے، نہ ہی ابھی اس کی ضرورت ہے۔

ادھر صدیقہ اسے ہر ملاقات پر ہر بار فون پر سمجھاتی رہتی کہ بچے کے بغیر مرد کسی بھی وقت عورت سے کنارہ کشی اختیار کرنے میں دیر نہیں لگاتا۔ اگر سدا آباد رہنا چاہتی ہو تو اس مقدس رشتے کو اپنانا بہت ضروری ہے۔ دوسری طرف ساس اور نند نے طعنے دے دے کر برا حال کر رکھا تھا۔ وہ کیا بتاتی کہ ان کے بیٹے کو اولاد کی چاہ ہی نہیں۔ ایک کی پیدائش اور پھر چند دنوں کی رفاقت کے بعد اس کا چلے جانا خرم کے لئے ایسا ٹراما تھا، جس سے وہ ابھی تک نہیں نکلا تھا۔ ڈرپوک تو وہ بچپن سے ہی تھا، بیٹے کی موت کا ری ایکشن اسے اور بھی بزدل بنا گیا۔ مگر حدیقہ خوفزدگی میں سوچتی رہتی کہ وہ کسی بھی وقت اسے فارغ کر دے گا۔ کیونکہ پیار کی جگہ لافعلی نے لے لی تھی۔ حدیقہ، سر کی وفات کے بعد بھی روایتی ساس اور نند کے ہتھے چڑھی رہی۔ اسے ماں کی وہ باتیں یاد آ کر رزلاتی رہتیں کہ غریب گھر سے لائی ہوئی بہو کا اسٹیٹس ایک ملازمہ اور لونڈی سے بڑھ کر نہیں ہوتا۔ وہ آہ بھر کر بڑبڑاتی۔ چلی تھی بیگم صاحبہ بننے۔ لعنت ہے ایسی سوچ پر اور ایسی غلامانہ زندگی پر۔ چاند پانے کی پرواز پر نکل تھی، یہ نہ سوچا تھا کہ اس تک پہنچنے کے لئے اسے کہاں کہاں سے گزرنا پڑے گا۔

ابھی وہ اسی تذبذب میں مقید تھی کہ شیریں ایک بیٹی کو جنم دے کر بھابی سے خدمات کرانے کے پہنچ گئی۔ حدیقہ پھر سے شب و روز کے لئے مصروف ہو گئی۔ شیریں کی اسٹیش ڈائٹ اور بچے کو سنبھالنے کی تمام ذمہ داری حدیقہ پر آ گئی۔ کئی بار ہارون اس کی ہمدردی میں انہیں سمجھانے کی کوشش کر چکا تھا کہ جو کام ملازم سے لئے جا سکتے ہیں، وہ حدیقہ سے کیونکر لئے جائیں؟ مگر اس کے بولنے کو کسی نے کوئی اہمیت نہ دی۔

زندگی اسی کشمکش میں چلتی جا رہی تھی۔ میٹرنٹی لیو کے گزرنے کا پتہ ہی نہ چلا۔ شیریں نے بچی کو حدیقہ کے سپرد کر کے دوبارہ سے ہسپتال جوائن کر لیا تھا۔ انہی دنوں خرم کے ماموں کینیڈا سے ایک مہینے کی چھٹی پر پاکستان آ گئے۔ شرف

میزبانی انہیں بخش کر بہن پر احسانِ عظیم ہر وقت جتاتے رہتے۔
حدیقہ نے محسوس کیا کہ بڑے خاندانوں میں تو ذمہ داریاں بتدریج بڑھتی چلی جاتی ہیں اور گھر میں بیٹھنے والی بہو فقط خدمت گار اور ہاتھ جوڑے غلام کی مانند ہے اور پھر ہو بھی غریب اور بغیر خاندان کے۔

اس نے دوبارہ سے نوکری کی پیشکش کی، جسے گھر کے ہر فرد نے مسترد کر دیا بلکہ سو سو باتیں بنائیں۔ نرس کے پیشے کو فران دلی سے برا بھلا کہا گیا۔ ان میں خرم سرفہرست تھا۔ اُس میں بیوی کو سپورٹ کرنے کی گنجائش ہی نہ تھی۔ جو ماں اور بہن کہہ دیتیں، قرآن کا حرف سمجھ کر سوچے سمجھے بغیر قبول کر لیتا۔



سردیوں کی دوپہر اور پھر دھوپ کی تمازت اور حدت، بدن کو ایسی تھراپی دیتی ہے کہ کوئی دنیاوی آسائش اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ ہر مصنوعی آسائش پیچ نظر آنے لگتی ہے۔

سندے کی دوپہر سب لان میں بیٹھے کھانے پینے کے لوازمات کے ساتھ چمکتے ہوئے سورج کو انجوائے کر رہے تھے۔ ماموں ان کی خاطر داری اور مہمان نوازی پر اتنے خوش نظر آ رہے تھے کہ انہوں نے ہارون کو پانسہ کرنے کا وعدہ کر لیا۔ بات ہوتے ہوتے شیریں اور خرم تک پہنچی تو ماں نے مشورہ دیا کہ وہ وہاں چند سالوں کے لئے جاب کر کے پیپر جمع کر کے پاکستان میں اپنا ہاسپٹل تعمیر کرنے کے بارے میں سوچیں۔ یہاں رہ کر وہ جائز کے علاوہ اپنے ذاتی سیٹ اپ کے بارے میں تصور بھی نہیں کر سکتے۔ کیونکہ پیسہ مین پر اہم تھا۔ دونوں کے دل کو بات بھاگئی۔

حدیقہ نے بھی ہاں میں ہاں ملائی کہ کم از کم یہاں کے کبھی نہ ختم ہونے والے عذاب سے تو چھٹکارا مل جائے گا۔ وہاں اپنا گھر، اپنی زندگی، اپنی آزادی ہوگی۔ اپنا خادمہ اور پھر اس میں سے بچے۔ وہ یہ سوچ کر کھل اُٹھی تھی۔ اُمید و بیم کی دنیا میں کھوئے اُس نے دعاؤں پر زور دے دیا۔ وظیفے اور رات بھر کی عبادت میں کھو کر رہ گئی۔ اُس کی اس دعا کو اتنی تیزی سے قبولیت نصیب ہوئی کہ چند مہینوں میں جانے کی تیاریاں ہونے لگیں۔

نوشہٴ تقدیر کا فیصلہ کبھی ملتا نہیں۔ ہو کر رہتا ہے۔ خرم نے جب ماں کی تنہائیوں اور بیماریوں کی مجبوری پر حدیقہ کو ساتھ لے جانے کا پروگرام پوسٹ پون کر دیا تو وہ

تڑپ کر رہ گئی تھی۔ بلک بلک کر فریادیں کر ڈالی تھیں کہ وہ خرم کے بغیر نہیں رہ سکتی۔ مگر اُس نے ایک نہ سنی۔ ساس نے الگ کلاس لے لی۔ نند نے بھی خوب لتاڑا۔ رشتے داروں نے خوب درگت بنائی کہ بھلا ماں اکیلی کیسے رہ سکتی ہے۔

وہ خاموش بیٹھی سب کا منہ کتتی رہ گئی۔ کسی کو اس کے احساس اور جذبات کا اندازہ ہی نہ تھا۔ ہارون نے خرم کو سمجھانے کی لاکھ کوشش کی مگر وہ ماں کو دی گئی تسلی و تشفی کو پریشانی میں کیسے بدل سکتا تھا؟

صدیقہ نے سنا تو وہ بھی تڑپ کر رہ گئی۔ لیکن بیٹی کے سرال میں انٹرفیر کرنا مناسب نہیں تھا۔ الٹا بیٹی کو ہی سمجھانے لگی۔ اس کے بغیر چارہ ہی نہ تھا۔ بے بسی اور لاچارگی نے ماں بیٹی کے لبوں پر خاموشی کے تالے ہی لگا دیئے۔ لیکن حدیقہ اندر ہی اندر ہر وقت کھلوتی رہتی۔ اسے آج یقین ہو چلا تھا کہ اگر فطرتاً بیٹی، ماں جیسی نہیں بھی ہوتی تو مقدر اُسی جیسا لکھوا کر جنم لیتی ہے۔

اب اُس کی پڑمردگی عروج پر پہنچ چکی تھی۔ اُسے اپنا نصیب اپنی ماں جیسا ہی معلوم ہوا۔ اس کا باپ بھی شتر بے مہارت تھا۔ طبعاً غیر متوازن تھا۔ خرم بہن کا رسیا اور ماں کا عاشق اور بیوی کی ذمہ داریوں سے آزاد اور اس کی خوشیوں سے بے بہرہ تھا۔ ماں اپنے بہن بھائیوں کو چھوڑ کر ساتھ جانے کو تیار نہ تھی۔ اس کی بیماری بھی ایسی جان لیوا نہ تھی۔ فقط بڑھاپا تھا۔ اس کے اپنے ہی مسائل تھے جو حدیقہ کی موجودگی میں ختم ہونے سے رہے۔ تنہائی اور بیماری کا جو نقشہ ساس نے کھینچا تھا، کوئی بھی بچہ اس کے اثرات سے محفوظ نہ ہو پاتا۔ وہ تو خرم تھا۔ حد درجہ فرمانبردار اور ہمدرد۔ ہارون نے حدیقہ کو تسلی و تشفی دی اور اس سے وعدہ کیا کہ وہ خرم کو مجبور کر دے گا ہر طریقے اور ہر حربے سے کہ وہ اسے اپنے پاس جلد از جلد بلا لے۔

تینوں کو رخصت کر کے وہ ایئر پورٹ سے گھر پہنچی تو سامنے ماں کو دیکھ کر چونک گئی۔ ساس، ماں کے سلام کا جواب دیئے بغیر نکلیوں سے دیکھتی اپنے کمرے میں چلی گئی۔

”ماما! آپ کیوں آئی ہیں؟“ وہ ماں کے قریب آ کر سہم کر بولی۔

”بیٹا! اس کھانے کے ذائقے سے میں باخبر ہوں۔ مجھ سے کب تک چھپاؤ گی اپنے ازدواجی حالات؟ میں تمہیں لینے آئی ہوں۔ ان کے قدموں میں گر کر تم عزت کیسے حاصل کر سکتی ہو؟ بہت ہو گئی۔ اپنے گھر چلو۔ میں یہی سمجھتی رہی، غلط فہمیوں کا

شکار رہی کہ تم اپنی زندگی میں اتنی خوش و مطمئن ہو کہ مجھے بھلا بیٹھی ہو۔ یہ تصور مجھے ہر وقت زندہ رہنے پر مجبور کرتا رہا۔ مگر کل ہارون نے مجھے تمام حالات سے روشناس کرا کر مجھ پر احسانِ عظیم کیا ہے۔ میں تمہیں یہاں ایک پل کے لئے نہیں رہنے دوں گی۔“ اُس کے تیور، اُس کی مضبوطی کی داستان بنے ہوئے تھے۔

”ماما! میں اپنا گھر چھوڑ کر آپ کے پاس نہیں جاؤں گی۔ چند ماہ کی بات ہے، مجھے خرم بلا لیں گے۔ آپ خواجہ خواہ فکر مند ہو گئی ہیں۔“ وہ ماں کے سامنے اپنے دکھ کو چھپاتے ہوئے حوصلے سے بولی۔

”تمہیں یہاں کی آسائشوں نے بے غیرت بنا دیا ہے۔“ وہ غصے سے بولی۔
 ”ایسی بات نہیں ماما!“ وہ تڑپ اٹھی۔ ”خرم میرا پیار ہے۔ اور یہ گھر میرے لئے بہترین پناہ گاہ ہے۔ یہ گھر میری جنت ہے ماما! میں کیونکر چھوڑ دوں؟ اماں جی اکیلی ہیں، ان کو کیسے اکیلا چھوڑ کر آپ کے ساتھ چل پڑوں؟ خرم میری اس غلطی اور کوتاہی کو کبھی معاف نہیں کریں گے ماما!..... میں ان کی اجازت کے بغیر کوئی قدم نہیں اٹھا سکتی۔ ورنہ برباد ہو جاؤں گی۔“

”ٹھیک ہے۔ کوشش کر دیکھو۔ مگر مجھے انجامِ نظر آ رہا ہے۔ میرے گھر کے دروازے ہر سے تمہارے لئے کھلے ہیں۔ اللہ کرے میری تمام پیشین گوئیاں ناکام ہو جائیں۔ میرے تمام خدشے اور اندیشے غلط ثابت ہوں اللہ کرے۔“ وہ ہاتھ اٹھا کر دعا مانگنے لگی۔

”بس میرے لئے دعا کریں ماما! میرا گھر آباد رہے۔ آپ یقین کریں، میرا اسرال بہت اچھا ہے ماما! میں خرم کے بغیر جینے کا تصور بھی نہیں کر سکتی۔ اس گھر میں اُس کی یادیں ہیں۔ اُس کی خوشبو ہر سُرچی بسی ہوئی ہے۔ اُس کے سنگ کچھ مینے گزار لوں گی۔ ماں جی نے اجازت دی تو آپ کو ملنے ضرور آؤں گی۔ ماما! میں بہت، مجبور ہوں، مجھے معاف کر دیجئے گا۔ مجھے دعا دیجئے گا۔“ وہ زار و قطار رو رہی تھی۔

ماں کو اپنے ماضی کی تڑپ اور دہرائی جانے والی تاریخ میں حد درجے کی مطابقت اور مناسبت نظر آرہی تھی۔ اُس نے اُس کے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے کہا۔
 ”ممکن ہے، ماں جی کی خدمت ہی تمہارے مقدر کا دھارا بدل ڈالے۔ مگر بیٹا! ہمت رکھنا۔ آہ و بکا سے وقت کا ایک لمحہ بھی جان پر بھاری ہو جاتا ہے۔ اس لئے وقت کو اُمید کی کرنوں سے ضو فشاں رکھنا میری جان! آج کے بعد اپنے لب و لہجے کی

مناقت اور پردہ پوشی کو نکال دو۔ مت کرنا اداکاری میرے سامنے۔ یہ ایسا دکھ ہے جو ہر لمحے بتدریج بڑھتا چلا جاتا ہے۔ تم میرے جسم کا حصہ ہو، مجھ سے دکھڑا رو کر خود کو ہلکا کرنا گناہ کے زمرے میں نہیں آتا۔ میں تمہاری ماں ہوں، تمہارے لئے ایک ٹھنڈا سایہ ہوں۔ اس سائے میں تھوڑی دیر سستا کر تازہ دم ہو جانا تمہارے لئے ٹانگ ہے۔ وقت پر لگا کر اڑ جائے گا میری بچی! اور تم اپنے شوہر کے پاس بخیر و عافیت پہنچ جاؤ گی، إنشاء اللہ۔“ ماں نے اسے پیار کرتے ہوئے کہا۔ ”نیلی چھت والے کا سہارا ہمیں آگے بڑھنے کا حوصلہ بخشتا ہے۔ اس کو ہر سانس کے ساتھ یاد رکھنا۔ مت بھولنا۔“

اُس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔



آج موسم بے حد خوب صورت تھا۔ چار سو موہی پھولوں کا راج تھا۔ لان معطر خوشبو کی آماجگاہ بنا حدیقہ کی محنت اور توجہ کی منہ بولتی تصویر بنا ہوا تھا۔ وہ گھنٹوں مالی کے ساتھ مل کر کام کراتے ہوئے اپنا دل بہلایا کرتی تھی۔

باغبانی کے اس شوق میں اپنے ذہن و قلب کو سکون سے ہم کنار کرتے چھ ماہ گزر گئے تھے مگر خرم کی جانب سے مسلسل بے توجہی اور لاپرواہی تھی۔ وہ اُسے اپنے پاس بلانے میں قطعاً انٹرسٹ نہ تھا۔ پیچلر لائف کا مزا اُس کی رگ رگ میں اتر چکا تھا۔ ماں کی نگہداشت کے لئے اُسے بیوی کی صورت میں ٹرینڈرز باعث رحمت محسوس ہوئی تھی۔ وہ اس لحاظ سے مطمئن اور خوش تھا۔ جبکہ ہارون بارہا خرم کو سمجھانے کی ناکام کوشش کر چکا تھا۔ شیریں کو بھی ہر وقت ذہنی دباؤ میں رکھتا۔ حدیقہ پر ہونے والی زیادتی کے خلاف آواز اٹھاتا، اس کو بھی سمجھانے کی کوشش کرتا۔ لیکن اس کی جانب سے انکار اور ان گنت اعتراضات کے سوا کوئی جواب نہ ملتا۔

حدیقہ کی اضطرابی کیفیت میں اضافے نے اسے خاصا چڑچڑایا دیا تھا۔ وہ کئی بار ساس سے اُس کی نامناسب حرکات پر اُلجھ چکی تھی۔ اپنی مرضی سے ماں کے گھر آنے جانے لگی تھی۔ اُس کے باغیانہ رویے کے نتائج خاصے بھیانک ہونے کے اندیشے میں ماں کی پریشانی بڑھ گئی تھی۔ ساس اسے ہر وقت گالی گلوچ اور طعنوں و تشعشعوں سے نوازتی رہتی جس کی اب اسے رتی بھر پروا نہ ہوتی۔ اپنی من مانی کرتی۔ ساس کی خدمت گزاری کو تو اُس نے پس پشت ہی ڈال دیا تھا۔ وہ ساس کو اپنے

روئے سے گھر کی مالکن ہونے کا احساس دلانے لگی تھی۔ وہ مزید آیا بن کر زندگی نہیں گزارے گی۔ یہ اٹل فیصلہ بدلنا ناممکن ہو گیا تھا۔

ان حالات سے اور ماں کی روز بروز بڑھتی ہوئی شکایات سے تنگ آ کر خرم نے حدیقہ کو تین ماہ کے ویزے پر کینیڈا بلا لیا۔ وہ خوشی خوشی تیاری کرتے ہوئے سوچے جا رہی تھی کہ ایک بار کینیڈا چلی جائے، ماں بیٹے کو وہ مزا چکھائے گی کہ یاد ہی رکھیں گے کہ حدیقہ زیدی ایک عام سی لڑکی نہیں۔ وہ ماں کی طرح گھٹن زدہ زندگی گزارنے کے تصور سے لرز جاتی، مگر اگلے ہی لمحے وہ پہلے سے بھی سڑانگ ہو چکی ہوتی۔

ایئرپورٹ اسے ریسیو کرنے ہارون پہنچ چکا تھا۔ شیریں اور خرم، ہاسپٹل میں اپنی ڈیوٹی پر مامور ہونے کی وجہ سے نہ آ سکے۔ ہارون، حدیقہ کو گھر لے جانے سے پہلے ریسیورنٹ لے گیا۔ دونوں نے کھانا تناول کیا۔

حدیقہ جلد از جلد خرم کے پاس جانا چاہتی تھی۔ مگر ہارون ایکسائٹ منٹ میں ڈرائیونگ کو طوالت دیئے جا رہا تھا۔ یہاں رہنے کے تمام تجربات اس کی سماعتوں میں اُٹھ پٹنے خراماں خراماں وہ دو بیڈروم کے صاف ستھرے فلیٹ میں آ گئے۔

حدیقہ نے بلی بھر میں جھوٹے سے اس فلیٹ کا معائنہ کر لیا۔ خرم کے وجود کی خوشبو اسے فوراً ہی اپنے بیڈروم تک لے گئی۔ ہارون کی مدد سے اس نے اپنے دونوں اٹیچی کھولے اور الماری میں خرم کے کپڑوں کے ساتھ اپنے چند ضروری جوڑے لٹکا دیئے۔ ڈریسنگ ٹیبل پر میک اپ کا سامان سجا کر وہ باتھ روم میں چلی گئی۔

سفر کی تمام تھکان رفوچکر ہو چکی تھی۔ سولہ سنگھار کئے وہ اپنے پیا کا بے چینی سے انتظار کرنے لگی۔ جبکہ ہارون کچن میں کھانا پکانے میں مشغول ہو گیا۔ حدیقہ حیران و پریشان اس سیٹ اپ کو سمجھنے کی کوشش کرنے لگی۔

”حدیقہ! یوں حیرت و تجسس میں غوطے کھانے کی قطعاً ضرورت نہیں۔ جس ملک میں تم بڑے شوق و اشتیاق سے آئی ہو نا، وہاں کا ہر فرد اپنی ذات کا خود ساختہ ملازم ہے۔ میں کتنے ہی مہینوں تک پانی کے لئے شریف چاچا کو آواز دے کر ندامت سے ادھر ادھر دیکھنے لگ جاتا تھا کہ کسی نے سن تو نہیں لیا۔ مگر اب یوں لگتا ہے، جیسے اس معاشرے کے تمام اصولوں کا حصہ دار بن چکا ہوں۔ بغیر جاب کے بیوی اور سالے کے لئے کوکنگ کرتا ہوں اور دستخو ہوں پر خوب عیاشی کی زندگی گزار رہا ہوں۔ جو رو کا غلام کیسا نمک حلال ثابت ہوا ہے، ذرا غور کرو۔ ہارون خان گولڈ میڈلسٹ اس

منحوس ملک میں دو کوڑی کا ہو کر رہ گیا ہے۔ مگر بیگم اپنے ہی نشے میں مگن ہے۔ کتنی بار عرض کی کہ واپس چلتے ہیں مگر بھائی بہن مجھے بے وقوف سمجھ کر محض مسکرا دیئے کو کافی سمجھتے ہیں۔ خود غرضی تو ٹوٹ ٹوٹ کر بھری ہے اس خاندان میں۔ خود کو ملاحظہ فرماؤ کہ تمہارے ساتھ جو سلوک خرم اور اُس کی ماں نے روا رکھا ہے، کیا وہ سراسر زیادتی نہیں؟ میں تو خدا کا شکر ادا کرتا ہوں کہ تم اپنے حقوق کی خاطر کھڑی ہو گئی۔ ورنہ خرم نے تمہیں نہ بلانے کے تمام بہانے اور ہتھکنڈے سوچ رکھے تھے۔“ وہ پیپی کاٹن کھول کر اس کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا۔

”آج سے تم میری مہمان ہو۔ کل سے ہم دونوں تھے، کام چور اور بے روزگار لوگ مل کر کام کریں گے۔“

”ہارون! آج سے آپ کوئی کام نہیں کریں گے۔ حتیٰ کہ آپ پانی بھی میرے ہاتھ سے لے کر پیئیں گے۔ آپ کا مقام اور رتبہ بہت اعلیٰ ہے۔ آپ کہیں بھی آڈ جاب پکڑ لیں۔ کم از کم معروفیت ہی رہے گی۔“ وہ تاسف بھرے لہجے میں بولی۔ ”مگر کتنے دن؟ خرم نے تین مہینے کا دیدہ بھیجا ہے چلیں، تین مہینے تو آپ کو آرام دے ہی سکتی ہوں۔“

”ہیں..... سچ.....؟ خرم نے مجھ سے ذکر نہیں کیا۔“ وہ اچنبھے سے بولا۔
 ”کیسے کرتا؟ اُسے دوسروں کا مشورہ یا نصیحت بہت ناگوار گزرتا ہے۔ مگر ہارون! میں آپ کو بتائے دیتی ہوں، میں اب اُس ظالم ساس کے ہتھے چڑھنے والی نہیں۔ میں نے بہت کچھ سہہ لیا ہے، اب ہمت نہیں رہی۔“ وہ روہانی ہو گئی۔
 ”ہمت رکھو۔ ہم دونوں کل سے ہی جاب ڈھونڈنے نکلتے ہیں۔ کسی سٹور پر کیشئر کی جاب با آسانی مل جائے گی۔“

”اور مجھے ہاسپٹل میں۔ چاہے آیا ہی کیوں نہ بن جاؤں۔ پاکستان میں بھی تو اس بے فیض بڑھیا کی آیا گیری ہی تو کر رہی تھی۔“ وہ بے حد سنجیدہ ہو گئی۔

”ٹھیک ہے..... ایسا ہی کریں گے۔ ایک اور ایک گیارہ۔ ایک نہ ایک دن ہم بھی بہترین جاب پر کھڑے ہوں گے۔ اور آج کے بعد سب اپنا کام خود کریں گے۔ تم اور میں کسی کا کوئی کام نہیں کریں گے۔“ ہارون نے مستحکم لہجے میں کہا۔
 ”میں اپنے شوہر کی خدمت گزاری میں اپنی عزت سمجھتی ہوں۔“ وہ مسکرا کر بولی۔
 ”درست۔ آج کے بعد شیریں بھی مابدولت کی خدمت کرے گی۔“ وہ مسکرا دیا۔

”مشکل۔ بلکہ نامکن۔ لاڈ پیار اور چاؤ چونچلوں میں گھڑی بیوی استعمال شدہ کارتوس کی مانند ہوتی ہے۔ بے کار اور بد بودار۔“ وہ ناک چڑھا کر بولی۔

”تم میرا ساتھ دو گی تو اس بے کاری کو کارآمد بنالوں گا۔“ وہ شرارت سے بولا۔

”بھئی مجھے معاف رکھئے گا اپنے پراپیگنڈوں سے۔ وہ میری نند اور اپنے بھائی کی چیتھی بہن ہے اور اپنے میاں کی لاڈلی۔ جسے بیڈٹی کی عادت آپ نے ہی تو ڈالی تھی۔ آج بھی خاندان بھر میں آپ کی اس حرکت کو موضوع بنا کر مذاق اڑایا جاتا ہے۔ اور میری وہ ناقابل فہم ساس یہ سن کر کبر و پندار سے اکڑ جاتی ہے۔ کجنت کہیں کی۔ ایک گھر میں ایک قانون کو دو مختلف اشکال دینا کوئی اس بڑھیا سے سیکھے۔“ وہ دانت پیستے ہوئے بولی۔

”ویری گڈ۔ اب تمہاری زبان نے اس زمانے اور ماحول کے مطابق بولنا سیکھ لیا ہے۔ وہ چھوٹی موٹی حدیقہ کہاں چھوڑ آئی ہو؟“ وہ حیرت سے بولا۔

”اسے حالات نے زندہ درگور کر دیا ہے ہارون! اس دنیا کے باسی ذہن کو شعور، زبان کو قوت بیان اور دل کو تمام بے معنی جذبات سے عاری کرنے میں اپنی مثال آپ ہیں۔ خرم کے بغیر دو سال کا عرصہ کن اذیتوں میں بیتا، یہ صرف میں ہی جانتی ہوں۔ جب سب ہی بے حس ہو گئے تو میرے احساسات بیدار ہو گئے۔ میں بھی تو ایک بہت بڑے باپ کی جائز اولاد ہوں۔ تو میرج کی غلطی شیریں سے بھی سرزد ہوئی تھی۔ شیریں کی زندگی میں آپ ایک خوش آئند فوج لے کر نمودار ہوئے ہیں، اس لئے وہ ٹھہری خوش بخت۔ اور ہم ماں بیٹی کے نصیب گناہوں کی فہرست میں لکھ دیئے گئے۔“ وہ گھڑی کی طرف دیکھ کر بولی۔ ”خرم کب آئیں گے ہارون؟..... انتظار کی گھڑیاں کتنی طویل اور جان لیوا ہوتی ہیں۔ میں نے جب سے ہوش سنبھالا ہے، انتظار کو ہر دم اپنا راز داں پایا ہے۔ یہ کرب انتظار کب میرا پیچھا چھوڑے گا؟“

”اوہو..... تم تو بہت جذباتی ہو گئی ہو۔“ وہ اس کے اتنے قریب آ کر کھڑا ہو گیا کہ دونوں کے سانس کی تمازت ایک دوسرے کو چھونے لگی۔ حدیقہ دو گام پیچھے ہٹ گئی۔

”تم آرام کرو۔ میں بچوں کو سکول سے لے کر آتا ہوں۔ پھر تمہیں خرم کے پاس ہاسپٹل لے چلوں گا۔ تم تو اسے دیکھنے کے لئے بے چین ہو۔ نہ جانے خرم کے جذبات کا کیا حال ہے؟ کچھ علم نہیں۔“ وہ طنز سے بولا اور مسکرانے لگا۔

”مجھے تھکاؤ نہیں ہوئی ہارون! میں آپ کے ساتھ ہی چلتی ہوں۔“ وہ ایک دم

خوشگوار لہجے میں بولی۔ ”خرم کو سر پر اتر دیتے ہیں۔“
 ”گلد آئیڈیا۔ خرم کی ٹائٹ ڈیوٹی ہے۔ شیریں پانچ بجے تک گھر پہنچے گی۔ ویسے آپس کی بات ہے، اسے آج چھٹی لے لینی چاہئے تھی۔“ وہ اس کے دکھ کو کریدتے ہوئے بولا۔

”کاش خرم کے سوچنے کا انداز آپ جیسا ہوتا۔ میں جانتی ہوں کہ میں ان کے لئے کتنی اہم ہوں، ان کی نظر میں میرا کیا مقام ہے۔“ اس کی آواز بھرا گئی تھی۔ ”نہ جانے یہ کیسا پیار تھا کہ مجھے حاصل کرنے کے ساتھ ہی غائب ہو گیا۔“
 دونوں گاڑی کی جانب ہو گئے۔ ہارون نے دونوں بچوں کو سکول سے پک کیا اور ہاسپٹل کی طرف چل پڑے۔ مگر افسوس کہ خرم آپریشن تھیٹر میں مصروف تھا۔ حدیقہ سے ملاقات ناممکن تھی۔ آخر وہ گھر کی طرف مڑ گئے۔ حدیقہ کے چہرے پر خاموشی چھا گئی۔

”حدیقہ! دل برا نہ کرو۔ رات کو پھر ملنے کی کوشش کرتے ہیں۔ امید ہے، وہ فارغ ہو چکا ہو گا۔“ اس نے تسلی دیتے ہوئے کہا۔ ”ڈاکٹر کی زندگی بے حد ٹھٹ اور مصروف ہوتی ہے۔ مجھے تو اس کی عادت ہو چکی ہے۔ تم بھی عادی ہو جاؤ گی۔ اس سچائی اور حقیقت کو جتنی جلدی قبول کرو گی، تمہاری ذہنی صحت کے لئے بہتر ہو گا۔“
 ”آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔“ وہ ہنسی ہوئی آواز میں بولی۔ ”میں خرم کا گھر پر ہی انتظار کروں گی۔ بہتر یہی ہے۔ انتظار جو میرے نصیب نامہ میں ان گنت دفعہ لکھ دیا گیا ہے، جس کی اذیت ہر حال میں مجھے برداشت کرنا ہو گی۔“
 ”بچو! اپنی ممانی جان کو نرسری رائٹرنسنا کر دل بہلانے کی کوشش کرتے ہیں۔“ وہ شگفتہ لہجے میں بولا۔

”ڈیڈ! وائے ازشی سوسیڈ؟“ آیان نے حیرت سے پوچھا۔
 ”آپ کے ماموں انہیں لینے ایئر پورٹ نہیں پہنچے۔ ڈیڈ وائے شی ازشیڈ۔“ وہ شرارت بھرے لہجے میں بولا۔

”نو ڈیڈ! شی ازمسنگ ہرمام۔“ عریشہ نے آنکھیں مٹکا کر کہا تو ممانی نے اس کے گلابی رخسار پر بوسہ دیتے ہوئے کہا۔
 ”ایسی بات نہیں۔ آئی ایم ویری پیسی ٹوسی بوتھ آف یو۔ ہارون بھائی! کتنے پیارے بچے ہیں آپ کے، ماشاء اللہ۔“

”ڈیڈ! ممائی کو دواٹر پارک لے چلتے ہیں۔“ عریشہ نے لالچی فرمائش کی۔
 ”وائے ناٹ۔ بٹ شی از ویری ٹائیڈ ناؤ۔ ٹو مارو وی ول میک آپروگریم۔ کیوں
 مائی! ٹھیک ہے نا؟“ وہ بے حد اپنائیت سے بولا۔
 ”کل آپ جاب کے لئے جائیں گے۔ ایسے پروگرام بعد میں بننے رہیں گے۔
 دو سال ہونے کو آئے، آپ نے تو حد ہی کر دی ہے۔“ وہ بھی مسکرا دی۔ ”یعنی کل کا
 کام کل پر نہ کہ پرسوں پر۔ آپ سن رہے ہیں نا؟“
 ”تم بھی ساتھ چلو گی۔ پروگرام تو یہی بنا تھا نا۔“ وہ مسکراتے ہوئے بولا۔ ”دیکھو
 زندگی میں ایک ہمدرد کی سپورٹ کتنی اہم ہے۔“
 ”بھئی مجھے صرف دو دن کا آرام چاہئے۔ ذرا تھکن اُتار لوں، نیند پوری کر لوں تو
 پھر آپ کے ساتھ چل پڑوں گی جہاں کہیں گے۔“ وہ جمائی لیتے ہوئے بولی۔ ”خرم
 کے آنے تک مجھے سو جانا چاہئے۔ تاکہ جب انہیں ملوں تو فریش ملوں۔“
 ”آئیڈیا برا نہیں ہے۔ کم از کم انتظار کی تکلیف سے توجیح جاؤ گی۔“ وہ اس کی
 طرف دیکھ کر بولا۔ ”لیکن سوچ لو! یہ دو عدد شیطان تمہیں سونے دیں گے؟ یہ بھی تو
 اپنوں کے پیار کو ترسے ہوئے ہیں۔ تمہارا ناک میں دم کر دیں گے۔ رات کو بھی
 تمہارے پہرے دار نہ بن گئے تو میرا نام بدل دیتا۔“
 حدیقہ کے چہرے پر حیا کی قوس قزح ابھری اور غائب ہو گئی۔



”ہارون! آج کا کھانا تو کوئی جانور بھی کھانا پسند نہ کرے۔“ شیریں نے دوسرا
 نوالہ پلیٹ میں پھینکتے ہوئے ناگواری سے کہا۔ ”کب سے آپ کھانا بنا رہے ہیں،
 اناڑی کے اناڑی ہی رہے۔ بڑے افسوس کی بات ہے۔“
 ”خود بتا لو۔ مجھ سے ایسا ہی پکتا ہے۔“ ہارون نے قدرے غصے سے کہا۔ ”اس
 بے روزگاری نے میرے رول کو ریورس تو کر ہی دیا ہے، اب اور کیا چاہتی ہو؟“
 ”شیریں! صبر سے کام لو۔ ہارون دو دن سے خاصا مصروف لگ رہا ہے۔ نہ
 جانے کن چکروں میں ہے۔ میری سمجھ سے بالاتر ہے۔“ خرم نے مسخرا نہ انداز میں کہا۔
 ”نو کری کی تلاش میں گھر سے نکل پڑا ہوں۔ آخر جس کا کام اُسی کو سا مجھے غلط
 نہیں کہا گیا۔“ وہ قہر آلود لہجے میں بولا۔ ”اگر جاب نہ ملی تو ہم واپس چلے جائیں گے۔“
 ”یار! وہاں کون سا تمہاری جاب تھی؟ وہاں کے حالات ہمارے یہاں آنے

سے کون سا بدل گئے ہیں؟ اتنا بھی دل برداشتہ مت ہو جاؤ۔ سنا ہے، جلد ہی انجینئرز کی جابز آفر ہونے والی ہیں۔ ویسے بھی حدیقہ تین مہینے تو ہمیں خوب مزے دار کھانے پکا کر کھلا سکتی ہے۔ تین دن کے بعد مہمان کا درجہ بھی بدل جاتا ہے۔“ خرم، حدیقہ کی طرف دیکھ کر سنجیدگی سے بولا۔

حدیقہ خاموش رہی۔ ہارون ٹیبل سے اٹھا اور باہر نکل گیا۔
 ”ہیں..... یہ ہارون کو کیا ہو گیا ہے؟ ایسا غصہ اور ناراضگی پہلے تو کبھی دیکھنے میں نہیں آئی تھی۔“ شیریں حیرت سے بوکھلاسی گئی۔

”آج کے بعد اس پر آرڈر کرنا چھوڑ دو شیریں! اُس کی مردانگی کو کیوں جھنجھوڑتی ہو دوسروں کے سامنے؟ اسپیشلی حدیقہ کے سامنے تمہارا یہ ہنک آمیز رویہ وہ ہنس کر قبول کرنے سے تو رہا۔ میری بات اور ہے۔ ہماری بچپن سے ایک دوسرے سے اٹو دوستی رہی ہے۔ ہم چار میں حدیقہ آؤٹ سائیڈر ہے۔ پلیرز ذرا کیئرفل ہو جاؤ۔ سچ مچ کہیں واپس جانے پر بعد ہی نہ ہو جائے۔ مرد کی غیرت اور انا کے سامنے تمام ٹھوس دلائل بھی بے معنی ہو جاتے ہیں۔ نوبت وہاں تک نہیں پہنچنی چاہئے۔“ خرم نے نہایت سنجیدگی سے کہا۔

”آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ بے چارہ، حدیقہ کے سامنے غیرت کھا گیا۔ حالانکہ یہ اُردو اسپیکنگ شوہر تو بیوی کے نیچے لگے ہوتے ہیں۔ بیٹی کے رشتے کے لئے آئیڈیل ہوتے ہیں ایسے گھرانے۔“ وہ مسخر اڑاتے ہوئے ایک دم سنجیدگی سے بولی۔
 ”تین پنجابیوں میں رہے گا تو یہی کچھ سیکھے گا۔“

مرد، جسے اللہ تعالیٰ نے عورت سے برتر بنایا۔ اگر وہ بھی بے روزگار، مفلس اور محتاج ہو گا تو اس کی شریک حیات اسے کس قدر کم تر نظروں سے دیکھتی ہے۔ عورت جو کہ ہے ہی مرد سے کم تر۔ اس کا شوہر اس کا نان نفقہ پورا کرنے پر اپنی برتری کو کیونکر نہ جتائے؟ آج تک انسانی فطرت کو کوئی قانون یا اصول بدل نہیں سکا۔ حدیقہ نے دل میں سوچا اور افسردگی سے خرم کی طرف دیکھنے لگی جو اسے مسلسل اگتور کئے جا رہا تھا۔ اس کے آنے کی خوشی کی ہلکی سی رمت بھی اس کے چہرے پر نظر نہ آئی تھی۔ مگر حدیقہ صبر کا دامن تھامے ہوئے تھی۔

دونوں بہن بھائی جاب پر چلے جاتے تو یوں محسوس ہوتا جیسے گھر میں اطمینان اور سکون کی لہر دوڑ گئی ہو۔ کیونکہ خرم کا رویہ ایسا روح فرسا ہوتا کہ وہ ڈری سہی سب کے آگے

پیچھے بھاگتی کسی جنگ عظیم کو نظر انداز کرنے میں کوشاں رہتی۔ جونہی دونوں باہر نکلتے، ہارون اس کے ہاتھوں پر اپنے ہاتھ مار کر اسے متزلزل ذہنی کیفیت سے باہر لے آتا۔



آج دونوں کا اندر ویو تھا۔ مگر خرم اور شیریں کو کانوں کان خبر نہ تھی۔
دونوں تیار ہو کر نکل رہے تھے کہ خرم نے آ پکڑا۔ حیرت سے دونوں کا جائزہ لیتے ہوئے ذہن کو تمام شکوک و شبہات سے پاک کرتے ہوئے بولا۔
”دونوں بہن بھائی کہاں جا رہے ہیں؟ ذرا ہم بھی تو جانیں۔“
”خرم! جب سے حدیقہ آئی ہے، ایک بار بھی باہر لنچ یا ڈنر کے لئے ہمارا جانا نہیں ہوا۔ آج میں نے سوچا، بچوں کو سکول سے لے کر لنچ باہر ہی کیوں نہ کر لیا جائے۔“ وہ نہایت خود اعتمادی سے بولا۔
”نہیں بھئی۔ اکیلے عیاشی نامنتظر، نامنتظر۔ سب مل کر چلیں گے۔“ خرم نے قدرے شوخی سے کہا۔

”ہارون! خرم ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ اس ویک اینڈ پر پروگرام بناتے ہیں کوئی ایکسٹینگ سا۔ مزہ رہے گا۔“ حدیقہ نے فوراً ہاں میں ہاں ملائی تو خرم نے اسے کھا جانے والی نظروں سے گھورا اور دانت پیس کر رہ گیا۔ وہ نظریں جھکائے ایک مجرم کی مانند کھربے میں کھڑی وجود کی تہوں تک لرز گئی۔
خرم تیزی سے کمرے کی طرف چلا گیا۔

حدیقہ نے ہارون کو اشارے سے اپنی پریشانی بتائی تو ہارون نے بھی اشارے سے اسے بھرپور تسلی دینے کی کوشش کی۔

اپنے اندرونی خدشات پر قابو پا کر وہ کمرے میں چلی گئی۔ خرم الماری سے کچھ ڈاکومنٹس نکالنے میں محو تھا۔ حدیقہ نے پیچھے سے اسے ہگ کیا۔ خرم نے ایک جھٹکے کے ساتھ اسے چند فٹ دور فرش پر گرادیا۔ سردیوار سے نکرانے کی وجہ سے وہ درد سے چیخ اٹھی۔ پیشانی سے خون کا فوارہ ابل پڑا۔ ہارون بھاگتا ہوا اندر آ گیا۔

”کیا ہوا خرم؟“ اس نے حدیقہ کو سہارا دے کر کھڑا کرتے ہوئے کہا۔

”آئی ایم سوری جان!“ خرم ایک دم ندامت سے پلٹا۔ حدیقہ کو بازوؤں میں بھر کر بیڈ پر لٹا دیا۔ ہارون فرسٹ ایڈ کٹ خرم کے ہاتھ میں تھا کرتھا کر تاسف بھری نظروں سے دیکھتا ہوا گھر سے باہر نکل گیا۔ خرم کے چہرے پر پھیلی ہوئی شرمندگی کی

سیاہی ایک دم کافور ہو گئی اور ڈرینک کرتے ہوئے خفگی سے بولا۔
 ”یہ بچکانہ حرکتیں مجھے ہرگز پسند نہیں ہیں۔ میں ضروری پیمپرز ڈھونڈ رہا تھا۔ آنا
 فانا ایسی بھی کیا محبت در آئی تھی کہ.....“

خرم نے جملہ نامکمل چھوڑ دیا۔ حدیقہ سر کی چوٹ کی تکلیف کو یکسر ہی بھول گئی۔
 شوہر کا سلوک اور لب و لہجہ اسے مزید زخمی کر گیا۔ آنکھیں سادون بھادوں کی مانند
 برسنے لگیں۔

خرم نے اس کے آنسوؤں کی پروا کئے بغیر ڈرینک مکمل کی اور پاؤں پٹختا ہوا باہر
 نکل گیا۔ گاڑی اشارت ہونے کی آواز آئی اور فضا میں ایک غصے کی لہر دوڑی اور
 گاڑی یہ جاوہ جا ہو گئی۔

ہارڈن ہارڈویئر کمپنی میں انڈیو دینے گیا ہوا تھا۔ مگر ناکامی کا سامنا کرنا پڑا۔
 قسمت نے آج بھی یادری نہ کی تھی۔ اسے کاؤنٹر جاب بھی ڈھونڈنے میں دقت ہو
 رہی تھی۔ اپنے اسٹیشن کے مطابقت برسر روزگار ہو جانا تو جوئے شیر لانے کے
 مترادف تھا۔

دل حدیقہ سے کئے جانے والے ناروا سلوک کی وجہ سے ہڈ مالال بھی تھا۔ اس پر
 طرزہ یہ کہ ایک معمولی ملازمت نے بھی اسے قبول نہ کیا تھا۔ بچوں کو سکول سے لے کر
 اس نے کے ایف سی سے برگرز پیک کروائے اور گھر آ گیا۔ حدیقہ تکلیف کی شدت
 میں تڑپ رہی تھی۔ بمشکل وہ چکراتے ہوئے سر کے ساتھ اٹھ کر فریج کے پاس آئی
 تھی۔ پانی کی بوتل لے کر اپنے کمرے میں واپس آئی اور پین بھر لے کر لیٹی ہی تھی
 کہ ٹیلی فون کی بیل اس کے سر کے اندرون خانہ تک گونجتی ہوئی درد میں مزید اضافہ کر
 گئی۔ وہ سر پکڑ کر کراہنے لگی۔ فون مسلسل بجے جا رہا تھا۔ ہو سکتا ہے خرم نے احوال
 پوچھنے کی جسارت کر لی ہو۔ ہو سکتا ہے اپنی زیادتی کا احساس ہو گیا ہو۔ ہو سکتا ہے
 آج کے بعد خرم کا رویہ مجھ سے بہتر ہو جائے۔ پل بھر میں ”ہو سکتا ہے“ کی گردان
 کرتے ہوئے نہایت خوش فہمی سے اس نے تیزی سے فون اٹھا لیا۔ درد کے باوجود
 بدن میں پھیری سی آگئی تھی۔ دوسری جانب سے آواز سن کر بچوں کی مانند چہرہ فریاد
 سے تپ اٹھا۔ مگر آواز کو ہشاش بشاش کرتے ہوئے بولی۔

”ماما! خیریت تو ہے؟ آپ ابھی تک سوئی نہیں؟“

”تم ٹھیک ہو؟“ ماں کی مامتا تڑپی۔ ”مجھے تم پریشان لگ رہی ہو۔ میں بہت بے

سکون ہوں میری بچی! خرم تمہارے ساتھ کیسا ہے؟ خوش ہے نا؟“
 ”جی ماما! آپ ہر بار یہ سوال کیوں کرتی ہیں؟ میں بہت خوش ہوں۔ شیریں اور
 ہارون بھی میرا بہت خیال رکھتے ہیں۔ دو منے معصوم فرشتوں کا تو جواب ہی نہیں۔ ماما!
 کاش میری جھولی بھی اس نعمت سے لبریز ہو جائے۔ دعا کیا کریں۔ باقی میری زندگی
 میں اور کوئی غم اور کمی نہیں ہے۔“ وہ خود اعتمادی سے بول رہی تھی۔

”سکامپ پر آ سکتی ہو؟ بہت دن ہو گئے تمہیں دیکھے ہوئے۔ آنکھیں ترس گئی
 ہیں تمہیں دیکھنے کو۔ اللہ تمہیں خوش رکھے۔“ ماں نے التجائیہ انداز میں کہا۔

”ماما! اس وقت آپ کے پاس رات کے دو بج رہے ہیں۔ آپ سو جائیں۔ میں
 بھی اس وقت کھانا پکا رہی ہوں۔ خرم اور شیریں کے آنے کا وقت بھی ہو چلا ہے۔ پھر
 کسی دن سکامپ پر آ جاؤں گی۔ بلکہ آپ خرم اور شیریں سے بھی بات کر لیجئے گا۔“
 وہ ماں کو ٹال رہی تھی۔ اور ماں اس کے لہجے کے اتار چڑھاؤ سے اندازہ لگا چکی تھی کہ
 وہ نہ جانے کیوں پلو چھڑانے کی کوشش کر رہی ہے۔

”سچ کہہ رہی ہوتا؟“ وہ فکر مندی سے بولی۔

”جی ماما! اس وقت میں گھر میں مصروف ہوتی ہوں۔ میں نے اپنا شیڈول آپ
 کو بتایا ہوا تو ہے۔ ہر وقت فکر نہ کیا کریں۔ تھوڑا سا وقت آپ کے لئے اور میرے
 لئے مشکل ہے۔ پھر آپ کو اپنے پاس بلا لوں گی۔“ وہ نہایت تسلی بخش لہجے میں بولی۔
 ”بیٹا! تم اپنے گھر میں خوش و خرم رہو۔ بھلا میں داماد کے گھر کیسے رہ سکتی ہوں،
 جس نے آج تک کبھی مجھے فون تک نہیں کیا۔ سدا آباد رہے۔ کوئی بات نہیں۔ ایسے
 بھی ہوتا ہے دنیا میں۔ اس سے کہیں گلہ شکوہ نہ کر بیٹھنا۔ کیونکہ اس کا انجام عموماً
 جھگڑے و فساد پر ختم ہوتا ہے۔ دوسرا کوئی بھی اپنی غلطی مان کر خود کو راہِ راست پر
 لانے کی ضرورت محسوس نہیں کرتا۔ پھر ایسی بیوی اور ساس کے لئے جو اس بھری دنیا
 میں بالکل تنہا اور لاوارث ہوں۔ بس اس کی عزت و تکریم میں تمہاری طرف سے کوئی
 شکایت نہیں ہونی چاہئے۔ میری فکر مت کرو۔ میں تمہارا نام لے لے کر جیتی ہوں اور
 مطمئن اور خوش رہتی ہوں۔“ ماں نے پیار سے سمجھایا۔

”آپ درست فرما رہی ہیں ماما! میں چلتی ہوں۔ پتہ چلے کھانا جلا بیٹھی ہوں۔
 خرم کو کھانے میں جلے کی مہک بالکل پسند نہیں۔ موڈ خراب کر لیتے ہیں۔ آپ جانتی تو
 ہیں کہ مرد تو فطرتاً ہی بہت سخت مزاج کے ہوتے ہیں۔“ وہ بمشکل بول رہی تھی۔

”میری بیٹی آج کیا پکا رہی ہے؟ ذرا میں بھی تو سنوں۔“ ماں نے ایک اور پتہ پھینکا۔

”ماما! میں..... میں کیا پکا رہی ہوں؟ ماما! بس ایسے ہی معمولی سا۔ یعنی چکن پلاؤ اور تورمہ۔ خرم کو دہی کھانے بے حد پسند ہیں۔ شیریں کی بھی فرمائش یہی ہوتی ہے۔“ ماں نے اس کا جھوٹ تو پکڑ لیا مگر جتنا بہتر نہ سمجھا اور مسکرا کر بولی۔

”اچھا بیٹا! جاؤ۔ لذیذ کھانا پکا کر سب کو خوش کر دو۔ عورت کا سکون اسی میں ہے۔“

”چاول دم دینے جا رہی ہوں۔ میں کل آپ کو فون کروں گی۔ اوکے ماما! اللہ حافظ۔“ اس نے ریسیور کر یڈل پر رکھا اور چکراتے ہوئے تکیے پر گر گئی۔

ہارون نے تمام گفتگو سن لی تھی۔ رحم اور ترس اس کی نس نس میں سرایت کر گیا تھا۔ ازراہ ہمدردی وہ اس کے قریب آ کر کھڑا ہو گیا اور آہستہ آہستہ سر کو سہلانے لگا۔ حدیقہ نے اس کا ہاتھ پکڑ کر آہستگی سے کہا۔

”آئی ایم فائن ہارون! ڈونٹ وری۔ انڈیو کیسا رہا؟“ اس نے موضوع بدلنے ہوئے کہا۔

”جس کام کی شروعات ہی پریشانی اور ناامیدی سے ہو تو کامیابی کیسے ممکن ہے؟ نہ جانے باری تعالیٰ کی طرف سے کیا منظور ہے؟ اپنے ملک نے مجھے جاب کے قابل نہ سمجھا تو یہاں عزت افزائی کیونکر ہوگی؟ جگہیں بدلنے سے، ماحول چیلنج کرنے سے قسمیں بدلتی ہوں تو کوئی انسان ناخوش نظر نہ آئے۔ ہمارا ایمان کس قدر کمزور ہے۔“ وہ پڑمردگی سے بولا۔

”میں تو پھر بھی مرد ہوں۔ بیوی کو دو چار کڑوی کیلی سنا کر مطمئن ہو جاتا ہوں۔ اسے اپنی کم مائیگی کا احساس دلا کر ہمدردی اور پیار بھی وصول کر لیتا ہوں۔ کیا کروں اس دل کا؟ تم تو قابل رحم بن کر میرے حواس پر چھائی رہتی ہو۔ تمہاری شنوائی کہیں نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ تم عورت ہو جس کا فرض بنتا ہے کہ سب کی خدمت کرے، منہ پر تالا لگا کر۔ چلو تین مہینوں میں سے کچھ دن تو کم ہوئے۔“

وہ خاموشی سے اس کا منہ ٹکتی رہی۔ اس نے تو اسے یہاں سنے کرنے کے تمام قوانین سمجھائے تھے، اب وہ جانے کی بات کر رہا تھا۔

”حادی! اگر خرم کا تمہارے ساتھ یہی رویہ رہا تو بہتر ہے کہ ویزے کی مدت پوری ہونے کے بعد واپس چلی جاؤ اور پھر کبھی نہ آنا۔ خرم خود ہی بندہ بن جائے گا۔“

”یہ آپ کی خوش فہمی ہے۔ اسے میری قطعاً ضرورت نہیں۔ فقط ماں کی نگہداشت

کے لئے نرس چاہئے۔ بیوی یا بہو نہیں۔ لیکن میں نے بھی انہیں سبق سکھانے کا سوچ لیا ہے۔“ وہ تذبذب میں بولی۔ ”بس سوچ رہی ہوں کہ ایسا کیا کروں؟“

”خرم بہت ضدی اور بے وقوف انسان ہے۔ اس کی فطرت سے تم واقف نہیں ہو۔ بے شمار مثالیں تمہارے سامنے موجود ہیں کہ جس کام کا وہ فیصلہ کر لیتا ہے، ہر قیمت پر پائیہ تکمیل تک پہنچا کر چین سے بیٹھتا ہے۔ چاہے اس میں اس کو خسارہ ہی کیوں نہ ہو۔ ایسی ہی فطرت شیریں نے پائی ہے۔ میں نے تو اس کماؤ بیوی کے سامنے ہار مان لی ہے۔ زن مرید ہونے کی ڈگری حاصل کر چکا ہوں۔“ وہ ماحول کو بہتر بنانے کے لئے ہنسنے لگا۔

”یہ ڈگری خرم کو کبھی دلا دیں پلیز ہارون بھائی! ورنہ اتنی پہاڑی زندگی کیسے بیت پائے گی؟“ وہ حسرت و یاس کی تصویر بنی ہوئی تھی۔

”چھوڑو! باتوں کو۔ فی الحال انجوائے کرتے ہیں۔ تم تو آج کھانا پکانے سے فارغ ہو گئی ہو۔ شیریں کیا یاد کرے گی، کھانا میں بھی نہیں پکاؤں گا۔ بہن بھائی خود ہی آکر چولہا جھونکیں یا بھوکے سونیں۔ مجھے کوئی سروکار نہیں ہے۔“ وہ چپکے لیتے ہوئے بولے جا رہا تھا۔

”نہیں ہارون! ایسا نہیں کرنا چاہئے۔ دونوں دن بھر کے تھکے ماندے گھر آکر کھانا خود پکا کر کھائیں گے۔ اس اِزناٹ فیئر۔ میں کچھ نہ کچھ کر لوں گی۔“ وہ اٹھنے کی کوشش کرنے لگی۔ مگر سر بری طرح چکرا رہا تھا۔

ہارون نے جلدی سے اسے پانی پلایا اور اس کے پیچھے تکیہ رکھ کر نیم دراز حالت میں اسے برگر کھلانے لگا۔ وہ برگر کھاتے ہوئے مسلسل روئے جا رہی تھی۔ بچے اس کو روتا دیکھ کر حیران و پریشان اسی کے ساتھ بیڈ پر لیٹ کر سو گئے۔



”میرے آنے کی خوشی کی ہلکی سی رمت بھی آپ کے چہرے پر نظر نہیں آتی۔ میں نے تو دو سال کا عرصہ ہر لمحہ آپ کی یاد میں گزارا تھا۔ لیکن مجھے محسوس ہو رہا ہے کہ میں غلطی پر تھی۔ مجھے ضد کر کے یہاں نہیں آنا چاہئے تھا۔“ وہ خرم کے جذبات سے عاری چہرے کا جائزہ لیتے ہوئے شکایت کے انداز میں بولی۔

”بہت جلد اپنی غلطی اور ضد کا احساس ہوا ہے۔ تمہاری عقل کا جواب نہیں۔ ماں بے چاری اتنے بڑے گھر میں اکیلی ہیں۔ اولاد کیا اس لئے ہوتی ہے کہ یوں بڑھا پے

اور بیماری کی حالت میں انہیں بے یار و مددگار چھوڑ دیا جائے؟ تمہارے ہر وقت کے رونے دھونے نے مجھے تمہیں یہاں بلانے پر مجبور کر دیا۔ تمہارا باغیانہ رویہ، ادھ مائی گاڈ!..... اور ماں کے ساتھ زبان درازی بتاؤ کیسے بھول جاؤں؟ تم جانتی ہو، مجبوری اور زبردستی کے رشتے میں سکون و طمانیت اور مسرت کا دخل نہیں ہوتا، فقط انتظار ہوتا ہے وقت کے بیت جانے کا۔“ وہ سخت ناگواری سے بولا۔

”آپ نے میرے دل کی بات کہہ دی۔ آپ کو ماں جی کو یوں تنہا چھوڑ کر یہاں نہیں آنا چاہئے تھا۔ آپ کو اس لاپرواہی اور بے توجہی کی سزا ضرور ملے گی۔ ماں کی لک آفرز کرنا آپ کا فرض بنتا ہے۔ اسی طرح میں اپنی ماما کے بڑھاپے کا سہارا بنوں۔ اسلام نے اولاد کے لئے یہی حکم دیا ہے۔“ وہ سوچ بچار کے بعد بولی تھی۔

”بڑی پتے کی بات سمجھا رہی ہو۔“ وہ غصے سے بولا۔ ”جب تک ماں جی ہمارے درمیان ہیں، تمہیں ان کے پاس رہنا پڑے گا۔ بہو کا رول یہی ہے۔ ہم اپنی روایتوں میں جکڑے ہوئے دیسی لوگ ہیں حدیقہ! یہاں لڑکی کی شادی، واحد لڑکے سے نہیں ہوتی بلکہ اس کے خاندان سے ہوتی ہے۔ تم کیا جانو؟ تمہارا اپنا خاندان ہوتا تو تم جان پاتی۔“

”شیریں کے بارے میں کیا خیال ہے؟“ وہ تلخی سے بولی۔

”ہارون اور شیریں کے معاملے میں تم بولنے والی کون ہوتی ہو؟“ وہ چیخ اٹھا۔

”کول ڈاؤن خرم!..... دنیا کو اپنی بے انصافانہ اور جاہلانہ سوچ کے بارے میں شور مچا کر اکٹھا مت کریں۔ یہ پاکستان نہیں۔ غصہ تھوک دیں اور گہری میٹھی نیند سو جائیں۔ آپ کی حادی، جس کے بغیر آپ رات بھر سو نہیں پاتے تھے اور فون پر جس کی آواز سن کر دل بہلایا کرتے تھے، آج آپ کی بغل میں لیٹی ہوئی ہے۔ آپ کے بستر کی رونق بنی ہوئی ہے۔ اس وقت ایسی غصیلی باتیں کرنے کا وقت نہیں ہے۔“ وہ طنزیہ بولی تو خرم نے ایک جھٹکے سے اسے خود سے دور کیا اور کروٹ بدل کر سو گیا۔

کینڈا، خرم کے ساتھ گزرنے والی ہر رات ہی بے آبرو اور توہین آمیز تھی۔ وہ اس کی طرف پیار و لگاؤ سے دیکھنے کا روادار نہ تھا۔ بیٹے ہوئے لحوں کے کرب کی شدت آج کے اپنی سوڈ کے بعد مزید بڑھ گئی تھی۔

کس قدر بے حس اور خود غرض انسان سے پالا پڑا ہے۔ ضرور ڈیڈی بھی ایسی ہی فطرت کے ہوں گے جو ماما کو چھوڑ گئے۔ شاید یہ تو میرج کا قصور ہے یا ہماری کم

مانگی ہمارا جرم ہے۔“ وہ بڑبڑائی تو خرم نے سوتے میں کروٹ بدل لی۔
 ’اچھوڑ ماں کا بے بی۔ اس نے اس کی طرف دیکھا۔ ماں جی کو یہاں کیوں نہیں
 بلا لیتا؟ یا واپس کیوں نہیں چلا جاتا؟ وہاں ہمیں کس چیز کی کمی ہے؟ محل جیسا ہمارا گھر
 اور دنیا کی ہر آسائش اور زیبائش سے آراستہ و پیراستہ۔ اور پھر اپنے ملک میں ہمارا
 نام اور پہچان۔ یہاں کیا رکھا ہے؟ شب و روز کی ذالالت اور مشقت۔ جہاں انہوں
 سے بات کرنے کا وقت ہی نہیں ملتا۔ ہاں، ڈالر کی چمک نے اندھا اور بہرہ کر دیا
 ہے۔ کیونکہ لالچی انسان ہمیشہ ہی مفلس اور غریب رہتا ہے۔ اسے ہر وقت امیر بننے
 کی کاوش میں دن رات ایک کرنے پڑتے ہیں۔ خرم! قصور تمہارا نہیں۔ تم بھی تو اسی
 دنیا کے باشندے ہو۔ لالچی اور مفلس۔“

کروٹ بدلتے ہوئے وہ درد سے بلک اٹھی اور ذہن سے تمام تلخیوں اور
 ترشیوں کو بھلانے کی کوشش کرنے لگی۔ خرم بے پروا نہایت لائق سے خرائے لے
 رہا تھا۔ وہ اس کی بے حسی پر آنسو بہاتی لاؤنج میں صوفے پر نیم دراز ہو کر اپنی قسمت
 پر ماتم کرنے لگی۔

اسی عالم میں صبح ہو گئی۔ خرم اور شیریں تیار ہو کر لاؤنج میں آ گئے۔ حدیقہ پر
 سرسری نظر دوڑا کر بچن کی طرف مڑ گئے۔ خرم نے کافی بنائی اور شیریں نے ٹوسٹر سے
 ٹوسٹ نکال کر ان پر نیم اور کھن لگایا اور ایک دوسرے سے گپ شب لگاتے کھانے
 لگے۔ پھر کافی کے مگڑ ہاتھ میں لئے گاڑی کی چابی اٹھائی اور باہر نکل گئے۔

حدیقہ جو صوفے پر نیم دراز تھی، حیرت و تاسف سے کھڑی ہو کر کھڑکی سے باہر
 بہن بھائی کو جاتے دیکھنے لگی جن کے چہروں پر پچھتاوے یا افسوس کی ہلکی سی جھلک
 بھی نہ تھی۔ ہنستے مسکراتے، باتیں کرتے آنکھوں سے اوجھل ہو گئے۔

’خرم! تم اتنی جلدی بدل جاؤ گے، میں نے کبھی سوچا بھی نہ تھا۔ کاش میں بھی
 اولاد والی ہوتی تو شاید آج اس کی وساطت سے ہی خرم کی منظور نظر بن جاتی۔ میرے
 اندر ماں کا دل دھڑکتا ہے۔ روح تشنہ ہے اولاد کے بغیر۔ خرم کیوں نہیں سمجھتا؟ ہر بار
 میری اس خواہش کو کیوں رد کر دیتا ہے؟ ایسے گمان ہوتا ہے، جیسے وہ مجھ سے جان
 چھڑانا چاہتا ہو۔ اُف! آئی ایم سوہیلپ لیس۔ ماں کے فوجہ کے لئے حفظِ ماتقدم
 اولاد ہی تو ہے۔“

وہ ادھیڑ بن میں اپنے کمرے میں آ کر بستر پر لیٹ کر سونے کی کوشش کرنے لگی۔

جب اس کی آنکھ کھلی تو دن کا ایک بج رہا تھا۔ ہارون بچوں کو پک کرنے جا چکا تھا۔ اس نے اٹھنے کی کوشش کی مگر وہ اٹھ نہ سکی۔ ہارون کو فون کیا مگر فون ریپلائے تھا۔ شاید وہ ڈرائیونگ کر رہا تھا۔ وہ یہی سوچ رہی تھی کہ باہر گاڑی رکنے کی مخصوص آواز آئی۔ بچے کے ہنسنے اور لاڈ و پیار میں ڈوبی ہوئی۔ ہارن کی آواز کی کھنک دل کو بے قرار کر گئی۔

عورت ماں کے روپ میں کس قدر مکمل اور حسین لگتی ہے کہ مرد اس کی اُن گنت خامیوں کو بھی نظر انداز کر دیتا ہے۔ اس نے حسرت سے سوچا۔ کیا مجھ پر بھی کبھی یہ خوب صورت وقت آئے گا؟

اسی اثناء میں باہر کا دروازہ کھلا اور دونوں بچے اُچھلتے کودتے ممانی کے کمرے میں آ گئے۔ ہارون نے کھڑکی کے پردے ہٹاتے ہوئے اپنائیت سے کہا۔
”حادی! اٹھ جاؤ۔ بھوکی پیاسی کب تک لیٹی رہو گی؟“

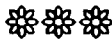
حدیقہ کے چہرے پر نظر پڑتے ہی اس نے اپنی چیخ اندر ہی دبا لی۔ سر پر چوٹ کی وجہ سے پیشانی اور آنکھوں کے ارد گرد دم کے ساتھ نیل بڑ چلے تھے۔
”حدیقہ! ہمت کر کے اُٹھو۔ میں تمہارے لئے پین کیس لایا ہوں۔ تم کھانا شروع کرو۔ میں گرم گرم دودھ کا گلاس لاتا ہوں، پھر دو کھا کر آرام کرنا۔“ اس نے بے حد ہمدردی سے کہا تو وہ اس کا دل رکھنے کے لئے مسکرا دی۔
”دراصل رات بھر نیند نہیں آئی۔“

”چلو اچھا ہوا تم نے اپنی نیند پوری کر لی۔“ وہ یہ کہہ کر باہر نکل گیا۔ اور دوسرے کمرے میں جا کر خرم کو فون کرنے لگا۔

”ہارون! تم نے جو کہنا تھا، کہہ لیا۔ اب میری سنو۔ میں تمہیں اپنے ذاتی معاملات اور مسائل میں آنے کی قطعاً اجازت نہیں دوں گا۔ میں بہت اچھی طرح جانتا ہوں کہ مجھے کیا کرنا چاہئے۔“ وہ نہایت رکھائی سے بولا۔

”ٹھیک ہے۔ آئندہ ہرگز دخل اندازی نہیں کروں گا۔ مگر میری ایک بات یاد رکھنا، یہی حال رہا تو تم کسی بھی وقت پولیس کے چنگل میں پھنس سکتے ہو۔“ ہارون نے غصے سے کہا اور فون بند کر دیا۔

”لگا ہے دھمکیاں دینے۔ آیا بڑا ہمدرد حدیقہ کا۔“ اس نے نفرت سے کہا اور اگلے مریض کی فائل کھول کر پڑھنے لگا۔



”شیریں کی تو نائٹ ڈیوٹی ہے۔ نہ جانے خرم کہاں رہ گیا۔“ ہارون نے فکر مندی سے حدیقہ سے کہا۔

”ہو سکتا ہے، بے چارے کہیں کھانے کے لئے رک گئے ہوں۔ آپ نے اپنی مردانہ غیرت کو پیدا کرنے کا غلط وقت چنا ہے۔ کیا میرے آنے پر ہی آپ کی انا اور خود داری کی آمد لازم تھی؟“ وہ چھیڑتے ہوئے بولی۔ ”میں کھانا پکائے دیتی ہوں۔“ ”ذرا آئینے میں اپنی شکل تو دیکھو اور اپنا ٹمپریج چیک کر لو۔ پھر فیصلہ کرنا کچن میں جانے کا۔“ وہ زچ ہو کر بولا۔ ”آرام سے لیٹی رہو۔ ورنہ میں بھی بول چال بند کر دوں گا۔ پھر روتی پھر دوگی۔“

”میں نے نوٹ کیا ہے۔ اس گھر میں دھمکیوں کے علاوہ اور کوئی بات ہی نہیں ہوتی۔ ہر بندہ ہوا کے گھوٹے پر سوار ہے۔ نفسا نفسی کا عالم ہے۔ ساری توجہ پیسہ کمانے پر ہے۔ کس قدر منحوس جگہ ہے یہ۔ اپنے ملک میں ہم شہنشاہوں جیسی زندگی بسر کرتے ہیں، پھر بھی ناخوش اور ہر وقت کی تنقید۔ یہاں ہماری زندگی کی کمینوں جیسی ہے، پھر بھی فخر و غرور میں پھولے نہیں سماتے۔“ وہ اضطراب سے بولی۔

”یہ دونوں بہن بھائی، ہم دونوں کے لئے پین ان دایک بن چکے ہیں۔ میری طرح گلوہنا چھوڑ دو اور جلد از جلد صحت یاب ہو جاؤ۔ کیونکہ ہم دونوں نے جاب پکڑنی ہے۔ چاہے کتنی ہی گھٹیا اور گئی گزری کیوں نہ ہو؟ تمہیں اپنا مشورہ یاد ہے نا؟“ وہ سنجیدگی سے بولا۔

”مجھے یاد ہے۔ لیکن دن تو پُر لگا کر اڑتے جا رہے ہیں۔“ وہ بے بسی سے بولی۔ ”دوائی نام پر اور آرام بے حساب اور وقت بے وقت۔ اس فارمولے پر عمل کرو گی تو تب ہمارے خواب خوش آئند تعبیر کے حامل ہوں گے۔“ وہ چائے کا مگ پکڑاتے ہوئے بولا۔ ”ویسے تمہارے آنے سے میری ذمہ داریوں اور خالمر داریوں میں کافی حد تک اضافہ ہی ہوا ہے۔ اب تو مجھے گھر داماد ہونے کا جان لیوا احساس پشیمان کرنے لگا ہے۔“

”آپ ہر وقت کریبنگ کرتے رہتے ہیں۔ کیا سچ مچ آپ اپنی ازدواجی زندگی سے مطمئن نہیں ہیں یا ویسے ہی ازراہ مذاق ایسی باتیں کرتے رہتے ہیں؟“ وہ استہزائیہ انداز میں پوچھ رہی تھی۔

ہارون نے مسکرا کر ٹال دیا اور گفتگو کا موضوع بدل ڈالا۔

”میں پاکستانی ریستورنٹ سے کھانا لے کر آتا ہوں۔ بچے بھی بھوکے بے حد خوش بیٹھے کھیل رہے ہیں۔ انہیں فاقہ کشی بلیگ لگتی ہے۔ اور تم اور میں تو ہیں ہی اس قدر کتے، ہڈ حرام اور بے روزگار۔“ وہ کراہت سے بولا۔

”ایسی بھی بات نہیں جناب! تھوڑا سا انتظار کریں۔ ریڑھی یا چھابڑی لگا کر اپنی بے روزگاری کو بھگا دیں گے۔“ وہ تسخرانہ انداز میں بولی۔ ”وہ دونوں بہن بھائی ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے دن بہ دن مستحکم اور مضبوط ہوتے جا رہے ہیں تو ہم دونوں بہن بھائی مل کر کیا کوئی کام نہیں کر سکتے؟“

”ویسے تمہاری باتوں میں سنجیدگی کی ہلکی سی جھلک بھی نظر نہیں آتی۔“ وہ مسکرا

دیا۔

”بھئی مجھے جاب نہ ملی تو کوئی چھوٹے موٹے بزنس کا ہی سوچ لیتے ہیں۔ ایک دن میلینز بن جائیں گے۔ بہن بھائی کو پنے نہ چہوا دیئے تو آپ کا تیا م ہارون اور میرا نام حدیقہ زیدی نہیں ہوگا۔“ وہ بمشکل بولتے ہوئے چھیڑے جا رہی تھی۔

”ویسے حدیقہ! ایک بات کہوں، تم ہنتے ہوئے کتنی حسین لگتی ہو۔ لبوں کی مسکراہٹ آنکھوں میں بھی عود کر آتی ہے۔ جھرنے اور پہاڑ کی چوٹی سے بہتے آبشار جیسی کھنک ہے تمہاری ہنسی میں۔“ وہ بے حد پیار سے بولا۔

”یہ شاعری شیریں کے سامنے جھاڑیے جناب! مجھے یہ سن کر کوئی خاص خوشی نہیں ہوئی۔“ وہ پھر کلیوں کی مانند دبی دبی ہنسی میں بولی۔

”یہ جو ڈاکٹروں کی قوم ہے نا، صرف چیرنا پھاڑنا جانتی ہے۔ شعر و شاعری، طنز و مزاح ان کے سر سے گزر جاتا ہے۔ کس قدر بد ذوق لوگوں کے سنگ ہماری زندگی گزر رہی ہے۔ کتنے افسوس کی بات ہے۔ ہم اللہ تعالیٰ کی طرف سے بخشے ہوئے اس تحفے کا استعمال کرنے میں انصاف نہیں کر رہے۔ ہماری پکڑ ضرور ہوگی۔ خاص کر تمہاری۔“ وہ شوخ انداز میں بولا۔

”بھئی میری کیوں؟ میری زندگی میں سب کچھ تو ہے۔“ وہ پھر طنزیہ مسکرائی۔

”بالکل درست فرمایا جناب نے۔ اتنا کچھ ہے کہ سنبھالے نہ سنبھال پائے۔“ وہ

مزاحیہ انداز میں بولا۔

”ان ساری باتوں کو چھوڑیں، خرم کا پتہ کریں وہ کہاں گئے۔ مجھے فکر ہو رہی ہے،

میرادل بے چین سا ہو رہا ہے۔“ وہ موضوع بدلتے ہوئے بولی۔

”عیش و عشرت کے مزے لوٹ رہا ہو گا۔ تم خواہ مخواہ پریشان ہو رہی ہو۔“ اس نے اسے چھیڑا۔ وہ اسے ہر ممکن اذیت سے نکالنے کی کوشش کر رہا تھا اور وہ بھی اس کی طنزیہ باتوں میں اپنا دکھ اور تکلیف بھول چکی تھی۔

”خرم ایسے تو ہرگز نہیں ہیں۔ الزام تراشی گناہ کبیرہ ہے۔ لا پرواہ اور بے حس لوگ تو کسی کو اپنانے کے لئے ایک شعر بھی نہیں کہہ سکتے۔ اور کیا کمال دکھا سکتے ہیں بھلا؟“ وہ اندر سے دہل گئی۔ ”خدا نہ کرے۔ اللہ کے سپرد۔ اللہ تعالیٰ اسے ہر طرح کے حرام سے محفوظ رکھے۔“

”اللہ کرے تمہاری خوش فہمی ہمیشہ قائم و دائم رہے۔ میں شیریں سے معلوم کرتا ہوں۔ کیونکہ خرم کا موبائل بند ہے۔“ وہ خود بھی فکر مند دکھائی دینے لگا تھا۔ وہ شیریں سے تمام تفصیلات جان کر اور پریشان ہو گیا۔ کیونکہ خرم آج طبیعت کی خرابی کی وجہ سے گھر جلدی چلا گیا تھا۔ وہ سوچ بچار میں تھا کہ فون کی گھنٹی بجی۔ دوسری طرف کی آواز بالکل انجان تھی۔ وہ تھوڑی دیر کے لئے چکرا گیا۔ حدیقہ کے سامنے صوفے پر آنکھیں بند کر کے نیم دراز ہو کر حدیقہ کے سوال زدہ چہرے کو دیکھنے لگا۔

”کیا ہوا ہارون!..... کس کا فون تھا؟..... خرم کہاں ہیں؟“ وہ اپنی تکلیف بھول کر بیڈ پر بیٹھ گئی۔

”ایکسڈنٹ۔“ اس نے ایک ہی لفظ بولا اور تیزی سے باہر نکل گیا۔

وہ جھولی پھیلا کر خرم کی سلامتی کے لئے دعائیں مانگنے لگی۔ ڈوبتے ہوئے دل کے ساتھ آہستہ آہستہ چلتی باتھ روم کی طرف چل پڑی۔ آئینے میں خود کو پہچان نہ سکی۔ خود پر قابو پاتے ہوئے بولی۔

”خرم! میرے ساتھ جو بھی ہوا، میں نے آپ کو صدقِ دل سے معاف کیا۔ باری تعالیٰ! میرا سہاگ سلامت رکھنا۔“ وہ دعا مانگے جا رہی تھی۔ وہ بچوں کے کمرے میں چلی گئی۔ بچے کھلونوں سے کھیل رہے تھے۔

وہ بے بسی کے عالم میں ان کے قریب قالین پر ہی لیٹ کر دل ہی دل میں دعائیں مانگنے لگی۔

”مائی جان! ہمیں برگرز اور چپس کھانے ہیں۔“ وہ کھیل چھوڑ کر اس کے ارد گرد

بیٹھ گئے۔

حدیقہ نے فون کر کے برگرز اور چپس کی ڈلیوری گھر پر ہی کروالی۔
اپنی حالت زار میں ہی وہ ہارون کے ساتھ جانے کے لئے بمشکل تیار تو ہو گئی مگر ہارون اسے ساتھ لے جانے کے لئے تیار نہ تھا۔ کہیں پیشانی کی پٹی اور آنکھوں کے گرد پھیلے ہوئے نیلے نشان کراہی کی سرگزشت نہ بن جائیں۔ وہ اسے تسلی و تسنی دے کر ہاسپٹل روانہ ہو گیا۔

خرم ایمر جنسی وارڈ میں ایڈمٹ تھا۔ شیریں پریشانی کے عالم میں اس کے پاس ہی موجود پائی گئی۔ وہ ابھی تک بے ہوش تھا۔ ایک بازو پر پلاسٹر اور سر پٹیوں میں مقید دیکھ کر وہ ناقدانہ انداز میں سوچنے لگا کہ انسان کس قدر کمزور اور بے بس بنایا گیا ہے۔ اس حقیقت کو تسلیم کرتے ہوئے بھی وہ کس قدر ڈھیٹ اور ناعاقبت اندیش ٹھہرا ہے کہ اس کی فطرت سے ظلم و تشدد، حریص پن اور احساس ملکیت سے مرعوب ہو کر خود پسندی اور خود ستائشی جیسی قبیح حماقتیں کبھی جدا نہیں ہوتیں۔ آج خرم کس لاچارگی اور بے بسی سے دنیا و مافیہا سے بے خبر تھا۔

اس نے حدیقہ کو فون کر کے اس کی حالت کے نشیب و فراز اس کے گوش گزار دیئے۔ وہ اپنی تکلیف یکسر ہی بھول گئی۔ فوراً ہی باہر نکل کر اس نے ٹیکسی پکڑی اور ایمر جنسی وارڈ پہنچ گئی۔ شیریں نے اسے اس حالت میں دیکھا تو حیرت و اشتیاق سے ہارون کی طرف متوجہ ہوئی۔

”یہ سب کیا ہے؟ میں سمجھنے سے قاصر ہوں۔“

ہارون اسے ایک طرف لے گیا اور اس کی سماعتوں میں زہر اندیل کر حدیقہ کے قریب بیٹھ کر اس کے چہرے پر ہمدردانہ ہاتھ رکھ کر بولا۔
”تمہیں تو تیز بخار ہے۔ تم کیوں چلی آئیں؟“

شیریں بھی قریب ہی آگئی اور اگلے ہی لمحے اسے ہسپتال ایڈمٹ کرانے کا فیصلہ کر کے وہ باہر نکل گئی۔ شرمندگی اور ندامت و پچھتاوا اس کی نس نس میں سرایت کر چکا تھا۔ وہ اسے جھوٹ بولنے کی تلقین کرتے ہوئے کس قدر حقیر لگ رہی تھی۔ جب اس نے اثبات میں سر ہلایا تو وہ اعتماد و محبت سے بھرپور دیوی اور اس دھرتی کی مانند فراخ دل اور آسمان کی رفعتوں کو چھوتی ہوئی ہستی معلوم ہوئی۔ ورنہ وہ خود پر ہونے والی زیادتی و ظلم کا حساب چکا کر اس کے خاندان کو وہ سبق سکھا سکتی تھی، جو مدتوں تک یاد دہانی کے طور پر دہرایا جاتا۔ اس معاملے کی صداقت سے کوئی بھی انکار نہ کر سکتا تھا۔

مگر حدیقہ پاکستانی تہذیب میں بل کر جوان ہوئی تھی، جہاں شوہر کی عزت کی خاطر اس نے قربان ہونا سیکھا تھا۔ ظلم کی برہنہ سچائی پر اپنے خلوص اور تمدن کا لبادہ اوڑھا کر اپنے معاشرے کے سامنے سرخرو ہونے کا درس لیا تھا۔ وہ آج کے ماڈرن دور میں بھی ایسی خود سری اور گستاخانہ حرکت نہیں کر سکتی تھی۔

وہ خرم کے لئے دعائیں کرتی آپریشن تھیٹر پہنچ گئی اور پیشانی پر دو انچ کے زخم کی اسلچنگ کرواتے ہوئے اس کی زبان سے خرم کی جان کی سلامتی کے کلمات نکل رہے تھے۔ گرد و پیش کا ماحول کس قدر سوگوار ہو چکا تھا، جس کا اندازہ شیریں بخوبی کر رہی تھی۔ ابھی تک اسے بھائی کی اس خالمانہ حرکت پر یقین نہ آ رہا تھا۔ کیونکہ وہ تو ایسا ہرگز نہ تھا۔ بہت نرم و ملائم اور بہن کی ذات میں کھب کر اس کے تمام مسائل کی جانچ پڑتال کر کے ان کے حل ڈھونڈنے والا شخص تھا۔ وہ اس حد تک گر سکتا ہے، یہ کیسے ممکن ہے؟

رنج و کلفت اور شکوک و شبہات اسے بتدریج متفکر اور مغموم بنائے جا رہے تھے۔ کیونکہ ایسا ناروا سلوک تو کسی لاوارث، فقیر و مسکین کے ساتھ روا رکھنا ڈاکٹر کی شان و ایمان کے خلاف تھا۔ شاید بیوی کا رشتہ ان تمام درجات سے کم تر سمجھا گیا تھا کہ اس نے اس کی تکلیف کی رتی بھر پروا نہ کی، اس کا حال دریافت کرنے کی ضرورت محسوس کی، نہ ہی اپنی غیر ارادی طور پر سرزد ہونے والی زیادتی کا اعتراف کرنے کی تکلیف گوارا کی۔ ایسی بھی کیا خفگی اور غصہ تھا کہ اسے ہب کرنے کا اجر اس صورت میں دیا گیا تھا۔



خرم دودن بے ہوش رہنے کے بعد ڈاکٹروں کی کوشش سے ہوش میں تو آ گیا۔ مگر وہ آنکھیں کھول کر نہ تو اس دنیا کے رنگوں کو دیکھنا چاہتا تھا، نہ ہی اپنی قوت گویائی سے اپنے احساسات کا اظہار کرنا چاہتا تھا۔ خدا تعالیٰ کی طرف سے مکافات عمل کا یہ طریقہ اسے حیران و پریشان کئے ہوئے تھا۔ ضیائے شعور میں پہلچل تو بچ گئی تھی۔ گریہ سرشاری سے اسے دلی تقویت تو نصیب ہو جاتی مگر تمام رد عمل بالکل ہی عارضی اور وقتی ہوتا۔

پانچ دن بعد حدیقہ ہسپتال سے گھر چلی گئی۔ اس کی لاکھ کوشش کے باوجود خرم نے نہ تو اس سے بات کی، نہ ہی اپنی آنکھ کھول کر اسے دیکھنے کی ہمت رکھی۔ وہ اس روئے سے دل برداشتہ تو ہوئی مگر اپنے پیار اور اپنے جیون ساتھی کی جان کی سلامتی پر بے انت شکرانے میں سجدہ ریز ہو گئی۔ ہارون نے اسے یقین دلایا کہ خرم اس جان لیوا جھٹکے کے بعد خود کو سرتا پابدلنے کے بارے میں سوچ رہا ہوگا۔ کیونکہ اس کی خدائی پکڑ میں زیادہ دیر جو نہ لگی تھی۔ وہ موہوم سی ہاں کہہ کر دعائیہ انداز میں کھو جاتی اور خوش فہمیوں کی دنیا آباد ہو جاتی۔

آج خرم ہسپتال سے ڈسچارج ہو رہا تھا۔ ابھی ایک مہینہ مزید اسے ریٹ کی تاکید کی گئی تھی۔ حدیقہ نے کمرے کو پھولوں، کارڈز اور موم بتیوں سے سجا دیا تھا۔ اسے اپنے گھر میں خوش آمدید کہنے کے تمام انتظامات مکمل کر کے اسے خرم کی پسند کا کھانا بنایا، نہایت سلیقے سے ٹیبل لگایا۔ وہ ہارون کی مسلسل چھیڑ خانیوں سے محظوظ بھی ہو رہی تھی۔ مگر اک خوف اور اندیشہ دل کے نہاں خانوں میں ہلکی سی کروٹ لے کر اسے مضطرب کر دیتا۔ کیونکہ خرم نے ابھی تک کسی سے کوئی بات شیر کرنے کی کوشش ہی نہ کی تھی۔ وہ سب کو دیکھ کر منہ دوسری طرف موڑ کر اپنی بے رخی اور بے توجہی کا

اظہار کر دیتا تھا۔

ڈاکٹرز نے ماحول کی تبدیلی سے اس فیز سے نکلنے کا انکشاف کر کے سب کو مطمئن کر دیا تھا۔ لیکن حدیقہ کبھی کبھار نا اُمید سی ہو جاتی۔ اسے بیٹے ہوئے ماضی کا ہر لمحہ یاد آنے لگتا، جب یہ ہسپتال میں اس کے ساتھ کام کرتی تھی۔ وہ اس کی غلطیوں کو کس فراخ دلی سے معاف کر دیا کرتا تھا۔ ڈانٹ ڈپٹ کا تو سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ اور یہ ہواؤں میں اڑی اڑی جاتی تھی۔ تمام زسیں بغض و حسد میں اسے طرح طرح کے طعنے دے کر کرتی تھیں اور یہ برا منانے کے بجائے خودی اور ترنگ میں لطف اندوز ہوا کرتی تھی۔ مگر خود کو کمپوز رکھنا اس کی فطرت تھی۔ جب اس کی ماں نے اس رشتے سے انکار کر دیا تو اس نے اعتراض کے بعد روایتی بیٹی کا کردار ادا کر کے ماں کے دل کو جیت لیا تھا۔ اس سے وہ کتنی خوش تھی۔ خرم کے پرشمرہ چہرے پر رونق آ گئی تھی۔ اور اس کی نظر میں حدیقہ کا مقام بہت بلند ہو گیا تھا۔ وہ ہر وقت گھنٹوں اس کے قرب میں گزارنے کا خواہش مند تھا۔ مگر حدیقہ اس کی ضد کی پروا کئے بغیر اپنے نسوانی وقار، عزت و تحریم کے اصولوں کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑتی تھی۔ کیونکہ اس نے اپنی ماں کی زندگی کا درد بھر سفر اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا، جس کی اذیت اور پچھتاؤں کی ٹھیس کو وہ ابھی تک محسوس کرتی تھی۔

آج اس کا میسا اپنی نئی زندگی پا کر گھر آ رہا تھا۔ بات تو خوشی کی تھی ہی۔ وہ اس کی تیار داری اور دلجوئی سے ایک بار پھر اسے جیت لینے کا پروگرام بنا چکی تھی۔ آہ! یہ عورت ذات درد و کرب کا گھر وندا ہی تو ہے۔ قدم قدم پر ہر طرح کے حالات سے سمجھوتہ کرنا اور اپنی جان دوسروں پر نثار کرنا اس کی خاصیت ہے جو مرد کے لئے محض ڈھکوسلہ ہے، اسے حاصل کرنے کا فریب اور دھوکا ہے۔ ہر عورت کی کہانی مختلف مگر دکھ کا روپ ایک ہی جیسا ہے۔ آج وہ ایک نئی ترنگ اور آس سے دانستگی میں اسے فسخ کرنے جا رہی تھی۔

باہر گاڑی کے رکنے کی آواز پر وہ تیزی سے مین ڈور کھول کر کھڑی ہو گئی۔ خرم بغیر کسی سہارے کے ہارون اور شیریں کے ساتھ نہایت سنبھل کر چل رہا تھا۔ جسم کمزور اور لاغر لگ رہا تھا۔ چہرے پر بلا کی خاموشی کی چھاپ تھی۔ پچھتاوا تھا یا احساسِ ندامت تھا، کسی کو خبر نہ تھی۔

’میں تمہیں زندگی میں واپس لے آؤں گی میری جان!‘ وہ دکھ سے بڑبڑاتی۔

’میری زندگی بھی تمہیں لگ جائے خرم! میری تمام تر فرحتوں اور راحتوں سے تمہارا دامن گل و گلزار بن جائے‘ ایک دم وہ اپنی اس دعا پر چونک کر مسکرائی کہ اس کی زندگی میں خوشیوں اور سکون نام کی کوئی چیز نہ تھی، جس کا وہ نذرانہ پیش کر سکتی۔

وہ مسکراتی خرم کی طرف بڑھ گئی۔ اس کا ہاتھ پکڑ کر اس نے بوسہ دیا اور خود پردگی کے انداز میں ہاتھ کو آنکھوں سے لگانے لگی کہ خرم نے جھٹکے سے چھڑا لیا۔ وہ کسمسا کر شیریں کو دیکھنے لگی۔ ہارون نے سخت برہمی سے خرم کو گھورا اور اندر چلا گیا جسے شیریں نے بھی محسوس کیا تھا۔ مگر نظر انداز کرنے میں عافیت جانی۔

وہ لاؤنج میں صوفے پر نیم دراز ہو گیا۔ حدیقہ نیچے بیٹھ کر اس کے جوتے کے تسمے کھولنے لگی۔ ماں کی اکلوتی پر نرسز بیٹی اپنی اس حیثیت پر بھی خوش و مطمئن تھی۔ شیریں واپس ہسپتال جا چکی تھی۔ ہارون بچوں کو سکول سے لینے کے لئے نکل گیا تھا۔ دونوں اکیلے تھے۔ مگر کمرے میں ہو کا عالم تھا۔ آخر اس ضمن میں پہل حدیقہ نے کی۔ وہ اس کا ہاتھ پیار سے پکڑتے ہوئے بولی۔

”خرم! کمرے میں آ جائیے۔ تھوڑا آرام کر لیں۔ پھر آپ کو مزے دار کھانا کھلاؤں گی، آپ کی پسند کا۔“
دوسری طرف خاموشی تھی۔

”کچھ تو کہئے۔ اتنی ادا سی اور مایوسی اچھی نہیں آپ کے لئے۔“ وہ ہمدردانہ لہجے میں بولی۔ ”کل ماں جی سے میری بات ہوئی۔ یہ مامتا کی کشش بھی کیا شے ہے کہ اولاد کی رتی بھر تکلیف کو سات سمندر پار سے بھی محسوس کر لیتی ہے۔ میں نے انہیں ہر طریقے سے پُر تسکین کرنے کی کوشش کی ہے، مگر وہ ایک ہی بات بار بار کہے جا رہی تھیں کہ خرم مجھے فون کر رہا ہے نہ میری کال اٹینڈ کرتا ہے۔ میں نے انہیں بہتیرا سمجھانے کی کوشش کی ہے کہ وہ آج کل اتنے مصروف ہیں کہ ہمیں بھی ٹائم نہیں دے پاتے۔“ وہ ڈھٹائی سے آئیں بائیں شائیں بولے جا رہی تھی۔ اور وہ ایک نقطے پر نگاہیں منجمد کئے چپ سادھے ہوئے تھا۔

”میں آپ کو گرما گرم سوپ یہاں ہی دیے دیتی ہوں۔“ وہ لہجے میں شگفتگی بھرتے ہوئے بولی۔ ”میں چند دنوں میں ہی آپ کو پہلے جیسا بنا کر چھوڑوں گی، ذرا میرا جادو تو دیکھئے گا۔“ وہ سرعت سے کچن کی جانب چل دی۔ تھوڑی دیر بعد سوپ کا پیالہ ٹرے میں رکھے اس کے قریب آ کر بیٹھ گئی۔ دایاں بازو ابھی تک پلاسٹر میں مقید

تھا۔ لیفٹ ہاتھ سے سوپ کو بیلنس کرنے کی مشکل کو جانتے ہوئے اس نے چیخ بھر کر اس کے ہونٹوں کی جانب بڑھایا ہی تھا کہ اس نے ٹرے کو نفرت سے پورے استحقاق کے ساتھ پرے کیا اور سوپ کا پیالہ اچھل کر حدیقہ کی چھاتی سے ٹکرا کر قالین پر جا گرا۔

اس اچانک ردِ عمل پر وہ جلن سے چیخ اٹھی۔ تیزی سے فرنیچ کی طرف بھاگی۔ برف سے خود کو سہلانے لگی۔ شدت تکلیف اور احساسِ کم مائیگی میں گھری وہ **disintegration** کا شکار ہونے لگی۔

”وِس اِز ناٹ فیئر۔“ اس نے سرگوشی کے انداز میں خود کلامی کی۔ جسے خرم نے سن لیا۔ وہ صوفے سے اٹھا اور سیدھا کمرے میں چلا گیا۔ کمرے کے خوابیدہ ماحول نے اس کی خاموشی کو توڑا۔ وہ قہر و غضب میں چیختا ہوا پھولوں کو پاؤں تلے روندے جا رہا تھا۔ کارڈز کو بے دردی سے پھاڑ رہا تھا۔ موم بتیوں پر ہاتھ مار کر بجھانے کی کوشش میں اس نے اپنا ہاتھ جلا لیا۔ منہ سے جھاگ اور آنکھوں سے شعلے اُبل پڑے تھے۔ وہ اپنی تکلیف میں بڑپتی ہوئی کمرے کی طرف بڑھ گئی اور اس کی غیر معقول حرکات کو دیکھ کر چیخ اٹھی۔

”خرم! آپ پاگل ہو چکے ہیں۔ آپ کو گھر کے بجائے پاگل خانے جانا چاہئے تھا۔ میں ابھی ہاسپٹل فون کرنی ہوں۔ مجھے آپ سے خطرہ لاحق ہونے لگا ہے۔ آپ تو مجھے جان سے مار دیں گے۔ میری بد قسمتی۔ آپ جیسے محبوظِ الحواسِ مرد کی بیوی بننے سے بہتر تھا کہ زندہ درگور کر دی جاتی۔ آج مجھے اس سوال کا جواب چاہئے کہ مجھ سے ایسی کون سی غلطی سرزد ہوئی ہے، جس کی اتنی بڑی سزا دی جا رہی ہے۔“ وہ بیچ و تاب کھا کر رہ گئی۔

”تمہاری تمام خرابیوں کی جڑ تمہاری ضد ہے۔“ وہ پوری قوت سے چیخا۔ سر چکرانے لگا اور وہیں بیڈ پر سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔

”ابھی آپ کو آرام کی ضرورت ہے خرم! کچھ دنوں کے لئے میری تمام غلطیوں کو نظر انداز کر دیجئے۔ صحت یاب ہونے کے بعد مجھ سے حساب چکا لیجئے گا۔“ وہ ایک دم سے نرم پڑ گئی۔ اسے سہارا دے کر بیڈ پر لٹایا اور آہستہ آہستہ اس کے جسم کو دبانے لگی اور وہ بے سدھ، خاموش لیٹا کسی قسم کا اعتراض یا انکار نہ کر سکا۔

حدیقہ کی آنکھوں سے بہتے ہوئے آنسو اس کے اندر ہی گرنے لگے، جن میں

ترس و رحم بھی تھا، غصہ اور غم بھی تھا، اور اپنے مقدر سے کبھی نہ ختم ہونے والا گلہ و شکوہ بھی تھا۔ یہ ٹھٹھٹ کر جینے کو زندگی کا نام دینا سراسر نا انصافی ہے۔ عفریت سے چھٹکارا ہر ذی روح کا حق ہے۔ آج اسے تمام حکمت عملی بیکار ہوتی معلوم ہو رہی تھی۔ لیکن وہ خرم کو اس ناگفتہ بہ حالت میں تنہا چھوڑنے کا تصور بھی نہ کر سکتی تھی۔ اس نے ہار مان کر اس کی صحت یابی کے بعد واپس جانے کا پروگرام بنا لیا تھا۔ اگر اس کی قسمت میں اس کی ماں کی آیا گیری کرنے میں ہی جیت لکھی ہے تو یہ بھی اسے منظور ہے۔ مگر طلاق لے کر اس رشتے سے کنارہ کشی اسے کسی صورت قبول نہ تھی۔

یہ سوچ کر حلق میں پھانس چبھتی ہوئی محسوس ہوئی۔ کتنا مشکل تھا محبتوں اور چاہتوں کے اس گم شدہ رشتے میں اعتماد اور بھروسہ بحال کرنا۔ اس کی قیمت بہت بڑی تھی۔

وہ اسی سوچ میں کمرے میں طوفانِ بدتمیزی و ناگواری کے تمام آثار کو سمیٹ رہی تھی کہ ہارون برآمد ہوا، دروازے میں ہی ٹھٹکا۔ ایک نظر سے حدیقہ کا جائزہ لیا۔ کالے رنگ کی کمیز بھیک کر بدن کے خوب صورت آثار چڑھاؤ کو نمایاں کر رہی تھی اور اس میں سے جھلکتا ہوا گورا اور بے داغ رنگ روشنی بکھیر رہا تھا۔ اس نے جلدی سے اپنی چھاتی پر اپنے بازوؤں کو کراس کر کے اس کی طرف بیک کر لی۔ وہ سوئے ہوئے خرم کو حیرت و تجسس سے دیکھتا ہوا واپس پلٹ گیا۔

حدیقہ نے فوراً کپڑے بدلے اور چاہتوں سے سجایا ہوا تمام سامان جو کوڑے کا ڈھیر بن چکا تھا، پلاسٹک کے تھیلوں میں ڈال کر باہر ڈسٹ بن میں پھینکنے چلی گئی۔ ہارون خاموشی سے صوفے پر بیٹھا اس حیران کن ایکٹیوٹی کا جائزہ لے رہا تھا۔

”حدیقہ! مجھے بتاؤ گی نہیں کہ میرے جانے کے بعد کیا ہوا کہ تمہارا کمرہ کارزار بنا ہوا تھا؟ کیا خرم کو اپنی زیادتیوں کا احساس نہیں ہوا؟ شرمندگی اور بچھتاؤ انہیں ہوا؟“ وہ اس کے قریب آ کر سرگوشی کے انداز میں بولا۔ اس کی نگاہیں ابھی بھی اس کے حسن و جمال کی متلاشی اس کے وجود کے ارد گرد سرگرداں تھیں۔ وہ تھوڑی سی جھینپ گئی۔ آج فرسٹ ٹائم ہارون کی نظروں میں آنے والی میل کو اس نے بری طرح محسوس کیا تھا۔ عجیب سی الجھنوں میں گرفتار وہ اس کی نظروں سے دور ہو جانا چاہتی تھی کہ ہارون نے اس کی لال ہوتی گردن کو چھو کر پیار سے اسے دیکھ کر کہا۔

”یہ کیا اور کیسے ہوا؟..... برف کی لکڑ کر۔“

”سو پ نکال رہی تھی کہ اوپر گر گیا۔ فکر کی کوئی بات نہیں، دو چار گھنٹوں میں سکن نارل ہو جائے گی۔“ وہ اس کے ہمدردانہ اور لگاؤ سے بھرپور لہجے کو نظر انداز کرتے ہوئے بولی۔ ”ہارون! میں نے واپس جانے کا پروگرام بنالیا ہے۔“

”کیوں؟ میں ایسا کبھی نہیں ہونے دوں گا۔“ وہ مستحکم لہجے میں بولی۔

”خرم کے صحت یاب ہونے تک یہاں ٹھہروں گی۔ بہتر ہے، تین مہینے کا ویزہ لگوا لوں۔“ وہ سنجیدگی سے بولی۔

”تین مہینے کیوں؟ تین سال کا کیوں نہیں؟ تمہارے ویزے کا کوئی مسئلہ نہیں ہے، فوراً لگ جائے گا۔“ وہ اپنائیت سے بولا۔ ”ابھی تو ہم دونوں نے جاب ہننگ کے لئے نکلتا ہے۔ اور ان بہن اور بھائی کو سبق سکھانا ہے۔ تم ابھی سے ہار گئی۔ ویری سیڈ!“

”وہ سب تو ٹھیک ہی سوچا تھا۔ لیکن ہارون! اس طریقے سے میں خرم کو کھودوں گی۔ خرم اپنی سینسز میں نہیں ہے۔ یہ جو غصے کو حرام قرار دیا گیا ہے، اس کے پیچھے ایک مضبوط اور پائیدار منطق کارفرما ہے۔ ذہن و قلب اس کی رفاقت میں ناکارہ اور دہشت گرد ہو جاتا ہے۔ میں خرم کو اس کی شخصیت میں سرایت کرنے والے اس حرام سے نجات دلانا چاہتی ہوں۔ ہر گزرا ہوا معاملہ اور الجھا ہوا مسئلہ خود بخود حل ہو جائے گا۔ یہی اس کا قابل حل راستہ ہے ہارون!“ وہ اس سے دور ہٹ کر بیٹھ گئی۔

وہ کئی سمنائی اسے بہت معصوم اور پاکیزہ لگ رہی تھی۔ مارے ندامت کے ہارون کی نظریں زمین بوس ہو کر اس کے سامنے سجدہ ریزی میں معافی کی خواستگار لگ رہی تھیں۔ کیونکہ وہ جان چکا تھا کہ حدیقہ نگاہوں کے پڑھنے میں مہارت رکھتی ہے۔

”زرسنگ میرا پیشہ تھا، جس سے میں نے بے تحاشا نفرت کی تھی۔ مگر بد قسمتی سے خرم نے مجھے اپنی قربت میں بھی میرے پیشے اور ساکھ کو مرنے نہیں دیا۔ یہی میرا نصیب ہے۔ میں اس سے کہاں تک بھاگ سکتی ہوں؟“ وہ رد ہانسی ہو گئی۔

”بس اتنی جلدی ہار مان لی۔ میں تمہیں اتنی بزدل اور کم ہمت نہیں سمجھتا تھا۔“ وہ اس سے نظریں چراتے ہوئے بولا۔

”بس یوں ہی سمجھ لیجئے۔ اب مجھ میں نفرت کی چنگاریوں میں جلنے کی سکت نہیں رہی۔ نفرت کرنے والوں کا سامنا کرنا ہی بے غیرتی اور بے شرمی ہے ہارون! میری رگوں میں اعلیٰ خاندان کا خون دوڑ رہا ہے۔ میں ڈاکٹر آصف زیدی کی اولاد ہوں۔ گو

کہ ان کا ہمارے ساتھ کوئی تعلق اور واسطہ نہیں رہا، لیکن کیا ناخنوں سے گوشت کو الگ کیا جا سکتا ہے؟ ہرگز نہیں۔ میں انہی کی نسل میں سے ہوں اور ملک خاندان میرا نھیال ہے۔ ماں کی غلطی مجھے کمتر نہیں بنا سکتی۔ سوچتی ہوں، میں کن ناکردہ گناہوں کی پاداش میں دھری گئی ہوں؟ کیا اپنی پسند کی شادی جرم تھا؟ تو شیریں اپنی ازدواجی زندگی میں ہلکورے کیسے لے رہی ہے؟ اب میں اپنا محاسبہ خود کروں گی۔ اپنی اور اپنی ماں کی تمام تر ذمہ داریاں بخوبی سرانجام دینے کا پلین کروں گی۔ وہاں ماما تنہا اور یہاں میں بھری دنیا کی بارونق محفلوں میں تنہا۔ آہ! میں تو اپنا گھر بسانے اور آباد کرنے چلی تھی۔ اس نشے میں، میں نے اپنے وقار اور خود داری کو تہہ تیغ کر دیا۔ میرے احمقانہ پن کی بھی انتہا ہے کہ اپنی ماں کو تنہا چھوڑ کر اپنی دنیا بسانے کا خواب دیکھتی یہاں پہنچ گئی۔ مجھ جیسی لاوارث لڑکی کو شادی رچانے کا کوئی حق نہیں تھا۔ میری سسرال میں اور شوہر کی نظر میں کیا حیثیت ہے، اس کے چشم دید گواہ آپ بھی ہیں۔ مجھے کس گناہ کی پاداش میں سزا دی جا رہی ہے؟ بولے، جواب دیجیے۔“

آج آتش فشاں پھٹ گیا تھا۔ بہتا ہوا لاوا، ہارون کو خوف زدہ کرنے لگا تھا۔
 ”تم بہت ہمت اور حوصلے والی لڑکی ہو۔ یہ یکدم دل برداشتگی کیوں؟..... مجھے سچ سچ بتاؤ، کیا ہوا ہے؟ تمہارے بدن کا جلنا، کمرے کی ناگفتہ بہ حالت، تمہارے موڈ کی تبدیلی اور ناامیدی کی باتیں نشانہ ہی کسی اور سمت کر رہی ہیں۔“ وہ بہت آہستگی سے بول رہا تھا۔

”آپ کی ہمدردیوں کا بہت بہت شکریہ ہارون! آپ مجھے میرے حال پر چھوڑ دیں۔“ وہ سر پکڑ کر کوفت آمیز لہجے میں بولی۔

”چھوڑ دیا۔“ وہ طنزیہ مسکرایا۔ ”جاؤ اپنے مجازی خدا کی تیار داری کرو۔“

”آپ کو اس سے مطلب؟“ وہ رُوکھائی سے بولی۔

”تمہاری یہ بے رخی میری سمجھ سے بالاتر ہے حدیقہ! مجھ سے ایسی کون سی غلطی سرزد ہو گئی ہے؟“ وہ معاملہ کو سمجھ کر بھی انجان بن گیا۔

”ہارون! اللہ تعالیٰ نے عورت کو ایک ایسی جس سے نوازا ہے۔ جس سے قوی صنف محروم ہے۔“ وہ سنجیدگی سے بولی۔

”بھلا میں بھی سنوں۔“ وہ سمجھ کر بھی معصوم بن گیا۔

”عقل مند کے لئے اشارہ ہی کافی ہوتا ہے۔ آپ اتنے بھی معصوم اور ناسمجھ نہیں

ہیں کہ میری ناراضگی کی وجہ کا صحیح اندازہ نہ لگا سکیں۔“ وہ تلخ لہجے میں بولی۔
 ”نہ جانے کیسی پہیلیاں بوجھوانے پر تنگی ہو۔“ خود بخود ہی اس کی آنکھیں جھک گئیں۔ ”آئی ایم ایکسٹریملی سوری حدیقہ! مجھے آپ کے کمرے میں ناک کر کے جانا چاہئے تھا۔ دراصل میں تمہیں اپنے سے الگ نہیں سمجھتا۔ وہ دو بہن بھائی تو ہم دو بہن بھائی۔ اسی خوش فہمی میں رہا۔ میں غلطی پر تھا۔ تم سے میرا رشتہ شیریں کی وساطت سے قائم ہے۔ میں بھول گیا تھا۔“

وہ سرعت سے اٹھا اور باہر نکل گیا۔ حدیقہ اپنی عقل پر تاسف کرتی ہوئی گہری سوچ میں پڑ گئی کہ اس نے اپنے ہمدرد اور رازدار پر یہ شک کیوں کیا کہ آج اس کی نظر میں پاکیزہ پیار کی جگہ مکروہ جھلک تھی۔ مقدس شبیہ کی جگہ شیطانیت کا فرما تھی۔ وہ اس غلط فہمی سے اپنے بہت بڑے محسن اور مربی سے ہاتھ دھو بیٹھ گئی۔ اس کی تسلی و تشفی کی وجہ سے تو یہ آج تک ان مندوش حالات میں بھی پہاڑ کی مانند مضبوط بھی۔ میں ہارون کو خفا نہیں ہونے دوں گی۔ میں نے اس کے خلوص و پیار کو شک کی نظر سے کیوں دیکھا۔

وہ پچھتاوے کی آگ میں سلگ اٹھی تھی۔ سرگھنوں میں دبائے وہ زار و قطار رونے لگی۔ سسکیاں آس پاس کے ماحول کو غم ناک بنا رہی تھیں۔ نہ جانے کتنا وقت اسی عالم میں گزر گیا۔ وہ خرم کی دبی دلی آواز پر چونکی۔ وہ تکلیف کی شدت میں کراہ رہا تھا۔ وہ بھاگتی ہوئی کمرے میں چلی گئی۔ وہ آنکھیں بند کئے لیٹا تھا۔ حدیقہ نے ایک بار پھر معاف کر کے اپنے ہونٹ اس کے ہونٹوں پر پیوست کر دیئے۔ اس نے فوراً کروت بدل لی۔

”یہاں سے جاؤ۔ مجھے آرام کرنے دو۔“ وہ زہر آلود لہجے میں بولا۔

”آپ کے لئے کھانا لے آؤں؟“ وہ پیالے بھرے لہجے میں بولی۔

”نہیں۔“ وہ غصے سے بولا۔

’انسان بھی دو پائے والا جانور ہی ہے۔ آئی تھنک کہ صرف اپنی بیوی کے لئے۔ باقی دنیا کے ہر رشتے کے لئے انسانیت اور اہنایت سے بھرپور شخصیت کا حامل ہے۔‘ وہ سوچتی ہوئی اس کے پاؤں کی طرف سر جھکا کر بیٹھ گئی۔

ہارون کو بھی ناراض کر دیا۔ شیریں تند کے ناطے کچھ بھی سننے کو تیار نہ تھی۔ شوہر اپنی ضد پر اڑا ہوا نفرت و حقارت کے اظہار کا کوئی موقع ضائع نہیں جانے دیتا۔ وہ

جائے تو کس کے پاس جائے؟ اور اپنے سینے کے بگولوں کو کیسے ٹھنڈا کرے؟ وہ بے بسی سے سوچے جا رہی تھی کہ خرم کی آواز پر اس کے قریب ہوگئی۔

”حذیقہ! تم یہ ایکٹنگ کرنے سے باز نہیں آؤ گی؟ مجھے تم سے کوئی سروکار نہیں۔ میری بوڑھی اور بیمار ماں کے لئے تمہارے دل میں ہمدردی ہے نہ رحم و ترس۔ میں تم پر کیسے فدا و نثار ہو سکتا ہوں؟ تم میرا پیچھا چھوڑ دو۔ خدا کے لئے مجھے مزید پریشان مت کرو۔“ وہ چڑچڑاتے ہوئے بولا۔ ”آئی ہیٹ یو۔ لیوی الون۔“

”ابھی آپ کی صحت ٹھیک نہیں۔ غصہ تھوک دیں۔ ورنہ ریکوری بہت سلو ہو جائے گی۔“ وہ نہایت ملائمت سے بولی۔ ”آئی لو یو خرم! آئی نو یور مام آلو۔ بٹ آئی وانٹ ٹو سٹے و دیو۔ میں آپ کے بغیر نامکمل اور ناکارہ ہوں۔ مجھے ایسے محسوس ہوتا ہے جیسے اس بھری دنیا میں اپنی ماں کی طرح بالکل تنہا اور لاوارث ہوں۔ خرم! میں اس کرب میں زندہ نہیں رہ سکتی۔ میں اپنی ماں جیسی ہرگز نہیں ہوں کہ آپ سے دور رہ کر سانس بھی لے سکوں۔ میں مر جاؤں گی خرم! مجھے خود سے الگ مت کریں۔ ہم اپنا الگ گھر رینٹ پر لے کر ماں جی کو اپنے پاس بلا لیتے ہیں۔ ہماری اپنی الگ دنیا ہونی چاہئے خرم! ہمارے آگن میں بھی خوشیوں کی بارات اتر سکتی ہے۔ معصوم قہقہوں کے دیے روشن ہو سکتے ہیں۔ آپ ذرا سوچ کر تو دیکھیں، آپ کو کتنا بھلا لگے گا۔“

”یعنی تم نے ماں کے بعد شیریں سے دور ہونے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ یہ ناممکن ہے۔ اس وطن غیر میں، میں اسے اکیلا کیسے چھوڑ سکتا ہوں؟ وہ تمہاری طرح نکمی اور ہڈ حرام نہیں، جاب کرتی ہے۔ اس نے اپنے بچوں اور خاوند کی ذمہ داریاں کندھوں پر اٹھا رکھی ہیں۔ قسمت کی بات ہے کہ ہارون کو جاب ملنا مشکل ترین ہوتا جا رہا ہے۔“ وہ سنجیدگی سے بولا۔

”ویسے آپس کی بات ہے، ہارون کی ماں بھی اکیلی ان کے انتظار میں ایک ایک منٹ گن رہی ہے۔ دوسری طرف میری ماں بھی بیمار اور تنہا۔ خرم! ہم سب واپس کیوں نہیں چلے جاتے؟ یہاں کیا رکھا ہے؟ جو کماتے ہیں، بہ مشکل ہی گزارا کر پاتے ہیں۔“ وہ سمجھانے کے انداز میں بولی۔

”یہاں فوج کے روشن پہلو نمایاں ہیں۔ جبکہ پاکستان میں ڈاکٹر کی تنخواہ ایک کلرک سے بھی کم ہے۔ اگر اپنا کلینک کھولتے ہیں تو اس میں پیسہ صرف اس صورت

میں ہے کہ بددیانتی سے کام لیا جائے۔ ایسی میری فطرت نہیں۔“
 وہ پہلی بار اس سے تفصیلات کر رہا تھا۔ اسے حالات سدھرنے کی امید ہونے
 لگی تھی۔ احمق کہیں کی۔ اُس کے موڈ کے مد و جزر میں مرتی اور جیتی رہی۔
 ”تو پھر کیا یہ بہتر نہیں کہ ہم تین عدد ماؤں کو اپنے پاس بلا لیں۔“
 ”یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ ابھی ہم فائنٹشلی اس قابل نہیں ہوئے۔“ وہ نرمی سے بولا۔
 ”تو پھر اس جینون مسئلے کا حل کیا ہو؟“ وہ آہستگی سے بولی۔

”تم میری بات پر غور تو کرو۔ تمہاری ماں کو اکیلا رہنے کی عادت ہے۔ شیریں
 کی اپنی ساس سے ایک پل کے لئے نہیں بنتی۔ میری ماں خود محتاج اور مجبور ہے، اسے
 تمہاری ضرورت ہے۔ مگر تم اس قدر ضدی اور کم عقل عورت ہو کہ میری ایک نہیں
 سنتی۔ اُلٹا مجھے بد دعائیں دیتی ہو۔ مجھے اس حال تک پہنچانے والی تم ہی تو ہو۔“ وہ
 پھر زہر اُگلنے لگا تھا۔ وہ خاموشی سے اس کی گفتگو کے اُتار چڑھاؤ کا جائزہ لینے لگی۔

”اب تمہارے واپس جانے کے دن نزدیک آ گئے ہیں۔ خدا کے لئے اب
 واپس جا کر میری ماں کو تنگ مت کرنا۔ میں نے تمہاری ضد پوری کر دی ہے۔ تم
 میری خواہش کی قدر دانی کرو۔ بہتری اسی میں ہے۔“ وہ پیشانی پر بل ڈالتے ہوئے
 بولا۔ ”تم نے دیکھ تو لیا ہے کہ ہم یہاں عیاشی نہیں کر رہے، سڑگل ہے دن رات کی۔“
 ”میں نے بھی واپس جانے کا پروگرام بنا لیا ہے۔ مگر آپ کی صحت یابی کے
 بعد۔“ وہ اس کا ہاتھ پکڑتے ہوئے بولی۔ ”گو کہ آپ کے بغیر میں بہت اُداس رہتی
 ہوں۔ کاش! میرا بیٹا ہی سلامت رہتا۔ جینے کا اک بہانہ تو میرے پاس ہوتا۔“

”بچے بھی ہو جائیں گے۔ کیوں فکر کرتی ہو؟ ہر کام کا ایک وقت مقرر ہوتا ہے۔“
 وہ پھر نرمی سے بولا۔ ”تم تو بہت بہادر ماں کی اولاد ہو۔ ڈپریشن کی باتیں تمہیں زیب
 نہیں دیتیں۔ میں جلد ہی ٹھیک ہو جاؤں گا۔ تم جانے کی تیاری کرو، ماں بہت پریشان
 ہے۔ تمہارا بار بار پوچھتی ہے۔ اُنگلیوں پر دن گن رہی ہے۔“

”میں واپس چلی جاؤں گی۔ مگر ایک شرط ہے میری۔“ وہ سوچتے ہوئے بولی۔
 ”تمہاری شرائط سے میں بہت تنگ آ گیا ہوں۔ اب فرماؤ کون سی نئی شرط سوچ
 لی ہے تم نے؟“ وہ تلخی سے بولا۔

”میرے وجود میں اپنی نئی نسل کا بیج بودیجئے۔“ وہ التجائیہ انداز میں بولی۔
 ”تم تو بالکل پاگل ہو گئی ہو۔ تمہیں کیسے سمجھاؤں کہ ابھی یہ ناممکن ہے۔ ابھی

حالات ہی ناسازگار ہیں۔“ وہ سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ ”بچہ بچہ..... بند کر دیہ رٹ۔“

”میری مامتا ڈہائی دیتی ہے۔ آپ سے بھیک مانگتی ہوں خرم! بچے، میاں بیوی کو ایک دوسرے کو انڈر شینڈ کرنے اور ایڈجسٹ ہونے میں بہت اہم رول ادا کرتے ہیں۔ آپ شیریں اور ہارون کو ہی دیکھ لیں۔ دونوں کے بیچ بچے نہ ہوتے تو آج وہ ایک دوسرے کے لئے لازم و ملزوم نہ ہوتے۔“ وہ نہایت عاجزی سے بولی۔

”میں اس پرانی تھیوری پر یقین نہیں رکھتا۔“ وہ لاپرواہی سے بولا۔

”خرم! کاش میں آپ کی شخصیت کے اس بھیاںک روپ کو پہچان گئی ہوتی۔ آپ تو بہت بے ہمتے مرد نکلے۔ نہ جانے میرے لئے کیسے اڑ گئے تھے؟ لگتا ہے، مجھے حاصل کرنے کا مقصد فقط اپنی خود داری کو تسکین پہنچانا تھا، مجھ سے محبت یا عشق ہرگز نہ تھا۔ آپ نے محض اپنی ذات میں گم رہ کر خودی سے عشق کیا ہے اور پیار صرف اپنی ماں سے کیا ہے۔ اور ہمز اور غموار کا شرف بہن کو سوپ دیا ہے۔ میں آپ کی زندگی میں کہاں ہوں، کس مقام پر ہوں؟ مجھے اس کا جواب دیجئے۔“ وہ بے بسی میں تلملا رہی تھی۔

”بیوی اپنا مقام خود تجویز کرتی ہے۔ کیا تم نے اس کے مول کے لئے محنت کی ہے؟“ لہجے میں قہر تھا۔ وہ حیرت سے اس بے حس مجسمے کو دیکھتی رہ گئی۔

”میں نے زندگی میں ایک سبق بہت ہی کڑوے اور کیلے طریقے سے سیکھا ہے کہ کبھی کسی کی کسمپرسی پر رحم کھا کر اپنی زندگی داؤ پر نہیں لگانی چاہئے۔ نالی کی اینٹ کو محل میں جگہ ملے تو وہاں وہ نکلتی نہیں، زمین بوس ہو کر ہی رہتی ہے۔ اور ستم در ستم یہ کہ اپنے آس پاس کی کتنی ہی اینٹوں کو ساتھ لے کر گرتی ہے۔ اس لئے میں اپنی نئی نسل کے لئے ایسا رسک نہیں لینا چاہتا۔ تم نہ جانے کب اپنے راستے بدل ڈالو۔ آخر تمہاری رگوں میں خون ڈاکٹر زیدی کا ہی دوڑ رہا ہے۔ مجھے تم پر رتی بھر بھروسہ نہیں رہا۔“ وہ اسے مسلسل لعن طعن کر رہا تھا۔

”راہیں تو آپ نے بدلی ہیں خرم! میرے ساتھ کئے ہوئے وعدے کہاں رہ گئے؟..... دوسرا میں نالی کی اینٹ کیسے ہوں؟ دونوں سائیڈ سے اچھے خاندان سے ہوں۔“ وہ بچوں کی طرح بلک بلک کر رونے لگی۔

”ٹھوے بہانا بند کرو۔ جب سے میری زندگی میں آئی ہو، تب سے میرے نصیب ہی جل گئے۔ سکون نام کی کوئی چیز میرے پاس نہیں۔ تمام خاندانی نظام درہم

برہم ہو کر رہ گیا ہے۔“ وہ حقارت بھرے لہجے میں بولا۔ ”اُٹھو..... میری آنکھوں سے دُور ہو جاؤ۔ وعدے ایفا تب ہوتے ہیں، جب پائنٹر آپ کے پرابلمز کو سمجھ سکے۔“ وہ باہر نکل آئی۔ ہارون نے تمام گفتگو سن لی تھی۔ اس کے شانوں پر ہاتھ رکھ کر بولا۔

”سب ٹھیک ہو جائے گا..... فکر نہ کرو۔“

”آپ یہاں کب سے کھڑے ہیں؟ اور ہماری باتیں سننے کی آپ کو کس نے اجازت دی ہے؟“ وہ جھٹکے سے پرے ہو گئی۔

”خرم پر غصہ ہے۔ شامت میری کیوں؟“ وہ استہزائیہ انداز میں بولا۔

”آپ کی ہمدردیوں کا مجھے کیا فائدہ؟ کیا بھائی ہیں آپ؟..... میں اس رشتے کے ذائقے سے نا آشنا ضرور ہوں ہارون! مگر خرم کی جیلتی جاگتی مثال تو میرے سامنے ہے۔ میری آپ سے وابستہ توقعات جائز ہیں۔“ وہ اتنی آہستہ بول رہی تھی کہ ہارون کچھ نہ سمجھ سکا اور سیدھا خرم کے پاس چلا گیا۔ اور حدیقہ شوہر کے لئے کھانا نکالنے لگی۔

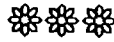
وہ اس پیار و عشق میں پاگل تو تھی ہی، پر لے در بے کی بے غیرت بھی بن گئی۔ وہ قہقہہ لگا اٹھی۔

’کھانا پیش کرو مجازی خدا کو۔ جو تمہاری شکل دیکھنا نہیں چاہتا..... کس قدر بے بسی اور لا چارگی کا عالم ہے۔ خرم کو چھوڑنا بھی نہیں چاہتی اور اس کے ہتک آمیز رویے کے ساتھ رہنا بھی نہیں چاہتی۔

’اما! آپ کو کیا بتاؤں، کس منحصرے میں گھر کر رہ گئی ہوں..... آپ نے فرمایا تھا، بے جا برداشت اور اپنے مسائل کی اپنے پیاروں سے پردہ داری عذاب الہی ہے۔ میں اسی عذاب کے شکنجے میں گرفتار ہوں۔ اس سے نکلنے کا راستہ بہت آسان ہے اما! لیکن آپ سنتے ہی جیتے جی مرجائیں گی۔ میں آپ کو خوشیاں تو نہ دے سکا، غموں سے ہمکنار کیونکر کروں؟..... میری اما! مرد کی میٹھی اور لذت سے بھرپور باتوں پر بھروسہ کرنے والی اور پھر مرد کے ہاتھوں دھوکا کھانے والی، اپنے دکھوں اور غموں کو من میں چھپا کر اپنی عزت بحال رکھنے والی اما! مجھے آپ پر فخر ہے۔ کاش آپ جیسی ہمت اور صبر مجھ پر بھی کرم فرما ہو جائے۔ کاش اما!‘

وہ بچن میں سالن ڈونگوں میں ڈالتے سوچتے جا رہی تھی۔

قلب و ذہن میں تلاطم برپا تھا۔ بے غیرتی کا احساس ہر لمحے بڑھتا جا رہا تھا۔ اسی اثناء میں شیریں بھی بچوں کے ہمراہ گھر پہنچ گئی۔ اس کو نظر انداز کئے وہ بھائی کے کمرے کی طرف تیزی سے بڑھ گئی اور حدیقہ اور ہارون مل کر ٹیبل پر کھانا لگانے لگے۔



”تم واپس نہیں جاؤ گی حدیقہ! یہ میرا فیصلہ ہے۔“ ہارون نے سختی سے کہا۔
 ”آپ کون ہوتے ہیں فیصلہ سنانے والے؟“ وہ روکھائی سے بولی۔ ”میرے فرائض میں اپنی ماں کی خدمت کرنا شامل کیا گیا ہے نہ کہ ساس کی۔ میں نے اپنی بیمار ماں کو چھوڑ کر اس ساس کی خدمت کی، جس نے مجھے اپنی بیٹی کے بجائے آیا سمجھ کر جی بھر کر کوسا۔ جب سے یہاں آئی ہوں، بڑھیا نے بیٹے کے کان بھر بھر کر مجھے تنگی کا ناچ نچوڑ دیا۔ آپ کی ماں کیوں خاموش ہے؟ آپ کیسے عجیب بیٹے ہیں کہ شیریں کو کبھی جتایا، نہ ہی ماں کو ایشو بنا کر اسے تنگ کیا۔ اب مجھے کوئی نہیں روک سکتا۔ میں ماما کے پاس جا رہی ہوں۔ کانوں کے کچے مرد کی میرے دل میں نہ عزت رہی ہے، نہ ہی میں ایسے نامراد اور ناہنجارشوہر کی خدمت کر سکتی ہوں، نہ ہی اس کا سامنا کر سکتی ہوں۔“ وہ غصے اور نفرت سے کہہ کر خاموش ہو گئی۔

”خاموش کیوں ہو گئی ہو؟..... خوب بولو اور دل کی بھڑاس نکال لو۔ تمہاری صحت کے لئے بہتر ہے۔“ وہ اسے چھیڑنے کے انداز میں بولا۔

”ہارون! نہ جانے آپ کو وقت بے وقت چھیڑ خانوں کی ہی کیوں پڑی رہتی ہے۔ میں بہت مضطرب ہوں۔ دل چاہتا ہے ابھی اور اسی وقت کچھ کھا کر مر جاؤں۔“ وہ بے قراری سے بولی۔

”اس بے انصاف اور بے رحم شوہر کی خاطر اپنی جان قربان کرنے پر تمہیں کوئی تمغہ ملنے والا نہیں۔ آج مرے، کل دوسرا دن۔ کوئی لمحہ بھر کو بھی یاد نہیں کرے گا۔ اور ویسے بھی یہ بزدلی کی باتیں تمہاری زبان ادا نہیں کر سکتی۔“ وہ ابھی بھی شوخی سے بول رہا تھا۔

”آپ مجھے پریشان دیکھ کر خوش کیوں ہو رہے ہیں؟ ذرا اس سوال کا جواب تو دیں۔“ وہ ذرا سا مسکرائی۔

”ایک بہت بڑی نوید لایا ہوں۔“ وہ مسکرایا۔

”ویزہ لگ گیا ہو گا۔ جس کی مجھے اب کوئی ضرورت نہیں۔“ وہ لاپرواہی سے بولی۔ ”میں نے اپنی سیٹ کفرم کرا لی ہے۔ پرسوں میری روانگی ہے۔ آپ مزے اُڑائیں یہاں۔ میں تو چلی۔“

”مجھے اکیلا چھوڑ کر؟..... کیسی ظالم بہن واقع ہوئی ہو، بے مروت کہیں کی۔ تم کان کھول کر سن لو۔ میں تمہیں نہیں جانے دوں گا۔“ وہ سختی سے بولا۔ ”تم چلی گئی تو میں بھی رخصت ہو جاؤں گا۔“

”ایسی باتیں آپ کو زیب نہیں دیتیں۔ آپ یہاں خاطر داریاں کریں اپنی بیوی کی اور بچوں کی۔ اور خدمت گزاری اور محل سے کام لیں سالا صاحب کے ساتھ۔“ وہ طنز سے بولی۔

”اور بھی برا بھلا اور گالی گلوچ کر لو۔“ وہ مسکرا کر بولا۔

”گھر داماد بن کر رہنے کا بھی اپنا ہی مزہ ہے۔ خوب انجوائے کریں۔“ وہ چھیڑتے ہوئے بولی۔ وہ خاموش رہا۔

”اسی لئے تو ایک پلوریشن اور کونفی ڈینس میں کمی آگئی ہے۔ آپ کی مردانہ شخصیت کے وقار کو جوٹھیں پہنچی ہے، اس نے آپ کو ہیلپ لیس کر دیا ہے۔“

”تمہارا موقف سمجھ میں آ گیا ہے۔“ وہ مسکرا کر بولا۔

وہ بدتمیزی کا ارتکاب کرتے ہوئے یونہی بات بڑھا کر اپنی خجالت مٹانے کی کوشش کر رہی تھی۔ انسان کتنا ہی ڈھیٹ کیوں نہ بن جائے، کبھی تو غیرت اور انا المناک گھنٹیاں بجا کر اسے بیدار کرنے کی کوشش ضرور کرتی ہے۔

”ہارون! دونوں پاکستان واپس چلتے ہیں۔“ حدیقہ ایک انہونی بات کہہ کر اسے تاؤ دلانا چاہ رہی تھی۔

”واہ واہ..... جینٹلس آئیڈیا۔“ اس نے مسرت آگیاں لہجے میں کہا۔

”آپ کیسے مرد ہیں ہمارے معاشرے کے؟ یہ سب آپ کی acceptance کے سائیڈ ایفیکٹس ہیں کہ بیوی آپ کو منہ نہیں لگاتی۔ میری مائیں اسے خرم جیسا شوہر بن کر دکھائیں۔ ذرا اس کی اور اس کی ماں کی عقل تو ٹھکانے آئے۔“ وہ رازداری کے انداز میں بولی۔

”سپر آئیڈیا۔ آج تو حدیقہ نہیں، ایک روایتی بھابی بول رہی ہے۔“ وہ مسکرا کر بولا۔

”آپ میرے کیسے بے حس بھائی ہیں؟“ اب وہ سنجیدہ تھی۔ انتقام ہی لے لیا
 ”تا۔ سب منہ کی باتیں ہیں۔ اب تو مجھے اپنی کج فہمی پر غصہ آ رہا ہے۔ میں نے
 ’بقی المقدور آپ کو بھی خوش رکھنے کی کوشش کی، ایک ان دیکھے جذبے کے ساتھ جس
 لی حدت کو میں محسوس نہیں کرتی تھی۔ لیکن میں نے وہ مقدس رشتہ آپ سے جوڑ لیا
 تھا۔ آپ نے کیا ایوارڈ دیا ہے؟“

”جمع تفریق کر لیتے ہیں۔“ وہ مسکرا رہا تھا۔ اسے اس کی بات ترک ادب سے
 مماثل لگی۔ ہارون نے مترجم نگاہ اس پر ڈالی۔ جسے محسوس کر کے حدیقہ دوسری طرف
 دیکھنے لگی۔

”آپ پاکستان نہیں جائیں گے۔ میں جانتی ہوں ہارون! آپ قطعاً میرا ساتھ
 نہیں دیں گے۔ میری خاطر آپ گھر کیونکر برباد کریں گے؟ اگر آپ بھائی ہوتے تو
 آج معاملہ ہی فرق ہوتا۔ میں بھی رانیوں والی زندگی گزار رہی ہوتی۔ آپ کی بیگم اور
 بچے یہاں ہیں ہارون! میرا یہاں کوئی نہیں۔“ اس کی آنکھیں ایک دم سے چھلک
 پڑیں۔

”کیا میں بھی نہیں؟“ وہ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولا۔

”مجھے بھروسہ نہیں۔“ وہ آنسو صاف کرتے ہوئے بولی۔

”مجھ پر کہ تمہارے اور میرے درمیان حائل ہونے والے رشتے پر؟“ وہ نہایت

اپنائیت سے بولا۔

”دونوں پر۔ کیونکہ بنیاد پانی پر رکھی گئی ہے۔“ وہ افسردگی سے بولی۔

”بنیاد کی کھج کر لیتے ہیں۔“ وہ بے تکلفی سے بولا۔

”وہ کیسے؟“ وہ حیرت سے بولی۔

”دوستی کا رشتہ بہت مضبوط اور پائیدار ہوتا ہے حدیقہ!..... نکل آؤ ان فضولیات

سے کہ میں تمہاری تند کا شوہر ہوں یا پھر تمہارا بھائی ہوں۔“

”دونوں رشتے غیر معقول اور تکلیف دہ ہیں۔ ہم ایک دوسرے کے دوست اور

ہر اونچ نیچ میں شانہ بشانہ چلنے والے ساتھی ہیں۔ مجھ پر اعتماد کر کے دیکھو، تمہارا دامن

خوشیوں سے بھر دوں گا۔“ اس دورانیے میں وہ پہلی دفعہ بہت جذباتی ہو گیا تھا۔

حدیقہ ایک دم سے کھسک کر دور ہو گئی۔ خوف انگ انگ میں سرایت کر گیا۔

جسے ہارون نے محسوس تو کیا مگر اظہار نہ کیا۔

وہ اسی ذہنی رد و کد میں اٹھی اور کچن میں کافی بناتے ہوئے بولی۔

”ہارون! کافی یا چائے..... کیا چاہئے؟“

”تم جو بھی دے دو۔ اٹ از فائن۔“ وہ سوچتے ہوئے بولا۔

اس نے جواب نہ دیا۔ کافی لا کر اس کے سامنے رکھ دی اور خود اس کے سامنے

بیٹھ کر کافی پینے لگی۔

کافی دیر خاموشی طاری رہی۔ ہارون نظریں جھکائے سوچے جا رہا تھا۔ حدیقہ کی

آواز میں یاسیت رچ بس گئی تھی۔ وہ مردنی آواز میں بولی۔

”ہارون! مجھے آج سچ بتائیے کہ کیا کجی ہے مجھ میں کہ ناقابلِ قبول ہوں؟ کسی کا

حق نہیں مارا ماسوائے اپنے حقوق مانگنے کے۔ مجھے خرم کے تازیانے، ہر وقت کی

دھتکار اور پھنکار۔ اور پھر اس پرستم ظریفی کہ مجھے دو دفعہ زخمی کر چکے ہیں۔“ وہ ہذیبانی

انداز میں بولی۔ ”کچھ سمجھ نہیں آ رہی ہارون! خرم کے ساتھ کون سا فارمولا کام کر سکتا

ہے؟ وہ تو آپ کے بچپن کے دوست ہیں۔ آپ ہی بتا دیجئے۔“

وہ مربیانہ انداز میں بولا۔

”ہمت کرو۔ حوصلہ ہار بیٹھی تو خسارے میں رہو گی۔ دراصل خرم کیا جانے؟

ہیرے کی قیمت جوہری سے پوچھو، جو تمہارے مقابل بیٹھا ہے۔ تم خرم پر اکتفا کر گئی

اور میں بھی قناعت کر گیا۔ یہی تو ہمارے کلچر نے ہمیں درس دیا ہے۔ ہم ہر وقت

زندگی کو قربانیوں کے سپرد کر کے خود کو عظیم کہلانے کے چکروں میں کیوں پڑے رہتے

ہیں؟“

”آپ کی ان باتوں کا لب لباب نہیں سمجھی۔“ وہ اسے کریدنے کے موڈ میں تھی۔

”لب لباب یہ ہے کہ ہم دونوں بہترین دوست تو بن سکتے ہیں۔ کیونکہ ہماری

فطرت ایک جیسی ہے۔ سوچنے کے انداز میں بھی باہمی مفاہمت ہے۔ ہمیں ایک

دوسرے کی ضرورت بھی ہے۔“ وہ یہ کہہ کر اس کا جائزہ لینے لگا۔

”مجھے بے وقوف مت بنائیں۔“ اس نے قدرے بے زاری سے کہا۔ ”خاوند کی

رتبیکلڈ بیوی بھلا کسی کی ضرورت کیسے بن سکتی ہے؟“ وہ اٹھ کر کمرے میں چلی گئی اور

پینکنگ کرنے لگی۔

”تم نہیں جاؤ گی۔“ وہ اس کے پیچھے آ گیا اور ہاتھ جوڑ کر اس کے سامنے بیٹھ گیا۔

”مجھے روکنے کا حق خرم کو ہے، آپ کو نہیں۔“ وہ ناقدانہ انداز سے اسے گھورے

گئی۔ ”اُسے تو پروا نہیں اور جس کے ساتھ میرا کوئی رشتہ نہیں، وہ خواہ مخواہ ہلکان ہوئے جا رہا ہے۔“ وہ روکھائی سے بولی۔

”اگر تم نے خرم کو سزا دینی ہے تو یہاں رہ کر اس کے سینے پر مونگ دلو۔ یہاں سے بھاگ جاؤ گی تو وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو جائے گا۔ اپنی ماں کی جی بھر کر خوشامییں اور خدمتیں بھی کرائے گا اور ساتھ دس نقص نکال کر گالیاں بھی دے گا۔ کیا ایسی ہی زندگی چاہتی ہو کہ خود کو اس دلدل سے نکالنا چاہتی ہو؟“ وہ اسے سمجھانے کے انداز میں بولا۔

”آپ کی بات اپیل تو کرتی ہے۔ اگر مجھے کہیں جاب مل جائے تو میں آج ہی یہ گھر چھوڑ دوں گی۔ اب مزید ذلیل ہونے کی ہمت نہیں رہی۔ کتنا اچھا ہو، اپنی ماں کو اپنے پاس بلالوں۔ اب تو یہی میرے خواب ہیں، یہی میری تمنا ہے۔ خرم کا ظرف تو میں نے پرکھ ہی لیا ہے۔ بہت گھٹیا اور بے فیض انسان ہے۔“ وہ حقارت سے بولی۔

”مجھے لگتا ہے، میرا مشورہ تمہیں پسند آ گیا ہے۔“ وہ مسکرا دیا۔

”جی۔“ اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ ”پاکستان میں ماں کے علاوہ اور میرے لئے کوئی اٹریکشن نہیں ہے۔ انہیں یہاں کیوں نہ بلالوں؟“

”یہ پڑھو ذرا اور بینڈ باجوں کے ساتھ خوشیاں مناؤ۔“ وہ کمپیوٹر کی اسکرین اس کے سامنے کرتے ہوئے بولا۔ ”مجھے محسوس ہو رہا ہے کہ تمہاری تو قسمت کھل گئی۔ اب میں ہی باقی رہ گیا ہوں۔“

اس نے پل بھر میں جابز دیکھنی پڑھ کر ایک لمبی آہ بھری۔

”میں ایسی خوش نصیب کہاں کہ اپنے پاؤں پر کھڑی ہو سکوں۔ جبکہ اس کے لئے کب سے کوشش جاری ہے۔“

”تمہاری خود اعتمادی کہاں چلی گئی ہے؟ ویری بیڈ۔ اٹھو یہاں سے ابھی اور اسی وقت۔ ورک آؤٹ کرتے ہیں۔ بھلے کی امید رکھو۔ کامیابی تمہارے قدم چومے گی۔“ وہ نہایت اپنائیت سے بولا تو اس نے تمام بکمرے ہوئے کپڑے جو پیک ہونے تھے، وہیں پر پھینکے اور اٹھ کر لاؤنج میں آ گئی۔

”ہارون! آپ کو مجھ سے حد درجے کی ہمدردی کیوں ہے؟ بیٹے ہوئے دنوں میں خرم کو بھی مجھ سے بے پناہ پیار کے ساتھ بے حد ہمدردی بھی تھی۔“ وہ مضطرب سی ہو گئی۔

”اس نے تم پر ترس کھا کر شادی کی تھی۔ یہ رحم اور احسان کرنے والے جذبے وقت کے ساتھ مدہم ہوتے ہوتے بچھ جاتے ہیں۔ اور پچھتاوے ہر دم پیچھا کرتے چین نہیں لینے دیتے۔ حدیقہ! تم نے اپنی حیثیت کو منوانا ہے، اپنی ذات کے ہونے کا اسے یقین دلانا ہے۔ یہی میرا مقصد ہے۔“ وہ نہایت سنجیدگی سے بولا۔ ”ماں کی نگہداشت تو اسے بہانے کی صورت میں مل گئی، وہ اپنے پچھتاوے کا قلق اور اذیت اس عمل سے کم کرنا چاہتا ہے۔ کیونکہ اس شادی میں ماں کی رضامندی کم، مجبوری زیادہ تھی۔

”مجھے اس حقیقت اور سچائی کا احساس ہے۔ تو کیا اس مسئلے کا حل خرم سے علیحدگی میں پوشیدہ ہے؟“ وہ تذبذب میں بولی۔ ”وٹ ڈو یو تھنک؟“

”نیور ایور۔ ہم نے خرم کو راہِ راست پر لانا ہے۔ نہ کہ اسے اس پر اگندہ ماحول میں آزاد اور بے مہار چھوڑ کر مسائل کو مزید بڑھانا ہے۔“ وہ بہت سنجیدہ تھا۔

”یو آر ٹو گریٹ۔ شیریں کس قدر خوش قسمت ہے جسے آپ جیسے شوہر کی قربت نصیب ہے۔ میں آپ کو سیلوٹ کرتی ہوں۔“ وہ حسرت و یاس سے بولی۔

”خرم دوسرا جنم بھی لے، پھر بھی آپ کی ہوا کو نہیں پہنچ سکتا۔ ان کی ہر زیادتی صرف مجھ تک محدود ہے۔ وہ نہیں بدلے گا۔ ہارون! میں اُس کے دل سے اُتر چکی

ہوں۔ وہ فطرتاً ہی کافی پیچیدہ انسان ہے۔“

”ہاں۔ مگر اچھا بھی بہت ہے۔ ضد میں ناقابلِ برداشت اور غیر معقول لیکن پیار میں لاجواب اور بے مثال۔“ وہ تسلی دینے کے انداز میں بولا۔

”ایکسٹریسٹ ہے نا۔ بلیک اینڈ وائٹ کے درمیان گرے کے بھی تو ان گنت شیڈز ہوتے ہیں۔ جن پر وہ بی لیو ہی نہیں کرتا۔“ وہ ناامیدی سے بولی۔

”سب ٹھیک ہو جائے گا۔ اس وقت اپنی C.V نکالو، خوشی اور امید کے ساتھ۔“ وہ پیار سے بولا۔ ”جس دن تمہاری فلائٹ ہے، اُس دن تم اپنی جاب پر کھڑی ہو جاؤ

گی۔ میرا دل گواہی دیتا ہے۔“

”آپ کے منہ میں کھی شکر۔ مگر ڈر لگ رہا ہے خرم کے ری ایکشن سے۔“ وہ پاؤں تک لرز گئی۔

”بہادر بنو یار! ورنہ عمر بھر جوتے ہی کھاؤ گی۔ یہ ہے تم عورتوں کا ناقابلِ معافی نقص کہ اپنی زندگی کو ہر طرح کے اندیشوں کے سپرد کر کے تمنغہ صبر و استقلال حاصل

کرنے کے چکر میں تمام حق تلفیوں اور زیادتیوں کو سینے سے لگا کر اپنی زندگی بتا دیتی ہیں۔ کاش تم نے اپنی ماں کی ہمتی ہوئی زندگی کے تلخ تجربات سے ہی کچھ سیکھ لیا ہوتا۔“ وہ سنجیدگی سے بول رہا تھا۔ ”میں بھی اسی معاشرے میں بل کر جوان ہوا ہوں جس کا پروردہ خرم ہے۔ ہم دونوں کی سوچ میں زمین و آسمان کا لامتناہی فاصلہ کیوں ہے؟ یہ کریڈٹ شیریں کو جاتا ہے۔ کیونکہ وہ زندگی کے کسی موڑ پر میری محتاج ہوئی ہے، نہ ہی مجھے کسی قسم کی زیادتی کرنے کی اجازت دی ہے۔ عورت اپنا آباد گھر بنا کر خوش رہنا چاہتی ہے تو مرد بھی اسی کا خواہش مند ہوتا ہے۔ جو عورت اپنے حقوق پہچاننے کے باوجود آواز بلند نہیں کرتی، اسے یہ معاشرہ اور اس کا شوہر حقوق دے کر مستحکم کیونکر بنائے گا؟ بچہ بھی روتا ہے تو ماں اسے دودھ پلاتی ہے۔ یہ بات پتلے باندھ لو اچھی طرح سے۔“ وہ نصیحت کے انداز میں بولا۔

وہ احسان مندی اور تشکر آمیز نظروں سے اسے دیکھنے لگی۔



”سب کے لئے ایک شاگنک نیوز ہے میرے پاس۔“ حدیقہ نے خرم کی پلیٹ میں کھانا نکالتے ہوئے کہا۔ لہجہ بہت خوشگوار تھا۔ ”سر پرانز ہے۔“

”اب سمجھ آئی کہ میری بھابی جان نے اتنا خوش ذائقہ کھانا کیوں پکایا ہے۔ مزے دار۔ سوٹ ڈش اور سیلڈز کا تو جواب ہی نہیں۔“ ہارون مسکرا کر بولا۔

”واپسی کی اطلاع دینا چاہتی ہوگی۔“ خرم نے ماتھے پر بل ڈال کر کہا۔

”یہی تو خبر ہے کہ میں نے واپس جانے کا پروگرام کینسل کر دیا ہے۔“ وہ ہنستے ہوئے بولی۔

”وہ کیوں؟“ خرم نے چونک کر دیکھا۔

”یار! تمہارے پاس رہنا چاہتی ہے۔ حیران کن خبر ہرگز نہیں۔“ ہارون نے مسکراتے ہوئے پھیڑا۔

”اچھا..... تو تمہاری لگائی ہوئی آگ ہے۔ تب ہی خوش ہو رہے ہو۔ تم ہمارے معاملے سے دور نہیں رہ سکتے کیا؟“ خرم نے نہایت سنجیدگی سے کہا۔ ”اسے واپس جانا ہوگا۔“

”مجھے بہت اعلیٰ جاب مل گئی ہے ایک پرائیویٹ ہسپتال میں۔ آئی ایم سو پٹی۔ یو کانٹ امچن خرم! ہاؤ لکی آئی ایم۔“ وہ چمک کر خوشی کا اظہار کر رہی تھی۔

”مجھے منظور نہیں۔“ وہ کھانے سے ہاتھ کھینچ کر بولا۔ ”تمہیں ہر حال میں واپس جانا ہوگا۔ وہاں ماں بے چاری دن گن رہی ہیں۔“

”خرم صحیح کہہ رہے ہیں۔ تم نے تو ہمارے ساتھ اونٹ والا سلوک کیا ہے۔ کل تو تم ہمیں گھر سے باہر کھڑا کر دو گی۔“ شیریں نے تلخ لہجے میں کہا۔

”آپ فکر نہ کریں۔ اگر نوبت نکلنے تک پہنچ گئی تو میں اس گھر سے نکل جاؤں گی۔ آپ سب کو ڈسٹرب ہرگز نہیں کروں گی۔“ وہ برجستہ بولی۔

”اپنی ٹون لو رکھو۔“ خرم غصے سے بولا۔

”میرے ساتھ جس ٹون میں بات کی جائے گی، جواب اسی ٹون میں ملے گا۔ اس لئے آج سے بی کیئر فل۔“ وہ بھی قدرے غصے میں بولی۔ خرم اور شیریں حیرت سے اسے دیکھنے لگے۔ حدیقہ کا یہ روپ آج پہلی دفعہ سامنے آیا تھا۔

”ماں جی کا کیا ہوگا؟“ خرم چیخا۔ ”وہ اکیلی بھی ہیں اور بیمار بھی۔“

”اس سوال کا جواب ہارون بھائی کے پاس بھی ہونا چاہئے۔ ان کی ماں بھی وہاں اکیلی ہے۔ انہیں بھی تو ہر وقت فکر رہتی ہے۔ کیوں شیریں؟“ وہ طنز سے بولی۔

”حدیقہ! تم ہوش میں ہو؟ میرے خلاف اُکسانے کی ضرورت نہیں۔ ویسے ہارون! تمہاری باتوں میں آنے والے نہیں ہیں۔ تم جتنی بھی کوشش کرنا چاہتی ہو کر دیکھو۔ منہ کی کھاؤ گی۔“ شیریں غصے میں لال ہو گئی۔

”تم یہاں جا ب نہیں کرو گی۔ کان کھول کر سن لو۔ اگر تم واپس نہ گئے تو میں تمہیں طلاق دے دوں گا۔“ خرم نے دھمکی دی۔

”میں پاکستان میں نہیں ہوں، جہاں مل بھر میں تین الفاظ کی ادائیگی سے بیوی کو برطرف کر دیا جاتا ہے۔ یہاں میں آپ کی جمع پونجی کی حق دار ہوں۔ یہاں کی پالیسی کی جانچ پڑتال کے بعد یہ قدم اٹھائے گا۔“ وہ دھمکی کے انداز میں بولی۔ ”میں آپ کو چوبیس گھنٹوں کے اندر ڈی پورٹ کروا سکتی ہوں۔ اب ذرا مجھے چھو کر تو دیکھیں۔ آپ شوہر کے روپ میں جلاد ہیں۔ یہ ہے آپ کے اعلیٰ و ارفع خاندان کی مختصر سرگزشت۔ اور ایک بیوی ہی ایک مرد کی اصلیت اور اس کی شخصیت کی گہرائی کو جان پاتی ہے۔ مجھ سے دنیا پوچھے کہ آپ کتنے پانی میں ہیں۔“

”بکواس بند کرو۔“ خرم اسے مارنے کے لئے آگے بڑھا ہی تھا کہ حدیقہ نے اس کی ٹانگ میں اپنی ٹانگ اڑائی اور وہ کرسیوں سے ٹکراتا چاروں شانے چت نیچے

گر گیا۔ غصے سے چیخا۔ بہن اور بہنوئی کے سامنے سکی بھی ہوئی۔
 ”آئی ایم سوری خرم!“ وہ مسکرا دی۔ ”مجھے زخمی کرنے کا پہلا حساب تو مکمل ہوا۔
 باقی رہ گیا مجھے سوپ سے جلانے کا حساب۔ ذرا سوچ سمجھ کر قدم اٹھائیے گا آئندہ۔
 انشاء اللہ وہ حساب بھی آپ کو چکانا ہی پڑے گا۔“
 وہ کھڑا ہو کر خونخوار آنکھوں سے گھورتا ہوا اپنے جسم کو سہلانے لگا۔

”حقیقہ! تم ابھی اور اسی وقت یہاں سے نکل جاؤ۔ ورنہ مجھ سے برا کوئی نہ ہو
 گا۔“ شیریں چیخ اٹھی۔ ”تمہاری یہ جرات..... اپنی حیثیت بھول گئی ہو۔“
 ”تم میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتی۔ میں ہارون نہیں جو تمہاری اول فول کو شیرینی سمجھ کر
 کھاپی جاؤں۔“ وہ طنزیہ لہجے میں بولی۔ ”تم میرے گھر میں رہ رہی ہو۔ نہ کہ میں
 تمہاری محتاج ہوں۔ پھر جناب ذرا سوچ کر فیصلہ کیجئے کہ یہاں سے کس کو دفع ہو
 جانا چاہئے۔“

”خرم! تم چپ کھڑے ہو؟“ شیریں حیرت سے بھائی کو دیکھ کر بولی۔ ”اس کی
 زبان لمدی سے نکال لو۔ خود کو کیا سمجھتی ہے؟ نالی کا کیڑا۔“
 ”شیریں! تم اندر جاؤ۔“ ہارون نے نرمی سے کہا۔
 ”مجھے تو یہ ملی بھگت لگتی ہے۔ خرم! ہم نوکریاں کرتے رہے اور یہ دونوں رنگ
 رلیاں مناتے رہے۔ مجھے دال میں کالا نظر آ رہا ہے۔“ شیریں نے عینک درست
 کرتے ہوئے کہا۔

”شیریں! ہوش میں رہو۔“ ہارون نے چونک کر کہا۔ ”تم اس حد تک گر سکتی ہو،
 آئی کانٹ بی لیواٹ۔ تم تو پرلے درجے کی جاہل بیوی نکلی۔ افسوس ہے۔“
 ”میں شیریں کی بات سے اتفاق کرتا ہوں۔ حقیقہ! تمہارے خون میں بے وفائی،
 دھوکے بازی اور بد معاشی کی آمیزش پر آج مجھے یقین آ گیا ہے۔ تمہیں جاب مبارک
 ہو۔ میں کل ہی یہاں سے چلا جاؤں گا۔ اور شیریں! تم بھی میرے ساتھ واپس چلو
 گی۔“ خرم نے آخری اور حتمی فیصلہ سناتے ہوئے کہا۔

”ہم اس دو نکلے کی چھوکری کی خاطر اپنا اور ان دو معصوم بچوں کا فوج تباہ نہیں کر
 سکتے۔“ شیریں ایک دم سے گویا ہوئی۔ ”بیٹھو اور پانی پیو۔ غصہ ٹھنڈا کرؤ۔ وقت کے
 ساتھ اس مسئلے کا حل ضرور سامنے آئے گا۔“

ہارون اور حقیقہ اپنے اپنے کمروں میں چلے گئے۔ شیریں سر پکڑ کر بیٹھ گئی۔

”اس لڑکی نے تو میرے شوہر کو بھی بگاڑ دیا ہے۔“ وہ خرم کی طرف دیکھ کر فکر مندی سے بولی۔

”ہارون نے تو تمہیں کوئی ایسی بات نہیں کہی، جو تمہارے مزاج پر ناگوار گزری ہو۔ خواہ اُس بھلے مانس کی زندگی اجیرن مت کر دینا۔ تم بھی تو حد کرتی ہو اسے کنٹرول کرنے میں۔ اس کی جگہ میں ہوتا تو کب کی ختم ہو گئی ہوتی یہ شادی۔ بے وقوف! مرد کو تھوڑی ڈھیل دینا بے حد ضروری ہے، اپنے سہاگ کی سلامتی کے لئے۔ وہ تمہاری کسی بات کو ٹالتا ہے نہ ہی اپنی منوانے کی کوشش کرتا ہے۔ اس کے صبر کو اتنا نہ آزماد کہ وہ باگیں تڑوا کر بھاگ ہی جائے۔ تم نے جو اوٹ پٹانگ بولا ہے، جا کر اسے سوری کہو۔ مجھے اس کے تیور کچھ بھلے نہیں لگے۔“ خرم نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔

”سوری میں بولوں گی؟..... کیوں بھی؟ مجھ سے ایسی کون سی غلطی سرزد ہوئی ہے؟ سچ کو آواز دی ہے، حقیقت سے پردہ کشائی کی ہے۔ برا لگتا ہے تو لگے۔ مجھے اس کی کوئی پروا نہیں۔ مجھے حدیقہ کے روپے نے خائف کر دیا ہے۔ ہم دونوں گھر پر نہیں ہوتے، ہمیں ان کی حرکات کا قطعاً علم ہی نہیں۔ ایک سچائی تو سامنے آ ہی گئی ہے۔ کل یہ لڑکی انٹر ہوئی ہے، آج جاب۔ وہ بھی ہاسپٹل میں۔ یہ سب کیا دھرا اس ہارون کے بچے کا ہے۔ اس نے تو اس کے منہ میں زبان ڈال دی ہے۔ کیسے بدتمیزی اور بے لحاظی سے اس نے گفتگو کی ہے ہم دونوں سے۔ ورنہ یہ تو آنکھ اٹھا کر بات کرنے کی مجال ہی نہ رکھتی تھی۔“ لہجہ خوف و خدشات سے بھرا ہوا تھا۔

”اگر ایسا ہے تو مطلب یہ ہوا کہ مسئلہ کافی گہبھر ہو چکا ہے۔ لیکن فی الحال میں حدیقہ کو کچھ نہیں کہہ سکتا۔ مجھے مصلحتاً خاموش ہی رہنا چاہئے۔ پاکستان میں ہوتا تو اب تک اسے نانی کی یاد دہانی کر دیتا۔ مگر یہاں مجبور ہوں۔“ وہ ہاتھ آپس میں رگڑتے ہوئے بولا۔ ”میرے ساتھ حدیقہ ایسا کرے گی، میں نے کبھی تصور بھی نہ کیا تھا۔ اب وہ میری محتاج نہیں رہی۔ ورکنگ ویزہ اسے کورٹج دے گا۔ تم تو جانتی ہو، یہاں نرس کا اسٹیشنس ڈاکٹر سے کم ہرگز نہیں۔ اس لئے تو اسے فوراً جاب مل گئی۔“

”ہم دونوں ناقابلِ فہم اور عاقبت نااندیش ہی ٹھہرے۔ مجھے اسی بات کا خدشہ ہے کہ ہارون کی طرف سے ضرور کچھ نہ کچھ انہونی نازل ہونے والی ہے۔ خرم! میرا دل سخت بے چین ہو گیا ہے۔“ اس پر کچپی طاری ہو چکی تھی۔

”حوصلہ رکھو۔ کچھ نہیں ہونے والا۔ دو بچوں کا باپ ہے، بھاگ کر کہاں تک جائے گا؟ زنجیر کھینچ لیں گے۔ فکر نہ کرو۔“ وہ تسلی دیتے ہوئے بولا۔

”جب شوہر دوسری عورت میں انٹرسٹ لینے لگے تو پھر بچے اس کے پاؤں کی زنجیر نہیں بن سکتے۔ بیوی سے پیار اور عشق جھاگ کی مانند بیٹھ جاتا ہے۔“ وہ رد ہانسی ہو گئی۔

”ایک تو تم شکی مزاج ہونے کی وجہ سے ہمیشہ عذاب الہی میں مبتلا رہی ہو۔ ریلیکس پلیز! میں سب کچھ ٹھیک کر لوں گا۔“ وہ مضطرب سا ہو گیا۔

”میں نے آج تک ہارون پر اندھا اعتماد کیا ہے۔ آج میری چھٹی حس خطرے کا الارم بجا کر مجھے چوکنا کر رہی ہے۔ خرم! سم تھنگ اِز رائگ۔ کچھ حل سوچو۔ ورنہ میرا سانس گھٹ جائے گا۔“ وہ بے قراری سے بھائی کے کندھے پر سر رکھ کر رونے لگی۔

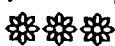
”یار! خواخواہ ہی بات کا بنگلہ بنا لیا ہے تم نے۔ حدیقہ کی جگہ میں قسم اٹھاتا ہوں۔ اُس میں ہزاروں خامیاں سہی، مگر امانت میں خیانت کرنا اس کی فطرت میں ہی نہیں۔ تم تسلی رکھو۔“ خرم نے اسے یقین دہانی کراتے ہوئے کہا۔ ”ہارون میرا بچپن کا دوست ہے۔ کردار کا مضبوط، اخلاقیات میں لا جواب۔ اور کیا چاہئے تمہیں؟ ویسے آپس کی بات ہے، ایسی سخت مزاج بیوی کے ساتھ وہ ہی نباہ کئے جا رہا ہے۔ وہ حدیقہ اور تم میں کمپیریزن تو ضرور کرتا ہو گا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ہمیشہ سے اس کی طرف داری کرتا آیا ہے۔“

”یعنی قصور وار میں ہوں۔ بیوی نے ذرا سی آنکھیں دکھائی ہیں تو تم ہتھے سے ہی اُکھڑ گئے ہو۔ ہوش کرو۔ مجھے تو لگتا ہے، اب تم اپنی ماں کے بجائے اس کی ماں کو اہمیت دو گے۔ اور اسے بلانے سے پہلے ہمیں بتا دینا۔ تاکہ ہم یہاں سے کوچ کر جائیں۔“ وہ تلخی سے بولی۔

”کیسی بے تنگی اور غیر مہذب باتیں کرتی ہو؟ ہم دونوں بہن بھائی کا جینا اور مرنا ساتھ ساتھ ہے۔ آئندہ ایسی اذیت دہ پیشین گوئیاں مت کرنا۔“ وہ اسے پیار کرتے ہوئے بولا۔ ”چھوٹی سی تو ہماری فیملی ہے، اس میں بھی اتحاد و اتفاق نہ ہو تو بڑے افسوس کی بات ہے۔“

”مجھے محسوس ہو رہا ہے کہ اب حدیقہ رنگ میں بھگ ڈال کر رہے گی۔“ وہ فہمائی انداز میں بولے جا رہی تھی۔ اور وہ اسے دیکھتے ہوئے ہر پہلو کا بغور جائزہ

لینے لگا کہ اس کے خدشات اور تڑپ میں کتنے پرسٹ سچائی ہو سکتی ہے۔ یا عورت ہونے کے ناطے وہ فقط شک اور وہم میں مبتلا ہے۔



”خرم.....!“ حدیقہ نے اسے جھنجھوڑتے ہوئے تیز لہجے میں کہا۔ ”خراٹے بند کریں۔ مجھے نیند نہیں آرہی۔ تمام دن محنت مشقت کرو اور نیند شوہر کے خراٹوں پر قربان کر دو۔“

خرم بڑبڑاتے ہوئے کروٹ بدل کر پھر سے خراٹے بھرنے لگا۔ حدیقہ نے اپنا تکیہ اٹھایا اور سٹڈی میں صوفے پر لیٹ کر سونے کی کوشش کرنے لگی۔ صبح کی نماز کے لئے وہ کمرے میں چلی گئی۔ اس نے خرم کے کان کے قریب موبائل لگا کر الارم لگاتے ہوئے کہا۔

”اٹھ جائیں نماز کے لئے۔ آپ نے نیند تو خوب پوری کر لی ہے۔ میری نیند کا بیڑہ غرق کر دیا آپ کے بے ہنگم خراٹوں نے۔“

”مجھے ڈسٹرب مت کرو۔ اپنے کام سے مطلب رکھو۔“ اس نے غصے سے کہا اور کروٹ بدل لی۔

”میں اللہ تعالیٰ کا پیغام آپ تک پہنچانا اپنا فرض سمجھتی ہوں۔ جب تک آپ اللہ کے حضور حاضری نہیں دیں گے، اس کے پیار کی لذت اور اس کی ناراضگی کے خوف سے آشنا کیسے ہوں گے؟ میں کہہ رہی ہوں کہ اٹھ جائیں۔ ورنہ وہ سلوک کروں گی، جس کا اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے۔“ وہ کبل کھینچتے ہوئے بولی۔

”تم میری جان نہیں چھوڑو گی؟“ وہ آنکھیں ملتے ہوئے بولا۔

”ہرگز نہیں۔“ وہ ضدی بچے کی طرح بولی۔

”اپنی حد میں رہو اور دفع ہو جاؤ یہاں سے۔“ اس نے کبل کھینچنا اور اوڑھ کر سونے کی کوشش کرنے لگا۔

’آج کے لئے اتنا ہی درس کافی ہے۔‘ حدیقہ نے دل ہی دل میں کہا اور وضو کرنے باتھ روم میں چلی گئی۔

دوسرے کمرے میں کچھ ایسا ہی سبق شیریں کو دیا جا رہا تھا۔ ہارون تو خاوند ہونے کے ناطے کامیاب ہو گیا۔ وہ قرآن مجید لے کر لاؤنج میں بیٹھا ہوا تھا۔ حدیقہ نے وکٹری کا اشارہ کیا اور ہاتھ اٹھا کر مبارکباد دی۔ اس نے مسکراہٹ کو دباتے ہوئے

اثبات میں سر ہلایا۔

ناشتے کی ٹیبل پر خرم اور شیریں منہ پھلائے بیٹھے تھے۔ حدیقہ اور ہارون کے چہرے خوشی کی غمازی کر رہے تھے۔ حدیقہ نے اپنے شوہر کے لئے ناشتہ تیار کیا۔ جبکہ شیریں نے ہارون کو سوکھی ذیل روٹی چائے کے ساتھ پیش کی تھی۔ وہ اسی پر اکتفا کر گیا۔ کیونکہ یہ شیریں کی ٹریننگ کی شروعات تھی۔ ایک دن آئے گا، جب وہ اپنے شوہر کو پراٹھے اور آلیٹ کا ناشتہ پیش کرے گی۔ ہارون نے دل میں سوچا اور چائے کا مک منہ سے لگانے کے بعد تعریفوں کے پل باندھ دیے۔ کیونکہ نئے شاگرد کے لئے ستائش و آفرین پہلا اصول ہے۔

مگر شیریں کو رتی بھر خوشی نہ ہوئی۔ حدیقہ کو کھا جانے والی نظروں سے گھورنے لگی۔

”خرم! مجھے ناشتہ بتاتے ہوئے دیر ہو گئی ہے۔ اپنی شرٹ استری کرنے کے بعد میرے گاؤن پر تو استری لگا دیجئے۔“ وہ کمرے میں آہنگی سے بولی کہ کہیں شیریں کو اس بات کی بھنک نہ پڑ جائے۔

”ہرگز نہیں۔ ذیل کیا ہوئی تھی، یاد ہے کہ بھول گئی ہو؟ سب اپنا کام خود کریں گے۔ پھر میں تمہارے گاؤن کی استری کیوں کروں؟ بالکل ہی پٹری سے اتر گئی ہو۔ اچھا بھلا سب کچھ چل رہا تھا۔ تم نے تو گڑبڑ ہی کر دی۔ بے چاری شیریں کس قدر تھک جاتی ہے۔“ وہ خفگی سے بولا۔

”ٹھیک ہے سر! کل سے میں آپ کا ناشتہ نہیں بناؤں گی۔“ وہ اکڑ کر بولی۔

”یار! اب بہن اور بہنوئی کے سامنے ذلیل و رسوا مت کرنا۔ کیا سوچیں گے میرے بارے میں کہ چند مہینوں میں زن مرید ہی ہو گیا۔“ وہ ایک دم سے نرم پڑ گیا۔

”تو پھر میرا گاؤن.....“ وہ اس کے گلے میں باہیں ڈالتے ہوئے بولی۔

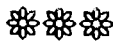
”ہاں ہاں..... کئے دیتا ہوں استری۔“ وہ سرگوشی کے انداز میں بولا۔

”ایک ہاتھ دے، دوسرے ہاتھ لے۔“ وہ گاؤن اس کے کندھے پر رکھ کر ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے کھڑی ہو گئی۔ اس کی آنکھیں شرارت سے چمک رہی تھیں۔ ہونٹوں پر کلیوں جیسی دبی ہوئی مسکان دیکھ کر وہ چونک گئی۔ اُس کا سُسن واپسی کی طرف گامزن ہو چکا تھا۔ اس کی ہر ادا میں تسکین اور اطمینان رچا بسا ہوا تھا۔ خرم جو اپنی حرکات و سکنات میں فرعونیت کی حدود کو چھونے لگا تھا، اب واپسی کے راستے پر

قدم رکھ چکا تھا۔ شیریں اپنا رول پہچاننے سے انکار اور اعتراض کرنے سے باز نہ آتی تھی۔ ہارون کی مستقل مزاجی کے سامنے وہ وقتی طور پر ہارتو مان جاتی جس کا خمیازہ لعن طعن کی صورت میں حدیقہ کو بھگتنا پڑتا تھا۔ جسے وہ ہنس کر ٹال جاتی۔ ہر صبح ایک نئے درس کے ہمراہ طلوع ہوتی اور ہر شام ایک نئے منصوبے کے ساتھ ختم ہوتی تھی۔ اللہ کا کرنا ایسا ہوا کہ خرم جس ہاسپٹل میں جاب پر تھا، وہاں کچھ ڈاکٹرز کو چند وجوہات کی بنا پر جاب لیس ہونا پڑا۔ سرفہرست ڈاکٹرز گرین پاسپورٹ ہولڈر تھے۔ یہ خرم کے لئے اتنا بڑا شاق تھا کہ وہ دو ہفتوں کے لئے اکیلی کیمپنگ کے لئے رخصت ہو گیا۔ جبکہ ہارون نے اس کے ساتھ جانے کی لاکھ کوشش کی۔

حدیقہ کو یہ دیکھ کر پریشانی کے ساتھ قدرے تسکین بھی ہوئی۔ کیونکہ اب گھر کے اخراجات کی تمام تر ذمہ داری حدیقہ بخوشی و بخوبی اپنے کندھوں پر اٹھانے کی ہمت و قوت رکھتی تھی اور اسے اپنے ازدواجی حالات مزید بہتر ہونے کے سنہری مواقع نظر آ رہے تھے کہ کم از کم اس کے شوہر کی اونچی ناک پر ایک نہیں، ہزاروں کی تعداد میں لکھیاں جھنھنائیں گی اور وہ مجبوراً آف تک نہیں کرے گا۔ وہ یہ سوچ کر مسرت و انبساط میں جھوم اٹھی۔

ہارون بھی سیٹیاں بجاتا کچن میں چائے دم دیتے ہوئے حدیقہ کے ہر فکر سے عاری اور پُر تسکین چہرے کو پڑھنے کی کوشش میں کامیاب ہو چکا تھا۔ جبکہ شیریں ایسی مضطرب ہوئی کہ ندامت اور فکر مندی کے احساس میں وہ حدیقہ کا سامنا کرنے سے کترار ہی تھی۔ کیونکہ زمانے کا رنگ بدل چکا تھا۔ ہوائیں اپنے رخ کا صحیح تعین کر چکی تھیں۔



”حدیقہ! تم سے ایک مشورہ لینا چاہتا ہوں۔“ خرم نے نہایت اپنائیت سے کہا۔
 ”وائے ناٹ۔ بولے۔“ وہ لپ اسٹک لگاتے ہوئے لاپرواہی سے بولی۔
 ”بات یہ ہے کہ تین مہینے ہونے کو آئے ہیں بے کار گھر میں بیٹھے ہوئے۔ اب تو ناامید ہونے کے ساتھ کم مائیگی کا احساس مارنے لگا ہے۔ سوچ رہا ہوں، واپس کیوں نہ چلے جائیں۔“ وہ نہایت نرمی سے بولا۔

وہ اس کی طرف معنی خیز نظروں سے دیکھتے ہوئے سوچنے لگی۔
 ”بس اتنی سی بات تھی۔ تمام پھول پھاں چند مہینوں کی بے روزگاری نے ملیا میٹ

کر دی۔ یہ روزگار، کمائی، اسٹیٹس اور عزت و وقار ہی تو ضعفِ قوی کو فرعونیت کی جانب لے جاتے ہیں۔ جوں جوں ان کی زندگی میں نعمتوں کا اضافہ ہوتا جاتا ہے، دماغِ عالم بالا کی سیر و تفریح میں ایسے مگن رہتا ہے، جیسے اپنی تقدیر کی لوح پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے عنایتیں اور رحمتیں وافر مقدار میں بذاتِ خود لکھوا کر لائے ہیں۔ وہ وقت ہوتا ہے اس کے سامنے سجدہ ریز ہو کر شکر ادا کرنے کا، جو کبر و پندار کی نذر ہو جاتا ہے۔“

”اچھا... تو تم مجھے طعنے دے رہی ہو۔ مجھے کیا جتنا چاہتی ہو؟“ وہ تلخی سے بولا۔
 ”جو اپنی محنت و مشقت سے گھر کو رن کرتا ہو، نان نفقے کا ذمہ دار ہو، اسے حق پہنچتا ہے کہ وہ اپنی تمام تر غلطیوں اور کوتاہیوں کا جان لیوا عذاب دوسروں پر تھوپ کر خود کو بری الذمہ اور دوسرے کی فہرست میں اپنی رضا کے مطابق گناہ اور سزا کا فیصلہ لکھ کر خوشیوں کے دیپ جلائے۔“ وہ نہایت سنجیدگی سے بولی۔

”میں تمہاری بات نہیں سمجھ سکا۔“ وہ نظر انداز کرتے ہوئے بولا۔ ”ذرا سوچ سمجھ کر مشورہ دینا۔ کیونکہ یہاں بیکار بیٹھنے کا کیا فائدہ؟“
 ”بہت خوب رہا کہ آپ میری بات کو سمجھنے سے قاصر ہیں۔ فکر مندی کی ضرورت نہیں۔ میں آپ کی ہر طرح کی ذمہ داری بخوشی اٹھانے کی ہمت رکھتی ہوں۔ اللہ تعالیٰ نے مجھے بھی تو جیتے ہوئے سالوں کا حساب چکانے کا موقع بخشا ہے۔“ وہ طنزیہ مسکرائی۔

”شوہر ہونے کے ناتے تمہاری ہر خواہش کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کا میں ذمہ دار ٹھہرایا گیا تھا۔ رول ریورس نہیں ہو سکتا جان!“ وہ نرمی سے بولا۔ ”میری غیرت و خود داری بہت ہرٹ ہوگی۔ اس لئے کہہ رہا ہوں کہ واپس اپنے ملک چلتے ہیں۔ ورنہ تمام جمع پونجی یہاں ہی صرف ہو جائے گی۔“

”اس رقم سے ہسپتال تو بننے سے رہا۔“ وہ سوچتے ہوئے بولی۔
 ”ہسپتال کے لئے ہم دونوں بہن بھائی کی رقم ہرگز کافی نہیں۔“ وہ سوچتے ہوئے بولا۔

”شیریں پر گھریلو ذمہ داریوں کے علاوہ بچوں کے اخراجات کا کافی بار ہے۔ آپ نے تو بہت کچھ سیو کر لیا ہوگا۔“ اندازِ کرید نے والا تھا۔
 ”یار! کیا میں بہن سے دال روٹی کا معاوضہ طلب کروں گا؟ فارگاڈ سیک۔ اُس

کی پوری تنخواہ بینک میں محفوظ ہے۔ ہر طرح کے اخراجات اٹھانا میری ذمہ داری ہے۔“
”ناراض ہونے کی بات نہیں۔ آپ نے مجھ سے کبھی کوئی بات شیئر ہی نہیں کی
کہ اصل حقیقت کو جان پاتی کہ گھر کون چلا رہا ہے، بچوں پر خرچ کون کر رہا ہے وغیرہ
وغیرہ۔“ وہ سوچتے ہوئے بولی۔

”کیا سوچ رہی ہو؟“ وہ پھر گویا ہوا۔

”سوچ رہی ہوں، میری بلی مجھے ہی میاؤں۔“ وہ زہریلے لہجے میں بولی۔

”کیا مطلب ہے تمہارا؟“ وہ مطلب سمجھ کر انجان بن گیا۔

”اتنے بھی معصوم مت بنے۔“ وہ چڑ کر بولی۔ ”اپنی بہن سے مشورہ کیجئے جس

پر آپ کی مہربانیاں وافر مقدار میں ہیں۔ زندگی بھر کی سہمی ہے وہ آپ کی۔“

”ہاں، اس میں شک نہیں۔ لیکن تم بھی تو جیون سہمی ہونا میرا۔“ وہ قدرے

پیار سے بولا۔

”میں ہوں سہمی نمبر 2..... جس کا نہ تو کوئی مقام ہے، نہ ہی حیثیت ہے۔“ وہ

خفگی سے بولی۔ وہ اس کی سچائی پر خاموشی سے اسے دیکھتا رہ گیا۔

”سہمی نمبر 1 کے پاس جائیے جناب! اُس کا مشورہ اہمیت کا حامل ہوگا۔ میں

خواخواہ اپنا وقت ضائع کیوں کروں؟“ وہ طنزیہ لہجے میں بولی۔ ”ہاں، اپنا فیصلہ سنا

دیجئے گا مجھے ہمیشہ کی طرح۔“

”بھئی اب تو تم بھی ہر فیصلے میں برابر کی شریک ہو۔“ وہ مسکرا دیا تو اس نے

چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ یہ کیسے ممکن ہے؟..... بھلا کتے کی دم کیسے سیدھی ہو سکتی

ہے؟ وہ دل میں ہی بڑبڑائی۔

”میں سچ کہہ رہا ہوں۔ یقین کرو۔“ وہ نرمی سے بولا۔

”مجھے ناچیز سے مطلب کیا ہے؟“ وہ حیرت و اشتیاق سے بولی۔

”کوئی مطلب نہیں یار۔“ وہ مسکرا رہا تھا۔

”تو ٹھیک ہے۔ ذرا میرا فیصلہ سن لیجئے۔ میں آپ کے ساتھ واپس نہیں جا

رہی۔“ وہ مستحکم لہجے میں بولی۔

”کیوں؟..... جہاں میں، وہاں تم۔ بیوی ہو میری۔“ وہ سنجیدگی سے بولا۔

”بہت جلد احساس ہونے کا تہہ دل سے شکر یہ ادا کرتی ہوں۔“ وہ طنز کے نشتر

چلا رہی تھی۔

”مہم طریقے سے بات سنو گی یا یونہی اول فول بیتی رہو گی؟“ اسے غصہ آ گیا۔
 ”اس لہات ہمیدگی سے مسئلے کا حل سوچنا چاہئے۔ تم ہو کہ بدلہ لینے پر تکی ہو۔“
 ”ہاں.....“ وہ مسکرا دی۔ ”بدلہ لینے پر آ جاؤں تو آپ سے برداشت نہ ہو گا۔
 اہل! امی بھی آپ 99 فیصد زیادتیوں اور بے انصافیوں کے مرتکب ہیں۔ ذرا سے
 مہم پڑ جانے کا مطلب راہ راست نہیں۔ ان دبی ہوئی چنگاریوں میں مجھے ہر دم شعلے
 بھڑکنے کے آثار نظر آتے ہیں۔ خرم! آپ نے مجھ پر اپنی بہن کو مسلط کر کے اچھا
 نہیں کیا۔ کیا ہم الگ اپنی دنیا نہیں بنا سکتے؟ کیا ہم اپنی دنیا کو معصوم شرارتوں اور
 بے غرض قہقہوں سے چار چاند نہیں لگا سکتے؟ کیا میری گود کبھی ہری نہیں ہو سکتی؟
 میرے اندر کی مانتا تڑپ رہی ہے، پلک رہی ہے۔ آپ نے ہمیشہ میری بات کو رد
 کیوں کیا؟ بتائیں آپ نے ایک نرس کی نرس بیٹی کے ساتھ شادی کیوں کی تھی؟ آپ
 مجرم ہیں میرے۔ میں آپ کو کبھی معاف نہیں کروں گی۔“ وہ قہر مان نظروں سے اسے
 دیکھنے لگی۔

”تم جانتی ہو، تمہاری ان بے جا خواہشوں کو پورا کرنا میرے بس کا روگ نہیں۔
 مجھے اولاد کی تمنا ہے نہ ہی میں الجھنوں میں پڑنے کے قائل ہوں۔ شیریں کے بچے
 ہماری زندگی میں خوشیاں بھرنے کو کافی ہیں۔“ وہ جزبہ ہو کر بولا۔ ”ہاں اگر تم میرے
 ساتھ نہیں رہنا چاہتی تو آج ہی فیصلہ کئے دیتا ہوں۔“ اس کی مردانگی عود کر آئی تھی۔
 ”میں ایک رکھیل بن کر آپ کے ساتھ نہیں رہ سکتی۔ مجھے آپ کا ہر فیصلہ منظور
 ہے۔ مگر یاد رکھئے گا کہ آدھے کی جھے دار ہوں یہاں کے لاء کے مطابق۔“ وہ ہنس
 پڑی۔

”فضولیات کے چکروں میں مت پڑو حدیقہ! اپنے ملک چلتے ہیں۔ دیکھو تین
 مائیں نگاہیں دروازے پر لگائے بیٹھی ہیں۔ ہم دونوں مرد کس قدر بے کار نکلے۔ وہاں
 کم از کم روزگار تو مہیا ہو گا۔“ وہ سوچتے ہوئے پھر نرم پڑ گیا۔

”وہاں نرس کے پیشے کو نہ تو باعزت نگاہ سے دیکھا جاتا ہے نہ ہی ضروریات
 زندگی احسن طریقے سے پوری ہو سکتی ہیں۔ میں یہاں بہت خوش ہوں۔ کیونکہ مجھے
 یہاں دونوں نعمتیں میسر ہیں۔ میری ماں بھی خوب عیش و عشرت میں ہے۔ میری انکم
 سے چھوٹا سا گھر خرید کر ریوڈیشن اسٹارٹ کر دی ہے انہوں نے۔ بہت خوش ہیں۔
 ان کی دعاؤں کے اثرات ہیں مجھ پر کہ میں ذرے سے پہاڑ بن گئی۔ بھلا مجھے کسی

باؤلے کتے نے کاٹا ہے کہ واپس چلی جاؤں، وہ بھی آپ کے ساتھ جنہوں نے مجھے وہاں لے جا کر مجھے پیسا مارنے کے منصوبے بنا رکھے ہیں۔ میں آپ کے دل و دماغ میں اٹھنے والی تلاطم خیز موجوں کے بارے میں بہت علم رکھتی ہوں۔“ وہ ڈکھ و مسرت کے ملے جلے لہجے میں اسے بتا رہی تھی۔

”ماں کی دعاؤں نے تمہاری زندگی سنوار دی۔ جبکہ میرے ساتھ ایسا نہیں ہوا۔ کیونکہ میں نافرمان اولاد جو ٹھہرا۔ ایک جاہل، خود غرض اور ضدی بیوی کا شوہر جو ہوں۔ چند سالوں کی بات تھی۔ کاش! تم میرا ساتھ ہی دے پاتی۔“ وہ اُلجھ گیا تھا۔

”آپ نے میرے ساتھ انسانوں جیسا سلوک کیا ہوتا تو چند سال کیا، اپنی تمام تر زیت آپ پر قربان کر دیتی۔ مگر آپ کے رویے اور سلوک نے مجھے وہ قدم اٹھانے پر مجبور کیا جس سے میری عزت اور نسوانی وقار بحال ہو سکتا تھا۔ میں آپ کی شریک حیات ہوں۔ سچی اور کھری بات کہوں، جاب کے بعد آپ کے ساتھ میرا یہ ردِ عمل فقط ایک نصیحت آموز سبق کے علاوہ کچھ نہ تھا۔ میں آپ کو ظلم و تشدد کا احساس دلا کر اپنی رفاقت میں لانا چاہتی تھی۔ گو کہ جس میں کامیابی دس فیصد ہی ہوئی ہے۔ میں اللہ تعالیٰ کی ذات سے ناامید ہرگز نہیں۔ جس دن آپ کو بیوی کے انسان ہونے کا مکمل طور پر احساس ہو گیا، اس دن ہم دونوں کی زندگی ہی بدل جائے گی۔ ہمارے گرد و پیش سوائے خوشیوں اور کامرانیوں کے اور کچھ نہ ہوگا۔ ماں اور بہن کا رشتہ بھرپور رحمتیں بن کر ہماری زندگی کو بتدریج پُر سکون بناتا رہے گا۔ آپ میری مان کر تو چلیں۔ ہماری زندگی شیریں اور ہارون کی مانند ہوگی۔“ وہ نہایت نرمی سے بولی۔

”تمہاری سب سے پہلی شرط ہی ماں بہن سے کنارہ کشی اور لاتعلقی کی ہوگی۔ دوسری شرط اس دنیا میں بچے لانے کی ہوگی۔ تیسری شرط زندگی بھر یہاں رہنے کی ہوگی۔ تینوں شرائط نامنظور ہیں۔“ وہ ہٹ دھرمی سے بولا۔ ”مجھے بیوی کا جاب کرنا قطعاً پسند نہیں ہے۔ عورت کی اجارہ داری یہاں سے ہی تو شروع ہوتی ہے جو سراسر ذلت اور فساد کی جڑ ہے۔“

”شیریں کے لئے آپ کے قانون میں فرق کیوں ہے؟ کس قدر بے انصاف اور غیر مناسب مرد ہیں آپ۔“ وہ تڑپ اٹھی۔

”شیریں کے لئے تمام قانون بنانے والا اس کا شوہر ہے۔ میں نہیں۔“ وہ ڈھٹائی سے بولا۔

”میں نے اس قسم کی دلچسپی کرنا سراسر حماقت ہے۔ آپ کے خیالات کو
 میں جانتی ہوں، آپ وہ فیصلہ کریں گے جو آپ کے لئے
 بہتر ہوگا۔ اور میں بھی تو اپنے بارے میں فیصلہ کرنے کا پورا حق
 رکھتی ہوں۔ اب میری زندگی کے لئے کیا مناسب ہے۔“ وہ بے بسی سے بولی۔

”پھر اے منم سے پیشانی ٹکراؤ گی تو اذیت کے سوا کچھ حاصل نہیں کر سکو گی
 حد ایسا! زخم، گھاؤ اور ہر پل خون کا رونا اور درد تمہارا مقدر ہے۔ راضی برضا ہو کر اپنی
 قسمت کا تماشا دیکھو۔ اپنی ضد سے باز نہیں آؤ گی تو یہی ہوگا تمہارے ساتھ۔“ وہ
 اپردائی سے بولا۔

”آج کے بعد آپ سے اس موضوع پر بات نہیں ہوگی۔ میں ہار گئی خرم! آپ
 بیت گئے۔ ہر طریقے اور ہر طرز سے۔“ وہ سختی سے بولی اور اٹھ کر لاؤنج میں چلی گئی۔
 شیریں کے کمرے سے ہارون کے اونچا بولنے کی آواز پر وہ چونک گئی۔ وہ تو بے
 حد مرغباں مرغ شوہر تھا، جسے شیریں نے بہت جلد ہی اپنے قبضے میں کر کے اس پر
 حکمرانی شروع کر دی تھی۔ مگر آج ایسی کون سی انہونی بات ہو گئی تھی کہ وہ چیخ رہا تھا
 اور شیریں کے رونے کی آواز سے وہ ہل گئی تھی۔ وہ کان کھڑے کئے چیخ دیکار پر غور
 کرنے لگی۔ حدیقہ کا نام بھی اس شور شرابے میں گونج رہا تھا۔

”حدیقہ کی ٹریننگ اور اس کی اداؤں کے اثرات نے میری زندگی کو دکھوں کی
 آماجگاہ بنا دیا ہے۔ میں بھی اسے چھین سے جینے نہ دوں گی۔ اسے طلاق نہ دلوائی تو
 میرا نام شیریں نہیں۔“ وہ آہستگی سے بول رہی تھی۔ مگر بات اس کی سماعتوں سے ٹکرا
 کر اس کے وجود میں کپکپی پیدا کر گئی۔

”مجھے ایک ناسمجھ اور معصوم بچہ سمجھ کر ایسی بے ہودہ الزام تراشیاں مت کرو۔ وہ
 دن گئے جب تم مجھے تنگی کا ناچ نہایا کرتی تھی۔ اور میں کس قدر ناقابل فہم شوہر تھا کہ
 خرم کے رویے سے بھی سبق نہ سیکھ سکا۔“ وہ زور سے بولا۔ ”آج کے بعد سوچ سمجھ کر
 بات کرنا اور نہ زبان گدی سے نکال کر کتوں کے آگے ڈال دوں گا۔“

”یہ تمہاری زبان ہرگز نہیں۔ میں نے تمہارے اور بچوں کے روشن مستقبل کی
 خاطر دن رات ایک کر دیا اور تم حدیقہ کی قربت میں اس کے اتنے قریب ہو گئے کہ
 تمام حدیں اور فاصلے ہی مٹ گئے۔ اور مجھ سے دن بہ دن دوری بڑھتی گئی۔ میری
 قربانیوں کی یہ قدر کی ہے تم نے۔“ وہ روئے جا رہی تھی۔

”میری عرضداشت پر غور کرو۔ مت لگاؤ اس پاکباز اور مقدس عورت پر الزام۔ بے غیرت عورت! اپنی بھابی کے بارے میں ایسے انکشافات اور الزامات۔ تم اس حد تک گر سکتی ہو، میں نے کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا۔“ وہ پھر چیخا۔

”تم میری زبان نہیں روک سکتے۔ میں اس دو ٹکے کی نرس کو پورے خاندان میں بدنام کر دوں گی۔ یہ یہاں بھی کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہے گی۔ اور تم سے تو میں خود ہی نمٹ لوں گی۔ جاتے کدھر ہو؟“ وہ گستاخی سے بولی تو ہارون مارے غصے کے ہاتھ آپس میں رگڑنے لگا۔

”تمہارے پاس میرے سوالات کے جوابات کہاں؟ تمہیں کتنے عرصے سے گھر بٹھا کر کھلا رہی ہوں اور تمہاری اولاد کو پال رہی ہوں۔ باتیں تو سنو ٹکے ٹکے کی۔ عشق کا بھوت جو سوار ہو گیا ہے سر پر۔“ وہ چیختے ہوئے بولی۔

”میں کہتا ہوں کہ اس بند کرو۔ ورنہ..... ورنہ.....“ وہ دانت پیستے ہوئے بولا۔

”ورنہ کیا کر لو گے؟ مجھے قتل کر دو گے تو پھانسی سے تم بھی نہیں بچو گے۔“ وہ برجستہ بولی۔

”اس وقت خرم گھر پر موجود ہے۔ ورنہ وہ مزا چکھاتا کہ عمر بھر میرے سامنے نہ آنکھ اٹھا کر دیکھتی، نہ ہی یوں زبان چلانے کی ہمت کرتی۔“ وہ اس کا کان مردڑتے ہوئے بولا۔

”واٹ ڈو یو تھنک کہ مجھے سمجھ نہیں آ رہی کہ مجھ پر ظلم کروانے والی کون ہے؟ وہ مجھ سے ہمیشہ جلیس ہوتی رہی ہے۔ چلو آج اس داشتہ کو خوش کر دو۔“ وہ اونچی اونچی روتے ہوئے بولی۔ ”اس سے ایسا کون سا قیمتی تحفہ مل گیا ہے کہ میری سالوں کی قربت کو بھول گئے ہو۔ بتاؤ..... بولو۔“

ہارون غصے پر قابو نہ پاسکا۔ اتنے بڑے الزام کا سن کر چیخا اور ایک زنانے دار تھپڑ اس کے گال پر رسید کر دیا۔ زور دار چیخ کے بعد کمرے میں صرف سسکیوں کی آواز اُبھرنے لگی تھی۔ اس کے کمرے سے خرم کے بے فکرے خرائے اسے بے کل کر گئے۔ ہارون تیزی سے باہر نکل آیا۔ حدیقہ کو لانچ میں سر پکڑے دیکھ کر اس کے قریب آ کر بولا۔

”آئی ایم سوری۔ میری وجہ سے تم پر کپکپڑا اچھالا گیا۔ میں جلد ہی فیصلہ کرنے والا ہوں۔ ایسی بدتمیز، زبان دراز اور گستاخ عورت کے ساتھ زندگی گزارنا سراسر بے

میرتی ہے۔ چار پیسے کیا کما کر لاتی ہے، سر پر سوار ہو کر ناچتی ہے کبخت کہیں کی۔“
 ”آپ غصے میں کوئی غلط فیصلہ نہیں کریں گے۔“ وہ التجائیہ انداز میں بولی۔
 ”مگر کی بنیاد پہلے ہی پانی پر رکھی گئی ہے۔ سمندر کی اتھاہ گہرائیوں میں گرنے
 ۔ مجھے بچا لیجئے ہارون! خرم مجھے اپنے ساتھ لے جانا چاہتے ہیں۔ انکار کی صورت
 میں طلاق میرا مقدر بن جائے گی۔“

وہ اتنا کہہ کر سرعت کے ساتھ اپنے کمرے میں آگئی کہ اس سے پہلے کہ شیریں
 اس پر حملہ آور ہو کر اسے زخمی کر دے۔ کیونکہ ایسا ردِ عمل ان کا شیوہ جو رہا تھا۔
 وہ بستر پر لیٹی طلوعِ سحر تک نہ جانے کتنے ہی بھیاں رنگوں سے تانے بانے بپتی
 رہی مگر کسی نتیجے پر نہ پہنچ سکی۔

صبح تیار ہو کر اس نے سب کے لئے ناشتہ ٹیبل پر رکھ دیا۔ بچوں کو اپنے ہاتھ سے
 ناشتہ کراتے ہوئے اس نے شیریں کے پڑمرده چہرے اور سرخ ہوتی ناراضگی سے
 لبریز آنکھوں کو بغور دیکھا تھا۔ لبوں پر خاموشی جانے کس طوفان کا پیش خیمہ تھی۔ وہ
 ناشتہ کئے بغیر ہی گھر سے باہر نکل کر سٹاپ پر میٹرو کا انتظار کرنے لگی۔

خرم ابھی تک بیدار نہ ہوا تھا۔ ہارون لاؤنج کے صوفے پر اوندھے منہ لیٹا ہوا
 تھا۔ بچے خاموش اور سہمے ہوئے تھے۔ گھر میں سوگواری اور اداسی رواں دواں تھی۔
 حدیقہ نے بچوں کو پیار کیا، گاڑی کی چابی اٹھا کر آہستہ سے بولی۔

”آج میں اپنے بچوں کو چھوڑنے جاؤں گی۔ راستے میں بچوں کو کیا چاہئے؟ مانی
 دلا دے گی۔“ وہ دونوں کو پیار کرتے ہوئے بولی۔

”کچھ نہیں چاہئے مانی! ماما اور پاپا کی صلح کروادیں۔“ دونوں بیک آواز بولے۔
 ”آج دونوں کی ہم سب مل کر پٹائی کریں گے۔“ وہ مسکراتے ہوئے بولی۔

”جو بچے لڑائی سے باز نہیں آتے، ان کی پٹائی تو لازم ہو جاتی ہے نا مانی! ذرا
 ہلکے ہاتھ سے۔“ بیٹی نے پیار سے کہا۔

”نشو و پیر کے ہم بنا کر ماریں گے۔“ بیٹا بھی ہنس پڑا اور وہ تینوں گاڑی میں بیٹھ
 کر اپنی اپنی منزل مقصود کی جانب چل پڑے۔



”حدیقہ جانو! میں نے گھر کو اے ون کر لیا ہے۔ اب باری ہے فرینچر اور پردوں کی۔“ حدیقہ کی ماں کے لہجے میں بے پناہ خوشی تھی۔

”ماما! اتنی محنت اور روپیہ صرف کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں جلد از جلد آپ کو اپنے پاس بلانے کا پروگرام بنا رہی ہوں۔“ وہ پیار بھرے لہجے میں بولی۔

”تمہارے پاس دو چار ہفتوں کے وزٹ پر آؤں گی۔ داماد کے گھر رہنا مجھے معیوب لگتا ہے۔ اور پھر میرا اسی گھر میں دل لگتا ہے جو میرا اپنا ہے۔“ ماما نے آہ بھرتے ہوئے کہا۔

”ماما! آپ پاپا کا انتظار کب تک کرتی رہیں گی؟ انہیں بھول کیوں نہیں جاتیں؟“ حدیقہ نے تسلی دیتے ہوئے کہا۔ ”میں انہی کی نشانی ہوں نا۔ اسی پر اکتفا کر لیجئے۔“

”بیٹے! انہوں نے واپس آنے کا وعدہ تو نہیں کیا تھا۔ لیکن نہ جانے پھر بھی کیوں منتظر ہوں۔ جلد یا بدیر انہیں ہوش ضرور آئے گی۔“ لہجے میں اُمید بر آئی تھی۔ ”وہ مجھے ڈھونڈتے ہوئے آگئے تو دروازے کو مقفل دیکھ کر کہیں واپس ہی نہ چلے جائیں۔“

”ماما! آپ ٹھیک تو ہیں؟ آپ مجھے نارمل نہیں لگ رہیں۔ ایسی باتیں آپ نے پہلے تو کبھی نہیں کہیں۔ پاپا کو ہمیشہ برا بھلا ہی کہا۔ اب کیا ہو گیا ہے؟ آئی ایم وریڈ۔

ماما! معجزات و اتفاقات کی دنیا سے باہر آئیں۔ آپ نے سچائی اور حقیقت کو تسلیم کرنے کے باوجود اپنے من مندر میں ایک ایسے بت کو سجا رکھا ہے، جو آپ کا اپنا کبھی تھا ہی نہیں۔ آپ کی باتوں سے اپنا رملٹی کی ہو آتی ہے۔ جس نے آپ کے وجود کو پانے کی خاطر ایسا گھٹاؤ نا ڈھونگ رچایا، جسے پیار کا نام دیا، آپ کو بھری دنیا میں جس بے دردی سے وہ چھوڑ گیا تھا، کیا وہ کرب اور ندامت بھول گئی ہیں؟“ وہ حیرت سے بول رہی تھی۔

”بیٹا! تمہیں سچی بات بتاؤں، میں انہیں ایک پل کے لئے بھی نہیں بھول پائی۔ یہ الگ بات ہے کہ سب کے سامنے سیسہ پلائی ہوئی دیوار بنی رہی۔ اگر کمزور پڑ جاتی تو سب مجھے اور تمہیں پاؤں تلے روند کر گلیوں کی خاک بنا دیتے۔“ وہ بھڑائی ہوئی آواز میں بولی۔

”لیکن میں اس کی غلطیوں کو ناقابل معافی قرار دیتی ہوں۔“ وہ دکھ بھرے لہجے میں بولی۔

”میں نے تو فرسٹ ڈے سے اسے معاف کر دیا تھا حدیقہ! مجھے اس سے پیار ہو گیا تھا۔ وہ پیار جو شادی کے بعد ہوتا ہے اور مرنے کے بعد بھی اپنی اہمیت نہیں کھوتا۔“ اس کی سسکی اُبھری تو حدیقہ تاسف اور دکھ کی اتھاہ گہرائیوں میں گھر گئی، تھوڑے وقف کے بعد بولی۔

”یہ گناہ ناقابل معافی ہے۔ میں اتنی فراخ دل نہیں ہوں ماما! آپ کو کیا علم کہ میری ازدواجی زندگی پاپا کی ان کوتاہیوں سے کس ڈگر پر چل نکلی ہے۔ میں شوہر کے لئے ایک ناقابل فراموش گالی سے بڑھ کر کسی اہمیت کے لائق نہیں رہی۔ نہ جانے اگلے لمحے میرے ساتھ کیا ہو جائے۔ اور آپ ہیں کہ ایسے سخت دل انسان کے انتظار میں زندگی بٹا دی۔ ہماری راہوں میں بکھرے ہوئے کانٹوں کو چھتے چھتے ہم دونوں کے ہاتھ لہو لہان ہو گئے ہیں، پاؤں زخمی ہو گئے ہیں ماما! آج کے بعد میرے سامنے اس سنگ دل کا نام نہ لیں۔ بس مجھے اسی ماں کی تلاش ہے جس نے اتنا بڑا راز سینے میں دبا کر مجھے چلنا سکھایا تھا، اس دنیا کے نشیب و فراز سے مقابلہ کرنے کی ہمت بخشی تھی۔ انتظار کمزوری اور بے بسی کا دوسرا نام ہے ماما! آپ اس زمرے میں نہیں آتیں۔“

”بیٹی! میں تو سمجھ رہی تھی کہ خرم نے تمہیں ایک باعزت مقام دیا ہے۔“ وہ پریشانی سے بولی۔

”ماما! جو بیوی، شوہر کی نظروں سے ایک بار گر جاتی ہے، وہ دوبارہ اس کے تاج کی زینت نہیں بن سکتی۔ لاوارثی اور کم مائیگی میرے اسٹیٹس کو کیسے بدل سکتی ہے؟ آپ میرے لئے دعا گور ہیں۔ میں جلد ہی آپ کو اپنے پاس بلا لوں گی۔ صرف اس انتظار میں ہوں، مجھ دید ہوں کہ برات کس سمت جاتی ہے۔“ وہ آج ماں کو تمام حالات گوش گزار کر دینا چاہتی تھی۔

”میں تمہاری اس سوچ سے اتفاق نہیں کروں گی۔ تم نے خرم کو چھوڑنے کا تصور

کیسے کر لیا؟“ وہ سنجیدگی سے بولی۔ ”آج تک تو وہ تمہارا دیوتا تھا، یک دم کیا ہو گیا کہ تم اتنی ناامیدی کی باتیں کرنے لگی ہو۔“

”ماما! کتے کی دُم پر فضول انتھک محنت کرتی رہی ہوں۔“ وہ تلخی سے بولی۔

”حذیقہ! شوہر کو ایسے خطابات سے نوازنے والی بیوی جہنمی ہوتی ہے۔ تو بہ کرو اور خرم سے صلح کے مراسم بڑھانے کی کوشش کرو۔“ وہ سمجھانے کے انداز میں بولی۔ ”دیکھو، بے اولاد ہونے کے باوجود اس نے تمہیں اپنا نام سوئپ رکھا ہے۔ اس کی وفا کی اس سے بڑی مثال اور کیا ہو سکتی ہے؟“

”قصور وار تو صرف میں ہوں۔ یہ بھی ٹھیک رہی ماما!“ اس نے قدرے خفگی سے کہا اور خدا حافظ کہہ کر فون بند کر کے ماں کے بارے میں سوچنے لگی جس نے اس کی تربیت میں خاوند کی فرمانبرداری، تابعداری اور خدمت گزاری کوٹ کوٹ کر بھر دی تھی۔ وہ اسی راستے پر اندھا اعتماد کئے گا مرن رہی مگر پھر بھی شوہر پر فتح مندی حاصل نہ کر سکی۔ اب وہ ان تمام الجھنوں سے نکل کر اپنی زندگی کے ایک ایک دن کی قدر دان ہو کر اس سے انصاف کرنے کے تمام گُر سیکھ چکی ہوں تو ماما! پھر سے واپس اسی راستے پر ڈالنے کی کوشش کرنے لگی ہیں۔ ماما! اب ایسا نہیں ہو گا۔ مجھے آپ جیسی حسرت و یاس میں ڈوبی ہوئی کرب زدہ، ناکام و ادا س زندگی نہیں چاہئے۔ معاشرہ، روایات و تہذیب اور میری موجودگی آپ کی مجبوری اور کمزوری بن گئی تھی۔ جبکہ میں ان تمام لعنتوں سے بے بہرہ اور لاتعلق ہوں۔ میرے پاؤں زنجیر سے آزاد ہیں۔ ہاؤ لکی آئی ایم۔

اُس نے اپنی سوچ کا دھارا بدلا اور اپنے کام میں مگن ہو گئی۔

شام کو تھکی ماندی گھر پہنچی تو گھر کی بدلی ہوئی فضا دیکھ کر حیرت سے گرد و پیش کا جائزہ لینے لگی۔ لاؤنچ میں اٹیچی اور بینڈ کیری بکھرے ہوئے تھے۔ ایک طرف خرم کے کپڑوں کا ڈھیر تو دوسری طرف شیریں کی الماری کا سامان۔

یہ سب کیا تھا؟ وہ سمجھ تو گئی۔ تیزی سے دونوں کمروں میں جھانکا۔ ہاتھ روم سے شاور کی آواز پر وہ خرم کی موجودگی پر قدرے مطمئن سی ہو گئی۔ شیریں، ہارون اور بچے گھر پر موجود نہ تھے۔ یہ سوچ کر ایک خوشی کی لہر پورے بدن میں دوڑ گئی کہ میاں بیوی میں صلح ہو گئی ہے۔

وہ گاؤں اتار کر جوتے اتار رہی تھی کہ خرم پھٹکارتا ہوا ہاتھ روم سے نکلا۔

”تم جیسی دہیات عورت میں نے زندگی میں نہیں دیکھی۔ جیسی ماں ویسی بیٹی۔“
وہ ہنستا ہوا بولا۔

”ماں تک پہنچنے کی ضرورت نہیں۔ مجھ سے بات کریں اگر آپ کا تعلق کسی شریف خاندان سے ہے۔“ وہ غصے سے بولی۔

”آخر کار تم ہارون کو اپنے شیشے میں اتارنے میں کامیاب ہو ہی گئی ہو۔ میری بہن، جس کو آج تک کسی نے پھول تک نہ مارا ہو، تم نے اس کو شوہر کے ہاتھوں پٹوا دیا۔“ وہ اس کے بال پکڑتے ہوئے بولا۔

”آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ یہ بہن آپ کا گھر اُجاڑ کر چھوڑے گی۔“ وہ بال چھڑانے کی کوشش کرتے ہوئے بولی۔ ”کاش آپ کو اپنی بہن کے اصلی روپ پر یقین آ گیا ہوتا تو آج نوبت یہاں تک نہ پہنچتی۔ آپ کی بہن اپنی ملکیت اور حاکمیت کو کسی صورت خیر باد کہنے کو تیار ہی نہیں۔ آپ کے اور میرے درمیان لامتناہی فاصلے اسی وجہ سے بڑھتے جا رہے ہیں۔

خرم نے اس کے بال تو چھوڑ دیئے مگر ایک زوردار طمانچہ اس کے گال کو سہلا گیا۔ ”یہ وہ پتھر ہے جو ہارون نے تمہارے کہنے پر میری بہن کے چہرے پر رسید کیا تھا۔ دُور ہو جاؤ میری آنکھوں سے۔ مجھے تم سے بلا وجہ نفرت نہیں۔ اس کی اُن گنت وجوہات ہیں۔ کاش میں اپنے والدین کی بات مان گیا ہوتا۔ میری ضد اور ہٹ دھرمی کا یہی انجام ہونا تھا۔ گناہ میرا ہے، خطا کار میں ہوں۔ میں اب تمہارے ساتھ دو گام بھی نہیں چلنا چاہتا۔“ وہ حقارت سے بولا۔ ”میں تمہیں چھوڑ کر پاکستان جا رہا ہوں۔ اپنی نئی زندگی کی شروعات کرنے۔ اور میری بات کان کھول کر سن لو۔ میری بہن کا پیچھا چھوڑ دو۔ اس کے بچوں کو باپ کے ہوتے ہوئے یتیمی کا لبادہ مت اوڑھاؤ اور مت بیوگی کا نشانہ بناؤ میری بہن کو۔“

”اب میری سننا چاہیں گے کیا؟“ یکطرفہ سرگزشت پر فیصلہ کرنا تو نا انصافی ہے۔ اگر آپ چاہتے ہیں کہ میں آپ کے ساتھ چلی چلوں تو ٹھیک ہے، مان لیتی ہوں۔ مگر میں خود پر لگائی ہوئی تہمت پر خاموش نہیں رہوں گی۔ دودھ کا دودھ، پانی کا پانی سامنے آنا بے حد ضروری ہے۔ میں اپنی تمام تر زندگی سب کے سامنے ایک مجرم بن کر نہیں گزارنا چاہتی۔ میرا چہرہ الزام کی تاریکی میں کیونکر گمشدہ ہو کر رہ جائے؟“ وہ ہمت بحال کرتے ہوئے بولی۔

”میری بہن نے جو کہہ دیا ہے، مجھے اس کی سچائی پر بھروسہ ہے۔ تم کیا بتاؤ گی اپنے بارے میں؟ میں تمہاری نس نس سے واقف ہوں محترمہ!“ وہ چیخ رہا تھا۔
وہ پروا کئے بغیر اٹھی اور لاؤنچ میں آکر بکھرے ہوئے کپڑوں کو دیکھ رہی تھی کہ ہارون بچوں کے ساتھ وارد ہوا۔ چہرے سے پریشانی کے آثار ہویدا تھے۔
”ویر از شیریں؟“ وہ قریب جا کر بولی۔ ”آپ کی آنکھوں میں ایسا درد تو میں نے کبھی نہ دیکھا تھا ہارون!..... کیا ہو گیا ہے؟“

”وہ اپنی سہیلی کے گھر ہے۔ یہاں آنا نہیں چاہتی۔ مجھ سے طلاق لینا چاہتی ہے۔ اس کا دماغ اس حد تک خراب ہو چکا ہے کہ اب اس کی واپسی ناممکن ہے۔ سر پر چڑھ کر ناچنے والی بیوی کو زمین پر کھڑا کرنا بہت مشکل ہے۔ قصور میرا ہے کہ اسے بے پناہ محبت کرتے ہوئے اپنی حیثیت ہی بھول گیا۔“ وہ افسردگی سے بولا۔
”کیوں؟..... ایسی بھی کیا بات ہو گئی کہ اس نے اتنا بڑا فیصلہ کر لیا پل بھر میں؟ ہارون! وہ جذباتی خاتون نہیں ہیں۔ آپ نے ضرور کچھ غیر مناسب حرکت کی ہوگی۔ عورت اتنی جلدی اپنا گھر برباد کہاں کرتی ہے؟ اسے منا کر لے آئیے۔ بچے بھی پریشان ہو رہے ہیں۔ ورنہ میرا فیصلہ بھی سن لیں کہ میں زندگی بھر کے لئے آپ سے دور ہو جاؤں گی۔ اور ختم ہو جائے گا یہ بہن بھائی کا مقدس رشتہ اور دوستی کا حسین ناطہ۔“

”دوستی کا حسین ناطہ.....“ خرم نے اندر آتے ہوئے آخری الفاظ سن کر قہقہہ لگایا۔ ”ہارون! تم نے ہی خیانت کر ڈالی۔ میرے بھروسے کے اونچے محلات کو زمین بوس کر دیا۔ بچپن کے رشتے کا تقدس چکنا چور کر کے تم نے کیا ایچو کیا ہے اس عورت کی خاطر جس کے باپ کی کسی کو خبر ہی نہیں؟ اپنا گھر تباہ کرنے پر تئل گئے ہو۔ بہت ہی بے وقوف نکلے ہو۔ میں تو اس کے جادو کے حصار میں آ ہی گیا تھا، تم بھی نہ بچ سکے۔“ وہ نفرت سے بولا۔

”بکو اس بند۔ ایک لفظ بھی اب منہ سے نکالا تو مجھ سے برا کوئی نہیں ہوگا۔ ایک پاکیزہ عورت پر اتنا بڑا الزام۔“ ہارون چیخ اٹھا۔

بچے کمرے کے کونے میں سکھنے لگے۔ حدیقہ بڑے ہی تھل سے بولی۔
”خرم! آپ کی عقل شریف میں میری بات ضرور بیٹھ گئی ہوگی کہ میں کیوں الگ رہنے کا اصرار کیا کرتی تھی۔ نند اور بھابی کے رشتے میں کدورتیں اور نفرتیں شامل

ہو نے میں دیر نہیں لگتی۔ شیریں نے ہر مشکل کا موردِ الزام مجھے ہی ٹھہرایا اور آپ نے اسے سمجھانے کے بجائے اس کی حوصلہ افزائی کی۔ ہر بار مجھے اس کے سامنے ذلیل و خوار کرنا، اسے ذہنی و دلی سکون سے نوازنا اپنے پیار کا اظہار سمجھا۔ اب جو بھی انجام ہوتا ہے ان دو شادیوں کا، اس کی تمام تر ذمہ داری آپ کے سر پر ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے ایک بدکردار عورت ایک نسل، ایک خاندان اور ایک معاشرے کے لئے ناسور ہے۔ اُن بیلنسڈ مرد تو ہے ہی سراسر تباہی و بربادی۔ ایک جیتی جاگتی مثال آپ ہیں، دور کیا جانا۔“

حدیقہ نے اپنے توہین میں جلتے ہوئے گال کو سہلایا۔

”آپ تو اپنے خاندان کے وہ سپوت نکلے کہ جس نے اپنے آباء اجداد کی نسل خود تک ہی محدود کر دی۔ اور بد قسمتی سے ایک جاہل، گنوار اور تنگ نظر شوہر جس کی نظر میں بیوی بے جان، ناکارہ، بے مول اور بے وقعت چیز ہونے کے سوا کچھ نہیں۔ اور ایسی بے قیمت اور بنجر پر اپڑی کہ جس سے چھٹکارے کے لئے فقط تین بار ایک ہی لفظ کی ادائیگی کافی ہے۔ اور اگر مزید اپنی مردانگی کی سیٹس فیکشن چاہئے تو زرد کوب کرو۔ تیل ڈال کر جلا دو اور گلا دبا کر موت کے گھاٹ اتار دو۔ یہ ہیں آپ۔ تف ہے آپ کی تعلیم و تربیت پر اور آپ کی گھٹیا اور حقیر سوچ پر۔“

”خرم! حدیقہ بالکل صحیح کہہ رہی ہے۔ ایک آپ کی پرستیشی کی کمزوری نے کتنے مسائل کھڑے کر دیئے ہیں۔ ایسا بھی بہن بھائی کا پیار کیا ہوا کہ اپنے جیون ساتھی کو سیکنڈری درجہ دے ڈالا۔“ ہارون منہ بھل کر بولا۔

”ہارون غلط نہیں کہہ رہے۔“ وہ بھی آہستگی سے بولی۔

”بکواس بند کرو حدیقہ! یہ میری بہن کو تمہاری جیب سے طلاق دینا چاہ رہا ہے۔ اگر ایسا گھٹاؤ ناکام عمل درپیش آیا تو تمہاری بھی خیر نہیں۔ تمہیں طلاق تو کیا، تڑپا تڑپا کر موت کے گھاٹ اتار دوں گا۔“ خرم نے نفرت آگئیں لہجے میں کہا۔

”خرم! طلاق کا مطالبہ شیریں نے خود کیا ہے۔ اسے سمجھاؤ۔ حدیقہ کو دھمکیاں دینے کا وقت گزر چکا ہے۔“ ہارون نے بے قراری سے کہا۔

”قصور تمہارا ہے۔ اُس کے پاؤں پڑ کر معافی مانگ لو اور اپنی غلطی پر پشیمان ہونا سیکھو۔ اور حدیقہ بیگم! تم اپنا قرض چکانے کی ہمت رکھتی ہو کیا؟..... تم نے میری بہن کی جنت کو جہنم میں بدل ڈالا۔“ خرم بولے جا رہا تھا۔

”خرم! میری بات کان کھول کر سن لو۔ نہ تو میں پاؤں پڑ کر معافی مانگنے کا خواستگار ہوں، نہ ہی مجھے کسی قسم کی گٹلی فیلنگ ہے۔ کیونکہ میں نے کوئی غلطی کی ہے، نہ ہی کسی قسم کی بے ایمانی و بددیانتی کی ہے۔ باقی حدیقہ کو لاوارث مت سمجھو کہ تم جو چاہو گے، کر لو گے۔ اس خام خیالی سے نکل آؤ۔ میں اس کے ساتھ ہوں۔ جیسے تم شیریں کا سہارا ہو، میں بھی اس کا ماں جایا نہ سہی، منہ بولا بھائی ہوں۔“ ہارون نے سمجھانے کی کوشش کی۔

”شیریں کا اس عورت سے مقابلہ کرنا سراسر ناانصافی ہے۔ تو بہن ہے میری بہن کی۔ ہارون! شیریں نے تمہارے وجود میں پراگندہ جراثیم دیکھ کر اتنا بڑا فیصلہ کیا ہے۔ ہارون! تم اچھی طرح جانتے ہو کہ میں اور شیریں بچپن سے ہی ایک ذہن یک قالب ہیں۔ میں اس کی اور بچوں کی ذمہ داری اٹھانے سے گریز نہیں کر دوں گا۔ تم اپنی خیر مناؤ۔ اور حدیقہ! تم میری بات یاد رکھنا۔ سڑکوں پر رزل جاؤ گی۔ ہارون اس وقت عشق میں گرفتار ہے۔ یہ بھوت بڑی ہی جلدی سر سے اتر جایا کرتا ہے۔ پھر تم ایک لٹو پیپر کی حیثیت میں ڈسٹ بن میں پھینک دی جاؤ گی۔ تمہیں پہلی رات کی بات یاد تو ہوگی کہ میں نے کیا کہا تھا کہ میری قربت اور پیار کو ابدی اور ہمیشگی کی زندگی دینا چاہتی ہو تو میری ماں کی خدمت گزاری اور تابعداری کرو۔ اور بہن کی ہماری زندگی میں دخل اندازی کو برداشت کر کے تم بھی میری طرح اس کی مطیع و غلام بن جاؤ۔ میرا خیال ہے، تمہیں میری یہ نصیحت سراسر مذاق ہی معلوم ہوئی تھی۔ اب تم نے ماں جی کے ساتھ جو سلوک کیا ہے، ہمارا پورا خاندان تمہاری اس گستاخی اور دیدہ دلیری پر نالاں ہے۔ گو کہ ماں جی کی نگہداشت کے لئے ان کے آس پاس ان گنت لوگ موجود ہیں، مگر فرض تو تمہارا تھا۔ یہاں آ کر تم نے شیریں کے ساتھ جو کیا ہے، ناقابلِ معافی ہے۔ اور میرے لئے ایسا ناقابلِ فراموش دھچکا ہے کہ کبھی دوسری شادی کے بارے میں سوچنا بھی میرے لئے گناہ کبیرہ ہو گا۔“ وہ زہریلے لہجے میں بولے جا رہا تھا کہ ہارون نے ٹوک دیا۔

”خرم! تمہاری کسی بات میں لاجک کی ہلکی سی رمت تک نہیں۔ غیر فطری اور غیر مناسب خواہشات کے بر آنے کی توقعات نے تمہیں کہیں کا نہیں چھوڑا۔ تم نے اپنی زندگی کی تمام خوشیوں کو داؤ پر تو لگایا ہی تھا، اس معصوم کو تو تم نے انڈر گراؤنڈ ہی کر ڈالا ہے۔ وہ حالات کے ساتھ سمجھوتہ کر کے اپنے حوصلے اور ہمت کو بحال کر لیتی اگر

تم نے اس کے سر پر الزامات کا بدبو دار ٹوکرا نہ رکھ دیا ہوتا۔ خرم! میری بات پر غور لانا۔ حدیقہ کا بچپن، دن باپ کے کس حال میں گزرا، تم جانتے ہو۔ شادی کے بعد اس کی زندگی میں شادمانیاں اور کامرانیاں اس کا حق بنتا تھا۔ یہ بے جا خواہش تھی نہ ہی غیر فطری ایمان فسی۔ مگر تم نے اس کی جوانی، بچپن سے بھی بھیا تک اور قابلِ عبرت بنا دی اس لئے مجھے اس سے ہر وقت ہی ہمدردی رہی اور اس سے لگاؤ اور اُلس وصال کا کیا جس کو تم نے اور شیریں نے غلط رنگ دے کر بہت بڑا ظلم کیا۔ خرم! لگائی کی تہمت ہمیشہ عمر دراز پاتی ہے۔ لوگ دینائے جادوانی میں پہنچ جاتے ہیں، مگر الزام تراشی کا زہر نسل در نسل پھیلتا چلا جاتا ہے۔ تمہاری اس قبیح حرکت کو ہم زندگی بھر فراموش نہیں کریں گے اور تمہیں ہم دونوں باری تعالیٰ کے حضور گریبان سے پکڑ کر اپنی بے گناہی کو منوا کر چھوڑیں گے۔“

ہارون کی آواز بھرا گئی۔ حدیقہ کے چہرے پر خاموشی کی چھاپ لگ چکی تھی۔ وہ اس قدر تنگ نظر اور غیر معقول انسان کے سامنے کیا صفائی پیش کرنی۔ سر جھکائے اپنی قسمت پر ماتم کرنے کے سوا کیا کر سکتی تھی۔ خرم مسلسل ہر بات اور حرکت میں مین شیخ نکالے جا رہا تھا۔ جبکہ ہارون اس کی ہر بات کو غلط ثابت کرنے کی کوشش میں مصروف تھا۔ مگر بد قسمتی سے بات کا بنگلہ بن چکا تھا۔ رائی کے ان خود ساختہ پہاڑوں کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی جو بیل بھر میں وقت کی آندھی اور طوفانوں کی نذر تو ہو جاتے ہیں لیکن وقت پچھتاؤں کے لاتعداد نشانات چھوڑ کر واپسی کے تمام راستوں پر ناکہ بندی کر کے ذہن و قلب پر چھا جانے والے جمود سے روح کو کبھی تسکین اور آسودگی نہیں سونپ سکتا۔ باقی ماندہ زندگی اپنی ذات میں چیقلش میں بیت جاتی ہے۔ جسی فائیڈ کا یہ سلسلہ قبر کے دھانے تک چلتا ہے۔

ہارون نے خرم کو ہر طریقے سے لاکھ سمجھانے کی کوشش کی مگر اس پر رتی بھر اثر نہ ہوا۔ وہ بہن کے ساتھ واپس جانے پر بضد رہا اور تیاری کرنے لگا۔



”شیریں! ایک غلط فہمی کی بنیاد پر اپنا سہاگ، اپنی عزت اور سکون کیوں تیاگ کرنے لگی ہو؟ یہ عقل مند ہی نہیں، سراسر پاگل پن ہے۔ تم ان معصوم بچوں کو، دن باپ کے خوشیاں کیسے فراہم کر سکتی ہو؟ چاہے تم ان کی آغوش دنیا کی ہر نعمت سے ہی کیوں نہ بھر دو، بچوں کو اتنے حسین و جمیل رشتے کی محرومی کا احساس کبھی چین نہیں لینے دیتا۔

اور بد قسمتی سے بچے اپنی ماں پر بھی اعتماد اور بھروسہ کھودیتے ہیں۔ اس کی مثال چاہئے تو میرے گزرے ہوئے بچپن کے ہر لمحے کا کرب جاننا چاہو گی؟ نرسری کلاس کے ایڈمیشن سے لے کر آج تک میں نے زندگی کے ہر امتحان میں اپنے باپ کو دھائی دے کر پکارا۔ میری ذات کے ساتھ ان کا پوسٹہ نام مجھے ڈھارس ضرور بندھاتا تھا، مگر احساسِ محرومی میں ’کاش‘ کی گردان اتنی طویل ہو جاتی کہ آخر بے بسی و لاچارگی، آنسوؤں کی صورت میں پھوٹ پڑتی۔ میری مان جاؤ اور اپنے بچوں کو تیشی کی اذیت سے بچالو۔“

حدیقہ پیننگ کرتی ہوئی شیریں کے پاس بیٹھ کر سمجھانے کی کوشش کرنے لگی۔ کئی بار اس نے اس کے ہاتھ کام سے روکے تھے۔

”ناممکن ہے۔ اس نے مجھے کس بل بوتے پر تھپڑ رسید کیا، مجھے اس کا جواب دے سکتی ہو؟“ وہ تڑپ کر بولی۔ ”تمہارے پاس میرے اس سوال کا کوئی جواب موجود نہیں۔ کیونکہ یہ آگ تمہاری لگائی ہوئی ہے۔ یہ سارا ڈرامہ کھیلنے سے پہلے یہ تمام باتیں سوچ لی ہوتیں تو آج نوبت یہاں تک نہ پہنچتی۔“

”میں نے خرم کے ہاتھوں کئی دفعہ تکلیف اٹھائی ہے۔ اپنی توہین پر جس احساسِ ندامت سے دوچار ہوا کرتی تھی، اس کا بیان ہی مشکل ہے۔ خود ہی اپنے دل کو سمجھوتے اور صلح کی جانب مائل کر کے خرم کے پاؤں پکڑ کر معافی مانگ لیا کرتی تھی۔ تمہارے ساتھ ہارون کا معاملہ ہی مختلف ہے۔ دس دفعہ تم سے معافی مانگ چکے ہیں۔ درگزر کر جاؤ شیریں! ایسی فطرت کے مرد کسی خوش بخت عورت کے حصے میں آیا کرتے ہیں۔ ان کی قدر کرنا سیکھو اور ہلسی خوشی زندگی گزارو۔“ حدیقہ نے نہایت اپنائیت سے کہا۔

”ضرور معاف کر دیتی اگر مسئلہ ہم دونوں کا ہوتا۔ تمہاری انوالومنٹ نے میرے ہنستے بستے گھر کو تباہ و برباد کر دیا ہے۔ اب تم دونوں کو کھلی چھٹی ہے۔ شادی کرو یا اسی طرح رکھیل کے رشتے میں زندگی گزارو۔“ شیریں نے زہر آلود لہجے میں کہا۔ ”اس نے میرے اعتماد کو نہیں پہنچائی ہے۔ میں اپنے نام کے ساتھ ایسے مکار اور بے وفا کا نام لکھنے میں بھی کراہت محسوس کرتی ہوں۔ اس کے ساتھ زندگی گزارنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔“

”شیریں! تمہیں اور تمہارے بھائی کو سمجھانا بالکل ہی بے کار ہے۔ تم دونوں کا

دماغ جس شک کی طرف چل پڑا ہے، اس نے تمہیں اندھا اور بہرا کر دیا ہے۔ تم دونوں کی سوچنے سمجھنے کی تمام صلاحیتیں سلب ہو کر رہ گئی ہیں۔ شیریں! مجھے تمہارا گھر اور بچوں کی خوشیاں بچانے میں محض ایک ہی راہ بھائی دے رہی ہے کہ میں پاکستان واپس چلی جاؤں۔ خرم بھی جاب لیس ہیں۔ وہ ویسے بھی واپس جانا چاہتے ہیں۔“ وہ سوچتے ہوئے بولی۔

”وہ تمہیں طلاق دینا چاہتا ہے۔ وہ وقت گزر گیا، جب وہ تمہارے ساتھ پاکستان جانے کی خواہش کر رہا تھا۔ تم نے یہاں اپنی رنگ رلیوں کے سامان کر لئے ہیں۔ تم بھلا کیونکر اس کی مان کر دیتی؟“ وہ زہر خند سے بولی۔

”شیریں! تمہاری وجہ سے میری زندگی میں نہ شیرینی رہی، نہ ہی سکون۔ کیا سوچے گی میری ماں کہ اس کی بیٹی پیدائش ہی سے اتنی بدنصیب کیوں ٹھہری؟ وہ تو پہلے ہی ایک زندہ لاش تھی۔ اب میری طرف کی خوش کن رپورتوں پر انہوں نے اپنے دل و دماغ کو موت کی تاریکیوں سے باہر نکال کر جینے کی تمنا کی ہے۔ میری اولاد کو خوش آمدید کہنے کی خاطر اُجڑے ہوئے گھر کو پُر رونق اور آباد کر لیا ہے۔ وہ ہر وقت میری خوش حال زندگی پر سرشار ہو کر میرے ملن کی دعائیں کرتی ہیں۔ آپ سب کے سلوک سے وہ ایک بار پھر زندہ درگور ہو جائیں گی۔ شیریں! اپنے بھائی کو سمجھاؤ۔ کیونکہ وہ تمہاری کسی بات کو غیر ضروری نہیں سمجھتا۔ تمہاری ہر بات پتھر پر لکیر اور حرف آخر ہے اس کے لئے۔ میری بات کا یقین کرو۔ ہارون میرے بھائی اور ہمدرد کے علاوہ کسی اور رشتے میں مقید نہیں ہیں۔ ہمارے کسی قسم کے عہد و پیمان ہیں نہ ہی مستقبل کے کوئی پلیز ہیں۔ شیریں! ہم دونوں ایک دوسرے کو با آسانی چھوڑ سکتے ہیں۔ ہمیں اپنے گھروں کی سلامتی چاہئے۔“ وہ اس کے پاؤں پکڑ کر زار و قطار رونے لگی۔

”میں ہارون کے بدلتے ہوئے تیور اور روئے کو کیسے فراموش کر کے تمہاری بات پر یقین کر لوں؟ میں عورت ہوں، جو دوسری عورت کی خباثت کو پل بھر میں پہچان جاتی ہے۔ میں نے تو بہت زیادہ ٹائٹ لیا تمہیں پہچاننے میں۔“ وہ اسے دھکا دیتے ہوئے بولی۔ ”جاؤ یہاں سے۔ لیوی الون حدیقہ!“

ہارون نے دروازے میں کھڑے ہو کر تمام باتیں سن لیں۔ وہ زور سے گر جا۔ ”حدیقہ! اگر تم میں خودداری اور غیرت نام کی کوئی چیز موجود ہو تو زہر کھا کر مر جاؤ۔ مگر اس عورت سے التجائیں اور فریادیں کر کے خود کو اتنا نہ گرا دو کہ تمہیں خود

سے گھن آنے لگے۔ میں نے فیصلہ کر لیا ہے۔ جو عورت اپنے شوہر پر بغیر کسی ثبوت کے تہمت لگائے، اس سے چھٹکارا واجب ہے۔ شیریں! میں تمہیں طلاق دیتا ہوں۔“ اس نے تین بار انہی کلمات کو دہرا دیا۔

حدیقہ اس کے لبوں پر ہاتھ رکھ کر چیخی۔
 ”واپس لے لو اپنے الفاظ۔ یہ کھیل یا مذاق نہیں۔“

”تم خاموش رہو۔“ وہ بھی زور سے چیخا اور تیزی سے گھر سے باہر نکل گیا۔ شیریں ہکا بکا دیکھتی رہ گئی۔ اسے اس کے اس رد عمل کی توقع ہرگز نہ تھی۔ وہ تو اپنی سوچ کے مطابق اسے راہِ راست پر لانے کی دھمکی دے رہی تھی۔ بھلا پاکستان واپسی اس کے بغیر کیسے ممکن تھی؟ وہ اُسے سوئی کے ناکے سے نکال کر اس کا ہر خم نکال دینا چاہتی تھی۔ اس کو نصیحت آموز سبق دے کر زندگی بھر کے لئے اس کی نظروں کو نیچا کرنا چاہتی تھی تاکہ وہ کبھی خواب میں بھی حدیقہ کا تصور نہ کر سکے۔ مگر یہ تو کہانی کو انجام دے کر جا چکا تھا۔

وہ دھاڑیں مار کر رونے لگی۔ شیریں خوف سے لرزیدہ آواز میں بولی۔
 ”شیریں! یہ کیا ہو گیا؟.... ہارون بھائی تو ایسے جلد باز ہرگز نہ تھے۔“

”تمہارا نشہ اور سحر اس کو جنونی اور دیوانہ بنا گیا۔ ہائے، اُسے اپنے یہ دو معصوم بچے بھی نظر نہ آئے۔ کیا اندھا کر دیا ہے تم نے اسے؟ کہاں ہے خرم؟ اسی بلی تمہاری بھی چھٹی کر داتی ہوں۔ وہ تو کب سے تیار تھا، میرے سمجھانے پر رُکا ہوا تھا۔ اُف! مجھے نیکی اور بھلائی کا یہ اجر ملا۔ تم نے یہ صلہ دیا مجھے۔“

وہ اول فول بک رہی تھی کہ خرم اندر آ گیا۔ تمام الفاظ ہر بن کر اس کے کان میں گھل رہے تھے۔ مگر خاموشی سے ہارے ہوئے جواری کی طرح بہن کو سینے سے لگا کر آنسو ضبط کرنے کی کوشش کرنے لگا۔

”خرم! ہارون کو ڈھونڈ لائیے۔ ابھی بھی کچھ نہیں بگڑا۔“ حدیقہ پلک پلک کر رو رہی تھی۔

”تم میری نظروں سے دُور ہو جاؤ کمبخت! تم نے میرے خاندان کو بدنامی اور رسوائی کے سوا دیا ہی کیا ہے؟“ وہ غیض و غضب سے بولا۔

”میں آپ کی زندگی سے نکل جاؤں گی خرم! ہارون کو واپس لے آئیے۔ میں آج ہی آپ کا گھر چھوڑ دوں گی۔ افسوس کہ میں آپ کے لئے مبارک ثابت نہ ہو سکی۔“

۱۔ انت ماں کی کوکھ سے خوش بخت اولاد پیدا ہونا ایک معجزہ عظیم ہوتا ہے۔ ایسے لہرات کے رونما ہونے کے مواقع میرے لئے کہاں؟ میں کس قدر ناقابل فہم نکلی کہ سراب پر تکیہ کر بیٹھی۔ ”وہ ٹھنڈی آہ بھرتے ہوئے بولی۔ ”واہ میرے مولا! بد نصیبی بھی پشتوں سے تقدیر کی سختی پر لکھ دی جاتی ہے۔ ان ہیروئٹ کی جاتی ہے، باقی بیمار یوں کی طرح۔ خصلتوں اور فطرتوں کی مانند۔“

”اس ایکٹنگ کا اب مجھ پر رتی بھرا اثر نہیں ہو گا۔ اس لئے بکواس بند کرو۔ اسی میں تمہاری عافیت ہے۔“ خرم گر جا۔

”میری خوشگوار زندگی کو تمہاری بیوی کھا گئی۔ ہضم کر گئی اور مجھے خبر تک نہ ہوئی۔ میں سمجھتی تھی کہ میں بہت چالاک اور ہوشیار عورت ہوں، جس نے شادی کے چند مہینوں بعد ہی اپنی من مانیوں اور ہٹ دھرمیوں کو منوا کر ساس سے علیحدگی اختیار کر لی تھی۔ لیکن میں غلطی پر تھی۔ یہ تو میری نانی نکلی۔ خرم! اس نے ہارون کو مجھ سے ایسے چھین لیا، جیسے مکھن سے بال نکالا جاتا ہے۔“ وہ دھاڑیں مار مار کر رو رہی تھی۔

”اب رونا بند کرو شیریں! تمہارے ساتھ تو جو ہوا بہت ہی برا ہوا۔ اس کا حال دیکھنا۔ لوگ اس پر تھوک کر اس کے عشق کی داستان رہتی دنیا تک بیان کرتے رہیں گے۔“ خرم چلا کر بولا۔

”خرم! ماں جی تک خبر پہنچنے نہ پائے۔ وہ مر جائیں گی۔ وہ میری پیشانی پر لگے ہوئے اس بدنماداغ کو کیسے قبول کریں گی؟ ہائے ان پر تو قیامت ہی ٹوٹ پڑے گی خرم! ماں جی کو ہم کیسے سنبھال پائیں گے؟..... خرم! پلیز دیر مت کریں۔ غصے سے کام نہیں بنے گا۔ آپ دونوں بہن بھائی ذرا ٹھنڈے دل سے سوچیں کہ ہمیں کیا کرنا چاہئے کہ طلاق کا دھبہ فوری طور پر مٹ جائے۔“ حدیقہ تڑپ کر بولی۔ وہ ان کی ہر بات کو نظر انداز کئے جا رہی تھی۔ شیریں کے دکھ میں ہلکان ہو رہی تھی۔

”تم تو اپنے مشورے اپنے پاس ہی رکھو۔ چار پیسے کیا کمانے لگی ہے کہ اب اتنے نگہبر مسائل کو یہ حل کر لے گی۔ تم اپنی عقل اپنے پاس رکھو۔ پہلے ہی تم نے بہت بدلے لئے ہیں ہم سے۔ اب دور ہو جاؤ ہماری نظروں سے۔ تمہاری یہ ایکٹنگ تمہیں معصوم اور بے قصور منوانے میں ناکام ہے۔ کوئی اور طریقہ سوچو۔“ خرم پھر دھاڑا۔ ”یو ہیونو آئیڈیا کہ تم نے کتنا بڑا ظلم کیا ہے ان معصوم بچوں پر اور شیریں اور ہارون پر۔“

”خرم! اسے زبردستی ساتھ لے چلو۔ وہاں جا کر اسے بھوکا اور پیاسا رکھ کر مارو۔ دیکھتی ہوں کون پوچھتا ہے ہمیں۔ نہ اس کا آگاہ نہ پیچھا۔“ شیریں نفرت و حقارت سے چینی۔

”یہ کبخت جانتی ہے کہ اس معاشرے میں عورت پر زبردستی نہیں چل سکتی۔ اس لئے تو شیر بنی کھڑی ہے۔ ذرا دیکھو اس کے چہرے کا گھمنڈ اور غرور۔“ خرم نے اس کا چہرہ ٹھوڑی سے اونچا کرتے ہوئے کہا۔

”میں اس ذلیل عورت سے انتقام لے کر چھوڑ دوں گی۔ آج وقت تمہارے ساتھ ہے، کل میری گرفت میں ہو گا۔ دیکھو تو سہی۔ خرم! اپنی بیوی کو تم بھی اسی وقت طلاق کیوں نہیں دے دیتے؟ جس اذیت سے میں گزر رہی ہوں، وہی اذیت اس کا مقدر بنا دو۔“ شیریں نے روتے ہوئے کہا۔

”میں جذباتی فیصلے کرنے والا ہوتا تو اس کو کب کا فارغ کر چکا ہوتا۔ وقت بہت بڑا منصف ہے۔ وقت کا انتظار کرو۔“ خرم نے تسلی دیتے ہوئے کہا۔ ”صبر کرو۔ شام ڈھلنے سے پہلے وہ کھٹو گھر لوٹ آئے گا۔ فکر کیوں کرتی ہو؟ یہ اپنا ملک نہیں کہ کسی کے گھر میں دن بلائے مہمان بن کر گھس جاؤ اور جی بھر کر خاطر داریاں کراؤ۔ یہاں کوئی بھی بھوکا پیاسا، سڑک کے کنارے دم توڑ دے، کوئی پلٹ کر نہ دیکھے گا۔ یہاں کوئی پرسان حال نہیں۔ نفسا نفسی کے اس عالم میں شیطانی عروج پر ہے۔ وہ واپس آ جائے گا۔ اب اس سے منہ ماری مت کرنا۔ حالات کو سنوارانے کا ذمہ میں خود اٹھاتا ہوں۔ اور سنو حدیقہ بیگم! کوئی غلطی گم نہ ڈال دینا بیچ میں۔“

”میری طرف سے آپ اپنا دل صاف کیوں نہیں کر لیتے؟ آج ایسا گھٹاؤ نا رد عمل کیونکر سرزد ہو گیا؟ شک اور وہم کی بنیاد پر ہم کتنی ہی قیمتی زندگیوں کے روشن مستقبل کو تاریکیوں کے حوالے کرنے کے خطاوار ہو گئے۔ یہ لمحہ فکریہ ہے۔ سب غصہ تھوک کر بھلائی کے راستے کا کھوج لگائیں۔ اور خرم! آپ سے التجا کرتی ہوں کہ مجھے سزا سنا دیجئے۔ مجھے ان بچوں کی خاطر ہر طرح کی سزا منظور ہے۔“ وہ ہاتھ باندھے کھڑی تھی۔

”ڈرامے کا ڈرامہ سین ہونے کے بعد تمہاری عقل ٹھکانے کیوں آئی؟ اس میں بھی کوئی چال ہے۔“ خرم نفرت آمیز لہجے میں بولا۔ ”ہارون کی واپسی کے بعد تم اپنی سزا خود بخود تجویز کرو گی۔ اگر میری بہن کا گھر اجڑ گیا تو تمہیں کچا چبا جاؤں گا۔“

”خرم! میں تمہیں حکم دیتی ہوں کہ اسے ابھی اور اسی وقت طلاق دے کر گھر سے نکال دو۔ میں اس کے وجود کو ایک لمحے کے لئے برداشت نہیں کر سکتی۔“ شیریں نے آنسو صاف کرتے ہوئے کہا۔

”بے وقوف! اس کو طلاق دینے کے حکم کا مطلب سمجھتی ہو کیا؟“ خرم نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر سوال کیا تو حدیقہ کمرے سے باہر نکل گئی کہ کہیں سچ مچ خرم کھڑے کھڑے اسے الوداع ہی نہ کر دے۔

”میں مزید کچھ بھی جاننا نہیں چاہتی خرم!“ وہ بے چارگی سے بولی۔

”عقل سے سوچو۔“ خرم نے آہستہ سے کہا۔ ”میں اسے بیڑیوں سے رہا نہیں کروں گا۔ یہ ڈاکومنٹس میں میری بیوی رہے گی۔ آزاد اور بے مہار چھوڑ دیا تو نہ جانے کتنے گھروں کو برباد کر دے۔ اور دوسرا ہارون کو پانے کے تمام راستوں پر نکاح پہرے دار بن جائے گا، میری ناسمجھ اور بھولی بھالی بہنا!“ وہ ذومعنی الفاظ میں بولا تو شیریں سوچ کی وادیوں میں کھو گئی۔

خرم نے ٹی وی آن کیا اور ہارون کا انتظار کرنے لگا۔ حدیقہ نے اپنا اٹیچی تیار کیا اور بغیر کچھ کہے باہر نکل گئی۔

”خود ہی واپس آئے گی۔ ذرا باہر کی دنیا کو پرکھ لے۔“ خرم بڑبڑاتے ہوئے اٹھا۔ کھڑکی سے باہر جھانکا۔ وہ تیزی سے میٹرو کی طرف بڑھ رہی تھی۔ ایک لمحہ کو تو وہ چکرا گیا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے ماضی والی حدیقہ گھوم گئی، جس کو حاصل کرنے کے لئے اس نے کیسے کیسے طریقوں سے پاؤں بیلے تھے، آج اس نے اسے کس آسانی سے جانے دیا۔ نہ روکا، نہ احتجاج کیا۔ بس اسے جانے دیا۔

”اب ہارون واپس نہیں آئے گا خرم! تم نے حدیقہ کو روکا کیوں نہیں؟“ شیریں کے لہجے میں شک تھا۔

”اس سوسائٹی میں انہیں مل کر رہنے سے کوئی روک نہیں سکتا۔ بس دونوں ہی نکل گئے اپنی ایک منزل کا تعین کر کے۔“

”ایسی بھی دھاندلی نہیں۔ حدیقہ ہاسپٹل کے سوا کہیں نہیں جائے گی۔ میں اس کی فطرت سے بخوبی واقف ہوں۔ اس وقت ہارون کی واپسی ضروری ہے۔ مجھے حدیقہ کی فکر ہے نہ ہی پروا۔ جاتی ہے تو جائے۔ خس کم جہاں پاک۔ مگر طلاق دے کر آزاد نہیں کروں گا۔“ وہ اٹل لہجے میں بولا۔

”اگر ہارون واپس نہ آیا تو طلاق واجب ہو جائے گی۔“ وہ فکر مندی سے بولی۔
 ”بھئی فکر کیوں کرتی ہو؟ ابھی ہمارے پاس کافی وقت ہے۔ آئے گا نہیں تو
 کہاں جائے گا؟ بولو۔ حدیقہ کے ساتھ ہاسٹل میں رہنے سے تو رہا۔“
 وہ بھی فکر مند تو ہو ہی گیا تھا مگر بہن کے سامنے بے فکری کا اظہار کر کے اسے
 مطمئن و پرسکون رکھنا چاہتا تھا۔

انتظار کرتے کرتے دونوں کھڑکی سے باہر سڑک پر ہر آتی ہوئی میٹرو کا بغور
 جائزہ لینے لگے۔ تنگ آ کر دونوں صوفے پر بیٹھ گئے۔ بچے بھی بے چین اور پریشان
 کارپٹ پر لیٹ کر باپ کا انتظار کرتے کرتے سو گئے۔



”خرم! وہ تو نہیں آیا۔ اب کیا ہوگا؟“ شیریں روتے ہوئے بولی۔
 ”مرد ایک بار گھر چھوڑ جائے تو پھر وہ زندگی بھر واپس نہیں آیا کرتا۔ ہارون پر
 توقع اس کی مرنجیاں مرنج طبیعت کی وجہ سے ہے۔ مرد کی یہی خوبی تو دوسری عورتوں کو
 اپنی طرف مائل کرتی ہے۔ حدیقہ کے ساتھ بھی یہی ہوا ہے۔“ خرم نے پیار سے اس
 کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ ”اور ایسے ہی مرد بہت جلد اپنی ڈگر سے پھسل بھی
 جاتے ہیں۔ میں ہمیشہ سے تمہیں یہ نصیحت کرتا آیا ہوں کہ ہارون کو زیادہ پریشاں
 مت کیا کرو۔ جب اپنی مردانگی دکھانے پر آیا تو پھر اسے نہ تمہاری، نہ ہی ان بچوں کی
 اور نہ ہی اپنے خاندان کی عزت کی پروا رہے گی۔ وہی ہوا جس کا مجھے اندیشہ رہتا تھا۔
 میں تمہارے سلوک کی وجہ سے ہمیشہ خائف رہنے لگا تھا۔“

”یعنی مطلب یہ ہوا کہ اس شادی کے ٹوٹنے میں میرا ہاتھ ہے۔ خرم! ابھی تو
 ہارون کو گئے چند دن ہوئے ہیں، تم مجھے مورد الزام ٹھہرانے لگے۔ میری باقی ماندہ
 زندگی کا انجام مجھے نظر آنے لگا ہے۔“ وہ غصے سے بولی۔

”ایسی بات ہرگز نہیں۔ تم میرے سر آنکھوں پر۔ ہمیں اتنے الم ناک حادثے
 کے بعد اپنا موازنہ کرنا چاہئے۔ اپنی قسمت کو تسلیم کرنا چاہئے۔“ وہ نرمی سے بولا۔

”تو کیا آج حدیقہ بھی پارسا ہوئی ہے؟“ وہ شدید ہو کر بولی۔
 ”ہرگز نہیں۔ آدم کو حوا نے درغلا کر جنت سے سبکدوش کروا دیا تھا۔ سو فیصد قصور

حدیقہ کا ہے۔ اسے مردوں کو پھانسنے کے جھکنڈے آتے ہیں۔ یہ آرٹ نرس اپنی
 ٹریننگ میں ہی سیکھ لیتی ہے۔ اسے میں ہی نہ سمجھ سکا۔ کس کس نے سمجھانے کی کوشش

نے کی۔ مگر میں ہی چغد نکلا۔“ لہجے میں پچھتاوا تھا۔

”تو پھر اس سے جان کیوں نہیں چھڑا لیتے؟ ایسی عورت کے ساتھ تمہارا نام تو بن ہے تمہاری۔“ وہ نفرت آمیز لہجے میں بولی۔ ”اس کی خاطر تم نے کتنی ہی لڑکیوں کو ٹھکرا دیا تھا۔ نہ وہ اس گھر میں آتی، نہ ہی ہمارے گھر کے پر نچے اڑتے۔“

”اب ایسی باتیں کرنے کا کچھ فائدہ نہیں۔ میرا خیال ہے، ہم واپس جانے کی تیاری کو مکمل کرتے ہیں۔ ہم اس ملک میں آباد ہونے نہیں، برباد اور ذلیل و خوار ہونے آئے تھے۔ مقدر میں یہی لکھا تھا۔ ان حالات سے بچاؤ کیسے ہوتا؟“ وہ افسردگی سے بولا۔

”میں آخری منٹ تک ہارون کا انتظار کروں گی۔ ہو سکتا ہے، اللہ تعالیٰ کی رضا اس میں شامل ہو جائے۔ اللہ تعالیٰ نے اس عمل کو ناپسندیدہ قرار دیا ہے۔ خرم! جب اس روئے زمین پر طلاق کے الفاظ گونجتے ہیں تو عرش معلیٰ بھی لرز اٹھتا ہے۔ اور فرشتے ایسی لعن طعن کرتے ہیں کہ طلاق شدہ جوڑے کی زندگی سے تمام تر خوشیاں، برکتیں اور رحمتیں چھن جاتی ہیں۔ ان کے مقدر میں حسرت و یاس اور پچھتاوے کی اذیت لکھ دی جاتی ہے۔ میں یہ سب نہیں چاہتی۔ مجھے باری تعالیٰ کے فضل کی ضرورت ہے۔ اس کے کرم اور رحم کی اُمید پر زندہ ہوں۔“ وہ مسلسل روئے جا رہی تھی۔ ”ہاں، ایسی بدکار عورت کو کیفر انجام تک ضرور پہنچانا چاہئے جس کے لئے تم راضی ہی نہیں ہو رہے۔“

”تمہیں کیسے سمجھاؤں؟ اس وقت پریشانی کے عالم میں تم تصویر کے ایک ہی رخ کو دیکھ رہی ہو۔ مگر میں ہوش و حواس میں دوسرا پہلو بھی دیکھ رہا ہوں۔ میں زندگی بھر نہ اسے آزاد کروں گا، نہ ہی اس سے جنسی و جذباتی تعلقات رکھوں گا۔ میرا تم سے وعدہ ہے۔“ وہ اسے تسلی و شفای دیتے ہوئے بولا۔

”یہ تمہاری بھول ہے خرم! وہ جب بھی ہارون سے شادی کرنا چاہے گی، خلع لینے کی حق دار ہے۔ اپنا حق ڈنکے کی چوٹ پر وصول کر کے تمہیں ری جیکشن کے کرب ناک احساس میں زندگی بھر کے لئے دھکیل دے گی۔ بہتر نہیں کہ تم اس کو یک لگاؤ۔ تاکہ وہ عمر بھر تڑپتی رہے۔ عورت کے لئے اس سے بڑا دکھ اور کیا ہو سکتا ہے کہ اس کا شوہر اسے ری جیکٹ کر دے۔ مجھ سے پوچھو یہ درد کیسا ہے۔ ہر بل دہکتی چنگاریوں پر غم و غصے اور بے بسی و لاچارگی کے گھردندے میں مقید رہنا۔ تم کیا جانو کہ میں کس دور سے

گزر رہی ہوں۔ تم حدیقہ کو جب تک اس درد میں مبتلا نہیں کرو گے، تمہیں ہرگز معاف کروں گی نہ ہی تم سے کوئی تعلق اور رابطہ رکھوں گی۔“ اس کا لہجہ مستحکم تھا۔

”یار! خفا کیوں ہوتی ہو؟..... میرے پیار کو آزمانے کی کوشش کی تو میں خود تمہیں چھوڑ دوں گا۔ مجھ پر بھروسہ رکھو۔ صرف میاں اور بیوی کا رشتہ ہی اعتماد کی مضبوطی پر استوار نہیں کیا جاتا بلکہ ہر رشتہ اعتماد اور بھروسے کی آماجگاہ میں پائیداری اور بیٹگی پاتا ہے۔ آج کے بعد تم اس موضوع پر بات نہیں کرو گی۔ میرے آخری الفاظ اپنی ڈائری میں لکھ لو تاکہ تمہیں یاد دہانی رہے کہ اگر ہارون تمہاری زندگی سے نکل گیا تو میں حدیقہ کے نوٹس کا انتظار کروں گا۔ صاف ظاہر ہو جائے گا کہ اب وہ شادی کے چکروں میں ہے۔ میں پھر بھی اس کی خواہش پوری نہیں ہونے دوں گا۔ ہاں، اپنے طور پر وہ یہاں کے قانون کے مطابق یک طرفہ فیصلہ لے کر اس سے شادی کر لیتی ہے تو اس کا علاج ہم دونوں کے پاس نہیں ہے۔“ وہ اپنی منطق جھاڑے جارہا تھا۔

”یعنی تم اس نامعقول چھوکر سے اپنے چہرے پر طمانچہ کھانے کے لئے تیار بیٹھے ہو۔ بہت بے غیرت اور بے شرم انسان ہو۔ مجھے تمہیں بھائی کہتے ہوئے ہنک محسوس ہونے لگی ہے۔ اب مجھے سمجھ آئی ہے کہ تم ایک کمزور اور سخت لاغر قسم کے شوہر تھے کہ بیوی نے دن دھاڑے تمہاری بہن کے سہاگ پر ڈاکہ ڈالنے میں ہلکی سی ہچکچاہٹ محسوس نہ کی۔ اور ایک کمزور شوہر اپنی بیوی کو زد و کوب کر کے خود کو قوی اور مضبوط ہونے کا یقین دلانے میں اپنی دلی اور ذہنی تسکین و تسلی سے ہمکنار ہوتا ہے۔ اب مجھے سمجھ آئی ہے کہ ہارون نے مجھ پر ہاتھ اٹھانا کس سے سیکھا ہے۔“ وہ زہر خند سے بولے جارہی تھی۔ ”کاش یہ حقیقت پہلے کھل کر میرے سامنے آگئی ہوتی تو میں تم سے بہت دور اپنی دنیا بسا چکی ہوتی۔“

”شیریں! شاید تم درست کہہ رہی ہو۔ کیونکہ میری تربیت میں ماں کا تصور ہے۔ انہوں نے اکلوتا بیٹا ہونے کی وجہ سے مجھے اپنا عاشق اور تمہارا شیدائی بنائے رکھا۔ میں تمہارے بغیر قدم اٹھانے کا تصور بھی نہ کر سکتا تھا۔ تمہاری موجودگی سکول سے لے کر اب تک مجھے وقتی طور پر مضبوط بناتی رہی، میری خود اعتمادی کو عارضی جلا بخشی رہی۔ میں رو بوٹ کی مانند آپ دونوں کے اشاروں پر چلتا رہا۔ میری سوچ اپنی تھی، نہ ہی میں کسی قسم کا فیصلہ کرنے کا تصور کر سکتا تھا۔ کیونکہ میں ایک کمزور اور محتاج بیٹا اور بھائی تھا۔ خاوند کی صورت میں سڑانگ بننے کی کوشش کی۔ مگر اس میں بھی میری فطری

کمزوری کی بھلک نمایاں تھی۔ حدیقہ کے بجائے بہن میرے تمام حقوق کی وارث سمجھی گئی۔ جو تم نے کہہ دیا، میں نے ہنستے ہوئے احتراماً قبول کر لیا۔ آج تم نے مجھے کمزور مرد کا طعنہ دے کر میری سوچ کے بند دریچوں کو کھول دیا ہے۔ مگر اب اس کا کیا فائدہ؟“ احساسِ زیاں میں وہ تڑپ اٹھا۔

”خرم! مجھے معاف کر دو۔ میں نے تمہیں بلاوجہ ہی دکھی کر دیا۔ دراصل میں خود جو بہت دل برداشتہ ہو گئی ہوں۔ تم میرے پیار میں اور میں تمہاری ملکیت کے فصول میں برباد اور نیست و نابود ہو گئی۔ آج کے بعد میں تمہاری زندگی کا بے حد اہم فیصلہ کرنے کا اختیار تمہیں دیتی ہوں، جیسے آج سے کچھ سال پہلے ماں نے شادی کا اختیار تمہیں سونپا تھا جس کے نتائج تمہارے سامنے ہیں۔ اب تم زندگی کے مددِ جزر کو سمجھ چکے ہو۔ جو فیصلہ کرو گے، بہترین اور اعلیٰ ہو گا۔ بس میری ایک نصیحت یاد رکھنا۔ جھوٹن کو اپنے من کی دیوی بناؤ گے تو کمزور ہی کہلاؤ گے۔“ وہ پھر اسے اس کی حیثیت یاد دلانے لگی۔ وہ اس کی سچائی پر سر جھکا کر بیٹھ گیا۔

شیریں کو اس پر اتنا ترس آیا کہ جہاں کمزور عورت معاشرے کا گھٹاؤ بنا روپ ہے، وہاں کم ہمت اور کم حوصلہ مرد بھی معاشرے کی بگڑی ہوئی صورت کا دوسرا نام ہے۔ جس کی قبولیت میں ہمیشہ مردانگی آڑے آتی رہی ہے۔ وہ اُس کی بے بسی کا اندازہ لگاتے ہوئے سوچے جا رہی تھی۔ اسے بہلانے کی خاطر گویا ہوئی۔

”آئی ایم سوری خرم! تم جیسے بیٹے مقدر والی مائیں جنتی ہیں۔ اور خوش قسمت ہوتی ہیں وہ بہنیں جنہیں خرم جیسے پیار کرنے والے بھائیوں کی رفاقت نصیب ہوتی ہے اور عزت پاتی ہیں وہ بیویاں جو ایسی جبلت کے شوہر کو پہچاننے کی وسیع نظر رکھتی ہیں۔“ وہ اس کے افسردہ چہرے پر بوسہ دیتے ہوئے بولی۔ ”ہارون نہ سہی، میرے بھائی! تمہارے ساتھ اپنی زندگی کی شامیں گزارنے میں فخر و خوش محسوس کروں گی۔“ وہ خرم کی ٹریجک لائف کی وجوہات کو بخوبی سمجھتی تھی۔ اسے سمندر کی تلاطم خیز موجوں میں کبھی تنہا چھوڑا ہی نہ گیا تھا۔ اکیلے ہاتھ پاؤں مار کر ساحل تک آنے کی اسے ٹریننگ ہی نہ دی گئی تھی۔ اور وہ بھی آج تک بہن کی انگلی پکڑے ننھے بچے کی مانند چلنے میں کوشاں تھا۔ گرنے کے خوف کا پیمانہ ایسا ہمہ گیر تھا کہ اس کے لئے سہارا چھوڑنا ناممکن تھا۔ خود غرض بہن کو اور کیا چاہئے تھا۔ وہ کیونکر اسے حدیقہ کے مضبوط اور پائیدار سہارے کا احساس دلا کر اسے ہمیشہ کے لئے کھودیتی۔ ماں کا جایا اس کے

ہاتھ میں تھا۔ سسرال پر اس کا رعب و دبدبہ اسی وجہ سے قائم و دائم تھا کہ میکے میں بے پناہ اہمیت کی حامل ڈاکٹر بہو کے سامنے کسی کی دم مارنے کی مجال نہ تھی۔

جب سے ہارون نے بیوی کے رول کو خود پر مسلط کر لیا تھا، معاملہ اور بھی گہیر اور اُلجھ کر رہ گیا تھا۔ اب شیریں کے رڈے میں بدتمیزی اور زبان کی بے لحاظی کو وہ بچوں کی خاطر برداشت کر رہا تھا۔ مگر اپنی نکھری اُجلی ذات پر کچھڑ کے چھینٹوں کو برداشت کرنا ناممکن ہو گیا اور وہ پل بھر میں طلاق کا اختیار اور حق استعمال کر کے غائب ہو گیا۔

شیریں کی عقل ٹھکانے پر آنے میں زیادہ وقت ہی نہ لگا تھا۔ میکے کا ساتھ، بھائی کی موجودگی اور لگاؤ، جاب کی سیٹس فیکشن سب کچھ بے معنی و لا حاصل معلوم ہونے لگا۔ بے بسی اور پچھتاوے کا دور دورہ تھا۔ لیکن ابھی تک حدیقہ قابلِ معافی تھی، نہ ہی قابلِ قبول تھی۔ کیونکہ ان کے ضمن میں یہ آگ اسی کی بھڑکائی ہوئی تھی۔



”خرم! غضب ہو گیا۔ حدیقہ دو ہفتوں سے اپنی نوکری چھوڑ کر نہ جانے کہاں روپوش ہو گئی ہے۔“ شیریں نے یہ انکشاف کرتے ہی رونا شروع کر دیا۔

”ہارون کے پاس چلی گئی ہوگی۔ اور اس نے کہاں جانا ہے؟“ خرم بے بسی سے بولا۔

”مگر مجھے تو ہر بار اس نے ایک ہی جواب دیا کہ وہ ہارون کے بارے میں نہ کچھ جانتی ہے، نہ ہی جاننا چاہتی ہے۔“ شیریں نے سر پکڑ کر کہا۔ ”دیکھا، وہ پھر ہمیں دھوکا دے گئی۔ شی ازلو کلیور۔ وہ تمہارے قابلِ ہرگز نہ تھی۔“

”میری غلطی کو بار بار جتنا چھوڑ دو شیریں!“ خرم سیخ پا ہو گیا۔

”طلاق نہ دینے کے بہانے ڈھونڈنا تمہاری کمزوری کی دلیل ہے خرم! اب ذرا آگے آگے دیکھئے جناب! وہ تمہیں طلاق روانہ کرے گی۔“ شیریں نے بھی غصے میں کہا۔ ”اور جلد ہی تمہیں اپنی شادی کا کارڈ بھی ارسال کرے گی۔“

”شیریں! خاموش ہو جاؤ۔ میرا غصہ حد سے بڑھ گیا تو.....“ وہ نامکمل فقرہ کہہ کر خاموش ہو گیا۔

”تو مجھے قتل کر دو گے؟“ وہ چیخ کر بولی۔

”ہاں۔“ وہ آنکھیں نکالتے ہوئے بولا۔

”اپنی بدکردار بیوی کی ٹانگیں تک تو توڑ نہ سکے، مجھے قتل کرو گے۔ میں بخوبی واقف ہوں تمہاری دلیری اور بہادری سے۔“ وہ طنزیہ بولی۔

”شیریں! پاگل پن کی باتیں مت کرو۔ غصہ تمہیں حدیقہ اور ہارون پر ہے۔ مجھ پر کاغے کو اتار رہی ہو؟ صبر کرو۔ ہماری ماں نے ہمیشہ ہمیں صبر کی تلقین کی ہے۔“ وہ اس کی فکر مندی کے لبریز پیمانے کا اندازہ کرتے ہوئے نرمی سے بولا۔

”تم جیسا صبر مجھ میں کہاں؟ دو دنوں بعد طلاق ویلڈ ہو جائے گی۔ خرم! کوئی راستہ نکالو۔ ہارون تو ایسا کبھی نہ تھا۔ وہ تو دس منٹ سے زیادہ مجھ سے خفا نہیں رہ سکتا تھا اب ایسے منہ موڑ لیا ہے جیسے کبھی آشنا ہی نہ تھا۔“ وہ بری طرح تڑپ رہی تھی۔

”وہ دوبارہ رشتہ بحال کرنا نہیں چاہتا۔ ورنہ توڑتا ہی کیوں؟ دو دن کے بعد ہم یہاں ایک منٹ کے لئے بھی نہیں رکیں گے۔ ورنہ ہم دونوں لڑکر غارت ہو جائیں گے۔ پریشانیوں نے ہم دونوں کے دماغ خراب کر دیئے ہیں۔“ خرم نے سنجیدگی سے کہا۔

”کس منہ سے واپس جاؤں گی؟“ اس نے جاہل عورت کی طرح اپنا سر پیٹ لیا۔
 ”دنیا کو فیس کرنے کی ہمت پیدا کرو۔“ خرم نے پیار سے کہا۔ ”میرے ہوتے ہوئے کوئی تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ دیکھو، فاطمہ جناح اور قائد اعظم بہن بھائی کے رشتے میں مرتے دم تک جیون کے ساتھی رہے۔ ہم بھی ایسی ہی مثال قائم کریں گے۔“
 ”میرے بچوں کو باپ کی محرومی کا احساس کبھی نہ ہونے دینا خرم!..... میرے بچوں کے چہروں پر یتیمی کی مسکینیت کی ہلکی سی رتق بھی نہ آنے دینا۔ یکدم یہ کیا ہو گیا خرم؟ میں تو تخت سے گر کر دھرتی کی گہرائیوں اور تاریکیوں میں دھنس گئی ہوں۔ مجھے اس سے نکال لو خرم! خدا کے لئے مجھے طلاق سے بچا لو۔“ وہ مائی بے آب کی مانند تڑپ اُٹھی۔ خرم بھی اس کی تڑپ برداشت نہ کر سکا اور اس کے گلے لگ کر دھاڑیں مار کر رونے لگا۔

.....
 دھوکوں کو چھپائے پاکستان روانہ ہو گئے۔ اور یوں ظلم کی اس پیچیدہ داستان کو انجام مل گیا۔ ان ستم کاریوں اور بے انصافیوں کے بیچ بونے والوں میں کون کون شامل تھا اور اس کے تناور درخت کی تنج بستہ اور جذبات کی حدت سے عاری چھاؤں میں کتنی نسلوں نے نہ چاہتے ہوئے قیام کیا۔ کیونکہ اس کے بغیر چارہ ہی نہ تھا۔



حدیقہ ایمر جنسی وارڈ میں ڈاکٹر جوہرٹن کے ساتھ راؤنڈ پر تھی کہ ایک اور مریض زندگی اور موت کی کشمکش میں مبتلا وارڈ میں پہنچ گیا۔ گوکہ اُس کا سر پٹیوں میں جکڑا ہوا تھا لیکن لاکھوں میں بھی اپنی شناخت رکھتا تھا۔

حدیقہ نے اس کی بند آنکھوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے پکارا۔

’ہارون! آنکھیں کھولئے۔ آپ ہم سب کو چھوڑ کر کہاں چلے گئے تھے؟ آپ نے شیریں کے ساتھ اچھا نہیں کیا۔ آپ نے میری پیشانی پر اک تہمت کی مہر چسپاں کر کے اتنا بڑا ستم کیوں ڈھا دیا؟‘ وہ دل ہی دل میں سوچتے ہوئے اُس کا نمبر پیچر لینے لگی۔

وہ ابھی تک بے ہوش تھا۔ موت کے دہانے پر کھڑا بے پروا اور بے بس۔

وہ گلے شکوے بھول کر اس کی زندگی کی بھیک مانگنے لگی۔ معرہ حل کرنا مشکل نہ رہا کہ وہ اتنے عرصے سے اس سٹیٹ میں ایک ٹیکسی چلا کر گزر اوقات کر رہا تھا۔ آج ایک ایکسیڈنٹ نے اتفاقاً ان کا ملاپ کر دیا تھا۔ شیریں کے ناروا سلوک اور دوسروں کے سامنے اپنی مظلومیت کی جھوٹی داستان سے وہ تنگ آ کر اس سٹیٹ میں آ کر سیٹل ہو گئی تھی۔ چھوٹی سی نہایت حسین سٹیٹ میں۔ اس کی جاب وہاں سے بہت بہتر تھی۔ کموڈیشن کا بھی کوئی مسئلہ نہ تھا۔ ٹرانسپورٹیشن بھی بہترین تھی۔

یہاں اس نے خرم کے لئے جاب بھی ڈھونڈ لی تھی مگر اسے انفارم کرنے کی اس میں ہمت نہ تھی۔ وہ اپنی زندگی کو اپنی پسند کے مطابق گزارنے کو فوفیت دینے لگی۔ اس کی ماما کو ان حالات کی قطعاً خبر نہ تھی۔ وہ اپنی جگہ مطمئن اور خوش ہر اتوار اس سے سکا پ پر گھنٹوں بات کرتی۔ مگر صدیقہ اس کے پاس آنے کی ہامی نہ بھرتی۔ اسے نہ جانے آج بھی شوہر کے واپس آنے کی کیوں امید تھی۔ شاید وہ خود کو بے وقوف بنا کر کسی امید پر اپنی زندگی میں خوشیاں بھرنا چاہتی تھی۔ ڈپریشن کی دنیا کو تو اس نے پرکھ لیا تھا، جہاں ہمدردی کے بجائے مذاق اڑایا جاتا ہے۔ پاگل قرار دے کر ہر عقلمندانہ بات کو بھی نظر انداز کر کے اپنی دھونس جمائی جاتی ہے۔ بیٹی کی خوشحالی نے اس کی زندگی کا دھارا بھی بدلا اور شوہر کی بے وفائی کی بڑنس کو فراموش کر کے اس کے واپس آنے کی دعاؤں میں بھی اضافہ ہو گیا۔ یہ پاگل پن کی قسم ہی تو تھی۔ حدیقہ، ماما کو اسی مسرور کیفیت میں رکھنے کے لئے اپنی اصل زندگی کے بارے میں بتانے سے گریز

کرتی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ اس شاق کو وہ برداشت نہ کر سکے گی۔ اور اب کی ڈپریشن اسے موت کی گھاٹی میں اتار دے گی۔

رات بھر وہ ہارون کے پاس رہی۔ بیٹے ہوئے لحوں کی یادوں نے بے کل و بے قرار کر دیا۔ کئی ہار آنکھوں سے آنسو چھلک پڑے۔

وہ صبح کتنی حسین تھی جب اس کی پکار پر ہارون نے آنکھیں کھول کر اسے پہچاننے کی کوشش کی۔ نگاہوں کا انجانا پن بدستور قائم تھا۔ اس نے اپنی مخصوص مسکان سے اپنا نام بتایا تو اس نے غور سے اسے دیکھا اور نگاہوں میں آشنائی، یگانگت اور دوستی کی لہر دوڑ گئی۔

”ہارون! آپ بالکل ٹھیک ہو جائیں گے۔ کچھ سوچنے کی قطعاً ضرورت نہیں۔ ٹھیک ہے نا؟“ وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر پیار سے بولی۔ ”خدا کا شکر ہے میرے احق بھیا کی جان بچ گئی۔“

ہارون نے مسکراہٹ سے جواب دینے کی کوشش کی جو ناکام رہی۔ کیونکہ سر میں ایک درد کی ٹیس نے اس کے چہرے کے تاثرات بدل دیئے تھے۔

”بولنا منع ہے۔“ وہ ذرا سا مسکرائی۔ ”چپ کا روزہ بھی ایک عبادت ہے۔“ اس نے بمشکل ہاتھ آگے بڑھایا۔ حدیقہ نے اس کا ہاتھ اپنی آنکھوں سے لگا لیا۔ ”میں آج چوبیس گھنٹے آپ کے پاس ہوں۔ بس آپ کسی قسم کی فکر نہ کریں۔ جلد از جلد صحت یاب ہو کر گھر جائیں۔“

وہ ذرا سا مسکرایا اور دو آنسو اس کے گالوں پر پھسل کر اس کے دکھی دل کی سرگزشت بیان کر گئے۔ حدیقہ نے نظر انداز کر دیا۔ کیونکہ اس وقت ماضی کریدنے سے سوائے انگاروں کے کیا حاصل ہو سکتا تھا۔ ان دونوں کو ایک دوسرے سے کسی قسم کی کوئی شکایت نہ تھی۔

یہ بات حقیقت پر مبنی تھی کہ اگر ہارون اس کا ساتھ نہ دیتا تو نہ جانے آج یہ کس حال میں اور کہاں ہوتی۔ حدیقہ احسان فراموش نہ تھی۔ وہ اسے صحت اور زندگی کی جانب گامزن کرنے کے لئے ہاسپٹل سے ڈسچارج ہونے کے بعد اپنے ہوسٹل کے کمرے میں لے آئی اور اس کی دوا اور غذا کی ذمہ داری ایسے اٹھالی جیسے وہ ابھی بھی ہاسپٹل میں ایڈمٹ ہے۔

سر کی تمام پٹیاں کھل چکی تھیں۔ صرف ٹانگ ابھی تک پلاسٹر میں جکڑی ہوئی

تھی۔ وہ اپنی ڈیوٹی کے دوران موقع ملتے ہی اس کی خبر گیری کے لئے کمرے میں پہنچ جاتی۔ آہستہ آہستہ ہارون کی صحت بحال ہوتی گئی اور ایک دن وہ اسے چھوڑ کر جانے کی عرضداشت لے کر پہنچ گیا۔ حدیقہ کے آنسو تھمنے کا نام نہ لیتے تھے۔ اس کے سر کا سایہ اس سے دور بھاگنا چاہتا تھا۔ وہ کتنی بد قسمت تھی۔ جب سے پیدا ہوئی تھی، مرد ہر رشتے میں ہی اس سے قطع تعلق کرنے پر تئل جاتا تھا۔ اس نے بے بسی اور لاچارگی سے ہارون کی اُداس اور غمگین آنکھوں میں جھانکا۔ وہ اس کا سوال سمجھ کر گویا ہوا۔

”کس رشتے، کس ناٹے یہاں کا ہو کر رہ جاؤں؟ تم نے ایک مخلص اور ہمدرد دوست ہونے کا ثبوت دے دیا تھا۔ اس چھوٹے سے کمرے میں تم نے میری موجودگی کو ہنس کر برداشت کیا۔ مجھے چلنے پھرنے اور سوچنے سمجھنے کے قابل بنایا، مجھ میں زندہ رہنے کی اُمنگ ڈالی۔ میرے ہونٹوں پر آہوں کی جگہ مسکراہٹ نے لے لی۔ سارا کریڈٹ تمہیں جاتا ہے حادی! کیا میں اس بیتے ہوئے مشکل وقت میں تمہاری مہربانیوں اور نوازشوں کو بھول سکتا ہوں؟ میری اس عطا کردہ زندگی کے ایک ایک لمحے پر تمہارا حق ہے حادی! تمہارا دل جب بھی مجھے پکارے گا، مجھے حاضر پاؤں گی۔ میں تمہارے آس پاس ہی موجود ہوں گا۔“

”میں نے جس مقدس رشتے کی ذور آپ سے باندھ رکھی ہے، اس کے واسطے ہی رُک جائیں۔ اس بندھن کی لاج رکھ لیں۔“ وہ التجائیہ انداز میں بولی۔

”ٹو پگلی ہے نری۔ نہیں سمجھو گی۔ تمہارے اور میرے درمیان کسی بھی خونی رشتے کی مطابقت نہیں ہے۔ ان منہ بولے رشتوں کے ٹوٹنے میں دیر نہیں لگتی۔ مجھے ڈر ہے کہ کہیں اکٹھے رہتے ہوئے مانوسیت اور ملکیت کے اس درجے تک نہ پہنچ جائیں کہ شیریں اور خرم کے تمام شکوک و شبہات سچائی سے دامن گیر ہو کر ہمیں جھوٹا، دغا باز اور فریبی قرار دینے میں کامیاب ہو جائیں۔ میں یہ سوچ کر خائف ہو جاتا ہوں۔“ وہ اسے اونچے اونچے سمجھانے لگا تھا۔

”آپ کو خود پر اعتماد نہیں۔ جبکہ مجھے اپنی ذات کے ذرے ذرے پر بھرپور بھروسہ ہے۔ میں نے آپ میں ایک ہم راز دوست کے ساتھ بھائی کے رشتے کو بھی ہمہ گیر پایا ہے۔“ وہ ایک دم ہی حیرت سے اسے دیکھتے ہوئے بولی۔ ”ورنہ آپ اس وقت یہاں نہ ہوتے۔“

کمرے میں سوگوار خاموشی چھا گئی۔

”آپ جاسکتے ہیں۔ میں ہی غلطی پر تھی۔“ وہ سنجیدگی سے بولی۔
 ”تم تو ناراض ہی ہو گئی ہو۔ مان گیا، تم سچائی پر ہو حادی! ورنہ میں کون ہوتا
 ہوں تمہارا کہ تم میری اتنی لک آفر کرتی۔“ وہ بھی سنجیدگی سے بولا۔
 ”میرا خیال ہے اب آپ کی سمجھ دانی میں ایک بہت سادہ اور عام فہم بات بیٹھ
 پائی ہے۔“ وہ معمولی سا مسکرائی۔

”ہم کتنے کمزور انسان ہیں حادی! ہر وقت کسی نہ کسی سہارے کے متلاشی رہتے
 ہیں۔“ وہ بہت رنجیدہ بنا نظر آنے لگا۔

”لیس..... یو آر رائٹ۔“ اس نے اثبات میں سر ہلایا اور خاموشی چھا گئی۔

ایک طویل توقف کے بعد ہارون نے ایک سرد آہ بھرتے ہوئے کہا۔

”حادی! میں کبھی کبھی تم سے بہت امپر لیس ہو جاتا ہوں۔“

”وہ کیوں؟“ وہ جاننا چاہ رہی تھی۔

”تم ان گنت خوبیوں کا شاہکار ہو۔ تم نہیں جانتی اپنے بارے میں کہ تم کیا ہو؟“

وہ سوچے جا رہا تھا۔

”جھوٹی تعریفوں سے مجھے خوش کرنے کی کوشش مت کریں۔ اگر مجھ میں ایک

بھی خوبی خرم کو نظر آ جاتی تو وہ مجھے یوں دھتکار کر ہمیشہ کے لئے مجھ سے تعلق نہ توڑ
 لیتا۔“ وہ پڑمرہ نظروں سے اسے دیکھنے لگی۔

”اس کی آنکھوں پر ماں اور بہن نے پٹی جو باندھ رکھی ہے۔“ وہ دیکھنے اور محسوس

کرنے سے نااہل ہے۔ مگر اب ان باتوں کا کیا فائدہ؟ وقت تو گزر گیا۔ اپنے پیچھے

لا تعداد دکھ اور حسرتیں چھوڑ گیا۔ بے وجہ اور بے مقصد ہم دونوں اس کی گرفت میں آ

گئے۔“ وہ خاصا پریشان نظر آنے لگا۔

”ہارون! آپ کو پاکستان واپس جا کرنی جاب کے ساتھ نئی زندگی کی شروعات

کرنی چاہئے۔ آپ کے لئے وہاں کا ہر در کھلا ہے۔ ہر طرح کی بے جا پابندیاں تو مجھ

پر لاگو ہیں۔ میں اکیلی یہاں سروایو کر سکتی ہوں۔ لیکن وہاں مجھ پر زمانہ انگلیاں

اٹھائے گا۔ میری اپنی ماں ہی میرا جینا دو بھر کر دے گی۔“ وہ بھی پریشان ہو گئی۔ ”مجھے

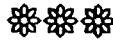
لگتا ہے ہارون! میں پردیس کی انہی گلیوں کی دھول بن کر ہوا میں تحلیل ہو جاؤں گی۔

میرا انجام کبھی بھی تابناک ستارے کی مانند نہیں ہو سکتا۔“

”میں ایسا نہیں ہونے دوں گا حادی! میں تمہارا وہ سائبان ہوں جو بوقت

ضرورت فقط سستانے کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔ حقیقہ! تم خود کو کبھی تنہا نہ سمجھنا۔
میں ہوں نا۔“ وہ ابھی بھی سنجیدہ تھا۔

”آپ کے جو احسانات مجھ پر ہیں، ان کے بارے میں بھی سوچ کر پریشان ہو جاتی ہوں۔ مزید آپ کو کیونکر تنگ کروں گی۔“ وہ ذرا سا مسکرائی اور اٹھ کر پچن میں کھانا پکانے لگی۔



”اب میں تندرست ہو چکا ہوں۔ تمہارے قدموں میں گدا ڈال کر سوؤں گا۔
اور تم آج سے اپنے بستر پر۔“ وہ ہنستے ہوئے بولا۔
”یہ کیسے ممکن ہے ہارون؟ آپ بڑے ہیں۔ قابلِ احترام۔“ وہ ابھی بھی سنجیدہ تھی۔

”اگر تم نہیں مانو گی تو ابھی اور اسی لمحے یہاں سے چلا جاؤں گا۔“ وہ ضدی بچے کی طرح بولا۔

”جب تک آپ کو جاب نہیں ملتی، آپ میرے ساتھ رہیں گے۔ ہم جلد ہی دو بیڈ روم کے اپارٹمنٹ میں شفٹ ہو رہے ہیں۔ یہ کمرہ میاں بیوی کے لئے تو ٹھیک ہے مگر بہن بھائی کے لئے نہیں۔“ وہ اسے تسلی دیتے ہوئے بولی۔ ”جب آپ کو جاب مل جائے گی تو ایک ایک پائی وصول کر لوں گی۔ اس کی فکر ہرگز مت کریں۔“
”کیا تم افورڈ کر سکتی ہو دو بیڈ روم کا اپارٹمنٹ؟“ وہ حیرت سے بولا۔

”بالکل۔ اس کی فکر نہ کریں۔ بندی بہت امیر ہے۔“ وہ کھل کر ہنسنے لگی۔ ”آپ کو جاب ملنے پر واپس ہاسپٹل کے اپارٹمنٹ میں آ جاؤں گی۔ مجھے اکیلی کے لئے اتنی رہائش کافی ہے۔“

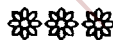
”حقیقہ! مجھے جانے کی اجازت دے دو۔ کیوں اپنی ضد پر اڑ گئی ہو؟“ وہ الجھ کر بولا۔ ”میں تمہارے ساتھ نہیں رہ سکتا۔ تم کیوں نہیں سمجھ رہی؟ مجھے خود سے ڈر لگتا ہے کہ کہیں تمہیں مزید پریشان ہی نہ کر دوں۔ کہیں ہمارے رشتوں کا تقدس جل کر راکھ ہی نہ ہو جائے۔ تم مرد کے ذہن کا مطالعہ کر سکتی تو مجھ پر کبھی اعتبار نہ کرتی۔ میں غیر اور نامحرم ہوں تمہارا۔ اور شیطان ہر وقت مرد کے سر پر منڈلاتا رہتا ہے۔ تمہیں میری باتوں پر یقین اس لئے نہیں آ رہا کیونکہ تم آئینے میں اپنا چہرہ دیکھ رہی ہو۔ میں تمہارا بھائی نہیں ہو سکتا حادی! اس لئے ہمارے درمیان کچھ حدیں رہنا ضروری ہیں۔“

”پھر وہی بے ہودہ اور فضول بکواس۔ آج سے میری آپ سے کٹی۔ اٹھائیں اپنا سامان اور خدا حافظ!“ اس نے بیگ اٹھا کر دروازے سے باہر پھینکا۔ ”میرے گھر میں غیر مرد کے لئے کوئی جگہ نہیں۔ آج کے بعد مجھے اپنی شکل بھی مت دکھائیے گا۔ مجھے یہ سمجھ نہیں آتی کہ یہاں نہ بیوی بچے نہ نوکری نہ رہنے کو جگہ۔ پھر کون سی مجبوری پاؤں کی انوٹ زنجیر بن گئی ہے کہ اپنے ملک کو ہمیشہ کے لئے خیر باد کہہ دیا ہے؟“ وہ فیسے سے بولے جا رہی تھی۔

”یہ میرا ذاتی پرائیویٹ افیئر ہے۔ میری شخصی آزادی ہر چیز سے زیادہ اہم ہے۔ میں ٹھوک کر چاٹنے کے سخت خلاف ہوں۔ ہاں البتہ تم اس چانس کے انتظار میں جوانی بیٹا دو۔“ وہ بھی قہر آلود لہجے میں بولا۔

”میں خرم کے نام پر اپنی زندگی فدا و نثار کر سکتی ہوں ہارون! میں نے اُسے دل و جان سے پیار کیا ہے۔ ایک دن وہ مجھے ضرور منانے آئے گا۔“ وہ امید و بیم کی کیفیت میں بولی۔

”افسوس کہ تم نے اپنی ماں سے بھی سبق نہ سیکھا۔ اس نے تو پھر بھی تمہارے سہارے زندگی گزار لی، تم کس کے بل بوتے پر اپنی پہاڑ جیسی زندگی گزارو گی؟“ وہ سخت اضطرابی کیفیت میں بولا۔ ”اپنے بارے میں جلد از جلد فیصلہ کرو۔ وقت تمہارے لئے رُکنے والا نہیں۔“ وہ یہ کہہ کر تیزی سے باہر نکل گیا۔ وہ بھی اس کے پیچھے باہر نکلی مگر اسے روک نہ سکی۔ آنسو بہتے ہوئے اس کے گریبان کو بھگونے لگے۔ ذومعنی باتیں اور حرکتیں اس کی سمجھ سے بالاتر تو نہ تھیں۔ وہ اسے کیا سمجھانا چاہتا تھا، وہ جانتی تھی۔



”شیریں! تمہیں واپس آئے سال ہونے کو آیا۔ کہاں رہ گیا ہارون؟ مجھ سے تم دونوں کوئی راز چھپانے کی کوشش کر رہے ہو۔ اور حدیقہ خرم کے ساتھ واپس کیوں نہیں آئی؟ میں کب تک اس کی ماں سے خرم کو چھپائے رکھوں گی؟ اس سر پھری پاگل بڑھیا کو اس کی بیٹی کہاں سے دوں گی؟“

ماں جی روزانہ سوالات کی ایک پوٹلی کھول کر بیٹھ جاتیں اور دونوں آئیں بائیں شائیں کرتے رہ جاتے۔

آخر ایک دن شیریں نے تمام روداد ماں کے گوش گزار دی تو وہ بے اختیار ہو کر بولی۔ ”مجھے تمہاری باتوں میں شک کی بو آ رہی ہے۔ بے شک حدیقہ میرے پاس

رہنے کی مخالفت کرتی تھی، اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ وہ بدکردار تھی۔ وہ بہت نیک اور پاکیزہ بچی تھی۔ اس کی اپنے خاوند کے ساتھ رہنے کی خواہش جازز تھی۔ یہ اس کا حق تھا۔ دوسرا ہارون جیسے لڑکے اس زمانے میں چراغ لے کر ڈھونڈے سے نہ ملیں۔ تمہاری اور خرم کی خوشی کی خاطر اپنی ماں کو اکیلا چھوڑ کر چل پڑا تھا۔ جبکہ اسے وہاں بے روزگاری اور محتاجی کا سامنا کرنا پڑا۔ پھر بھی تمہیں وہاں چھوڑ کر واپس نہ لوٹا۔ ایک دن تمہیں طلاق دے کر غائب ہو جانے میں تمہارا بھی قصور ہے۔ ایسے مرد اگر کچھ برداشت نہیں کر سکتے تو وہ ہے الزام تراشی اور ان کے کردار پر تہمت۔ بہت برا کیا تم نے۔“

”آپ نے بھی ہر ماں کی طرح مجھے قصور وار ٹھہرا دیا۔“ شیریں رونے لگی۔
”میری زندگی کے تجربات کے عکس ہیں یہ۔ تم نے ایک قیمتی ہیرا کھو دیا ہے بد بخت!“ ماں جی بھی رونے لگیں۔

”تم نہیں جانتیں کہ تہمت اور الزام تراشی کا انجام آخر بے گناہوں کی یکجائی پر ہو کر رہتا ہے۔ تم دونوں نے انہیں اس راستے کا پتہ بتا کر عقل مندی نہیں کی۔ اب وہ نکاح کے بغیر رہیں یا شادی رچا کر رہیں۔ انہیں نہ تم روک سکتی ہو، نہ خرم۔“ ماں آنسو صاف کرتے ہوئے بولی۔ ”میں خاندان بھر میں کیا منہ دکھاؤں گی؟ جس دن یہ راز افشا ہو گیا، دونوں گھرانوں کی عزت خاک میں مل جائے گی۔“
”ہم اسی لئے آپ کو حقیقت بتانے سے ہچکچا رہے تھے۔“ شیریں نے برا سامنہ بنا کر کہا۔

”تم کب تک چھپائے رکھتی؟ ایسی باتیں کبھی پوشیدہ رہتی بھی ہیں، بے وقوف کہیں کی۔ شک میں اپنی زندگی کی خوشیوں کو داؤ پر لگایا تو تھا، بچوں کو بھی جیتے جی کنوئیں میں دھکیل دیا۔ آج تم میری نظروں سے گر گئی ہو شیریں! تم نے ایک جاہل، آن پڑھ عورت کا رول ادا کر کے میری تربیت کا جنازہ نکال دیا ہے۔ تمہیں کبھی معاف نہیں کروں گی۔“ وہ مسلسل بولے جا رہی تھی۔ اور شیریں سر جھکائے۔ ننے کے علاوہ اور کچھ نہ کر سکتی تھی۔



”حدیقہ! مجھے خرم سے ضروری بات کرنی ہے۔“ ماما نے اصرار کیا۔
”وہ ابھی ڈیوٹی سے واپس نہیں آئے۔“ وہ ہمیشہ کی طرح بہانہ بنانے لگی۔

”تم ایک سال سے مجھے بے وقوف بنائے جا رہی ہو۔ حدیقہ! تم نے تو میرا منہ
 والا رکھ دیا ہے۔ آج خرم کی ماں کی نکلے نکلے کی باتیں سن کر مجھے تم پر شدید
 اصرار ہے۔ میرے قریب ہوئی تو تمہیں ذبح کر دیتی۔ تمہاری ماں نے اپنے شوہر
 کے نام پر زندگی گزار دی۔ تم اپنے شوہر کے ہوتے ہوئے نند کے خاوند کی معشوقہ بن
 گئی۔ حدیقہ! اگر تم میری بیٹی ہو تو ڈوب مرو۔“ ماما تو غصے میں چیخے جا رہی تھی۔
 ”مجھے علم تھا، آپ مجھے ہی گناہگار ٹھہرائیں گی۔ میری ایک نہیں سنیں گی۔ ہمیشہ کی
 طرح میں لا اُبابی ہوں، من چلی ہوں اور جذباتی ہوں۔“ وہ خفگی سے بولی۔ ”آپ
 مجھے اب بھی ایسا ہی سمجھتی ہیں ناں؟“

”تم نے ایسی ہی حرکت کی ہے۔ اب تمہیں عقلمند کہوں کیا؟..... تم میرے لئے
 آج سے مرگئی اور میں تمہارے لئے۔ اسی دن کے لئے تو میں نے تمہیں پیدا کر کے
 پردان چڑھایا تھا کہ دنیا کے سامنے میرا سر ہی نیچا کر دو۔ کاش تم پیدا ہوتے ہی مر
 جاتی تو آج مجھے تمہارے کردار پر شرم ناک نہ ہونا پڑتا۔ مجھے ایک سوال کا جواب دو۔
 کیا تم اپنی ماں کی تڑپ اور سسکیوں کو بھول گئی تھی یا اپنے حسرت زدہ ذہن باپ کے
 بیٹے ہوئے بچپن کو فراموش کر دیا تھا کہ ان بچوں پر ظلم کرتے ہوئے تمہیں رتی بھر
 خیال نہ آیا؟ بھلا تم اس زیادتی اور حرام کا کیا جواب دے سکتی ہو؟ میں قصور وار ہارون
 کو نہیں ٹھہراؤں گی۔ عورت کی چال بازی، چالاکی اور فریب مرد کو بے وقوف بنا دیتی
 ہے۔ اور پھر ہارون جیسا شریف النفس مرد، اس کو جال میں پھنسانا تم جیسی عورت
 کے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔ کیونکہ تم میں وہ جراثیم وافر مقدار میں موجود ہیں۔“
 صدیقہ فون پر پورے زور سے چیخ رہی تھی۔ حدیقہ کہتے کے عالم میں مری ہوئی
 آواز میں بولی۔

”یہ جراثیم آپ سے ہی ٹرانسفر ہوئے ہیں مجھ میں۔ جیسی ماں، ویسی بیٹی۔ بات
 تو سچ ہے مگر ہے رسوائی کی۔“

”تم نے اس مثال کو سچا کر دکھایا ہے۔ مگر ایک بات یاد رکھو، میں نے کسی کے
 سہاگ پر سر عام ندیدے پن سے ڈاکہ نہیں ڈالا تھا۔ میں نے پیار کیا تھا ایک بچلر
 لڑکے سے۔ ہاں، والدین کی رضامندی کے بغیر نکاح کیا تھا۔ اس کی داشتہ بن کر
 تمہیں جہنم نہیں دے سکتا تھا۔“ مارا کا گفتگو کا زہر اس کے وجود میں سرایت کر گیا۔

یہ آپ میری سائیدنی پی اور اسی لہائی میں۔ میں یا حرم کی صرح آپ فظ

اپنی سوچ اور حتیٰ اور آخری فیصلے پر قائم رہیں گی۔ وہ میرا شوہر تھا۔ کمزور اور بے حس۔ آپ تو ماں ہیں، میری سس سس کی گہرائیوں کی پہچان رکھنے والی۔“ وہ دھاڑیں مار کر رونے لگی۔

”مجھے تمہارے رونے پر نہ ترس آ رہا ہے، نہ ہی مجھے تمہاری من گھڑت کہانی پر یقین آئے گا۔ شیریں کی ٹریجک سٹوری اور خرم کا تم سے کنارہ کشی اختیار کرنا اور پھر تمہارا اور ہارون کا وہاں رک جانا کس بات کی نشاندہی کر رہا ہے؟ کیا تم مجھے اجتناب سمجھتی ہو؟ تم نے مجھے اپنے باپ سے بھی بڑھ کر ذلیل و خوار کر دیا ہے؟ مجھے مار ڈالا ہے تم نے..... مجھے مار ڈالا ہے تم نے۔“

وہ جیتی چلاتی رہی مگر صدیقہ نے فون بند کر دیا۔ حدیقہ نے اس کے بعد بیسیوں فون کئے مگر جواب نہ ارد۔ اسی کشمکش میں کئی مہینے گزر گئے۔ کوشش کے باوجود اسے چھٹی نہیں مل رہی تھی۔ ورنہ وہ ماں کو تمام داستان سناتے پہنچ جاتی۔ ہارون کا ویزہ ری نیو ہو رہا تھا۔ وہ اپنی جگہ مجبور اور بے بس تھا۔ وہ ہر بار اپنی ماں کو جلدی آنے کا دلاسا دے کر بہلا لیتا۔ بچوں کا دادی سے رابطہ کٹ چکا تھا۔ شیریں پہلے ہی ساس سے بے پناہ نفرت کرتی تھی۔ اب ان سے مراسم رکھنے کا اسے کوئی جواز نظر نہ آتا تھا۔ ساس بھی اپنی جگہ خاصی مطمئن اور پرسکون نظر آتی تھی۔ وہ بھی ہارون کے لئے دائیں بائیں لڑکیوں کی تاک جھانک میں مصروف ہو گئی تھی۔ جبکہ ہارون نے ماں کو ایسا کرنے سے سختی سے روک رکھا تھا۔ اس کے دوبارہ شادی کرنے کے قطعاً ارادے نہ تھے۔ شیریں کے سلوک اور رویے نے اسے ایسا تلخ سبق سکھایا تھا کہ اس کی نظروں میں عورت کی عزت اور قدر و قیمت زبرد ہو گئی تھی۔

جب سے وہ حدیقہ کے گھر گیا تھا، اس سے رابطہ رکھا، نہ کوئی تعلق۔ ایک ہارڈ ویئر سٹور پر جاب کر کے بزنس کے گُر اور اصول سیکھ کر اپنا بزنس کرنے کا اس نے ایم بنا لیا تھا۔ سیٹل ہونے کی صورت میں وہ بچوں کو تعلیم کے لئے یہاں بلانے کے خواب کھلی آنکھوں سے دیکھا کرتا تھا۔ اسی تمنا میں اس کی زندگی کی تمام خوشیاں پنہاں تھیں۔ وہ امید و بیم کی دنیا میں رہتے ہوئے حدیقہ کو یاد ضرور کرتا تھا۔ اس کے پیار اور احسانات کو یاد کر کے بے تاب ہو جایا کرتا تھا۔ مگر وہ اس کے قریب ہونے سے ڈرتا تھا۔ اس کی بھرپور جوانی کے حسن کو دیکھ کر بمشکل خود پر قابو پا سکتا تھا۔ اپنی نفسانی خواہش پر غالب آنا ایک آزمائش بن جاتا۔ ایسی سوچوں کی اس خاردار راہ پر اس کی

یہی نے ڈال کر بڑا برا کیا تھا۔ ورنہ وہ حدیقہ کو ہمیشہ چھوٹی بہن کا درجہ دیتا آیا تھا۔
بھائیوں جیسی ہمدردی اور لگاؤ تھی اس کے ہر ایکشن میں۔ ہر وقت اس کا سایہ بن کر رہتا اور وہ بھی اس کے ساتھ کمفرٹبل اور سکیور فیل کیا کرتی تھی۔

حدیقہ کی فیلنگو اسی طرح قائم و دائم تھیں۔ معاملے میں گڑبڑ اور ان دونوں میں دوری اور فاصلے ہارون کے رویے کی وجہ سے تھی جس کے دکھ میں حدیقہ کھلتی جا رہی تھی۔ اب وہ بھی اندیشوں اور دوسوں میں مبتلا اسے فون کرنے سے گریز کرنے لگی تھی۔ آج جب ماں نے بھی ایک نہ سنی اور خوب درگت بنا دی تو اسے اس بھری دنیا میں واحد ہارون اپنائیت اور لگاؤ کے ہمراہ اس کے سامنے ہاتھ جوڑے کھڑا نظر آیا۔ اس نے اسے روتے ہوئے فون کیا تو وہ اپنی جاب سے چھٹی کے بعد سیدھا اس کے پاس ہاسپٹل پہنچ گیا۔

حدیقہ کا چہرہ زرد اور آنکھیں آگ بگولا ہو رہی تھیں جن میں غصے کے ساتھ بے پناہ درد اور بے بسی بھی تھی۔ ہارون نے آگے بڑھ کر اسے اپنے سینے سے چٹا لیا۔ حدیقہ نے بھی احتجاج نہ کیا۔ اس کی آنکھیں اپنی بے گناہی کی دہائی دیے لگیں۔

”گندی سالی پر لے درجے کی۔“ وہ جب بھی تسلی دیا کرتا تھا، اسے اسی طرح پکارا کرتا تھا اور وہ ہنس دیتی۔ مگر آج حدیقہ کے چہرے پر مسکراہٹ نام کی ہلکی سی جھلک بھی نہ تھی۔ ہر انگ سے سوگواہی ٹپک رہی تھی۔

”مجھے مسکراتی ہوئی حادی چاہئے۔“ وہ اس کی پیشانی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولا تو وہ اس کی گرفت سے نکل کر اپنے آنسو صاف کرنے لگی۔

”میں جو تمہارے ساتھ ہوں ازل سے ابد تک، پھر یہ رونا دھونا کیا؟“ وہ اس کا ہاتھ تھام کر بولا۔ ”مجھے دیکھو، جس کی تمام متاع حیات لٹ گئی، پھر بھی زندہ ہوں اور مسلسل سڑگل کئے جا رہا ہوں۔ اچھے دنوں کا منتظر ہوں۔ بس اسی امید نے میرے وجود میں حد رے کی ہمت و حوصلہ بھر دیا ہے۔“

”آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں ہارون! آپ نہیں جانتے، جب ماں کی ماما میں خور آجائے تو دل پر کیا گزرتی ہے۔ ہارون! اگر آج آپ آنے جاتے تو مجھ سے خودکشی کا گناہ سرزد ہو جاتا۔ مجھے ایسے گمان ہوتا ہے جیسے کسی نے میرے جسم کے ہر حصے کو کچوکے لگا کر قیمہ بنا دیا ہے۔ آج میرے سر سے ماں کا سایہ بھی اٹھ گیا۔“ وہ بے بسی سے بولے جا رہی تھی۔ ”میں پیدائشی بد نصیب ہوں ہارون! آپ بھی تو مجھے چھوڑ

گئے تھے نا۔“

”ایسی بات ہر گز نہیں۔ دوسرا ماں کبھی بھی اولاد سے خفا نہیں ہوتی۔ چند مہینوں کی بات ہے۔ دیکھنا ان کا فون آجائے گا۔ اپنا دل مضبوط رکھو۔“

وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر باہر آ گیا اور اسے لے کر ہوٹل پہنچ گیا۔ کچن میں جا کر اس نے اس کے لئے کافی بنا کر اسے نہایت اپنائیت سے پیش کی۔

”ہارون! آپ میری ماں کی فطرت کو نہیں جانتے۔ انہوں نے مجھے دھمکی نہیں دی۔ وہ فیصلوں پر بی لیو کرنے والی خاتون ہیں۔ اور جسے چھوڑنا چاہیں، بل بھر میں چھوڑ سکتی ہیں۔ دوبارہ اس طرف آنکھ اٹھا کر دیکھتی تک نہیں۔ بہت سی مثالیں ہیں میرے سامنے۔ والدین اور خاندان سے کنارہ کشی کی تو کبھی پچھتاوا تک نہ ہوا۔ کبھی دوبارہ اپنے تعلقات استوار کرنے کی کوشش نہ کی۔ پایا چھوڑ کر چلے گئے تو کبھی ان کو ڈھونڈنے کی کوشش تک نہ کی۔ انہوں نے اس دنیا سے قطع تعلق کیا تو دوبارہ اس میں بننے کا تصور ہی نہ کیا۔ اب مجھے ان کی باتوں میں جو تبدیلی محسوس ہوئی تھی، وہ فقط میرے بچوں کی پیدائش کی امید سے آئی تھی۔ اس لئے میں نے ان سے اپنا کوئی دکھ شئیر ہی نہ کیا۔ اب وہ اچانک اتنے بڑے انکشاف کو ہضم ہی نہیں کر پائیں۔ ایک شاق تھی یہ خبر۔ کم از کم اپنی زندگی میں تو مجھے معاف نہیں کریں گی۔“ وہ کافی کا مگ ایک طرف رکھ کر گفتگو کئے جا رہی تھی۔

”اس مسئلے کا حل نکالنا پڑے گا۔ تم فکر مت کرو۔ تھوڑا وقت گزر جانے کے بعد تمام معاملات اپنی جگہ لے لیں گے۔ ابھی خاموشی میں ہی عافیت سمجھو۔“ وہ اس کی پریشانی کو کم کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ مگر وہ تھی کہ روئے جا رہی تھی۔ وہ اٹھ کر اس کے قریب آ کر بیٹھ گیا۔

”میرے لئے اب کیا حکم ہے سرکار؟“ وہ پیار بھرے لہجے میں بولا۔

”اس وقت آپ مجھے تنہا چھوڑ کر کہیں نہیں جائیں گے۔ میں ذہنی طور پر نارمل نہیں ہوں۔ میرے مرنے کی کسی اور کو تکلیف نہ ہوگی، سوائے آپ کے۔“ وہ سر جھکائے ابھی بھی آنسو بہائے جا رہی تھی۔

”گندی سالی پر لے درجے کی۔ اٹھو، تیار ہو جاؤ۔ آج ذر کے لئے باہر چلتے ہیں۔“ اس نے اسے بازوؤں سے کھینچ کر کھڑا کر کے ہاتھ روم کی طرف دھکیل دیا۔

”مجھے ٹرانکولا ئزر کے بغیر نیند نہیں آئے گی ہارون! میں کہیں نہیں جاؤں گی۔ میں

مرنا نہیں چاہتی حرام موت۔ مگر زندہ رہنا بھی سراسر گھانا ہے۔“
 ”کم ہمتی کی باتیں مت کرو۔ یو آراے بریو گرل۔“ اس نے اسے سہارا دیا۔
 ”سنجھل کر حادی!،“ وہ لڑکھڑا گئی تھی۔ ”تم آرام کرو۔ میں کھانا لے کر آتا ہوں
 تمہاری پسند کا۔ اسٹیکس دو واٹ ساس۔“ اس نے اسے بستر پر لٹا دیا۔ کبل اوڑھا کر
 اسے پیار بھری نظروں سے دیکھا اور لائٹ آف کر کے باہر نکل گیا۔ وہ اس کی والہانہ
 ہمدردی میں بہل گئی تھی۔

وہ آنکھیں بند کئے اپنی تمام تر قوت آشفتم کو یکجا کرنے کی کوشش کرنے لگی۔ مگر
 کانوں میں ماں کی زہر آلود آواز مسلسل گونج رہی تھی۔ اسے اپنا دم سینے میں گھٹتا ہوا
 محسوس ہونے لگا۔ کانوں میں ماں کی آواز کے ساتھ شائیں شائیں ہونے لگی۔ وہ
 نقاہت سے اٹھی اور ننگے پاؤں آہستہ آہستہ قدم اٹھاتی باہر سیڑھیوں پر بیٹھ کر ہارون کا
 انتظار کرنے لگی۔

”حادی! کیا بات ہے؟ یہاں آ کر کیوں بیٹھ گئی ہو؟ ٹھنڈ لگ جائے گی یا! بیمار
 پڑ کر مجھ سے فوری اجرو وصول کرنے کا پروگرام مجھے بھلا نہیں لگ رہا۔ اٹھو میری گندی
 سالی! دیکھو تمہارے لئے تمہاری پسند کا کھانا لایا ہوں۔“ وہ گہری اپنائیت سے بولا تو
 وہ کھڑی ہو گئی اور اس کا بازو پکڑ کر چلتی ہوئی کمرے میں آ گئی۔
 ”حدیقہ! دس از بیڈ۔ آئی ایم ریلی وریڈ اباؤٹ یو۔ مجھے آنٹی کا نمبر دو۔ میں
 ان سے بات کرتا ہوں۔“ وہ فکر مندی سے بولا۔

”آپ کہاں ہیں؟ میں کچھ نہیں جانتی۔ اس لئے فون کر کے مزید حالات
 بگاڑنے کی ضرورت نہیں۔“ وہ بمشکل بولی۔ ”جب کسی انسان کو جان لیوا بیماری لاحق
 ہو جائے تو موت کا خوف شب و روز کا سکون برباد کر دیتا ہے۔ مگر جب اس بیماری
 کے سامنے تمام حیلے ناکام ہو جاتے ہیں تو اس بیماری سے ہی لگاؤ ہو جاتا ہے۔ پھر
 زندگی کی پروا نہیں رہتی۔ موت کا ڈر اور اندیشہ ختم ہو جاتا ہے۔ میں بھی ٹھیک تو ہو
 جاؤں گی۔ تھوڑا وقت درکار ہے۔ لیکن بیماری میری جان لے کر دم لے گی۔“

ہارون نے کھانا اس کے سامنے رکھا، کولڈ ڈرنک اس کے منہ سے لگا کر بولا۔
 ”خواتنواہ دل کو روگ لگا بیٹھی ہو۔ خرم جس سے تم نے ٹوٹ کر پیار کیا ہے، اس
 کی بے وفائی اور نا انصافی کو تم نے ہنس کر برداشت کر لیا۔ اب بھی صبر سے کام لو۔
 سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔“

”ماں کا پیار ٹھنڈی چھاؤں ہے۔ ہر مشکل وقت میں اس سائے میں سستا کر نئے سرے سے زندگی کی شروعات کر دی جاتی ہے۔ ہارون! آج کے دکھ نے تو میری کمرہ ہی توڑ دی ہے۔“ وہ پھر سسکیاں بھرنے لگی۔

”نہ جانے عورتوں کی آنکھوں سے پانی کے چشمے کہاں سے اُبل پڑتے ہیں۔ میں فرمائش تو کیا آزمائش میں بھی آنکھوں سے ایک قطرہ نہیں نکال سکتا۔ مجھے صرف اتنا بتا دو کہ چشمے کب سوکھ پائیں گے؟“ وہ قدرے شوخی سے بولا۔

”آپ کو شرارت سوچھی ہوئی ہے۔ بے شک مرد ہر رشتے میں بے حس اور بے مروت ہی ثابت ہوا ہے۔“ وہ آنسو صاف کرتے ہوئے بولی۔ ”کیا آپ محسوس کرنے کی قوت رکھتے ہیں کہ میرے دل و دماغ پر کیا گزر رہی ہے۔“

”جانتا ہوں۔“ وہ سنجیدہ ہو گیا۔ ”اگر تمہارے ساتھ بیٹھ کر رونے سے کرب کی شدت کم ہوتی ہے تو مجھے ایسا کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں لگتا۔ یہ بتاؤ کہ ہم دونوں کے آنسو صاف کرنے والا کون ہو گا۔“

”آپ نے درست فرمایا ہے۔“ وہ سر جھکائے بولی۔

”کھانا کھا کر سونے کی کوشش کرو۔ میں صوفے پر سو جاتا ہوں۔ ذرا سی بھی طبیعت مضحل ہوئی تو آواز دے دینا۔ تکلف میں مضطرب نہ ہوتی رہنا۔“ اس نے سر پرستانہ انداز میں کہا۔ ”میرے ہوتے ہوئے کسی قسم کا فکرمٹ کرو۔ میں تمہیں اس حالت میں چھوڑ کر نہیں جاؤں گا۔“ وہ زبردستی اسے کھانا کھلانے لگا۔

”کھانے کے بعد اس نے اسے پین بکھر دی اور اسے سونے کی تلقین کرنے لگا۔ ”سو جاؤں گی۔ مگر صوفے پر۔ کیونکہ ساز میں، میں آپ سے بہت چھوٹی ہوں۔“ وہ بہت آہستگی سے بولی۔

”نہیں بھئی۔ تمہیں آرام دہ بستر کی ضرورت ہے۔“ وہ سنجیدگی سے بولا۔

”میں بیمار ہرگز نہیں ہوں۔“ وہ بھی سنجیدگی سے بولی۔

”جانتا ہوں۔ مگر پھر بھی۔ لیٹو، آج میں تمہیں وہ لوری سنا کر سلاتا ہوں، جو میں اپنے بچوں کو سنایا کرتا تھا۔“ اس کی آنکھوں میں اداسی در آئی۔ وہ آنکھیں بند کئے لیٹ گئی اور وہ اس کے بالوں میں ہاتھ پھیر کر لوری سناتے لگا۔ اور وہ سچ مچ بہت جلد نیند کی گہرائی میں چلی گئی۔

وہ قریب بیٹھا اس حسن کی معصوم اور مقدس دیوی کو دیکھنے لگا۔ رو رو کر ناک سرخ

ہو چکی تھی۔ آنکھیں درم شدہ تھیں ابھی تک۔ اور پیشانی پر اذیت وہ مل تھی۔ اس نے شیطانیت سے بھرپور ہاتھ اس کی طرف بڑھایا اور جھٹکے سے کھڑا ہو گیا اور خود کو لعنت ملامت کرتا ہوا باہر نکل گیا۔ اپنے اپارٹمنٹ تک پہنچتے ہوئے کئی بار اس کے قدم ڈمگائے کہ واپس چلا جائے اور اسے اتنا پیار کرے کہ وہ زندگی بھر کے دکھوں کو ہمیشہ کے لئے خیر باد کہہ کر اس کی ہو جائے۔ اس پر دیس میں ہم دونوں کو ایک دوسرے کی ضرورت ہے۔ کیا ایسا ممکن ہے؟

وہ سوچتا ہوا اپنے گھر پہنچ گیا اور رات بھر صوفے پر بیٹھ کر گزار دی۔ صبح تک وہ فیصلہ کر چکا تھا کہ وہ بہت جلد حدیقہ کو اپنے ارادوں سے مطلع کر دے گا۔



”ہارون!“ حدیقہ نے انگڑائی لیتے ہوئے ہارون کو پکارا۔ مگر ہارون کو نہ پا کر وہ سمجھی کہ وہ اپنے کام پر جا چکا ہے۔ فوراً اسے فون کرنے لگی۔ مگر فون بند کر کے تیزی سے بستر سے نیچے اتری۔ طبیعت رات بھر کے آرام سے کافی سنبھل چکی تھی۔ آئینے میں اپنی صورت دیکھ کر چونک گئی۔ خوب صورت بادامی آنکھوں پر شدتِ اشکباری کے ابھی تک نشانات مرئیں تھے۔ وہ پھر تڑپ کر ماں کو آواز دینے لگی۔

وہ ہاسپٹل جانے کے لئے تیار ہو گئی۔ چہرہ غمگین اور مایوسی کی تصویر بنا ہوا تھا۔ جسے کسی ذی روح نے محسوس کیا، نہ ہی اس کے درم شدہ سرخ چہرے کے بارے میں سوال کی۔ وہ اس کلچر سے مانوس ہونے کے باوجود توقع کر رہی تھی کہ کوئی اس سے ہمدردی کے دو بول کہہ کر اس کے درد کو ہلکا ہی کر دے۔ مگر ایسا ہونا ناممکن تھا۔ دن بے حد اضطرابی کیفیت میں گزر گیا۔ جونہی اس نے گھر جانے کے لئے بیک اٹھایا، سامنے ہی ہارون مسکراتا ہوا وارد ہوا۔

سلام دعا کے بعد حدیقہ نے نہایت اپنائیت بھری آواز میں کہا۔
”آپ صبح ناشتہ کئے بغیر ہی آفس چلے گئے۔ دراصل نیند اتنی گہری تھی کہ آپ کے جانے کا احساس ہی نہ ہوا۔“

”ہاں، کچھ ایسا ہی سمجھو۔“ وہ بات ٹال گیا۔ ”ہاؤ از موریل؟“
”بٹ فائن۔“ وہ سر ہلاتے ہوئے بولی۔ ”آپ میرے ساتھ گھر چل رہے ہیں

تا؟“

”ہاں۔ پہلے ڈنر کے لئے چلتے ہیں، پھر اپنے اپنے گھر۔ اگر تم نے اجازت دی

تو۔“ وہ سنجیدگی سے بولا۔

”مجھے تنہائی سے ڈر لگ رہا تھا۔ ایسے گمان ہوتا ہے جیسے تنہائی چڑیل کی طرح ہے جو میرا کلیجہ چبا کر مجھے مار دے گی۔ لیکن میں آپ کو مجبور نہیں کروں گی۔ میں جانتی ہوں، رات آپ صحیح طرح سے سو نہیں سکے۔“ کچھ توقف کے بعد وہ بولی۔

”میں اب کل سے بہت بہتر ہوں۔ آئی ایم سوری۔ میں نے کل آپ کو بہت تنگ کیا۔ کیا کرتی؟ اس دیارِ غیر میں آپ ہی تو میرے اپنے ہیں؟“ لہجے میں اُداسی تھی۔

”کیا ایک لڑکے اور لڑکی کے درمیان پاکیزگی اور تقدس کا رشتہ قائم نہیں رہ سکتا؟ کس قدر تنگ نظر نکلے ہمارے اپنے کہ ہمارے ساتھ وہ کچھ کر گئے، جس کا کبھی تصور بھی نہ کیا تھا۔“

”بس تم ذرا اس شاق سے نکل آؤ۔ پھر تمام مسائل کا حل نکالنے کی کوشش کرتے ہیں۔“ وہ بہت سنجیدہ ہو رہا تھا۔

کھانا کھانے کے بعد ہارون نے کل پھر اسی وقت آنے کا وعدہ کیا اور دونوں نے اپنی اپنی راہ لی۔

حدیقہ نے گھر پہنچ کر ماں کو پھر فون کیا۔ مگر جواب نہ ملا۔ رات اسی کوشش میں بیت گئی۔ مگر ماں نے جیسے بات نہ کرنے کی قسم ہی کھالی ہو۔

اتنی بد قسمتی میرے حصے میں کیونکر آئی؟ کاش مجھے ڈاکٹر آصف زیدی کا اتنے پتہ مل جائے تو ان کو ایک بات ضرور بتاؤں گی کہ آپ نے جو کڑھا ایک پرانی بیٹی کے لئے کھودا تھا، آپ کی اپنی بیٹی اسی کی نذر ہو گئی۔ اُف..... آپ کی بے حسی اور بے توجہی نے میری ماں کے اندر زہر بھر دیا ہے۔ وہ بھی بے حس اور لا پرواہ ہو گئی ہیں۔ آپ دونوں نے مجھ سے بدلہ لیا۔ میں کبھی معاف نہیں کروں گی۔ پاپا! آپ کو کیا علم کہ بیٹی کا گھر آباد رہتا ہے اس کے مضبوط، پائیدار اور خوش حال میکے سے۔ اس کا حسن و جمال، عقل و سمجھ تمام دھرے کا دھارا رہ جاتا ہے۔ اس کی حیثیت ملازمہ سے بھی کمتر گردانی جاتی ہے۔ جب شوہر اس کی کم مائیگی سے فائدہ اُٹھانے لگے۔

وہ نیکے میں سر چھپا کر چیخ کر رونے لگی۔ یہی سوچتے صبح ہو گئی۔ رات بھر کی بیداری سے سر چکرا رہا تھا۔ وہ ہاسپٹل نہ جاسکی۔ وہیں لیٹے سسکیاں بھرتی دھیرے دھیرے نیند کی ہجولی بن گئی۔ اور آنکھ اس وقت کھلی، جب شام کے سائے گہرے ہونے لگے اور دروازے پر مخصوص ناک ہوئی۔

وہ چونک کر ہڑبڑاتی ہوئی اٹھی۔ اسے صبح کا گمان ہوا۔ جیسے ملگجی روشنی کے بعد سورج طلوع ہونے والا ہو۔ وال کلاک کو دیکھ کر تیزی سے بیڈ سے اُتری۔
یہ تو شام کا وقت ہے۔ اُف اتنا لمبا سولیا۔ ہاسپٹل سے بھی غیر حاضری، ہارون بھی آکر واپس چلے گئے ہوں گے۔ وہ سوچ رہی تھی کہ ڈور بیل بجی۔
اس نے غیر ارادی طور پر دروازہ کھول دیا۔ ہارون نے تجسس بھری نظروں سے اسے گھورا۔ وہ ابھی تک نائٹ سوٹ میں تھی۔ آنکھیں ابھی ابھی بیدار ہونے کی غمازی کر رہی تھیں۔

”تم ٹھیک تو ہو؟“ وہ بے اختیاری سے بولا۔
”ابھی تو ٹھیک ہوں۔“ وہ آنکھیں ملتی ہوئی صوفے پر بیٹھ گئی۔
”تو پھر آج ہاسپٹل سے چھٹی کیسے کر لی؟“ وہ حیرت سے بولا۔
”نہ جانے کیوں؟“ وہ مختصر آ بولی۔
”کوئی تو وجہ ہوگی۔“ وہ ابھی تک حیران تھا۔ ”ورنہ تم چھٹی کرنے والی کہاں؟“
”بس غیر ارادی طور پر ہی غیر حاضری ہو گئی۔“ وہ دوپٹے سے خود کو لپیٹتے ہوئے بولی۔ ”سوئی ہی رہ گئی۔“
”اچھا، تو پھر رات جگا منایا ہوگا۔ خوب چراغاں کیا ہوگا۔“ وہ آہستگی سے بولا۔
”مجھے بھی ساتھ شامل کر لیا ہوتا۔ اکیلے اکیلے ہی مزے لوٹ لئے۔“
”جی۔“ اس نے اثبات میں سر ہلایا اور آنکھیں جھکا لیں۔

”اگر تم نے بیمار پڑنے کا ارادہ کر ہی لیا ہے تو مجھے صاف صاف بتا کیوں نہیں دیتیں؟ میں خوانخواہ ہی پریشان ہو رہا ہوں۔“ وہ ایک دم ہی افسردہ ہو گیا۔ وہ خاموش رہی۔ ”میں تمہیں بہت دلیر اور بہادر لڑکی سمجھتا تھا، تم تو بالکل ہی میں میں نکلی۔ تمہاری کمزوری، بزدلی اور کم ہمتی نے تمہیں یہ دن دکھایا ہے۔ سب کچھ کھو جانے کے بعد بھی تم میں زمانے سے ٹکر لینے کی جرأت و سکت پیدا نہیں ہوئی۔ اپنے انڈرگلز پیدا کرو اور خود غرض ہو جاؤ۔ اپنی زندگی میں خوشیاں بھرنے کے بارے میں سوچو۔“
”کیسے؟“

”جنہوں نے تمہارا سکون برباد کر کے تمہیں زلایا ہے، انہیں فراموش کر دو۔ ان کی یادوں کو سینے سے ایسے ٹھہرچ کر نکال دو جیسے تمہاری زندگی میں کبھی ان کا دخل تھا ہی نہیں۔ اگر تم یہ سب کچھ نہیں کرنا چاہتی تو میری ایک ریکویسٹ قبول کر لو۔ ذرا اپنی

وصیت بتا دو کہ تمہیں کہاں دفن کروں؟..... خرم کے پہلو میں کہ ماں کے چرنوں میں؟“ وہ بیزاری سے کہتے ہوئے ہنس پڑا۔

”ہائے خدا نہ کرے۔“ وہ تڑپ کر بولی۔ ”میری زندگی بھی ان دونوں کو لگ جائے۔ ہارون! یہ آپ نے بہت گھٹیا بات کی۔ آئی لو خرم۔ آئی مس خرم اینڈ مام۔“

”اور کیا کہوں؟ ذرا آئیے میں اپنی شکل تو ملاحظہ فرماؤ۔ شاید تمہیں میری بات سمجھ آ جائے کہ ایسا میں نے کیوں کہا ہے۔ افسوس کہ خرم ابھی تک تمہارے دل کے نہاں خانوں میں بستا ہے۔ تم میں اگر رتی بھر بھی اپنی عزت اور وقار کا پاس ہے تو اس کی یاد میں گھلتا چھوڑ دو۔ اس کی ماں نے اب تک اس کے لئے اپنی پسند کی لڑکی ڈھونڈ بھی لی ہوگی۔ اس کی شادی کا کارڈ طلاق کی صورت میں نازل ہوا تو پھر سنجیل نہ پاؤ گی۔ بہتر ہے کہ ابھی سے ہر طرح کے حالات سے سمجھوتہ کر کے اپنی زندگی کی نئی راہ تلاش کرو۔ تم میں کسی چیز کی کمی ہے کیا، جو خود اعتمادی کو تیاگ چکی ہو؟“ وہ قدرے سختی سے بول رہا تھا۔

”میں نے خرم سے پیار کیا ہے ہارون!..... بے شک خاوند کا پیار بہتی ندی ہے۔ ڈھلتی چھاؤں ہے۔ چاند کا گھٹنا اور سورج کا اترنا ہے۔ پھر بھی مجھے اپنی محبت پر یقین ہے، اپنی وفا پر بھروسہ ہے۔“ وہ مستحکم لہجے میں بولی۔ ”ایک دن اسے احساس ضرور ہو گا۔“

”تمہارا علاج میرے پاس نہیں۔ اُمیدوں کے دیے جلائے رکھو اور خود کو احمق بنا کر ایک بناوٹی، طلسمی دنیا کی باسی بنی رہو۔ تم جانتی ہو، اس کے اثرات کیا ہوں گے؟“ وہ تذبذب میں بولا۔

”جانتی ہوں۔“ وہ مایوسی سے بولی۔

”بھلا میں بھی سنوں۔“ وہ سنجیدہ تھا۔

”آپ مجھے چھوڑ جائیں گے۔“ آنکھیں نم آلود ہو گئیں۔

”وہ کیوں اور کیسے؟“ وہ قدرے نرمی سے بولا۔

”دنیا ہنسنے والوں کا ساتھ دیتی ہے ہارون! بالآخر رونے والوں کا کوئی ساتھی نہیں رہتا۔ کوئی ہمدرد اور غمگسار بن کر اس کے درد اور دکھ کو بانٹنے کی کوشش نہیں کرتا۔ اس کا انجام تنہائی اور اکیلا پن ہے ہارون! آپ بھی مجھ سے تنگ آ گئے ہیں۔ اس وقت مجھ پر وہ وقت ہے جب سایہ بھی ساتھ چھوڑ کر پرایا ہو جاتا ہے۔ آپ کو قصور وار نہیں

ظہر اڑس گی۔“ اس کے لہجے میں خفگی نمایاں تھی۔

”تم نے میری کنسرن کا بہت غلط مطلب نکالا ہے حدیقہ! تم جانتی ہو کہ اللہ تعالیٰ نے پہلے دن سے میرے دل میں تمہارے لئے بے پناہ پیار اور انس ڈال دیا تھا۔ مجھے ہمیشہ تم سے ہمدردی رہی ہے۔ تمہاری بے پناہ عزت و احترام کیا ہے میں نے۔ پھر تم نے فوری طور پر یہ فیصلہ کیسے سنا دیا کہ میں تمہیں چھوڑ جاؤں گا؟“ وہ اضطرابی کیفیت سے بولا تو وہ اس کا منہ ٹکنے لگی۔

بات تو سچ تھی۔ وہ انکار کیسے کرتی؟ اس سے ہمدردی، ترس اور رحم سے اس کا ہنسا بستا گھر اُجڑ گیا تھا۔ وہ مارے ندامت کے خاموشی سے اپنے ہاتھوں کی لکیروں کا موازنہ کرتے ہوئے بولی۔

”ہارون! جی چاہتا ہے ان آڑی ترچھی پھیلی ہوئی لکیروں کو ٹکرج کر مٹا دوں اور پھر اپنی پسند اور مرضی کے مطابق ان کو سیدھا کر دوں۔“

”کوشش کرو گی تو کامیاب ضرور ہو جاؤ گی۔ جو لوگ اپنے نصیب بدلنے پر یقین نہیں رکھتے، وہ اپنی تمام عمر آہ و فغاں میں بیتا دیتے ہیں۔ میں یہی راز تو تم پر افشا کرنا چاہتا ہوں۔ جنہوں نے تمہیں اس بھری دنیا میں تنہا چھوڑ دیا ہے، تم بھی انہیں بھلا کر اپنی بقیہ زندگی کے بارے میں اپنا من پسند فیصلہ کرو۔ اب نہ تو کوئی بندہ بشر تمہیں روکنے والا ہے، نہ ہی تمہیں انکار یا اعتراض کرنے کی ضرورت ہے۔ خود کو سنبھالو۔ کل کی صبح تمہاری نئی زندگی کی کرینیں لے کر طلوع ہو۔“ ہارون نے اس کا سر اپنے سینے سے لگا لیا۔ ”الوداع کہہ دو اس رونے دھونے کو، اس ٹپ کو اور کسک کو، پچھتاوؤں اور حسرتوں کو۔“

”ہارون! اگر آپ میری زندگی میں نہ آتے تو میں کب کی مر گئی ہوتی۔ آپ نے ہر مشکل گھڑی میں میرے وجود میں روح پھونک کر مجھے نئی زندگی بخشی۔ مجھے معاف کر دیجئے۔ میں آپ کی تابعدار بہن اور مربی دوست نہ بن سکی۔“ وہ ایک دم پیچھے ہٹ گیا۔

”حدیقہ! میں منہ بولے رشتوں کو نہ اہمیت دیتا ہوں، نہ ہی ایسے رشتوں کی قدر کرتا ہوں۔ ہاں، دوستی کے رشتے کا تو جواب نہیں۔“

”آپ مجھے ہر بار یہ احساس دلا کر مجھے حیران و پریشان کر دیتے ہیں۔ لیکن ایک بات پلٹے باندھ لیں کہ میرا ماں جایا تو ہے نہیں۔ آپ نے ہمیشہ اس سے بڑھ کر

میرا خیال رکھا ہے اور آئندہ بھی آپ کو اسی پر قائم رہنے پر مجبور کروں گی۔“ وہ خوشگوار موڈ میں بولی۔ ”آج کے بعد وہی کروں گی جیسا آپ چاہتے ہیں۔ ورنہ آپ کنارہ کشی اختیار کر جائیں گے۔ آپ کے بغیر میرا ہے بھی کون؟“

وہ اس کی باتیں سن کر سنبھل گیا اور سوچنے لگا کہ خرم کس قدر بد نصیب شوہر ہے جو اپنی اس معصوم، مقدس اور پوتر بیوی کو پہچان ہی نہ سکا۔ جو کوہِ ہمالیہ کی مانند بلند اور بارعب، دھرتی کی طرح فراخ دل اور سمندر جیسی بے حد و بے کراں خوبیوں کی شاہکار ہے۔

”کیا سوچ رہے ہیں آپ؟“ وہ توقف کے بعد بولی۔
 ”کچھ خاص نہیں۔ اٹھو تیار ہو جاؤ۔ آج فرائیڈے نائٹ، سینما ہال میں گزارتے ہیں۔“ وہ سنجیدگی سے بولا۔

”میرا دل نہیں چاہ رہا۔ اگر آپ جانا چاہتے ہیں تو شوق سے جائیے۔“ وہ ایک لمبی آہ بھر کر بولی۔

”یہ کیسے ممکن ہے؟ تمہیں اس حالت میں تنہا چھوڑنا میرے بس کا روگ نہیں۔“ وہ تاسف بھرے لہجے میں بولا۔ ”ہر انسان اپنے دکھوں کا مداوا خود ہی کرنے کی اہلیت رکھتا ہے۔ تم بھی انشاء اللہ تعالیٰ ایک دن اپنے ہر رنج و الم پر غالب آ جاؤ گی۔ میرا چند گھڑیوں کا ساتھ کسی خاص الخاص اہمیت کا حامل ہرگز نہیں۔ بس معمولی سی کوشش ہے کہ تم کسی طریقے سے اس فیر سے نکل آؤ۔“

”بہت بہت شکریہ ہارون!“ لہجہ تشکر آمیز تھا۔ ”آج کی رات مجھے نیند آنے سے رہی۔ آپ نے ٹھیک فرمایا ہے کہ قلم دیکھنے چلتے ہیں۔“ وہ اتنا کہہ کر ہاتھ روم میں تیار ہونے چلی گئی۔

اتنی دیر ہارون کے دل و دماغ پر گھٹا ٹوپ بادلوں نے غلبہ پائے رکھا کہ وہ کہیں اور بھی تو دل بہلا سکتا ہے۔ شادی کے لئے لڑکی ڈھونڈ سکتا ہے۔ اس کے ساتھ زندگی گزارنے کے تمام قانون و اصول ایک بار پھر سے آزما سکتا ہے۔ اپنی قسمت کو آزمانے میں قباحت ہی کیا ہے؟ یہ سوچنا بھی کس قدر تکلیف دہ ہے۔ مجھے جس سے ہمدردی اور رحم کرتے کرتے بے نیاز ہو گیا ہے، اس سے کیا ہو سکتا ہے؟ جیون ساتھی منتخب کرنے میں عار محسوس کروں۔ مگر حقیقہ کی سی بات، کسی حرکت میں اس کے ارادوں کی پابندی نہ ہو سکتی۔ وہ مجھے ہمارا کا درجہ دیتی ہے۔ میرا اللہ پرست ہے۔

مقدس رشتے میں براہمان تھی۔ میرے دل میں فتور آ گیا ہے۔ میری رگوں میں خون کے ساتھ شیطان سرایت کرنے لگا ہے۔ میں حدیقہ کی عصمت دری نہیں، اس کو ہمیشہ کے لئے اپنا چاہتا ہوں۔ لیکن وہ اس طرف آنے کا سوچتی ہی نہیں۔ خرم، خرم کا ورد جاری رکھتی ہے ہر وقت۔

وہ سوچتا رہا۔ اسی اثناء میں وہ تیار ہو کر باہر نکل آئی۔ بلیک کلر کی سکرٹ اور وائٹ کلر کا بلاؤز، کندھوں پر کوٹ ڈالا ہوا تھا۔ اونچی ہیل کے کوٹ شوز میں اس کا قد ہارون کے برابر آگیا تھا۔ چہرے پر سوائے لب اسٹک کے کسی بھی پینٹ کا استعمال نہیں کیا گیا تھا۔ نکھرا اُجلا روشن وکیل چہرہ معصومیت کی منہ بولتی تصویر بنا ہوا تھا۔ اس نے اسے نظریں بھر کر دیکھا۔ حدیقہ کے پورے جسم میں جھرجھری سی دوڑ گئی۔ وہ اس کی طرف پشت کر کے کھڑی ہو کر اس کی نگاہوں سے اوجھل ہو جانا چاہتی تھی۔ کیونکہ اسے ہارون کی آنکھ میں میل نظر آئی تھی۔ ہوس اور شیطانیّت کی جھلک عیاں تھی۔ اس نے پرس اٹھایا اور سرعت سے دروازہ کھول کر باہر نکل گئی۔ وہ کافی دیر سکتے کے عالم میں کھڑا اس حسن کے نکھار کے فسوں سے باہر نکلنے کی کوشش کرتا رہا۔



”حادی! یہ بتاؤ کہ تم اس وقت کہاں ہو؟ میرا فون نہ اٹھانے کی قسم کھالی ہے تم نے۔“ وہ شکوہ و شکایت بھرے لہجے میں بولا۔

”جی۔ یوں ہی سمجھ لیجئے۔“ وہ قدرے بے رخی سے بولی۔

”کیوں؟ کیا قصور سرزد ہو گیا ہے مجھ سے؟“ وہ انجان بنتے ہوئے بولا۔

”آپ معصوم بننے کی کوشش مت کریں۔ سب معلوم ہے آپ کو کہ مجھے آپ کی کون سی حرکت نہایت نازیبا اور غیر موزوں لگتی ہے۔“ وہ ناگواری سے بولی۔ ”بل بھر میں آپ رکھ رکھاؤ اور اخلاقیات کو پس پردہ ڈال دیتے ہیں۔ اٹ از ڈسٹر بنگ می۔ میں ڈر جاتی ہوں۔“

”تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے۔“ وہ پھر جھوٹ بول رہا تھا۔

”میں عورت ہوں۔ نظریں پہچانتی ہوں۔ دلوں کے حال جانتی ہوں۔ ذہن میں اُبھرنے والی ہر سوچ کو پڑھنے کا علم رکھتی ہوں۔ میں نے آپ کو پہلے بھی وارن کیا تھا کہ میرے ساتھ وہ رشتہ جو پہلے دن استوار ہوا تھا، اس کے علاوہ کوئی اور رشتہ

ڈیولپ نہیں ہو سکتا۔“ وہ رکھائی۔ بول رہی تھی۔
 ”آئی ایم سوری حدیقہ! کبھی مار ریڈنگ غلط بھی تو ہو سکتی ہے۔“ وہ نادما سا
 ہو گیا۔

”اگر آئندہ ایسا ہوا تو کبھی معاف نہیں کروں گی۔ آپ کیا سمجھتے ہیں کہ صرف
 خونی رشتوں میں ہی سرخی ہوتی ہے؟ بچی، کھری اور مقدس حرارت ہوتی ہے؟ ایسے
 خود غرضانہ خیالات آپ کے ہو سکتے ہیں۔ میں نے تو اس رشتے میں کبھی پت جھڑکی
 پیلا ہٹ اور برفانی ٹھنڈ و سفیدی نہیں دیکھی۔ مگر آپ نے ہر بار اسے ماننے سے انکار
 کیا۔ یہی وجہ ہے کہ میں نے کبھی کبھار آپ کے احساسات و جذبات میں خود کو بہت
 کمتر اور حقیر محسوس کیا ہے۔ حالانکہ میں ایسی نہیں ہوں۔“ وہ اس کی خوب کلاس لے
 رہی تھی۔ اور وہ چیس بہ چیس کئے جا رہا تھا۔
 اسی عالم میں فون ڈراپ ہو گیا۔

شام پانچ بجے اس نے حدیقہ کو ہاسپٹل میں پکڑ لیا۔ وہ پہلے ہی اس کی آمد کی
 منتظر تھی۔ کیونکہ وہ جانتی تھی کہ فطری طور پر وہ بہت عظیم انسان تھا۔ مگر مردانہ جبلت
 کے پیش نظر جب بھی کمزور اور ناتواں معلوم ہوتا تو حدیقہ بغیر کسی مردّت و لحاظ کے
 فوراً اسے اس کی غلطی جتا کر پرسکون ہو جایا کرتی تھی۔ اور پھر ہارون کا صراط مستقیم پر
 چلتے ہوئے کچھ عرصہ بہت خوشگوااری میں بیت جایا کرتا تھا۔

وہ ہوٹل پہنچا تو دونوں نے پھر اس موضوع کو چھیڑنے سے گریز کرنے میں ہی
 مصلحت سمجھی۔ دونوں نے کے ایف سی سے کھانا کھایا اور ادھر ادھر کی باتیں کرتے
 اپنے اپنے ٹھکانے کی طرف چل پڑے۔



”خرم! میں نے تم جیسا بے حس اور بے فیض بھائی اس روئے زمین پر نہیں دیکھا۔ کچھ خبر ہے کہ تمہاری بیوی کہاں ہے؟ کیسی ہے؟“ شیریں نے تلخ لہجے میں کہا۔

”جانتا ہوں۔ ایسا بھی احمق نہیں ہوں کہ حدیقہ کی ہر مومنٹ کی منجری کے لئے میں نے جاسوس نہ چھوڑے ہوں۔“ وہ بھی کڑواہٹ سے بولا۔ ”تم تو مجھے ہمیشہ سے ہی نادان، بے وقوف اور نہ جانے کیا کچھ سمجھتا رہا۔“

”تمہاری حرکات جو ایسی ہی ہیں۔“ تلخی قائم تھی۔

”تم نے اپنی طرف کبھی غور کیا ہے؟ ذرا گریبان میں جھانک کر تو دیکھو۔“ وہ بھی غصے میں ہی بولا۔

”تم مجھے بلیم نہیں کر سکتے۔ میرا گھر برباد ہونے میں تمہاری کمزوریاں اور کوتاہیاں نمایاں ہیں۔ ورنہ تمہاری بیوی کی یہ مجال نہ ہوتی۔ میرے شوہر کو ایسا ہاتھ میں کیا کہ تو بہ بھلی۔ اور تم ہو کہ اسے طلاق دینے پر رضامند ہونے میں نہیں آرہے۔“ وہ پھر چیختی۔

”شیریں! بڑے بھائی کی عزت و احترام کا دھیان رکھ کر بات کرو۔ پہلے ہی میرا بچہ حیران و پریشان ہے، اور پر سے تم ہر دوسرے دن یہی قضیہ لے بیٹھتی ہو۔ بیٹیاں اپنے ہی گھروں میں بستی بھلی لگتی ہیں۔ اب میری عمر ہے کیا تمہاری اور بچوں کی ذمہ داریاں نبھانے کی؟ پھر طرہ یہ کہ بڑے بھائی سے تمہاری ایک پل کے لئے نہیں بنتی۔ ہر وقت کا کوسنا، ڈانٹ پھنکار بھائی کہاں سہتے ہیں؟ میرا بچہ بسم اللہ کا تخم ہی تو ہے۔ اس نے ثابت کر دکھایا ہے۔“ ماں نے بیٹی کو زہر آلود لہجے میں ڈانٹ دیا۔

”ماں جی! آپ نے بھی بھائی کی طرح نظریں بدل لی ہیں۔ میں اس دن کو کیسے واپس لے آؤں جب میں نے طلاق کا مطالبہ کیا تھا؟“ وہ اونچی آواز میں رونے

لگی۔ ”میری دھسکی تو سزا بن کر وارد ہو گئی مجھ پر۔ ہارون! ایسا بھی کیا قصور کر ڈالا تھا میں نے؟“

”معمولی سی بات سمجھاؤ تو فوراً مگر مجھ کے آنسو بہہ نکلتے ہیں۔“ ماں نے مضطرب ہو کر کہا۔ ”بس سن لو! آج کے بعد بھائی کو طعنے و تشنے مت دیتا۔ اس کے لئے لڑکی نظر میں رکھو۔ آخر اس کا گھر تو بسانا ہے نا۔ اپنی زندگی میں ہی یہ خوشی دیکھنی نصیب ہو۔ اللہ کرے کوئی ڈھنگ کی بچی مل جائے۔ ایک نے تو ناک سے چنے چبوا دیئے ہیں۔ دل ڈر سا گیا ہے۔ آج کل کی لڑکیاں شاطرانہ چالیں سیکھ کر سسرال میں قدم رکھتی ہیں۔ خدا خیر ہی کرے۔ تمہارے آس پاس بے شمار ڈاکٹر لڑکیاں موجود ہوں گی۔ سوچ سمجھ کر کہیں بات چلا لو۔ میری طرف سے اجازت ہے۔“

”ڈاکٹر لڑکی سے اس کی شادی ناممکن ہے۔ کوئی پاگل کی بچی ہی اتنا خوف ناک فیصلہ کرے گی۔“ وہ منہ چڑاتے ہوئے بولی۔

”شیریں! کیا ہو گیا ہے تمہیں؟ مجھے ہوش و حواس سے بہت دور معلوم ہونے لگی ہو۔ کوئی بڑے بھائی سے یوں بھی بات کرتا ہے۔ بدتمیز لڑکی! تم دونوں کے پیار کی تو مثالیں دی جاتی ہیں۔ اب لوگوں کے سامنے تم نے ذلیل ہونے کی ٹھان لی ہے۔ یاد رکھو! تم سے منہ لگانا ہی چھوڑ دوں گی اور اپنا دودھ تمہیں ہرگز نہ بخشوں گی۔“ ماں نے غیظ و غضب سے کہا۔

”ماں جی! آپ کے لئے سب کچھ خرم ہی ہے۔ میں آپ پر بوجھ جو بن گئی ہوں۔ اب میری حیثیت نوکرانی سے بھی کم ہے۔ اور میرے بچے یتیم اور لاوارثوں جیسی مسکیت اور کمپرسی میں زندگی گزار رہے ہیں۔“ وہ روئے جا رہی تھی۔

”بچے دھیال رخصت کر کے خود شادی کر لو۔ چاہے تم ہارون کی نسل کو سنوارتے ہوئے قبر کے دھانے کو جا لگو مگر قدر دان کوئی نہ ہوگا۔ یہی بچے تمہیں موردِ الزام ٹھہرا کر باپ سے جاملیں گے۔ میری بات یاد رکھنا۔ میری زندگی کے تجربات و مشاہدات نے مجھے یہی کچھ سکھایا ہے۔“ ماں نرمی سے اسے سمجھانے لگی۔

”مجھے آپ کی سمجھ آگئی ہے۔ مجھے سر سے اتارنا چاہتی ہیں آپ۔ خرم! تم بھی خاموش بیٹھے ہو۔ کہاں گیا تمہارا پیار؟“ وہ تاسف بھرے لہجے میں بولی۔

”پیار تو میری نس نس میں ابھی بھی موجود ہے۔ بس حالات کی بھیمنٹ چڑھ گیا ہے۔ تم بہت نامقول باتیں کرنے لگی ہو۔ سوچا تھا دونوں بہن بھائی مل جل کر بقیہ

اس کی ہلکی خوشی گزار لیں گے۔ مگر میں نے نوٹ کیا ہے کہ تم جیسی بہن کے ساتھ اپنی نام نہان زندگی گزارنے کا منصوبہ خاصا بے وقوفانہ تھا۔ میں تمہیں ہرگز قصور وار نہیں ٹھہراتا۔ ہر ذی روح اپنی پسند اور اپنی خواہش کے مطابق اپنی زندگی کے ساتھ انصاف کرنے کا تمنائی ہوتا ہے۔ میں بھی اسی طریقے سے سوچنے لگا ہوں۔“ وہ جویدگی سے بولا۔ ”دو گھروں کی بربادی کا سبب ہی مل جل کر رہنے سے ہوا ہے۔ تم خود موازنہ کرو کہ ہارون کس قدر حسیل اور لوگ انسان ہے اور تمہاری بے انتہا قدر دانی کرنے والا شوہر تھا۔ حدیقہ کا کردار تمہارے سامنے ہے۔ حد درجے کی فرمانبردار اور خدمت گزار بیوی، بھابی اور بہو ثابت ہونے کے باوجود میں اسے قابل عزت مقام کیوں نہ دے سکا؟ کبھی اس بارے میں تم نے سوچا ہے؟“

”آج اس کی جدائی میں ہر نقص اور برائی مجھ میں نظر آنے لگی ہے۔“ وہ تمللا اٹھی۔ ”اب مجھے سمجھ آگئی ہے کہ تم نے اس کو طلاق دے کر فارغ کیوں نہیں کیا۔“

”یہ بھی تمہاری بھول اور غلط فہمی ہے۔ اتنے بگڑے ہوئے حالات کے پیش نظر میں حدیقہ کو واپس لانے کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ شک کی دنیا سے باہر نکل آؤ۔ البتہ تمہاری سوچ اور سلوک نے مجھے نیا سبق جو سکھا دیا ہے، اگلی زندگی کے لئے کافی کارگر ثابت ہو گا۔“

”تم شادی رچا سکتے ہو۔ ہارون اور حدیقہ یک جان ہو سکتے ہیں۔ میرے لئے بتاؤ کہ کیا حکم ہے؟ میں ان دو بچوں کے ساتھ کہاں جاؤں؟ عمر کے اس حصے میں، میں اکیلی رہنے کے قابل بھی نہیں۔ تم نے اور ماں جی نے بھی طوطا چشمی دکھا دی۔ ان کا دھیال مجھے منہ تک نہیں لگاتا۔ میں نے بھائی کے نشے میں مست کسی کو لفٹ کرانے کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی تھی۔ آج کل میں کس قدر تنہا ہو کر رہ گئی ہوں۔“ وہ دھاڑیں مارنے لگی۔

”شیریں! رونا بند کرو۔ ہمت سے کام لو۔ خرم جو کہہ رہا ہے، اس میں کافی حد تک سچائی ہے۔ بہن بھائی کا پیار اگر گھروں کو تباہ کر رہا ہے تو ایسے پیار سے دستبردار ہونا بہتر ہے۔ مگر اب تو دیر ہو گئی ہے۔ کاش! گیا وقت واپس آجائے اور ہم اپنی اپنی زندگی خود سے گزاریں۔ ایک دوسرے کی زندگی میں دخل اندازی کے رونا ہونے والے نتائج ایسے ہی بھیاںک اور پچھتاؤں اور آہوں کا حصہ ہوتے ہیں۔“ ماں کی آواز بھڑا گئی۔ ”اس بربادی میں میری بھی برابر کی شراکت ہے۔ میں نے شیریں

کے پیار میں حدیقہ کو کبھی بہو نہ سمجھا۔ اس نے اپنی خدمت کردائی، ایک نرس سمجھ کر بہو یا بیٹی کا درجہ دیا ہوتا تو وہ مجھے اکیلا چھوڑ کر کبھی نہ جاتی۔ وہ سمجھ گئی تھی کہ اس گھر میں اس کی حیثیت ایک نرس اور آیا کے سوا کچھ نہیں۔“

”آپ بھی اسی کے گن گانے لگی ہیں۔ اب تو اسے واپس نہ لانے کا کوئی جواز نہیں بنتا۔“ وہ تراخ سے بولی۔

”کاش ایسا ہو جائے۔ کاش وہ ہمیں معاف کر کے واپس آجائے، میرے آنگن کو پھولوں کی مہکار سے معطر کر دے۔ اس سونی فضا کو معصوم قہقہوں سے مٹل و مگزار بنا دے۔ مگر ایسا نہیں ہوگا۔ ہم ماں بیٹا کس منہ سے اس کے سامنے اپنی غلطیوں اور کوتاہیوں کا اعتراف کریں گے؟“ ماں آج سچ بولنے پر ٹٹل گئی تھی۔

”آپ ایسی بد کردار عورت کو واپس لانا چاہتی ہیں، جس نے آپ کے داماد کو ورغلا کر بیٹی کا سہاگ چھین لیا۔“ شیریں حیرت و تجسس سے بولی۔

”یہ بھی مجھے شک میں الزام تراشی ہی معلوم ہوتی ہے۔ مجھے تو دونوں ہی ایسے گھٹاؤ نے کردار کے مالک نہیں لگتے۔ اللہ معاف کر دے ہم سب کو۔“ وہ لاپرواہی سے بولیں۔ ”مجھے اس پر رتی بھر یقین نہیں۔ شیریں! تم تو بڑھی لکھی، دنیا کی اونچ نیچ میں پروان چڑھی ہو۔ مگر افسوس کہ پر لے درجے کی ناقابل فہم واقع ہوئی ہو۔ کیا ایک اُن پڑھ اور جاہل عورت تم سے بہتر نہیں ہے، جس نے شوہر کو رنگے ہاتھ پکڑ لیا مگر پردہ پوشی کر کے اپنے گھر کو ڈوبنے سے بچا لیا۔“ ماں نے قدرے خفگی سے کہا۔

”وہ اُن پڑھھی، شوہر کی محتاج تھی۔ پردہ پوشی اور صبر کے سوا اس کے پاس چارہ ہی نہ تھا۔ میں ایسے شوہر کو کیونکر معاف کرتی جو خود اس کی ایک ایک پائی کا محتاج تھا۔ زہر کا گھونٹ پی کر گھر کیسے بچا سکتی تھی؟ ناممکن تھا ماں جی!“ وہ غصے اور دکھ سے بولی۔

”عورت کی تعلیم اور اپنے گھر کی خوشحالی میں اس کا رول اس بات کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ شوہر کو جو مقام باری تعالیٰ نے بخش کر رکھا ہے، اس سے انکار کر کے وہ عزت و شان اپنے لئے منتخب کر لے۔ مجھے تو تمہیں پاؤں پر کھڑا کرنے پر ندامت اور بچھتاؤ کا احساس ہونے لگا ہے۔“ ماں ابھی بھی خفا ہی تھی۔

”ٹھیک ہے ماں جی! میں آپ کے پاس نہیں رہوں گی۔ مجھے اپنے مقام کا احساس دلانے کا بہت بہت شکریہ۔ اور خرم! ہم نے ہاسپٹل کے لئے جو مل کر زمین خریدی ہے، وہ بھی الگ کر دو۔ تم جانو اور تمہارا کام۔ میں سروائیو کر لوں گی ان تمام

لھو کھلے اور خود غرض رشتوں کے بغیر۔“ وہ آخری فیصلہ سنا کر رونے لگی۔

”اگر تم ایسا چاہتی ہو تو مجھے اعتراض ہے، نہ ہی انکار کرتا ہوں۔“ خرم نے برجستہ جواب دیا۔ ”پیسہ تو ویسے بھی رشتوں میں نفرت کی دراڑ ڈال دیتا ہے۔ مجھے تمہارا آئیڈیا پسند آیا۔“

”لیکن یاد رکھو، حدیقہ اب اس گھر میں نہیں آئے گی۔“ وہ مستحکم لہجے میں بولی۔ ”اس نے میرا ہارون مجھ سے چھینا ہے۔ اس جھوٹن کو گلے لگانے سے پہلے سوچ لینا کہ یہ دنیا، یہ برادری اور خاندان تمہاری بے غیرتی اور بے شرمی پر ہراساں ہو کر، پریشان ہو کر تم پر تھو کے گا۔ اور حدیقہ کے سپنے کبھی پورے نہ ہوں گے۔ یاد رکھیں یہ بات کہ نسلیں مٹ جاتی ہیں مگر ایسی داستانیں ہمیشہ زندہ جاوید رہتی ہیں۔“

”مجھے نصیحت کرنے سے پہلے یہ سوچ لو کہ تم مجھ سے کنارہ کشی اختیار کرنا چاہتی ہو۔ مجھ سے الگ ہونے کی خواہش کا اظہار تمہاری طرف سے ہوا ہے۔“

”اب میں جیوں یا مردوں، تمہیں اس سے کیا مطلب؟ تم محض اپنے بارے میں سوچو۔“ خرم کے لہجے میں ناراضگی تھی۔

”کنارہ کشی کا راستہ دکھانے والا کون ہے؟ تم اور تمہاری ماں جی۔ تو کیا کروں، مجبوری ہے میری۔ میرے پاس نیشٹلی ہے، واپس چلی جاؤں گی۔ اور اتنے ڈالر زکما کر لاؤں گی کہ اس شہر کا سب سے بڑا ہسپتال میرا ہو گا۔“ وہ ہمت و حوصلے سے بولی تو خرم اس کا منہ دیکھتا رہ گیا۔ کیونکہ ایسا خواب تو ان دونوں نے مل کر دیکھا تھا۔

رات بھر وہ سو نہ سکا۔ کیونکہ وہ ہسپتال کی خریدی ہوئی زمین کی تقسیم کرنے کے حق میں ہرگز نہ تھا۔ اس کے پاس اتنا پیسہ نہیں تھا کہ وہ شیریں کو فارغ کر سکتا۔ عجیب ہی مخمضے میں گھرے ہوئے کر دہائیں بدلتے رات گزار دی مگر کوئی فیصلہ نہ کر پایا۔

صبح ناشتہ کئے بغیر وہ ہسپتال چلا گیا۔ وہاں بھی اس کی بے چینی اس کے چہرے اور حرکتوں سے عیاں ہو رہی تھی۔ اس کی سینئر ڈاکٹر طوبیٰ نے وجہ دریافت کی تو وہ جواب نہ دے سکا۔ مگر اس کی ہمدردانہ اور مخلصانہ آواز کے اُتار چڑھاؤ میں کھوسا گیا۔ وہ اپنے دل کا حال کسی سے شیئر کر کے مشورہ لینا چاہتا تھا۔ ماں کو وہ اس قابل سمجھتا نہ تھا۔ شیریں سے ویسے بھی دل کھٹا ہو چکا تھا۔ اپنے حقیقی ساتھی سے کنارہ کشی اور ناراضگی زوروں پر تھی۔ وہ کس کے پاس جاتا؟ ہر انسان کو مسرت و الم کے لئے ایک سہارا چاہئے ہوتا ہے جس سے وہ محروم تھا۔ اس میں اس کی اپنی نالائقی، ہٹ دھرمی

اور نادانی تھی کہ وہ تمام رشتوں کو حقیقی اور اصلی مقام دینے میں ناکام رہا تھا۔ وہی بہن جو اس کی آنکھ کا تارا تھی، دل کا سہارا اور روح کی غذا تھی۔ اس سے بدظن ہو کر اس سے علیحدگی کا مطالبہ کرنے لگی تھی اور اس کا وطیرہ اور سلوک اور رویہ بھی سب کچھ کھونے کے بعد بہن سے بدل چکا تھا۔ بہن سے اُن بیلنسڈ پیار سے احساسِ زیاں کا پیا نہ اتنا لبریز ہو چکا تھا کہ اب ہر بار معمولی گفتگو کا انجام لڑائی بھگڑے پر ہوتا۔ اور کئی جہتے اس کی زد میں آ جاتے تھے۔ ماں کے سرد رویے اور بیٹے کی طرف داری سے بیٹی میں اشتعال انگیزی بھر گئی تھی۔ کہاں بیٹی آسمان کا روشن ستارہ اور ان کی روح رواں اور اب اُس کی یہ حیثیت۔ وہ سچ مچ واپس جانے کا سوچنے لگی تھی۔ جہاں وہ تنہا اور باعزت زندگی گزار سکتی تھی۔ وہاں رہ کر بچوں کے مستقبل سنوار کر سرخروئی حاصل کرنا مشکل نہ تھا۔ اور پھر وہاں بچے باپ کے سائے میں اس کا پیار و ڈالر لے کر ایک مکمل اور کامیاب انسان بن سکتے تھے۔ کیونکہ بہن کی چپقلش میں بچے خرم کی توجہ اور محبت سے محروم ہو چکے تھے۔ جس کے نتیجے میں ان بچوں کے بگڑنے کے چانسز نمایاں تھے۔ وہ اپنے طور پر جانے کی تیاری کرنے لگی۔

ڈاکٹر طوبیٰ نے بھی خرم کو یہی مشورہ دیا کہ وہ اسے آزاد و خود مختار ہونے پر بھرپور خوشی کا اظہار کر کے اسکی دلی کدورتوں اور نفرتوں کو کم کرنے کی کوشش کرے۔ مگر خرم کی کوشش کے باوجود شیریں نے بھائی کو معاف کیا، نہ ہی ماں کی سنی۔ ماں اپنی جگہ اپنی اولاد کے اس بٹوارے پر بے حد آزرده ہو کر رہ گئی تھی۔ دونوں اپنی منطق جھاڑتے ہوئے ماں کی بولتی بند کر دیتے۔ اور اپنے ارادوں پر مستحکم و پائیدار رہتے۔



”ڈاکٹر طوبیٰ! اس ویک اینڈ پر کوئی آؤٹ ڈور پروگرام بنانا کیسا رہے گا؟“ خرم نے اس کے سامنے بیٹھتے ہوئے کہا۔ ڈاکٹر کی زندگی میں چھٹی کا تصور گناہِ کبیرہ کیوں ہے؟ کیا ہم انسان نہیں ہیں؟“

”ہمارے پروفیشن کی ڈیمانڈ یہ ہے کہ ڈاکٹر کو مریض کی لائف بچانے میں کسی قسم کے آرام، نیند اور عیش و عشرت کو اولیت نہیں دینی چاہئے۔ دوسروں کی زندگی کو فوقیت دینا ہی تو عبادت ہے۔“ وہ بہت نرمی سے بولی۔

”آپ نے سچ کہا۔ اب سمجھ آئی کہ آپ نے کبھی شادی کے بارے میں سوچنے کی ضرورت محسوس کیوں نہیں کی؟“ وہ مسکرا دیا۔

”میری شادی میرے اس پروفیشن سے ہو چکی ہے۔ دوسرا میں شادی کے جھیلوں کے قابل نہیں ہوں۔ میں اپنے لئے سکون اور خوشی خدمتِ خلق سے حاصل کرتی ہوں، بس۔“ وہ بھی مسکراتے ہوئے بولی۔

”میں نے آپ کی اس بات پر عمل کیا ہے کہ لوگ تو پاہنج، محتاج و مفلس لوگوں کی خدمت کر کے ثواب حاصل کرتے ہیں۔ شیریں! تو میری بہن ہے، اس کے بچے میری ذمہ داری ہیں۔ میرا خود غرضی، بے مروتی اور خود پرستی کی دنیا سے نکلنے کا کریڈٹ آپ کو جاتا ہے۔ بے شک شیریں کا دل میں صاف نہیں کر سکا لیکن اس کا سہارا ضرور بن گیا ہوں۔“ وہ تشکر آمیز لہجے میں بولا۔

”اسی میں سکون اور زندگی کی کامیابیوں کا راز پنہاں ہے۔“ وہ لمبا سانس لیتے ہوئے بولی۔ ”آپ شیریں اور بچوں کے ساتھ اپنا پروگرام بنائیں۔ میں تو دن رات ڈیوٹی پر رہ کر مطمئن رہتی ہوں۔ ورنہ بے قرار اور مضطرب ہوتی ہوں۔“

”کیا آپ کو اپنی زندگی میں مسرتوں اور شادمانیوں کی چاشنی بھرنے کا کوئی حق نہیں؟“ خرم نے پیار بھرے لہجے میں کہا۔

”یہ حق اس دن مجھ سے چھن گیا تھا، جس دن میری ماں ڈاکٹر کی دیری، لاپرواہی اور بے توجہی کی وجہ سے خالقِ حقیقی سے جا ملی تھی۔ تب سے میں نے اپنی زندگی کا ہر لمحہ اور ہر دھڑکن ان مریضوں کے نام کر دی جو بے وقت ہاسپٹل میں اپنی زندگی کی بھیک مانگتے پہنچ جاتے ہیں۔ میں نے اس دن کے بعد ان کے دامن کو اس نعمت سے بھرنے کی کوشش کی ہے۔ آگے رضا میرے مالک کی۔ وہ جو فیصلہ کرے، سر تسلیم خم ہے۔“ وہ نہایت عاجزی سے بولی تو وہ لا جواب ہو کر رہ گیا۔

”شادی کی بہتر سے بہتر جہتجو میں سرگرداں رہنا، قیمتی زرق برق لباس اور ہیرے جواہرات کی تمنا میں وقت کا زیاں اور اس معاشرے میں اسٹیٹس کو بلند کر کے اپنی حیثیت کو منوانے کا جذبہ شوق میرے لئے سب سے بے کار و بے معنی ہے۔ میں اس ریس میں شامل ہو کر اپنے اطمینانِ قلب کو تیاگ نہیں کرنا چاہتی۔ میں خواہش کرتی ہوں کہ میرے اس ظاہری خُسن کے پیچھے میرا باطنی جمال ابدی اور لازوال رہے۔ کہیں اس میں جھوٹ و فریب کی آمیزش نہ ہو جائے۔ اپنی نظروں سے گرا ہوا انسان کبھی اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے کی سکت نہیں رکھتا۔ بھلا میں آپ کو یہ تمام باتیں کیوں سمجھا رہی ہوں؟ شاید اس لئے کہ میں نے آپ کو بظاہر بہت خستہ، سینس اسیبل اور

اوئیٹ پایا ہے۔ دل کیا ہے؟ کس دنیا کا باسی ہے؟ اس سے خدا تعالیٰ کی ذات ہی آشنا ہے۔“

وہ یہ کہہ کر خاموش ہو گئی۔ خرم کے کانوں میں اس ہاسپٹل میں کام کرنے والے ڈاکٹرز، نرسز اور ڈاکٹر ایاز کے گفتگوں گونجنے لگے کہ ڈاکٹر طوبی کا نہ گھر نہ باہر اور نہ ہی خاندان ہے۔ اس کے دن بھر ہاسپٹل میں آن ڈیوٹی رہنے کا کیا جواز بنتا ہے؟ نہ جانے کس ٹریجڈی کی ماری ہوئی عورت ہے کہ زندگی کے کسی پہلو میں نہ انٹرسٹ ہے، نہ ہی کیریئر میں آگے بڑھنے کی کوشش ہے۔ پھر بھی خدا تعالیٰ نے اسے اپنی ہر خوب صورت نعمت سے نوازا ہے۔ آج تک اس کے چہرے پر کبھی پریشانی کے آثار نظر نہیں آئے۔ رویے میں کبھی درستی نہیں پائی گئی۔ کوئی بھی اس کے بارے میں نہ جانتا تھا، نہ ہی کریدنے کی ہمت کر سکتا تھا۔ مگر آج خرم میں ایسی کیا بات نظر آ گئی کہ وہ اس سے دل کی باتیں کرنے لگی۔

”آپ سنڈے کا برنچ میری چھوٹی سی فیملی کے ساتھ تناول فرمانے میں سکی محسوس تو نہیں کریں گے؟ اس کے بارے میں کیا خیال ہے؟“ وہ اس کی خاموشی کو توڑنا چاہتا تھا۔

”خیال برا نہیں۔“ وہ مسکرا دی۔ ”مگر مجھے دوسروں کے گھروں میں جانا پسند نہیں۔“

”میں دوسرا نہیں ڈاکٹر طوبی! آپ تو میری راہبر ہیں۔ خاردار راہوں سے ہٹا کر راہ راست دکھانے والی۔ آپ نے تو مجھے ہر مشکل سے نکال کر میری زندگی کو پرسکون بنا دیا ہے۔ میرے وجود سے نفرت و حقارت کے بوئے تمام بیج آپ نے چُن چُن کر نکال دیئے ہیں۔“ وہ اتنی ملائمت سے بول رہا تھا کہ وہ تہقہہ لگا کر بولی۔

”بعض اوقات انسان اپنی خصلتوں کو جانتے ہوئے بھی چشم پوشی سے کام لے کر ہر طرح کے گٹ سے نجات پانے کی ناکام کوشش ضرور کرتا ہے۔ آپ کا بھی یہی مسئلہ ہے۔“

”مثلاً؟“ وہ حیرت و تجسس سے بولا۔

”حدیقہ کے لئے جو نفرت آپ کے اندر سرایت کر رہی ہے، میں اسے بتدریج بڑھتا ہی دیکھ رہی ہوں۔ آپ یہ تو مانیں کہ میں آپ سے دس سال بڑی بھی ہوں اور زندگی کا کسی اور نظر سے موازنہ بھی کرتی ہوں۔“ وہ سنجیدگی سے بولی۔

”جی، بالکل درست۔“ اس نے بھی سنجیدگی سے اثبات میں سر ہلایا۔
 ”حدیقہ کو منانے کی کوشش کریں۔ ایک آواز پر دوڑی چلی آئے گی۔“
 اُس کے سر پر جیسے کسی نے ہتھوڑا مار دیا ہو۔

”یہ نہیں ہو سکتا ڈاکٹر طوبی! وہ میرے بہنوئی کے ساتھ رہ رہی ہے، مجھے اس کے کردار پر شک نہیں، یقین ہے۔“

”اے معاف کرنے کا ذائقہ کس قدر شیریں ہو گا، کبھی چکھ کر تو دیکھیں۔ وہ دنیا اس دنیا سے بہت مختلف ہے۔ حسین و جمیل اور مسکراہٹوں اور قہقہوں سے لبریز۔ کیا آپ ایسی جنت میں رہنا پسند نہیں کریں گے؟“ وہ جھومتے ہوئے بولی۔

”ڈاکٹر طوبی! آپ نہ جانے کس فینٹسی میں رہتی ہیں۔ آپ کا اس دنیا میں کیا کام؟ جانیے، اللہ کے دربار میں فرشتوں اور حوروں کے مقام پر رہنا آپ کو زیب دیتا ہے۔“ وہ حیرت سے بولا۔

”ہم اس دنیا کو بھی جنت الفردوس بنا سکتے ہیں۔ اپنی سوچ سے، اپنی نیک نیتی اور بے لوث خلوص و چاہ سے۔“ وہ ہنستے ہوئے بولی۔ ”ذرا میری دنیا میں جھانک کر تو دیکھیں۔“

وہ لا جواب ہو کر اسے دیکھنے لگا۔

”انسان اور شیطان دونوں ایک دوسرے کے ہم پیالہ و ہم نوالہ ضرور ہیں، مگر ان کو ہماری ذات کے کھنڈرات میں ان کے دوستانہ رشتے کو مدفن کرنا مشکل ہرگز نہیں۔ انسانیت، شیطانیہ پر حاوی ہو کر رہتی ہے۔ یہ میرا اپنا تجربہ ہے۔ آپ نیت کریں، ارادہ باندھیں، اللہ تعالیٰ آپ کا وسیلہ بن جائے گا۔ ذرا سوچ کر تو دیکھیں، حدیقہ آپ کے لئے رحمت کا فرشتہ بن کر زندگی کو صوفشاں کر دے گی۔“ اس کے لہجے میں بلا کی پائیداری تھی۔

”اگر آپ برا نہ منائیں تو ایک عرض کروں؟“ وہ سوچتے ہوئے بولا۔

”ضرور..... فرمائیے۔“ وہ ملائمت سے بولی۔

”مجھے اپنی زندگی کو منور کرنے میں حدیقہ کی نہیں، آپ کی شراکت کی ضرورت ہے۔ میں اس دنیا میں بہشت کا مزہ چکھنا چاہتا ہوں۔ نیک اور ہر لالچ سے بے بہرہ بیوی کا ساتھ مجھے اس نعمت کے قریب کر سکتا ہے۔“ وہ ہچکچاتے ہوئے بولا۔
 ”درست فرمایا۔“ وہ چونکنے کے بجائے مسکرا دی۔

”آپ کو برا تو نہیں لگایہ پر پوزل؟“ وہ حیران و پریشان ہو گیا۔
 ”ہرگز نہیں۔ کیونکہ یہ نئی بات تو ہے نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے مرد کو خاص الخاص مٹی سے بنا کر اس میں جب روح پھونکی تو دنیا اس کے لئے وسیع و عریض کر دی۔ وہ جب چاہے، جہاں چاہے آجا سکتا ہے۔ اس کے لئے نہ وقت مقرر ہے، نہ ہی شرط۔ لیکن معمولی سا اختیار ہمیں بھی بخشا گیا ہے، اقرار یا انکار کا۔“ وہ ابھی بھی بے حد پُر تسکین تھی۔

”جی۔“ وہ سر ہلا کر رہ گیا۔ وہ اسے حیرت سے دیکھنے لگی۔
 ”ذرا اچھی طرح سے سوچ لیجئے۔ حدیقہ آپ سے دس سال چھوٹی اور ڈاکٹر طوبی دس سال بڑی ہے۔ کیمسٹری میں بے پناہ تضاد نا کامی و شکست کا سبب بنا کرتا ہے۔“ وہ اطمینان سے بولی۔
 ”لیکن آپ نے مجھے کنسیڈر تو کیا۔ تھینک یو دیری مچ۔“ وہ خوشی کا اظہار کرتے ہوئے بولا۔

”اب آپ کہئے کہ میں آپ کے لئے آسمان سے تارے توڑ لاؤں گا، چاند سے مانگ بھر دوں گا۔ ہر رشتے کو چھوڑ کر فقط تمہارا بن جاؤں گا۔ مسرتوں اور شادمانیوں سے دامن بھر دوں گا، وغیرہ وغیرہ۔“ وہ ہنستے ہوئے بولی۔
 ”آپ کو میرے ان کلمات کی قطعاً ضرورت نہیں۔“ وہ اس کے طنزیہ انداز کو نظر انداز کرتے ہوئے بولا۔ ”آئی لو یو فار دیٹ۔“

”جناب! میں تو بے حد معمولی شکل و صورت اور سادگی کو فوقیت دینے والی عورت ہوں۔ مرد ایسی عورتوں سے دور بھاگتے ہیں۔ آپ کو نہ جانے کون سا عارضہ لاحق ہو گیا ہے کہ ہوش و خرد کی دنیا سے دستبردار ہو گئے ہیں۔“ وہ ہنسے جا رہی تھی۔
 ”میں مکمل طور پر ہوش میں ہوں۔“ وہ بھی مسکرا دیا۔

”آپ کے ساتھ اماں لگوں گی۔ یہ دیکھیں، میرے بالوں میں چاندی کے جگمگاتے تار میری عمر اور بے پردائی کی سرگزشت پیش کرنے کو کافی ہیں۔“ وہ مضحکہ خیز لہجے میں بولی۔

”سب جانتا ہوں۔“ وہ مسکرایا۔
 ”کل آپ کی ڈیمانڈز اور ہوں گی۔“ وہ قدرے سنجیدگی سے بولی۔
 ”میں سمجھا نہیں۔“ وہ حیرت سے بولا۔

”میرا مطلب ہے کل آپ فرمائیں گے شوہر کی زبان میں، بال ڈائی اور خوبصورتی سے کئے ہونے چاہئیں۔ لباس سٹائلش اور ڈیزائنز ہونا چاہئے۔ جیولری ان اور جوتا پرس بے مثال اور فیشن ایبل ہونا چاہئے۔ یہ ہونا چاہئے، وہ ہونا چاہئے، جس کی گردان سننے سننے میں اپنی زندگی کی اصل اور سچی حقیقت کو یکسر فراموش کر دوں گی۔“ وہ بے حد تسلی بخش لہجے میں بولے جا رہی تھی۔

”کچھ نہیں کہوں گا۔“ وہ آہستگی سے بولا۔

”خواتنواہ ایک آؤٹ ڈیوڈ، ڈل ایجنڈ عورت سے شادی کر کے اپنا تمسخر اڑانے پر کیوں ٹل گئے ہیں؟ اٹ ایز رو کہ ہماری عورتوں نے اور کچھ سیکھا ہے یا نہیں، فیشن میں ان رہنے میں مہارت ضرور حاصل کی ہے۔ بد قسمتی ہے عورت کی کہ اپنے مقام کو بھول کر ڈیکوریشن پیس بن گئی۔ میں تمہاری اس دنیا میں مس فٹ ہوں۔“ وہ ایک دم سے افسردہ ہو گئی۔

”مجھے پروا نہیں۔“ وہ مستحکم لہجے میں بولا۔

”بات حال کی نہیں، آنے والے کل کی کر رہی ہوں۔“ وہ نرمی سے بولی۔

”وعدہ کرتا ہوں۔“ وہ سنجیدہ تھا۔

”وہ وعدہ ہی کیا جو ایفا ہو گیا۔“ وہ قہقہہ لگا اٹھی تھی۔

”آپ کو میری کسی بات پر یقین کیوں نہیں؟ جسٹ بی لیوی۔“ وہ شرمندہ سا ہو گیا۔

”آپ کے ادا کردہ ایک ایک لفظ پر دس فیصدی بھروسہ ہے۔ حالات اور رمانے کے بدلتے رنگوں پر اعتماد نہیں۔“ وہ سنجیدگی سے بولی۔ ”یہی اچھے انسانوں کو بدل دیتے ہیں۔“

”کیا آپ کے ساتھ حالات نے فریب اور دھوکے سے کام لیا ہے؟“ وہ تذبذب سے بولا۔

”ہرگز نہیں۔ میری جنت میں حالات کا کوئی دخل نہیں خرم! دوسرے لوگوں کی زندگیوں کو بے حد گہرائی سے پرکھا ہے۔ بد قسمتی سے سب ہوش و حواس میں، سراب کی دنیا میں رہنا چاہتے ہیں۔ خود کو بے وقوف بنا کر امید و بیم کے سہارے زندگی بیتانا چاہتے ہیں۔ جب ہمت اور حوصلہ جواب دے جاتا ہے، برداشت کی سکت رخصت ہو جاتی ہے تو پھر بھیانک نتائج کو سینے سے لگا کر باقی ماندہ زندگی بے بسی، لاچارگی اور

پچھتاؤں میں گزار دیتے ہیں۔ ڈاکٹر خرم! میں نے لوگوں کی احمقانہ حرکتوں اور بے وقوفانہ باتوں سے درسِ زیست سیکھا ہے۔“ وہ سمجھانے کے انداز میں بولی۔
 ”یعنی بات جہاں سے شروع ہوئی تھی، وہیں پر ختم سمجھوں؟“ وہ مضطرب سا ہو گیا۔

”میرا بھی یہی خیال ہے۔“ ہلکی سی مسکان اس کے لبوں پر پھیل گئی۔
 ”آپ بتا دیجئے کہ بات کو آگے کیسے بڑھایا جائے؟“ وہ نادم سا ہو گیا۔
 ”بے جوڑ رشتے تباہی و بربادی کو صدائیں دیتے ہیں۔ آپ مستقبل میں رہ کر سوچیں اور پھر فیصلہ کریں۔“ وہ سمجھانے لگی۔

”میں نے بارہا آپ کے بارے میں سوچا ہے۔ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی عمر میں فرق کے باوجود کتنی گہری انڈر سٹینڈنگ تھی۔“ وہ پیار سے بولا۔

”وہ رسولِ خدا تھے۔“ وہ عقیدت سے بولی۔ اور حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا ان کی لاڈلی بیوی تھیں۔“

”میں انہی کو گواہ بنا کر آپ سے وعدہ کرتا ہوں کہ میں نے جس حال میں آپ سے پیار کیا ہے، وہ ہمیشہ قائم و دائم رہے گا۔“ وہ بھی احتراماً بولا۔

”اتنی بڑی بات اتنی آسانی سے کہہ دی آپ نے۔“ وہ سر پکڑ کر بیٹھ گئی۔
 ”اور میں اس پاک ذات کو حاضر و ناظر جان کر وعدہ کرتا ہوں۔“ وہ پھر گویا ہوا۔
 ”خدا کے لئے چپ ہو جائیے۔“ وہ سر پکڑے بیٹھی تھی۔

”مجھے اس پاک اور مقدس کتاب کی قسم! میں آپ سے نباہنے کا وعدہ کرتا ہوں۔
 تاحیات اور مرتے دم تک۔“ خرم نے دراز سے قرآن نکال کر سینے سے لگا کر کہا۔

”آپ یہاں سے چلے جائیں۔“ وہ تقریباً چیخ اُٹھی۔
 ”آپ کا فیصلہ سن کر جاؤں گا۔“ وہ بچوں کی طرح ضد کرتے ہوئے بولا۔

ایک طویل توقف کے بعد وہ بولی۔

”مجھے سوچنے کا حق تو حاصل ہے نا؟“

”بالکل..... ہزار ہا دفعہ۔ میں آپ کا یہ حق چھیننا نہیں چاہتا۔“ وہ تشکر آمیز لہجے

میں بولا۔

”آپ ایک بار پھر سوچ لیں کہ کہیں آپ کے فیصلے میں جذبات کا ہاتھ تو نہیں؟“

”ہرگز نہیں۔ مجھے اپنی اولاد، اپنی نسل ایک ایسی عورت کے بطن سے چلانے کی ضرورت ہے جو حدیثہ نہیں، آپ جیسی لاتعداد خوبیوں کی مالک ہو۔“ وہ اٹل لہجے میں بولا۔

”اگر اولاد نصیب میں نہ ہوئی تو مجھے چھوڑ کر تیسری شادی رچالی جائے گی۔“ وہ تہقہہ لگا اٹھی۔

”ہرگز نہیں۔ مجھے ہمیشہ راضی برضا پائیں گی۔“ وہ بنجیدگی سے بولا۔

”اس وقت مجھے اکیلا چھوڑ دیجئے۔“ وہ اس سے مزید باتیں نہیں کرنا چاہ رہی تھی۔ وہ بھی سمجھ گیا اور اٹھ کر باہر چلا گیا۔

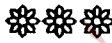
وہ سوچتا ہوا گھر پہنچ گیا۔

ڈاکٹر طوبی کی عمر چالیس سال کے گیزے میں تھی۔ گوکہ وہ اپنی چال ڈھال سے بہت چھوٹی معلوم ہوتی تھی۔ دھان پان سی، سانولے رنگ اور پُرسکون چہرے اور چمکتی ہوئی آنکھوں والی طوبی کی انتہا کی سادگی میں اپنی معصومیت اور نزاکت برقرار رکھے ہوئے تھی۔ ہر ایک کے کام آتا اس کا مشغلہ تھا لیکن خود دوسروں پر توقعات وابستہ کرتی، نہ ہی کسی کی محتاجی محسوس کرتی۔ خرم ایک سال سے اس کے کام کر رہا تھا۔ عورتوں میں ایسی بیلنسڈ پرسنلٹی کا فقدان عام تھا۔ اس کا بل میں تولہ اور بل میں ماشہ ہونے والی عورتوں سے واسطہ ہر وقت پڑتا تھا۔ وہ اس کی عام سی شکل و صورت کا شیدائی نہ تھا۔ وہ تو اُس کی سلجھی ہوئی جبلت پر مر مٹا تھا۔ دل میں محبت کا چراغ روشن کرنے کے بجائے اس نے اپنی خواہشوں اور حسرتوں کے مرغزاروں پر عقیدت کے دیے جلائے تھے۔ وہ اسے حاصل کر کے اپنی زندگی سے ہر طرح کا لالچ و طمع اور خود غرضی کو خیر باد کہہ کر اس کے ساتھ پُرسکون زندگی گزارنا چاہتا تھا۔ وہ نفسانفسی اور شوریدہ دنیا کی الجھنوں سے تنگ آچکا تھا۔ اس میں دنیا سے مقابلہ کرنے کی سکت تو پیدائش سے ہی مفقود تھی۔ عمر کے ساتھ یہ کمزوری اور بے ہمتی بڑھتی جا رہی تھی۔ بہن کے سامنے بھی اس نے ایسی چپ سادھ لی تھی کہ جیسے زبان کی گویائی اور سوچنے کو ذہن مفلوج ہو گیا ہو۔

حدیقہ تو دل کے نہاں خانوں سے بھی مفروز ہو چکی تھی۔ یاد کا ہلکا سا جھونکا بھی اس کے قریب سے نہ گزرتا تھا۔ لامحالہ اس نے شادی تو کرنی ہی تھی۔ پھر کیوں نہ ڈاکٹر طوبی کا انتخاب کیا جائے۔ اس کی سوچ کے مطابق طوبی کا حصول بہت انسان

اور سہل تھا۔ مگر یہاں تو معاملہ ہی برعکس نکلا۔ اس کی بڑھتی ہوئی عمر اس بات کی غمازی کر رہی تھی جیسے کسی نے اسے پرپوز ہی نہ کیا ہو۔ مگر ایسا ہرگز نہ تھا۔ وہ اپنی تنہائی کی خود ذمہ دار تھی۔ اس کی ذہنی ساخت، دلی رجحان ہی مختلف تھا۔ مقصدِ حیات میں ہی فرق تھا۔ وہ خرم کی سوچ سے بہت اعلیٰ اور عظیم ثابت ہوئی تھی۔ اس سے گفتگو کے بعد اسے حاصل کرنے کا ارادہ اور بھی مستحکم ہو گیا تھا۔

وہ اکلم بڑھانے، نام کمانے کے مقصد سے ہاسپٹل بنانا چاہتا تھا۔ مگر آج اسے احساس ہوا کہ طوبیٰ کی موجودگی میں تعمیر ہونے والا ہاسپٹل یتیموں اور غریبوں کے جینے کا سہارا بن جائے گا۔ کیا ایسا کرنا اسے منظور بھی ہے یا زبردستی خود پر یہ ارادہ مسلط کر کے طوبیٰ کی گفتگو سے امپریس ہو کر اس کے نقش قدم پر گامزن ہو کر کہیں زمانے سے واہ واہ تو نہیں کرنا چاہتا تھا؟ یا سچ مچ وہ ہر طرح کے لالچ سے عادی ہو کر خدمتِ خلق کے راستے کے چناؤ پر صدقہ جاریہ کا انتظام کر کے اپنی آخرت سنوارنا چاہتا ہے یا یہ نشہ وقتی اور عارضی تھا۔



”خرم! تمہاری کمزوری اور کم عقلی کی وجہ سے میری یہ حالت ہو گئی۔ اس دکھ کو کیسے ہضم کر جاؤں؟ اب تمہاری نئی خواہش کے انکشاف نے میرے پاؤں تلے کی زمین سرکا کر رکھ دی ہے۔ تم نے تو مجھ سے ساتھ نبھانے کا وعدہ کیا تھا۔ مل کر ہاسپٹل بنانے کے منصوبے کا کیا ہوا؟ وہ بھی اپنی ہونے والی نئی ڈاکٹر بیوی کے چرنوں کی نذر ہوتا معلوم ہو رہا ہے۔ تم تو اپنی زندگی سنوارنے کا فیصلہ کر چکے ہو۔ بتاؤ میرا کیا بنے گا؟ مجھے تو تمہاری بیوی اس گھر میں ایک پل کے لئے ٹکنے نہ دے گی۔“ شیریں غم و غصے میں بولے جا رہی تھی۔

”ڈاکٹر طوبیٰ کا چناؤ میں نے تمہیں مد نظر رکھ کر کیا ہے۔ وہ اس دنیا کی مخلوق نہیں ہے شیریں! اس کا بسیرا تو عالم بالا میں ہونا چاہئے تھا۔“ وہ عقیدت بھرے لہجے میں بولا۔

”سب فراڈ ہے خرم! عورت بہت کمپلیسڈ ذات ہے۔ اس کو سمجھنے کے لئے فہم اور دُور اندیشی بھی نا کام ثابت ہوئی ہے۔ اور پھر تم کیسے اس کے بارے میں یہ فیصلہ کر سکتے ہو، جو پہلے بھی ایک عورت کے ہاتھوں بے وقوف بن چکا ہے۔ اب دوسری کے لئے تیاری پکڑے ہوئے ہے۔“ اس کا لہجہ زہر آلود تھا۔

”شیریں! تمہیں مسئلہ کیا ہے؟ ہر وقت سر تا پا آگ بگولہ رہتی ہو۔ ماں جی بھی

سخت تنگ آئی ہوئی ہیں۔“ وہ تاسف بھرے لہجے میں بولا۔ ”مجھے تمہارے دکھوں اور اندیشوں کا اندازہ ہے۔ کیا اس کے علاوہ بھی کچھ ذہن میں چل رہا ہے؟“

”بس تم شادی نہیں کرو گے۔ میرے بچوں کو تم سے باپ کی خوشبو آتی ہے۔“ وہ روہاٹی ہو گئی۔

”میری شادی سے بچوں کے پیار میں کمی آئے گی، نہ ہی توجہ کمپروماز ہوگی۔ میرا تم سے وعدہ ہے شیریں! تمہارا اعتماد اور بھروسہ ہر ایک سے کیوں اٹھ گیا ہے؟ کیوں ہو گئی ہو پیرانا سڈ؟“ وہ پیار بھرے لہجے میں بولا۔ ”میں تمہیں اپنی بہن نہیں، اپنا ہمدرد بھائی، بہترین دوست اور رازداں سمجھتا ہوں۔ پھر مجھے ایسی کڑوی کیلی ہاتیں کہہ کر کیوں ہرٹ کرتی ہو؟ تمہاری جگہ جب حدیقہ نہ لے سکی تو طوبی کیسے کامیاب ہو سکتی ہے؟ جبکہ حدیقہ خوب صورت اور جوان تھی۔ طوبی تصویر کا دوسرا رخ ہے شیریں!“

”تو پھر ایک تاریک اور بھیاںک رخ سے اپنی زندگی کو ناکامیوں کے گھٹا ٹوپ اندھیروں کے سپرد کرنے پر کیوں ٹل گئے ہو؟“ وہ حیرت و تجسس سے بولی۔

”شیریں! مجھے نفرت ہو گئی ہے ایسی لڑکیوں سے جو شادی کو گلیر سمجھ کر کسی قسم کی ذمہ داری اٹھانے کو تیار نہیں ہوتیں۔ ان سے ڈیمانڈ کرو تو انجام تم نے دیکھ ہی لیا ہے، کس سرعت سے چال بدل لیتی ہیں۔ کم از کم طوبی ایسی عورت نہیں۔ وہ ہمارے خاندان کے لئے بہترین ثابت ہو گئی۔ چلو ایسا کرتے ہیں، میں فیصلہ تم پر چھوڑتا ہوں۔ تم ایک بار اس سے مل لو۔“

”ٹھیک ہے۔“ وہ سوچتے ہوئے بولی۔ ”اگر مجھے پسند نہ آئی تو؟“

”اس کی وجوہات بتانا ہوں گی۔“ وہ نرمی سے بولا۔ ”دنیاوی لذتوں اور چاہتوں سے بالکل ہٹ کر۔“

”بالکل۔ میں کل ہی چھٹی کے بعد تمہارے پاس آ جاؤں گی۔“ وہ سنجیدگی سے بولی تو خرم نے اس پر بھرپور ہمدردانہ نظر دوڑائی۔

”تم اجازت نہیں دو گی تو میرا فیصلہ بدل جائے گا۔ لیکن ایک بات پر غور کرنا، تمہاری طرف سے دنگا فساد اور لعن طعن کی شدت مجھے فیصلہ بدلنے پر مجبور کر دے گی۔ پلیز بی فیئر۔ میں صلح کل اور امن پسندی کو فوقیت دینے لگا ہوں۔ مجھے ایسا سب کچھ سننے کی عادت نہیں رہی۔ ہر وقت کی چیقلش کی وجہ سے میں نے حدیقہ سے کنارہ

کشی اختیار تو کر لی لیکن میں خود کو بھی قصور وار ٹھہراتا ہوں۔ میں اپنے رشتوں سے انصاف نہ کر سکا شیریں! ظلم ہو گیا مجھ سے۔ اور دیکھو کہ اب ہمارے درمیان سکون و اطمینان نام کی کوئی شے نہیں رہی۔ تم بھی خود کو بدلنے کی کوشش کرو اور صبر کرنا سیکھو۔

”آئی ایم سوری خرم! دراصل میرے وجود میں غصہ اور نفرت رچ بس گئی ہے جو زبان سے باہر نکلنے کو بے قرار رہتی ہے۔ مجھے معاف کر دو۔ میں نے تم جیسا بھائی اس روئے زمین پر کہیں نہیں دیکھا۔ اس میں کوئی شک نہیں۔ آئی ایم سوکلی۔“ وہ رونے لگی تھی۔

”مجھے تمہارے جیسی بہن بھی تو کہیں نظر نہیں آئی۔“ اس کی آنکھیں بھی بھر آئیں۔ ”پھر ہم کیونکر جھگڑنے لگے ہیں؟ ہمیں ایک دوسرے کی باتیں ناگوار کیوں گزرنے لگی ہیں؟ پہلے تو ہمارا دِل ایسا نہ تھا۔“

”یہ بھی تو پیار کی انتہا ہے خرم! تو قعات ریلیشن شپ کو داغ دار کرنے میں اہم کردار ادا کرتی ہیں۔ فساد کی جڑ ہے احساسِ ملکیت اور تو قعات۔ ان دونوں کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔“ وہ گہری سوچ میں چلی گئی اور خرم اس کی اس منطق پر حیرت سے اس چٹکاری کو بجھتے ہوئے دیکھنے لگا۔ سچ ہی تو تھا کہ محبتوں کے بڑھنے سے تو قعات مضبوطی پکڑتی جاتی ہیں اور ملکیت کا احساس سر چڑھ کر بولنے لگتا ہے۔ آخر اختتام اس قید سے رہائی حاصل کرنے پر ہوتا ہے۔ جبکہ اس آزادی میں بھی نہ لطافت رہتی ہے، نہ ہی خوشی اور سکون۔



”خرم! بچے ابھی تک گھر نہیں پہنچے۔“ ماں جی کی آواز خوف سے لرزش زدہ تھی۔

”آپ فکر نہ کریں۔ ہو سکتا ہے، شیریں نے انہیں لے لیا ہو اور باہر لپچ پر لے گئی ہو۔“ خرم نے تسلی دیتے ہوئے کہا۔

”اگر ایسا ہوتا تو وہ مجھے اطلاع کر دیتی۔ میرا ولی سخت پریشان ہے۔ شیریں کا موبائل بھی آف ہے۔“ وہ سخت فکر مند تھی۔ ”ہارون کی کوئی اطلاع ہے تمہیں؟.....“

کہیں وہ واپس تو نہیں آ گیا؟

”اگر واپس آ گیا ہے تو ہم بچوں کو باپ سے دور رکھنے کی غلطی نہیں کر سکتے۔“ وہ سنجیدگی سے بولا۔

”مگر یہ تو طریقہ نہیں ہے بچوں سے ملنے کا کہ سکول سے ہی لے اڑے۔“ ماں

روہاںسی ہو گئی۔

”ماں جی! آپ حوصلہ رکھیں۔ جب سے بچے پاکستان آئے ہیں، ددھیال میں انہیں جھانکنے کی اجازت تک نہ تھی۔ ان کی دادی اس غم و دکھ میں بیمار پڑ گئی تھی مگر شیریں کے دل میں معمولی سی نرمی تک نہ آئی۔ اڑوس پڑوس کی منت سماجت اور لعن طعن کا بھی ہم پر رتی بھرا اثر نہ ہوا۔ اب اگر ان کا باپ انہیں لے گیا ہے تو اس میں قصور ہم سب کا ہے۔ ہم نے خود ہی تو انہیں ایسا کرنے پر مجبور کر دیا ہے۔“ وہ کھری کھری سنارہا تھا۔ کیونکہ اندر کا ضمیر جو بیدار ہو چکا تھا۔

”اس مسئلے کا حل سوچو۔ اس قسم کی باتیں کرنے کا وقت نہیں ہے۔ شیریں کا پتہ کرو۔ اس کا موبائل آف کیوں ہے؟“ ماں بے قراری سے بولی۔

”ہو سکتا ہے، شیریں آپریشن ٹھیٹر میں ہو۔ آپ دعا کریں۔ میں خود سکول جا کر معلوم کرتا ہوں کہ بچوں کو ہمارے بغیر کسی کو لے جانے کی اجازت نہیں تھی۔“ وہ بھی فکر مند ہو گیا۔

”آپ ماسی کو مخبری کے لئے بھیجیں۔ ابھی اور اسی وقت تمام حالات پتہ چل جائیں گے۔ کم از کم سب کو تسلی تو ہو جائے گی کہ وہ سیف ہینڈز میں ہیں۔“

”ہاں، یہ ٹھیک کہا ہے تم نے۔ میں ابھی معلوم کروا لیتی ہوں کہ ہارون نے یہ حرکت کی ہے یا اس کی بڑھیا ماں نے کیننگی دکھائی ہے۔ بھلا کوئی ماں سے بچے یوں بھی چھین سکتا ہے۔“ اس نے تیزی سے فون بند کر دیا۔

تھوڑی ہی دیر بعد تمام ماجرا کھل کر سامنے آ گیا۔ ہارون تو واپس نہیں آیا تھا، امریکہ سے اس کا بڑا بھائی اور بہن بمعہ اہل و عیال کے آئے ہوئے تھے۔ غالباً یہ نازیبا حرکت انہی کی معلوم ہو رہی تھی۔

فوراً شیریں کو حالات سے مطلع کیا گیا تو وہ سیدھی سرسرا چلی گئی۔ بچے، ماں کو دیکھ کر بھاگتے ہوئے اس کی ٹانگوں سے لپٹ گئے۔ ساس اور نند کے سامنے اس نے انتہائی صبر کا مظاہرہ کیا۔ جیٹھ کو بھی برا بھلا کہنے کے بجائے بہت سمجھ داری سے کام لیا۔ بچے ڈھیروں تحفوں کے ساتھ ماں کے ہمراہ واپس آ گئے۔ اب وہ روزانہ اپنے کزنز سے کھیلنے کے لئے بھند ہونے لگے۔ مگر شیریں انہیں وہاں جانے کی اجازت نہ دیتی اور سکول میں گارڈز اور آیاؤں کی وہ شامت آئی کہ آئندہ کے لئے بچوں کو ملنے کے تمام گرنا کام ثابت ہونے لگے۔

اب شیریں کو دھڑکا تو لگ ہی گیا تھا، راتوں کی نیندیں بھی رخصت ہو گئیں۔ ہر آہٹ پر وہ چوٹک جاتی، جیسے ہارون نے اس کے ہاتھ سے تمام متاع حیات چھین کر اسے بے دست و پا کر دیا ہو۔ ڈاکٹر طوبی سے ملتا تو درکنار، اس کا ذکر تک زبان پر لانا ذہن کے نہاں خانوں میں جا چھپا۔

سوچ بچار کے بعد وہ واپس جانے کی تیاری کرنے لگی۔ تاکہ اس کے بچے مغربی تہذیب کے قانون کے مطابق اس کے پاس مکمل آزادی سے زندگی گزار سکیں۔ اور دوسرا سب سے بڑا فائدہ یہ تھا کہ وہ ہارون کے پیسے میں آدھے حصے کی مالک بن سکتی تھی۔ ہارون تعلیم یافتہ باپ ہونے کے ساتھ بے حد پیار کرنے والا انسان بھی تھا۔ بے روزگاری اور بے کاری کا خاتمہ اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں تھا۔ کسی ذی روح پر وقت ایک جیسا نہیں رہتا۔ دھوپ کے سائے کی مانند ڈھل کر اپنا مقام بدلنا اس کی فطرت ہے۔ یہ خبر سب کے لئے خاصی دھماکہ خیز تھی کہ وہ کسی کمپنی میں کام کر رہا ہے۔ اور حدیقہ عام شام اس کے ساتھ نظر آیا کرتی ہے۔ وہ اس کے ساتھ رہ رہی تھی۔ اور ان کی آپس میں کیا مناسبت و موافقت تھی، اس کا کسی کو علم نہ تھا۔ لیکن دیسی کمیونی میں انہیں باعزت نظروں سے دیکھنا تو درکنار، کوئی بات کرنا بھی گوارا نہ کرتا تھا۔

خرم نے بھی اسے سرسری طور پر روکنے کی کوشش کی۔ جب اس نے محسوس کیا کہ شیریں حتمی فیصلہ کر چکی ہے، وہ خود ڈاکٹر ہونے کے ساتھ کینیڈین نیشنلٹی ہولڈر بھی ہے، پھر وہ ان خطرات اور ناسازگار فضا میں رہ کر اپنے بچوں کی شخصیت کو کیونکر تباہ و برباد کرے؟ بھائی سے جو پیار تھا، وہ بھی جھاگ کی مانند غائب ہو گیا تھا۔ ماں سے بھی شکوے و شکایتیں زوروں پر تھیں۔ خرم بھی شادی کر۔ نے کے چکروں میں تھا۔ سسرال کی جانب سے بھی بچوں کو حاصل کرنے کے تمام ہتھکڑے استعمال ہونے لگے تھے۔ کس کے سہارے وہ اس معاشرے میں سانس لے سکتی تھی؟ اس معاشرے کے قانون یا پالیسی میں عورت اس مقام پر کھڑی تھی، جہاں نہ تو اس کے لئے انصاف تھا اور نہ ہی رحم و ترس تھا، نہ ہی ہمدردی تھی۔ وہ تو اس معاشرے کی باسی تھی، جہاں عورت ریپ ہو جائے تو قید و بند کی صعوبتیں اسے برداشت کرنی پڑتی ہیں۔ جیل کی سلاخوں سے باہر نکل آئے تو نفرت انگیز رویے سے ہر غنڈہ اس پر اجارہ داری جمانے کا سزاوار قرار دے دیا جاتا ہے۔ اور والدین ایسے کنارہ کشی اختیار کر لیتے ہیں جیسے انہوں نے اس کو جنم ہی نہ دیا تھا۔

ماشرے کی اس تاریک اور گھٹاؤنی شکل و صورت کو سمجھتے ہوئے اس نے پرائے اس لی پرانی تہذیب و تمدن اور پرانی عمرانیات کو قبول کرتے ہوئے یہاں سے اہاٹل ہونے میں اپنی عافیت سمجھی۔

وہ اپنے معصوم بچوں کو فقط اپنے ہی پروں تلے محفوظ رکھ کر دوسروں کی دخل اندازی سے کنارہ کشی اختیار کرنے کی سوچ سے ہی پُر تسکین ہو گئی تھی۔ جبکہ ماں دہائی دے رہی تھی کہ وہ بچوں کو اکیلے پردان کیسے چڑھائے گی؟ کیونکہ بچہ، ماں کی نظر میں کبھی بڑا نہیں ہوتا، ہمیشہ ناسمجھ اور سہارے کی ضرورت کا محتاج گردانا جاتا ہے۔ ماں اپنی جگہ درست تھی۔



”ہارون! ہے تو گولڈن چانس۔ اگر ہم دونوں اس کا فائدہ اٹھا سکتے ہیں تو اس میں ہرج ہی کیا ہے؟ رنگ کپنی ہے، خسارے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ بس ذرا ہمت کی ضرورت ہے۔ مانا کہ چھلانگ بہت اونچی ہے۔“ حدیقہ نے گہری سوچ بچار کے بعد ہارون کو مشورہ دیا۔

”تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔ اتنی بڑی رقم کا انتظام کرنا کوئی مذاق تو ہے نہیں۔“ وہ اس کے چہرے پر نظریں دوڑاتے ہوئے بولا۔

”نا اُمیدی کفر ہے۔ ہم دونوں مل کر پیسوں کا انتظام کریں گے تو کچھ نہ کچھ ہو جائے گا۔ آپ کو علم ہے کہ بڑے بڑے کاموں میں اللہ تعالیٰ رُوئے زمین پر بذات خود اُتر کر اپنے بندوں کی امداد کو پہنچتے ہیں۔ نیت باندھنا ہمارا کام ہے، آگے باری تعالیٰ پر چھوڑ دیں۔ اس میں ہمارا نہ تو دخل ہے، نہ ہی اتنا بڑا حوصلہ ہے کہ کچھ کر گزریں۔“ وہ تسلی دیتے ہوئے بولی۔

”میں نے بھیا اور اماں جی سے رقم کے بارے میں بات تو کی ہے، ان کی طرف سے مالی اور اموشل سپورٹ کی کمی تو ہرگز نہیں۔ مگر یہ کام اکیلے بندے کا نہیں۔“ وہ بہت سنجیدہ ہو رہا تھا۔

”میں جو تیار ہوں۔ میرا شیر ڈالیں۔ میں نوکری چھوڑ کر کپنی جوائن کر سکتی ہوں ہارون! ویسے کتنا مزہ رہے گا۔ ہم دونوں ہی باس ہوں گے، اُن گنت درکرز کے۔“ لہجے میں بے پناہ خوشی تھی۔ ”مجھے صرف یہ بتا دیں کہ کتنے لاکھ ڈالر کی ضرورت ہے میرے شیرز کے لئے؟“

”تمہارے پاس اتنی بڑی رقم کا ہونا ناممکن ہے۔“ وہ مسکراتے ہوئے بولا۔
 ”ناممکن تو کفر ہے ہارون! میری وائٹ کالر جاب نہیں کہ ٹیکس دینے کے بعد
 ہینڈ ٹو ماؤتھرہ کر ہی زندگی گزار دوں۔ میری زندگی بے حد سادہ اور سہل ہے۔ ایک
 کمرے کی رہائشی ہوں، لچھ ہاسٹل سے فری ملتا ہے۔ رات کا کھانا عموماً گول کر جاتی
 ہوں۔ شاپنگ اور بننے سنورنے کے تمام شوق و جذبے خرم کے ساتھ ہی رخصت ہو
 گئے تھے۔ اس لئے جو بھی کمایا، اس مقصد کے لئے بچا لیا کہ جب خرم کے اور میرے
 درمیان حائل شدہ دیواریں زمین بوس ہو جائیں گی تو میں اپنی تمام تر جمع شدہ پونجی،
 خرم کی خواہش کی نذر کر کے داد وصول کر لوں گی، ان کے دلوں کی ملکہ بن جاؤں گی۔
 مگر اس وقت آپ کو ضرورت ہے تو پہلے آپ کی باری، پھر خرم کی۔“ وہ خوشی سے
 پھولی جا رہی تھی۔

”شیخ چلی تو مذکر تھا، مگر یہاں تو شیخ چلی کی دادی جان نے جنم لے کر مجھے حیران
 و پریشان کر دیا ہے۔“ وہ قہقہہ لگا اٹھا۔
 ”کھلی آنکھوں اور بیدار ذہن سے خواب نہیں دیکھیں گے تو زندگی میں آگے کیسے
 بڑھیں گے؟ دعا کریں کہ ہماری خواب دیکھنے اور شیخ چلی جیسے پروگرام بنانے کی عادت
 قائم رہے۔“ وہ بھی ہلکا سا قہقہہ لگا اٹھی۔
 ”ٹھیک ہے جناب! کل وکیل کے پاس جا کر بات کرتے ہیں۔“ وہ پھر سنجیدہ
 ہو گیا۔

”ڈن۔“ حدیقہ نے ہاتھ آگے بڑھایا۔

”ڈن۔“ اس نے اس کے ہاتھ پر ہاتھ مارا اور ہنستے ہوئے بولا۔ ”اتنا بڑا فیصلہ
 عورت کے مشورے کے بغیر کرنا کس قدر مشکل لگ رہا تھا۔ تم نے تو میری ہر مشکل کو
 آسان اور بے جا اندیشوں سے چھٹکارا دلا کر ہُ سکون کر دیا ہے۔ حدیقہ! میں نے
 جب بھی اپنا کام اللہ پر چھوڑا ہے، وہ چٹکی بجاتے پایہ تکمیل تک پہنچ جاتا ہے۔ میں جو
 ایک طویل عرصے سے جاب لیس رہا، اس کی وجہ میرا غرور و تکبر تھا۔ مجھے اپنی
 ڈگریوں پر بڑا مان تھا کہ دنیا کے کسی بھی حصے میں مجھے ہاتھوں ہاتھ لیا جائے گا۔ جب
 میں نے معمولی سی نوکری پکڑ لی اور میری ”میں“ کو دھچکا لگا اور میں صبر کر گیا تو رزق
 کے دروازے مجھ پر وا ہو گئے۔ آج اللہ نے تمہیں میرا وسیلہ بنا کر بھیج دیا۔ یو آر ٹو گڈ
 حدیقہ! اتنی عقل مند اور دور اندیش ہونے کے باوجود ایک مرد کے ہاتھوں دھوکا کھا

کی بہت کی بات ہے۔“

”ہات یہ ہے کہ اس عمر میں ہر لڑکی احمق اور نادان بننا پسند کرتی ہے۔ بہت سے لڑکیاں سے چشم پوشی نہ کرے تو تاحیات کنواری ہی رہ جائے۔ دوسرا بچ بتاؤں، اس شے میں لالچ و طمع کی آمیزش بھی ناکامی کا سبب بنی۔ پھر برکت اور رحمت کا دخل ایسے ہوتا؟“ وہ ہنستے ہوئے سنجیدہ ہو گئی تھی۔ ”آج کی حدیقہ، دوسروں کی شاطرانہ چالوں کو سمجھنے کی اہمیت رکھتی ہے اور خوش فہمیوں کی اڑان میں زخموں اور پچھتاؤں سے بچنے کی سچائی و حقیقت کو بھی بخوبی جانتی ہے۔ اور دل میں کسی کو پالینے کا لالچ بھی نہیں رکھتی۔“

”اس کی تو مجھے خبر ہو چکی ہے۔“ وہ مسکراتے ہوئے بولا۔ ”اب تم اڑتی چڑیا کے پر پل بھر میں گن لو۔ سیکھ گئی ہو، سمجھ گئی ہو دنیا کو۔“

”یہ تو ہے۔ مجھے خود پر فخر ہونے لگا ہے۔ میں نے ایک سبق تو سیکھ ہی لیا ہے کہ چھوٹی موٹی عورتیں تاحیات بے وقوف بنتی ہیں۔ ایسے کردار ہمیں اس آزاد اور برابری کے حقوق کا پرچار کرنے والی اس سوسائٹی میں بھی جگہ جگہ نظر آتے ہیں۔ خرم میرے ہوش و حواس پر ایسے مسلط رہتا ہے جیسے وہ مجھ سے دُور گیا ہی نہیں۔ اس اُمید پر زندہ ہوں کہ واپس نہیں لوٹے گا تو کہاں جائے گا؟ ماما معاف نہیں فرمائیں گی تو سکون سے کیسے جی پائیں گی؟..... ہارون! آپ دعا کریں، یہ ہجر، وصال کا روپ دھار لے۔“ وہ حسرت بھرے لہجے میں بولی۔ ”پادیں پیچھا نہیں چھوڑتیں، پھر بھی میں نے اپنی عزت نفس کو مد نظر رکھتے ہوئے صبر و تحمل اور امید و بیم کی دنیا میں ایک طویل خاموشی اختیار کر لی ہے۔ ہر لمحہ انتظار یار اور ہر آہٹ پر چونکنا معمول بن گیا ہے۔ مگر پھر بھی آج کی حدیقہ نے دوسروں کی مسکراہٹ میں اپنے لئے خوشیاں ڈھونڈنا چھوڑ دی ہیں۔ اگر دوسرے میرے بغیر پُر سکون اور مطمئن ہیں تو میرا دِل بھی کچھ ایسا ہی ہونا چاہئے، جس کے لئے میں ہر وقت کوشاں رہتی ہوں کہ کہیں پھسل کر خود کو اتنا ہی ذلیل و خوار نہ کر دوں کہ خود سے آنکھ ہی نہ ملا سکوں..... اوہو..... بات کہاں سے شروع ہوئی تھی، کس جانب مڑ گئی۔“ وہ موضوع بدلتے ہوئے بولی۔ ”ہارون! کل سے آپ سنجیدگی اور دل جمعی سے اس کام پر دھیان دینا شروع کریں جس میں ہم دونوں کے لئے بے پناہ کامیابیاں پوشیدہ ہیں۔ دلی اور ذہنی تسکین، نئی سوچوں اور منصوبوں کے تشکیل دینے اور تخلیق کرنے میں ہے۔“ وہ کوئی فیڈبک نظر آ رہی تھی۔

”تم درست کہہ رہی ہو۔ میری ایک بات پر ذرا غور کرنا۔ تم جن خوش فہمیوں میں اپنی زندگی گزار رہی ہو، یہ سراب سراسر دہلا دینے والا ہے۔ تڑپ کر مرنے لگی اس دن جب خرم کی طرف سے بے وفائی کا سند یہ وصول کرو گی۔ گندی سالی۔ تم ابھی بھی بے حد کمزور اور نادان ہو۔ چھوڑ دو ان یادوں کو، جو تمہیں انتظار کی دنیا میں لے جا کر رلاتی ہیں۔ بھول جاؤ ان سب کو، جنہوں نے تمہیں پلٹ کر دیکھنے کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی۔“ وہ بے حد اداس سا نظر آنے لگا تھا۔

”میں بے اختیار ہوں ہاروں!..... یادوں پر پہرہ بٹھانا میرے بس کا روگ نہیں۔“

”ہاروں! میں نے خرم سے پیار ہی نہیں، عشق کیا ہے۔ اسی عشق کی طاقت میں خرم کی ہر زیادتی کو سہہ گئی۔ ورنہ فیصلہ تو کب کا ہو چکا ہوتا۔“ اس کے لہجے میں صداقت تھی۔

”حذیقہ! ایک دن بہت پچھتاؤ گی۔ گزرا وقت لوٹنے سے رہا۔ تم اپنے بارے میں سوچو! تمہاری عمر بڑھ رہی ہے۔ آگے جا رہی ہے۔“ وہ نرمی سے بولا۔

”میں آپ کی بات کا مطلب سمجھتی ہوں۔ بے وفائی میری فطرت میں ہی نہیں۔ میری ماما کی مثال آپ کے سامنے ہے، وہ آج بھی پاپا کے لئے دروازہ کھلا رکھتی ہیں۔ میں انہی کی بیٹی ہوں ہاروں! خرم کے بغیر کسی اور کا تصور بھی نہیں کر سکتی۔“ لہجہ مستحکم تھا۔ وہ اس وفا کی پٹلی کو دیکھتا ہی رہ گیا۔



”ڈاکٹر طوبی! ماں جی آپ سے مل کر بہت خوش ہوئی ہیں۔ ویسے ایک بات تو ماننے والی ہے کہ کوئی بات ضرور ہے آپ میں۔“ وہ خوش ہوتے ہوئے بولا۔

”مجھے بتانے کی کوشش مت کریں۔ ویسے مجھے ان کے گلے ملتے ہوئے اپنی ماں کی خوشبو نے چونکا دیا تھا۔ کیا ہر ماں کی مہک ایک ہی جیسی ہوتی ہے؟“

”ہو سکتا ہے۔“ وہ مسکراتے ہوئے بولا۔

”اس مقدس رشتے کی عظمت کی کیا بات ہے؟“ وہ بھی مسکرا دی۔

”کیا تمہارے اندر بسنے والی عورت نے کبھی تم سے اس عظیم رشتے کی ذمہ داری نہیں کی۔“ وہ جھجکتے ہوئے بولا۔

”کئی بار میرے کانوں میں اس عورت نے میٹھارس گھول کر مجھے سوچنے پر مجبور

اها ہے۔ مگر ڈاکٹر خرم! ہو سکتا ہے کہ میری مامتا ایسی معطر خوشبو کے فسون سے
 ۱۰۱۱ محروم ہی رہے۔ کیونکہ میں محسوس کرتی ہوں کہ میں اس رشتے کی تمام تر ذمہ
 ۱۰۱۲ اہوں کے قابل ہوں، نہ ہی بخوبی نبھانے کی شہد بد رکھتی ہوں۔“ وہ ایک دم بے حد
 ۱۰۱۳ ہمدہ ہو گئی۔

”یہ تو کوئی بات نہ ہوئی۔ سمندر کی گہرائیوں میں کودنے سے پہلے بھلا کس کو
 معلوم کہ وہ کیا کرنے جا رہا ہے، اس کے ساتھ کیا ہونے والا ہے۔ آخر کار اس جان
 کو بچانے کے لئے ہاتھ پاؤں مارتے ہوئے وہ تیراک بننے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ ماں
 کے رول میں بھی ایسا ہی لگتا ہوتا ہے۔ وہ نا آشنائی اور انجانے پن میں ہی ماں کی
 صف میں شامل ہو جاتی ہے۔ اس کے اندر اپنی اولاد کے لئے مامتا کے بے لوث پیار
 کا دوڑتا ہوا طوفان، جذبہ صداقت سے ہمکنار ہو کر اسے سر تا پا بدل کر رکھ دیتا ہے۔
 اور اولاد کی بخشش کا سامان اس کے پاؤں تلے محفوظ کر دیا جاتا ہے۔“ وہ جذبات سے
 مغلوب ہو کر بو لے جا رہا تھا۔

”سبحان اللہ! کیا شان ہے میرے مالک کی۔ عورت کو ایسا بلند و بالا مقام بخش کر
 اپنی رحمتوں کے دروازے اس پر کھول دیئے۔“ وہ عقیدت بھرے لہجے میں بولی۔
 ”اور ہم مرد بے چارے دیکھتے ہی رہ گئے۔“ وہ مزاحیہ انداز میں بولا۔
 وہ خاموشی سے اسے دیکھنے لگی۔ اک طویل توقف کے بعد وہ پھر گویا ہوا۔
 ”ہاں، تو بات ہو رہی تھی کہ آپ ماں جی کو بہت زبردست، مضبوط اور مستحکم
 کردار کی لگی ہیں۔ اُن کی جہان دیدہ نظروں نے آپ کو تھوڑے وقت میں ہی پرکھ لیا
 ہے۔“ وہ ملائمت بھرے لہجے میں بولا۔

”جی۔“ اس نے اثبات میں صرف سر ہلا دیا۔

”شیریں بھی واپس کینیڈا جانے کی تیاری کر رہی ہے۔ ان کی دلی خواہش ہے
 کہ بیٹی کے ہوتے ہوئے میری شادی ہو جائے۔ شیریں بھی یہی چاہتی ہے۔ کیونکہ
 ماں جی کو اکیلے میں بہت گھبراہٹ ہوتی ہے۔“ وہ ہچکچاتے ہوئے بولا۔

”جواب کرنے والی لڑکی آپ کے لئے سراسر پریشانی کا باعث بنے گی۔ آپ
 بہت سوچ سمجھ کر لڑکی کا انتخاب کریں۔“ وہ سوچتے ہوئے بولی۔

”میں نے سوچ سمجھ کر ہی آپ کو منتخب کیا ہے۔ آپ اپنی نوکری کے باوجود انہیں
 اپنی کہنی دینے کی اہلیت رکھتی ہیں۔“ وہ ہمت بحال کرتے ہوئے بولا۔

”اپنی زندگی سے کھیلتا، نت نئے تجربات کرنا اور پھر نا کامیوں کو ہنس کر گلے لگانا کوئی آپ سے سیکھے۔ حدیقہ جیسی لڑکی آپ کو ڈھونڈے سے نہیں ملے گی۔ آپ غور و فکر کریں تو آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ چراغ تلے اندھیرا ضرور ہے، مگر قارون کے خزانے کا حصول وہاں ہی پوشیدہ ہے۔“ وہ سنجیدہ ہو گئی۔

”آپ مجھے ناقابلِ فہم سمجھتی ہیں ڈاکٹر طوبی! میں ایسا ہرگز نہیں۔“ وہ قدرے سختی سے بولا۔

”شادی کے معاملے میں ایسا ہی تصور کرتی ہوں۔ آپ خود میرے انکار اور اعتراضات کی وجوہات تک پہنچ جائیں گے اگر تہہ دل سے ہر پہلو کا بغور جائزہ لینے میں سچائی سے کام لیں گے۔“ وہ بھنویں چڑھا کر بولی۔

”میں سب کچھ جانتا ہوں ڈاکٹر طوبی!“ وہ بھی اسی لہجے میں بولا۔

”تو پھر جانتے اور سمجھتے ہوئے آگ کے دریا میں چھلانگ کیوں لگانا چاہتے ہیں؟ جل کر راکھ ہو جائیں گے۔“ وہ بھی سختی سے بولی۔

”آپ آگ کا دریا نہیں ہیں ڈاکٹر طوبی! آپ تو گھنی اور ٹھنڈی چھاؤں ہیں، جس کے سائے تلے کوئی مسافر سستانے کو نہیں رکا۔ میں اس گھنیری چھاؤں میں اپنی بقیہ زندگی کا سفر آسودگی اور تسکین سے گزارنا چاہتا ہوں۔ مجھے انکار مت کیجئے۔ سوچ سمجھ کر فیصلہ کرنے کا حق میں آپ سے چھیننا نہیں چاہتا۔ آپ کے پاس وقت ہے۔ سوچ لیجئے۔“ وہ بے قراری سے بولا۔

”وقت زیاں کی ضرورت نہیں۔ میں فیصلہ کر چکی ہوں۔“ وہ سختی سے بولی۔

”میں یکطرفہ فیصلے کا قائل نہیں ہوں۔ فیصلہ ہم دونوں وجوہات کی بنا پر کریں تو بہتر رہے گا۔“ وہ ڈھیٹ بنا ہوا تھا۔

”وجوہات آپ جانتے ہیں۔ کیا ہم اچھے، مخلص دوستوں کی طرح اپنے تعلق و ربط کو قائم و دائم نہیں رکھ سکتے؟“ وہ تاسف بھرے لہجے میں بولی۔

”اگر آپ کی کچھ شرائط ہوں تو بتا دیجئے۔“ وہ نرمی سے بولا۔ ”دوستی تو ہے شرائط۔“

وہ مسکرا اٹھی۔

”دوستی شرائط کی محتاج نہیں ہوتی۔ جس رشتے میں شرائط حاکم ہو جائیں، وہ رشتہ جلد یا بدیر ٹوٹ جاتا ہے۔ اگر میں نے دوستی کے علاوہ دوسرا رشتہ قبول کر لیا تو

اس کو ابدی حیات بخشنے کے لئے میری طرف سے واحد شرط بھی نہ ہوگی۔“ وہ سوچتے ہوئے بولی۔

”ڈاکٹر طوبی! آپ کی انہی ٹھوس اور پختہ خوبیوں نے مجھے گرویدہ بنا دیا ہے۔ آپ کے خود ساختہ قانون اور اصول حقیقت پر مبنی ہیں۔ ان میں رتی بھر کی منافقت اور ہناوٹ نہیں۔ آپ کی ہر بات پر میں مکمل اعتماد اور بھروسہ رکھتا ہوں۔ آپ کا فیصلہ بھی میرے لئے بہترین ہوگا، مجھے اس پر پورا یقین ہے۔“ وہ نہایت سعادت مندی سے بولا۔

”فیصلہ تو میں نے سنا دیا ہے۔ آئی ایم سوری۔ میں وہ ذمہ داری اٹھانے کے حق میں نہیں ہوں، جس کو احسن طریقے سے نبھانہ سکوں۔ میں آپ کو کسی بھی خوش فہمی میں ایک لمحے کے لئے بھی نہیں رکھنا چاہتی۔ میں شادی کے قابل ہوتی تو کب کا گھر بسا چکی ہوتی۔ یہ جان جو کھوں کا کام کرنے کی مجھ میں سکت نہیں۔ میں نے پہلے بھی عرض کی تھی کہ میری شادی اس پروفیشن سے ہو چکی ہے۔ یہی میری زندگی اور یہی میری خوشیاں ہیں۔ آج کے بعد اس موضوع پر بات ناراضگی کو آواز دینے کے مترادف ہو گی۔“ وہ خود اعتمادی سے بول رہی تھی۔

”میرے در پیچے آپ کے لئے ہمیشہ کے لئے کھلے رہیں گے۔ آپ کے علاوہ کسی اور سے شادی کا تصور بھی گناہ سمجھتا ہوں۔“ وہ دکھی سا ہو گیا۔

”حدیقہ کو منالینجئے۔ وہ بہت سلجھی ہوئی، نیک اور دکھی لڑکی ہے۔ آپ سے بے پناہ محبت بھی کرتی ہے۔ آپ اپنے دل میں شک کی گریں کھول کر اس کو اپنے من میں بسیرا کرنے کی اجازت تو دے کر دیکھیں۔ حقیقی اور ابدی سکون سے ہمکنار ہو جائیں گے آپ۔ معاف کرنے سے بڑھ کر کون سی عبادت و ریاضت ہوگی، جو آپ کو مسرتوں کی دنیا کا باسی بنانے میں کامیاب ہوگی؟“ وہ بہت ملائمت سے سمجھا رہی تھی۔

”میزے یقین کو شک کا نام مت دیں۔ وہ آج بھی میری بہن کا سہاگ چھین کر اس سے رنگ رلیاں منارہی ہے۔ آج تک اس نے طلاق کا مطالبہ کیا، نہ ہی مجھ سے رابطہ کرنے کی کوشش کی ہے۔ میں بھی اسے آزاد نہیں کروں گا، تڑپا تڑپا کر اس کو ماروں گا۔ وہ بھی کیا یاد کرے گی کہ کس جلاد سے پالا پڑا تھا۔“ وہ نفرت آگئیں لہجے میں بولا۔

”ڈاکٹر خرم! ذرا دل کی صدا تو سنیں۔ وہ دُہائی دے رہا ہے کہ آپ کو حدیقہ سے

شکوے شکایات اس کے اسٹینس کی وجہ سے ہیں۔ جن کی شروعات شادی کے ایک ہفتے بعد ہی ہو گئی تھی۔ میں آپ کی روداد سے اسی نتیجے پر پہنچ پائی ہوں۔ آپ ماں اور بہن کی محبت اور لگن سے بے ہوئے جال میں ازل سے ابد تک مقید رہیں گے۔ جنہیں رشتوں کو بیلنس کرنا نہیں آتا، وہ شادی کے قابل نہیں ہوتے۔ ایک معصوم کی زندگی برباد کرتے ہوئے وہ خوفِ خدا سے لرز کیوں نہیں جاتے؟ شاید اس لئے کہ بیوی کی حیثیت کو کھلونے سے بڑھ کر تصور کرنا ان کی مردانگی کے خلاف ہے۔ ایک کھلونا پسند نہ آیا تو دوسرا حاصل کر لیا بغیر دام کے۔“

وہ سچ ہی تو کہہ رہی تھی۔ وہ آنکھیں جھکائے اس کے سامنے خاموش بیٹھا تھا۔ اسے اس پر بے پناہ رحم آ گیا۔

”ڈاکٹر خرم! کیا حد یقہ کو واپس لانے میں، میں آپ کی مدد کر سکتی ہوں؟“

”آئی ہیٹ ہر، ڈاکٹر طوبی! ڈونٹ فورس می۔ اس کا گناہ قابلِ معافی ہرگز نہیں۔ ورنہ آج کا خرم معاف کر سکتا تھا۔“ وہ ناگواری سے بولا۔ ”میں اپنی بہن کے ساتھ ہنسی خوشی زندگی بسر کر سکتا ہوں۔ اس کے بچے میرے ہی تو ہیں۔ اگر شیریں نہ رکی تو میں بھی اس کے ساتھ کینیڈا چلا جاؤں گا۔ لیکن آپ کے علاوہ کسی اور سے شادی کا تصور بھی نہ کروں گا۔“

”قابلِ ستائش سوچ ہے۔“ وہ سنجیدگی سے بولی۔ ”کیا معلوم آپ کا گھر آباد ہونے کے بند راستے کھل جائیں۔ آپ کینیڈا ضرور جائیں۔ میرا دل کہتا ہے، آپ کے لئے بہتر ہو گا۔“

”بس امید رکھئے کہ ایسا ہو جائے۔“ وہ سر جھٹک کر بولا۔ ”کس قدر ضد اور ہٹ دھرم ہیں آپ۔ میں کوشش کے باوجود آپ کو اپنی جگہ سے ایک انچ تک تو ہلا نہیں سکا۔ آئندہ میرے ساتھ کیا ہوتا، میں تو بے خبر ہی تھا۔ مگر آپ خوب باخبر ہیں۔ اس لئے تو نصیحتوں کے درس کھول دیئے ہیں۔“

”ہر انسان کو اپنی کمزوریوں کا موازنہ کرنے کی آزادی ہے۔ میں اپنی رگ رگ سے آشنا ہوں۔ آپ بھی تنہائی میں بیٹھ کر اپنے اندر کے خرم کو نہایت دیانت داری سے پڑھنے اور سمجھنے کی کوشش کریں۔ آپ کی صحت کے لئے بہت بہتر رہے گا۔“ وہ اس کی باتوں کا برا منانے کے بجائے نہایت لگاؤ سے بولی۔ ”کیا زندہ رہنے کا مقصد فقط شادی ہے؟ اور بھی بہت کام ہیں، بہت ذمہ داریاں ہیں اس بندھن کے

”بہت کلیئر تھنکلو ہیں آپ کی۔“ وہ آہستگی سے بولا۔
 ”تمام مسائل کا حل ہے یہ۔ آپ بھی کلیئر تھنکنگ ہو کر تو دیکھیں۔ تاریک،
 غاردار اور ڈراؤنی راہیں بھائی دینے لگیں گی۔“ وہ نرمی سے بولی۔
 ”آپ کی نصیحت پر عمل کرنے کی کوشش کروں گا۔“ وہ بھی نرم پڑ گیا تھا۔

”ایڈ جسٹ منٹ کا نام ہے شادی۔ اگر آپ ایک عورت کے ساتھ رہنے میں
 ناکام ہو گئے ہیں تو کیا گارنٹی ہے کہ آپ دوسری، تیسری اور چوتھی کے ساتھ خوش و
 خرم زندگی گزار لیں گے؟ کیوں نہ پہلی جو چاؤ چونچلوں کے ساتھ بیاہ کر آپ کی زندگی
 میں شامل ہوئی تھی، اس میں اپنی خوشیوں اور مسکراہٹوں کو تلاش کریں اور ہر رشتے کو
 اپنا مقام و درجہ دے کر ہر رشتے سے انصاف کرنا سیکھیں۔ یہی زندگی کا راز ہے۔“ وہ
 اپنائیت سے بول رہی تھی۔ اور وہ سوچنے پر مجبور ہو گیا کہ زندگی کا راز ہے کیا؟

”سوچنے اور خوب سوچنے۔“ وہ اسے بغور دیکھتے ہوئے بولی۔ ”آج میری ہر
 بات آپ کو ناگوار گزرے گی، مگر کل آپ کے خیالات میرے خیالات سے یکجا ہو کر
 بہت سی زندگیوں میں اطمینان و تسکین بھر دیں گے۔“

”ممکنات میں سے ہے کہ آپ کی سوچ کے مطابق حالات کا دھارا بدل جائے۔“
 ”امید رکھئے۔ ایسا ہوا تو سب سے پہلے آپ کو اطلاع دوں گا۔“ وہ سنجیدہ تھا۔
 ”اگر آپ کو کسی وقت، کسی جگہ میری مدد اور مشورے کی ضرورت پڑے تو مجھے
 حاضر پائیں گے۔“ وہ اس کے بدلتے تیور سے ارادوں کی تہہ تک پہنچ چکی تھی۔ وہ
 خاموش ہی رہا۔

”اماں جی کو میرا آداب پہنچا دیجئے گا۔ میں ان سے ملنے ضرور آؤں گی۔“ اس
 نے آخری جملے میں بات مکمل کی اور اپنے آفس سے اٹھ گئی۔ اس نے بھی نبھتی ہوئی
 آواز میں خدا حافظ کہا اور باہر نکل گیا۔



دسمبر کی بچ بستہ صبح نمودار ہوئی۔ خرم شب بیداری کی وجہ سے لڑ بھی تک سویا ہوا
 تھا۔ ماں آہستگی سے اس کے کمرے میں پہنچی۔ اسے سوتا دیکھ کر وہیں کھڑی اسے سنبھلنے
 لگی۔ دل سے ہوک سی اٹھیں۔ اس بھری جوانی میں احساسِ تنہائی سے اس کی آنکھیں
 بھر آئیں۔ ماما ڈھائی دینے لگی۔

”میں جلد از جلد اپنے بچے کے لئے دلہن لے کر آؤں گی۔ کاش میں نے پہلے ہی عقل مندانہ فیصلے کئے ہوتے تو آج نوبت یہاں تک نہ پہنچتی۔ لے دے کے دو بچے نصیب ہوئے، وہ بھی بد بخت ہی نکلے۔ دونوں کے بنتے بستے گھر پل بھر میں اُجڑ گئے۔ ہائے، کسی حاسد کی نظر ہی کھا گئی ہے۔ میرے گھر کے سکون و چین کو اور خوشیوں کو نگل لیا ہے حاسدوں نے۔ اب پریشانی کے سوا کچھ نظر ہی نہیں آتا..... گناہگار میں ہوں۔ دونوں بچوں کی یکجائی میں کس قدر خود غرضی کو مد نظر رکھا ہے میں نے۔ جب سب کچھ اُجڑ گیا تو دونوں بہن بھائی ایک دوسرے سے نفرت کرنے لگے۔ جب انسانی فطرت کو پس پردہ ڈال کر اپنے منصوبوں کو عملی جامہ پہنایا جائے تو انجام روح فرسا اور بھیا تک ہی ہوا کرتا ہے۔ میرے بچے اس کئے دھرے میں بالکل قصور وار نہیں۔“

وہ اس کے بے سکون چہرے کو دیکھ کر کچھتاؤں اور حسرتوں کے سمندر میں غوطہ زن ہو گئی تھی۔ اس نے بے اختیار ہو کر اس کے چہرے پر پیار سے ہاتھ پھیرتے ہوئے نہایت ملائمت سے کہا۔

”بیٹا! ناٹم دیکھو کیا ہو رہا ہے۔ اٹھ جاؤ میرے چاند!“

”ماں جی!“ وہ ایک معصوم بچے کی طرح کروٹ لیتے ہوئے بولا۔ ”آج ہاسپٹل نہیں جاؤں گا۔“

ماں نے اس کا کمر درست کیا اور باہر نکل گئی۔ سامنے شیریں سے ٹکراؤ ہو گیا۔

”لاڈلے صاحب آج ہاسپٹل نہیں گئے؟“ وہ طنز سے بولی۔

”شاید طبیعت درست نہیں۔ میں نے پوچھا نہیں۔“ ماں نے اس کے طنز کو

نظر انداز کرتے ہوئے فکر مندی سے کہا۔

”ظاہر ہے، طبیعت کی ناسازی، بڑھیا کے انتخاب کی وجہ سے ہے۔ گمان ہوتا

ہے، اس کا جہاں سے جوانی اور حسن و جمال روپوش ہو گیا ہے جو آپ کے لاڈلے نے ڈاکٹر طوبی کو اپنی زندگی کا ساتھی چن لیا ہے۔“ وہ پھر طنزیہ لہجے میں بولی۔

”کیوں طنزیہ نشتر چلا کر ہمیں مجروح کرتی ہو؟ تمہارے تو دونوں ہاتھ بھرے

ہوئے ہیں۔ وہ بے چارہ تمہا کس کے سہارے زندگی گزارے گا؟ اس کی پسند پر مجھے

بھروسہ کرنا پڑے گا۔ وہ کوئی دودھ پیتا بچہ تو ہے نہیں کہ میں نصیحتوں اور وصیتوں کے

درس کھول دوں۔“ وہ سنجیدگی سے بولی۔

”پہلے جو اس کی پسند نے کیا، رینگیلے ٹکل کھلائے ہیں، جواب میں پھر اس کی پسند پر مرنے لگی ہیں۔ جس کی وجہ سے میرا گھر برباد ہوا، وہ چلا ہے شادی رچانے۔ اللہ تعالیٰ بہت بڑے انصاف والا ہے۔ ماں جی! آپ کے لاڈلے کا گھر کبھی آباد نہ ہوگا۔“
 وہ روہانسی ہو گئی۔

”شیریں! تمہیں کیا ہو گیا ہے؟ مجھے بھائی کی مخالفت میں تمہاری طرف سے دشمنی کی بدبو آنے لگی ہے۔ کبھی بہن اور بھائی بھی زندگی کے ساتھی ٹھہرائے گئے ہیں؟ کیوں غیر فطری خواہش کے بل بوتے پر بھائی کے سامنے دشمنی کی دیواریں حائل کرنے لگی ہو؟ میرا مشورہ مانو، تم بھی شادی کے بارے میں فیصلہ کر لو۔ بچے باپ اور دوھیال سے بھی تعلق اور رابطہ رکھیں اور تم سے بھی۔ تم اپنی نئی زندگی کا آغاز کرو گی تو شاید بھائی کے لئے تمہارے دل سے نفرت، حسد اور غصہ نکل جائے۔ بالکل جاہلانہ باتیں اور غیر مناسب حرکتیں ہیں تمہاری۔“ ماں تذبذب و اضطراب میں بولے جا رہی تھی۔

”یہ آپ کی تربیت کے اثرات ہیں۔ آپ نے مجھے فاطمہ جناح اور بھائی کو قائد اعظم کے لقب سے نواز کر اسی رول میں قید کیا کہ شادی کے بعد بھی ہم دونوں اپنی زندگی کو تبدیل نہ کر سکے۔ آپ نے ہم دونوں کے ساتھ جو زیادتی اور بے انصافی کی ہے، آپ کو خدا تعالیٰ کے سامنے جواب دہ ہونا پڑے گا۔“ شیریں تلخ لہجے میں بول رہی تھی۔

”بیٹا! بعض اوقات والدین نا سمجھی میں بھلا کرنے کی سوچ رہے ہوتے ہیں۔ میں نے سوچا، ہماری چھوٹی سی تو فیملی ہے، دونوں مل جل کر رہیں گے تو ان سیکورٹی اور کسی قسم کی کمزوری اور تنہائی کا احساس نہیں ہوگا۔ مجھے علم نہ تھا کہ باہر کے خاندانوں سے آنے والے لوگ ہمیں یوں پشیمان کریں گے۔ بیٹے! کاش میں نے تم دونوں کا رشتہ اپنی بہن کے گھر کر دیا ہوتا۔ ہم تو مارے گئے اولاد کی محبت اور چاہ میں۔ اب اولاد ہماری درگت بنا رہی ہے۔ مان لیا کہ ہم مجرم ہیں۔ میں سزا کے لئے حاضر ہوں۔ سناؤ مجھے میری غلطیوں، کوتاہیوں اور بے جا خواہشوں کی سزا۔ اور جاؤ جا کر اپنا گھر بسا لو۔ میری اور اپنے بھائی کی جان بخش کر مجھ پر احسانِ عظیم کر دو۔ باقی رہی میری سزا تو میرے لئے تمہاری ناراضگی اور جدائی ہی سزا ہے۔ جس کو سہتے ہوئے میں اس دار فانی سے بہت جلد کوچ کر جاؤں گی۔“ وہ زار و قطار روئے لگی۔

”ماں جی! مجھے معاف کر دیں۔ عالم کرب و غم میں نہ جانے مجھ سے گستاخی اور

نافرمانی کیوں سرزد ہو جاتی ہے؟ مجھے آپ کی دعاؤں کی ضرورت ہے۔ ننگی اور بد دعائیں مجھے ذلیل و خوار کر دیں گی۔“ وہ وہیں پر ماں کے پاؤں پکڑ کر بیٹھ گئی۔ ”ماں جی! آپ نے ہمارے لئے بہتر ہی سوچا تھا۔ کیا میں اپنے بچوں کے لئے کوئی بھی غلط فیصلہ کرنے کا تصور بھی کر سکتی ہوں؟ ہرگز نہیں۔ ہم نصیب ہی ایسے لکھوا کر لائے ہیں۔ اس میں آپ کا کیا قصور؟“

”اٹھو یہاں سے۔ مجھے مزید پریشان نہ کرو۔“ وہ اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولی۔ ”میری جان، میری روح کا سکون و چین۔ دونوں بہن بھائی ایک ہو کر اپنی زندگی میں پیش آنے والے مسائل کو حل کرو۔ دنیا کو تماشا دکھا کر خود کو بے عزت و ذلیل کرنا مناسب نہیں۔ چپے پہ تمہارا سرال بستا ہے۔ جس دن ان کے کان میں تم دونوں کی نا اتفاقی کی بھنک پڑی، وہ بچے چھین کر لے جائیں گے۔“

”ان بچوں کی خاطر ہی تو یہاں سے بھاگنے لگی ہوں ماں جی! میں اپنے جسم کے ٹکڑوں کو خود سے جدا نہیں کر سکتی۔ میں نے اپنی تمام تر زندگی ان کے نام کر دی ہے۔ شادی میں کیا رکھا ہے؟ وہ لڈو میں نے کھا لئے ہیں جن کا ذائقہ زندگی بھر فراموش نہیں کروں گی۔ خرم کا جذبہ شوق ابھی تک زندہ ہے۔ پھر سے مزا چکھ لے۔“ وہ ملے جلے جذبات میں بولی۔

”بیٹا! تم کیوں نہیں سمجھتی؟ وہ بہت تنہا ہے۔“ وہ دکھ بھرے لہجے میں بولی۔ ”کیا میں بھری محفلوں کی باسی ہوں؟ ماں جی! آپ کیوں بھول گئی ہیں کہ میں آپ کی وہی شیریں ہوں جس کا نام لیتے ہوئے آپ کے منہ سے دعائیں نکلا کرتی تھیں۔ یہ دونوں معصوم اب آپ کی توجہ سے بھی محروم ہو گئے۔ یہ وہی بچے ہیں ماں جی! جن کی غلاظت سے آپ کو گھن نہیں آتی تھی۔ جن کے آرام کی خاطر آپ نے راتیں انہیں بہلاتے ہوئے گزاری تھیں۔ اب کیا ہو گیا کہ میں بالکل ہی آپ کی اور خرم کی نظروں سے گر گئی ہوں؟ ایسا سلوک تو گھر سے بھاگی ہوئی لڑکی کے ساتھ بھی نہیں کیا جاتا، جیسا آپ نے مجھ سے روا رکھا ہے۔“ وہ سسکیاں بھرنے لگی۔

”بیٹا! تمہیں غلط فہمی ہے سب۔ تم تو مجھے پہلے سے بھی پیاری ہو گئی ہو۔ کیونکہ میں عورت ہونے کے ناتے جانتی ہوں تمہارے دکھ اور درد کو، تمہاری محرومیوں اور ناکامیوں کو۔ پھر کیوں شکی مزاج بن گئی ہو؟ ایک ان پڑھ عورت اور پڑھی لکھی عورت میں یہی تو فرق ہوتا ہے کہ پڑھی لکھی عورت، زندگی کو ہر زاویے سے دیکھنے کی اہلیت

رہتی ہے۔ اسے حالات کے مطابق خود کو ڈھالنا آتا ہے۔ وہ اپنی زندگی کو ٹک و شے کے حوالے نہیں کر دیتی۔ خرم کے بارے میں دل صاف کر لو۔“ ماں سمجھاتے ہوئے بولی۔

”میرا دل اس کے لئے کیسے صاف ہو سکتا ہے، جس کی بیوی نے میرا گھر اُجاڑ دیا اور ایک بے مثال خاوند کو اپنے ہاتھوں میں ایسا کیا کہ اسے مجھے طلاق دیتے ہوئے رتی بھر اُپکھا ہٹ نہ ہوئی؟“ وہ آنسو صاف کرتے ہوئے درد و کرب سے بولی۔

”بیٹا! کہیں تو تمہاری بھی غلطی ہو گی۔ ہارون جیسا لڑکا ایسی حرکت کر جائے، مجھے یقین نہیں آتا۔“ ماں سوچتے ہوئے ناقدانہ انداز میں بولی۔

”بس ماں جی! آپ کو تو اپنی بیٹی میں دنیا بھر کے نقص نظر آنے لگے ہیں۔ کیونکہ آپ کے در پر جو آئیٹیشی ہوں۔ اب آپ کی اور آپ کے بیٹے کے پیار کی اصلی صورت سامنے آئی ہے۔ اپنے خاوند کا سہارا تھا تو میں کس قدر اہم تھی۔ وہ کیا گیا، گلیوں کے تنکوں سے بھی حقیر ہو گئی ہوں۔“ وہ ابھی بھی روئے جا رہی تھی۔

”تم ذرا ٹھنڈی پڑو تو میں کچھ عرض کروں۔ بس ہوا کے گھوڑے پر سوار ہو۔ نہ جانے یہ عادت تم نے کہاں سے سیکھ لی ہے؟“ ماں خفگی سے بولی۔

”ماں جی! اولاد تمام خصلتیں اپنے خاندان اور اپنے والدین سے ان بھرٹ کرتی ہے۔“ وہ تلخی سے بولی۔ ”آپ میری کوئی بات، کوئی مشورہ سمجھنا ہی نہیں چاہتیں۔ بتائیں آپ کو کیسے سمجھاؤں؟ آپ کو میری سہیل سی بات سمجھنے میں اتنی مشکل کیوں درپیش ہے؟ ہم دو ہیں تو زمانہ ہمارے ساتھ ہے۔ اسے شادی سے منع کریں ماں جی! اور وہ میرے ساتھ واپس کینیڈا جانے کا پروگرام بنا لے۔ اس صورت میں ہمارے لڑائی جھگڑے، اختلافات بھی ختم ہو جائیں گے۔ بقیہ زندگی بھی سکون و اطمینان سے گزر جائے گی۔“ وہ سمجھانے کے انداز میں بولی۔ ”بچوں کو باپ کا پیار اور توجہ بھی ملتی رہے گی۔“

”تو میرا کیا ہو گا؟ کیا اولاد اس دن کے لئے پروان چڑھائی جاتی ہے کہ بوڑھے، کمزور اور لاغر والدین کو کبک لگائیں اور یہ جا، وہ جا ہو جائیں؟“ ماں غصے سے بولی۔ ”کم از کم مجھے تم سے ایسی توقع ہرگز نہ تھی۔ بیٹی تو ماں کا اٹوٹ ساتھ ہوتی ہے۔ ماں کے دکھوں کو وہی تو محسوس کرنے کی ان دیدنی طاقت سے ہمکنار رہتی ہے۔ میرا بڑھاپا تو ذلیل ہی کر ڈالا ہے اولاد ہے۔“

”آپ کو ساتھ لے جائیں گے ماں جی!“ شیریں ایک دم سے نرم پڑ گئی۔ ”بھلا آپ کے بغیر میں یا خرم جا پائیں گے؟ پہلے جو گستاخی اور بے پروائی کی سزا بھگتی ہے۔“

”اب اللہ معاف کرے، میں اپنا گھر، اپنا ماحول، اپنے عزیز و اقارب چھوڑ کر تم لوگوں کے ساتھ چل پڑوں۔ دن بھر منہ اٹھائے شام کا انتظار کروں۔ یہ زندگی تو نہ ہوئی۔“ وہ طنز سے بولیں۔

”واہ بھی واہ! یہ خوب ہانگی ہے تم نے۔ پڑھ لکھ کر گنوا بیٹھی ہو۔ اپنی ضد اور خود غرضی میں بھائی کو اور مجھے اپنا نوالہ بنا لو۔ یہی چاہتی ہو تا؟ بہت خود غرض ہو گئی ہو۔ آج کے بعد ایسی بکواس مت کرنا۔ خود کو تو برباد کر ہی بیٹھی ہو، اب میرے بڑھاپے اور بھائی کی جوانی کو تباہ کر ڈالو۔“ ماں جل کر بولی۔

”تمام مسائل آپ سے شروع ہوتے ہیں اور آپ پر اختتام پذیر ہوتے ہیں۔ اگر آپ دور اندیش ماں ہوتیں تو آج ہم دونوں بہن بھائی، زندگی کے اس موڑ پر کھڑے نہ ہوتے۔ ہم دونوں کو قاعدے اور اصول کے مطابق اپنی اپنی زندگی گزارنے کے حقوق سے کیوں نہ بہرہ اندوز کیا؟“ وہ جل کر بولی اور کمرے میں چلی گئی۔

اس لڑکی کا تو دماغ چل گیا ہے۔ اکیلی کینیڈا میں بھلا کیسے رہ سکتی ہے؟ اس کی ڈپریشن وہاں کی تنہائی میں بڑھے گی۔ کم ہوتی نظر نہیں آرہی۔ کیسے مقابلہ کرے گی ہارون سے؟..... ہائے میری نازوں پٹی بچی کے ساتھ حدیقہ نے جو ظلم کیا ہے، نسلیں یاد رکھیں گی۔ ایک دم سے مامتا چیخ اٹھی۔

وہ بے چاری سچ ہی تو کہہ رہی ہے کہ بچ منجھدار میں خرم اسے چھوڑ کر الگ دنیا بسانا چاہتا ہے۔ اس صدمے کو کیسے ہضم کر لے؟ میری حیثیت اس وقت اس بے مہار اولاد کے سامنے نہ ہونے کے برابر ہے۔ دونوں بہرے اور اندھے ہو چکے ہیں۔ میری نصیحت و مشورہ سننے کو تیار ہیں، نہ ہی خود دانش مندی سے کام لے رہے ہیں۔ ہائے کیا کروں؟..... خرم کے ابا! مجھے اکیلا چھوڑ کر جاتے وقت آپ نے بھی کچھ نہ سوچا۔ ساتھ ہی لے گئے ہوتے۔

وہ سوچتے ہوئے روئے جا رہی تھی۔ آہستہ آہستہ چلتی وہ بھی اپنے کمرے میں بیڈ پر گر کر خود کلامی کرنے لگی۔

”حدیقہ! مبارک ہو۔ آج سے ہم اس کمپنی کے مالک ہیں۔“ ہارون نے خوشی سے مغلوب ہو کر اسے اپنی باہوں میں سمیٹ لیا۔ وہ سکتے کے عالم میں گنگ ہو چکی تھی۔

”آئی لو یو حدیقہ! تم ہمت نہ کرتی تو کچھ بھی ہونے والا نہیں تھا۔ ورنہ میں اس کمپنی میں تھرڈ کلاس ملازم ہی رہتا۔“ وہ تشکر آمیز لہجے میں بول رہا تھا۔ وہ ایک دم چونکی اور اس سے الگ ہو کر کھا جانے والی نظروں سے اسے گھورنے لگی۔

”آئی ایم سوری حدیقہ! اللہ تعالیٰ نے انسان کو بہت کمزور بنایا ہے۔ دکھ و غم میں بھی کمزور اور غمناک۔ خوشی میں بھی لاغر اور بے بس۔“ وہ بھی چونک کر بولا۔

”حدیں عبور کرنے والے لوگ مجھے ایک آنکھ نہیں بھاتے۔ آپ جانتے ہوئے بھی انجان کیوں بن جاتے ہیں؟ میں نے شیریں اور خرم کے شکوک و شبہات کو غلط ثابت کرنے کا عہد کر رکھا ہے۔ میرے اور آپ کے درمیان قائم شدہ اس مقدس رشتے کو برقرار رکھنا قطعاً مشکل نہیں۔ آپ کے اس بچپنے کا کیا کروں؟ کبھی کبھار میں بہت خائف ہو جاتی ہوں، آپ کو ہمیشہ کے لئے چھوڑنے کا ناکام فیصلہ کر لیتی ہوں۔ کیونکہ اس بھری دنیا میں میرا آپ کے سوا کوئی اور ہے ہی نہیں۔ اب تو ہم دونوں کا اس کمپنی میں مساوی شیر ہونے کی وجہ سے ایک دوسرے سے دور ہونے کے تمام راستے بند ہو چکے ہیں۔“ اس کے لہجے میں دنیا جہاں کا دکھ سمٹ آیا تھا۔

”تم ٹھیک کہتی ہو۔ اسی لئے تو عرضداشت حضور کے دربار میں بارہا لے کر حاضر ہوتا رہا ہوں کہ خرم کو بھول جاؤ۔ وہ واپس آنے والا نہیں۔ اس کی ماں نے اپنے لاڈ لے سپوت کی نیلای لگا رکھی ہو گی۔ اور تم ہو کہ اسی کے نام کی مالا چھتی جا رہی ہو۔“ وہ ہلکی سی خفت سے بولا۔

”اس موضوع پر بحث کرنا مجھے پسند نہیں ہے۔ میں ہر طرح کی اونچ نیچ کے نتائج

آپ کے گوش گزار کر چکی ہوں۔ ہر دوسرے دن پھر وہی قصہ لے بیٹھتے ہیں۔ میں اپنوں کی نظروں سے گرنے کو برداشت کر سکتی ہوں لیکن اپنی نگاہوں میں بے حیثیت و بے وقعت ہونے کو سہہ نہ سکوں گی۔ چلیں مسرت بھری باتیں کرتے ہیں۔ آج اس کہانی میں ہمارا پہلا مبارک دن ہے۔ اللہ تعالیٰ کے پاک نام سے کام شروع کرتے ہیں۔“ وہ موضوع بدل کر ہنستے ہوئے بولی۔ ”مجھے ابھی بھی یقین نہیں آ رہا، دو فقیرے آج اس کہانی کے مالک کیسے بن گئے؟ آج بھی ہر ایک کی زندگی میں معجزات نازل ہوتے ہیں۔ فقط غور و فکر کی ضرورت ہے۔“

”باہمی اتفاق، بے غرض میل ملاپ اور بچی لگن میں کامرانی و شادمانی پوشیدہ ہے حدیقہ بیگم! یہ اصول کبھی نہ بھولنا۔“ وہ چھیڑتے ہوئے بولا۔

”جانتی ہوں۔ جانتی ہوں جناب! یاد دہانی کی قطعاً ضرورت نہیں۔“ وہ بھی خوشگوار لہجے میں بولی۔

”ویسے حدیقہ! شیخ چلی کی دادی تو پوتے سے بھی تیز نکلی۔“ وہ قہقہہ لگا کر بولا۔

”شیریں اور خرم ہاسٹل بنانے کا خواب دیکھ سکتے ہیں تو ہم کیوں پیچھے رہیں؟ بلکہ خواب ہم نے ان کے بعد دیکھا، تعبیر میں ہم سبقت لے گئے۔“ وہ خوش ہوتے ہوئے بولی۔ ”ایک ہفتے بعد میں مکمل طور پر آپ کو جو ان کر لوں گی۔ مجھے پرسوں ہاسٹل چھوڑ کر اپنے اسٹوڈیو اپارٹمنٹ میں شفٹ ہونا ہے۔ ویسے آپس کی بات ہے، کرایہ دیتے ہوئے بے پناہ تکلیف ہو رہی ہے۔“

”مفت خوری اور مفت بیری تمہارے خون میں رچ بس گئی ہے۔“ وہ مذاقاً بولا۔

”میں یہ پہلے سوچ چکی ہوں۔“ وہ ہنستے ہوئے بولی۔ ”کیا مزے سے گزرے

ہیں یہ ماہ و سال۔ نہ گھر کی فکر، نہ بجلی بانی کا غم، نہ ہی کھانے پینے کی سر درد۔“

”اب تم ایک بڑا گھر انورڈ کر سکو گی، چھوڑو اسٹوڈیو اپارٹمنٹ کو۔“ وہ سنجیدگی سے

بولا۔

”کیوں بھی؟ ایسی بھی کیا قیامت آگئی ہے؟ ہمیں ان نو دولتوں سے سبق سیکھنا

چاہئے جو جدی پشتی رچ ہونے کا دعویٰ کر کے زوال کی طرف گامزن ہو جاتے ہیں۔

ہم ہمیشہ اپنی حیثیت کو یاد رکھیں گے۔ سیلف میڈ ہیں ہم۔ جس میں اللہ کی رضا شامل

رہے۔ بس یہ دعا کریں۔“ وہ سنجیدگی سے بولی۔ ”ضرورت ایک کمرے سے بڑھ کر

نہیں۔ قدم زمین پر پیوستہ رہے تو سب درست ہو گا۔“

”بہت سنجوس ہو۔ توبہ استغفار۔“ وہ کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے بولا۔
 ”ایسی نہ ہوتی تو آج اس کہنی کے اوز کیسے بنتے؟“ وہ فخر سے تن گئی۔
 ”تم تو سونے کا محل تعمیر کروا سکتی ہو اس طریقے سے۔ کتنا بد قسمت ہے خرم۔
 ایسی بیوی تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطا کردہ انمول تحفہ ہوتی ہے۔ بے قدروں پر
 جان چھڑکنے کا کوئی فائدہ نہیں ہے حدیقہ! کس حصول کی توقعات پر اپنی جوانی گزار
 رہی ہو؟“ وہ افسردہ ہو گیا۔

”انتظارِ یار میں زیست پتا دوں گی۔ میرا پیار ہے وہ، میرا عشق ہے وہ، میرا دل
 اور میری جان ہے وہ۔“ وہ جھومتے ہوئے بولی۔

”یہاں پر آکر گندی سالی بن جاتی ہو۔“ وہ مسکرانے لگا۔
 ”میں آپ کی طرح جذباتی ہرگز نہیں۔ نہ آؤ دیکھا نہ تاؤ، اپنا حق بے دردی سے
 استعمال کرتے ہوئے بیوی کو تو چھوڑا، دو معصوم بچے بھی نظر نہ آئے۔ کتنے دکھ اوز
 افسوس کی بات ہے۔“ وہ بڑمردہ سی ہو گئی۔ ”مرد ذات پر بھروسہ گویا ذلالت کو بلاوا
 دینے کے برابر ہے۔ میں تو کبھی بھی اس ذات پر اعتماد کرنے کی غلطی نہ کروں۔“
 ”مجھے برا بھلا کہنے سے پہلے ماضی کے تمام حالات کو ایک بار کھلی آنکھوں سے
 دیکھنے کی کوشش کرو۔ کیونکہ اس وقت تمہاری یادداشت گھاس چرنے جا چکی ہے۔“ وہ
 بے حد نارٹل لہجے میں بولا۔ ”شیریں جیسی ڈکٹیٹر بیوی کے ساتھ ایک دن گزارنا بھی
 مشکل ہے، میں نے تو سات آٹھ سال گزار لئے۔ صبر و استقلال کے انعام کا حق دار
 ہوں۔ اور تم ہو کہ قصور وار مجھے ٹھہرا رہی ہو۔“

”آپ پر محض جذباتی ہونے کا الزام ہے۔ سچ ہے کہ آپ کی یادداشت لا جواب
 اور لاٹانی ہے۔“ وہ سنجیدگی سے بولی۔ ”معاف کرنے کا اجر بہت اعلیٰ ہے۔ کیا آپ
 شیریں کو واپس نہیں لا سکتے؟“ وہ حسرت بھرے لہجے میں بولی۔

”اٹ اٹو لیٹ سویٹ ہارٹ!“ وہ تیزی سے بولا۔ ”مجھے نہ پچھتاوا ہے، نہ ہی
 افسوس۔ ہاں، بچے ہر وقت میرے ذہن اور قلب پر چھائے رہتے ہیں۔ انہی کی خاطر
 تو سب کچھ کر رہا ہوں تاکہ انہیں یہاں کی تعلیم دینے کے قابل بنا سکوں۔ ایک نہ ایک
 دن بچے ضرور میرے پاس ہی آئیں گے، شیریں کی رضامندی سے۔ آخر ان کا باپ
 ہوں۔ بے حد پیار کرنے والا۔ اپنے بچوں کے مستقبل کو بہتر اور کامیاب بنانے میں
 ہر وقت کوشاں رہتا ہوں۔ لیکن اب دوبارہ شیریں سے تعلق ناممکن ہے۔ کیونکہ میری

زبان سے تین دفعہ طلاق کا لفظ ادا ہو چکا ہے۔ اور پھر اس کے بعد رجوع کرنے کی کوشش بھی نہیں ہوئی۔“ وہ سنجیدگی سے اسے سمجھا رہا تھا۔

”طلاق نہ ہوئی، مذاق اور لطفہ ہو گیا۔ ہارون! ہم نے اپنے مذہب کا تمسخر اڑا کر اس کے حقیقی حُسن کے پرچے اڑا دیئے ہیں۔ آپ نے غصے میں بولا۔ نہ تو کوئی ڈاکومنٹس تیار ہوئے نہ تو شیریں نے وصول کئے، نہ ہی انہیں رجسٹر کرایا گیا، نہ ہی دو فریقین کی طرف سے میاں بیوی کو آمنے سامنے بٹھا کر گفت و شنید سے صلح کروانے کا رد عمل ہوا۔ آپ اسے طلاق کا نام دے کر اپنے دین اسلام کی توہین مت کریں۔ آپ بڑھے لکھے علماء سے اور کسی براڈ مائنڈ وکیل سے مشورہ تو کر کے دیکھیں۔ ہو سکتا ہے صلح کی کوئی صورت نکل آئے۔ خوب صورتی سے بے پناہ جھوٹ دینے والا میرا یہ مذہب غیر موزوں اور اس حد تک اذیت دہ نہیں ہو سکتا۔ میں اسے سائبریشن کا نام دیتی ہوں جس میں صلح کی راہ ضرور ہوگی۔“

وہ اسے لاجک کے ساتھ سمجھاتی چلی گئی اور وہ خاموشی سے سنتا رہا۔
 ”اب ایسا نہیں ہو سکتا حدیقہ! تمہاری تمام تر منطقی باتیں اسلام کے دائرے میں فٹ نہیں ہوتیں۔ بھول جاؤ کہ مذہب ہمیں اس کی اجازت دے گا۔“ وہ سوچتے ہوئے بولا۔

”در اصل آپ شیریں کو واپس نہیں لانا چاہتے۔“ وہ برا سا منہ بنا کر رہ گئی۔
 ”بس یوں ہی سمجھو۔“ وہ لاپرواہی سے بولا۔
 ”یعنی آپ سے ان کے شکوک کو جموٹا ثابت کرنے کے لئے بھی ایسا عمل سرزد نہ ہوگا۔“ وہ خفگی سے بولی۔

”تہمت کی جو نمبر ہم دونوں کی پیشانی پر ثبت ہو چکی ہے، وہ بھلا کیسے مٹ سکتی ہے؟ خوش فہمیوں کی دنیا میں بسیرا کرنے والی عورتیں بھی حد درجہ کی عاقبت نااندیش اور احمق ہوتی ہیں تمہاری طرح۔ ذرا منہ سے نکلی ہوئی بات کی واپسی کر کے دکھاؤ۔ کمان سے نکلے ہوئے تیر کو آگے کے بجائے پیچھے کی جانب رخ کر کے دکھاؤ تو میں تمہاری ہر بات مان جاؤں گا۔“ وہ نرمی اور سختی کے ملے جلے جذبات میں بولا۔

”ٹھیک ہے۔ مگر یہاں چویشن بالکل مختلف ہے۔“ وہ اپنی بات پر جہی ہوئی تھی۔
 ”تم اپنے دل کی دنیا سے باہر تو نکل کر دیکھو۔ دل ایک آئینے کی مانند ہے، جس میں اپنا چہرہ نیت کے مطابق کبھی دھندلا اور میلاد اور کبھی شکافتہ اور حسین نظر آتا ہے۔ مگر

انسوس! کہ تم خود کو ہمیشہ بہت مثبت اور پُر سکون پاتی ہو۔ کیونکہ نیت اور ارادوں میں فتور نہیں۔ لوگ ایسے نہیں ہوتے۔ اپنے دل کی غلامت میں وہ دوسروں کو بھی اپنے جیسا ہی تصور کیا کرتے ہیں۔ تم نے زندگی کے نشیب و فراز میں رہ کر بھی کچھ نہ سیکھا۔ ابھی بھی ہر ایک کو اپنی سوچ کے مطابق عالم بالا جیسی رفعتوں میں مقیم تصور کر کے زندگی کو سراب اور دھوکوں کے سپرد کر کے مدھوش رہتی ہو۔ مجھے نصیحتیں کرنے سے پہلے اپنے ماضی میں جھانک لو تو شاید مستقبل کے لئے تم کسی بہت بڑے ایسے کے ٹکٹے سے بچ جاؤ۔“ وہ بہت سنجیدہ تھا۔

”دل کی نرمی تو خدا تعالیٰ کی دین ہے۔ میں اس کو کیونکر ٹھکرا دوں؟“ وہ مستحکم لہجے میں بولی۔

”اس نرمی کا خمیازہ بھگتو۔ میں اس میں تمہارا ساتھ نہیں دوں گا۔“ وہ تہر آلود لہجے میں بولا۔

”ہارون! اس میں خفا ہونے والی کوئی بات ہے ہی نہیں۔ ذرا خود کو بھی تو ملاحظہ فرمائیں۔ مجھ سے دو ہاتھ آگے ہیں آپ۔ ورنہ بیوی سے یوں نہ بٹ جاتے۔“ وہ مسکراتے ہوئے بولی۔

”یہی تو تمہیں سمجھانا چاہتا ہوں، ہم دونوں ایک جیسی فطرت لے کر اس دنیا میں وارد ہوئے ہیں۔“ وہ ذمہ نگیں نگاہوں سے اسے دیکھتے ہوئے بولا۔ ”اب تو ہماری کمپنی بھی ایک دوسرے کے بغیر نہیں چل سکتی۔ یہ اتنی لمبی پہاڑی زندگی کیسے گزر سکتی ہے کسی.....“

”کسی ہم سفر کے بغیر؟“ وہ قہقہہ لگا کر بولی۔ ”آپ کا جملہ میں نے مکمل کر دیا۔“ ”تم میرے دل کے نہاں خانوں میں بستی ہو حدیقہ! پھر میرے دل کی خواہشات کو کیوں نہ جانو؟ میری سوچ کو کیوں نہ سمجھو؟“ وہ اُداس سا ہو گیا۔

”فارگاڈ سیک ہارون! میں آپ کی بیوی کی بھابی بھی ہوں اور آپ کو بھائی بھی مانتی ہوں۔ کتنی بار یاد دہانی کراؤں؟ پھر خرم کے نکاح میں بھی ہوں۔ آپ سب کچھ بھول کر انجان کیوں بن جاتے ہیں؟“ وہ سر پکڑ کر بیٹھ گئی۔

”نکاح ٹوٹنا کون سا کارِ عظیم ہے؟ ایک دفعہ کورٹ سے سپر گئے تو جناب فوراً تمہیں فارغ کر دیں گے، شرطیہ۔ شہری بابو مقدموں اور کچھری کے چکروں میں پڑ کر اپنے وقت اور پیسے کا زیاں نہیں کیا کرتے۔“ وہ سنجیدہ تھا۔

”ہارون! میں آج تک آپ کی باتوں کو مذاق اور بے معنی سمجھ کر ٹالتی رہی ہوں مگر مجھے لگنا ہوتا ہے کہ آپ کی نیت درست نہیں ہے۔“ وہ افسردگی سے بولی۔
 ”یار! مذاق ہی سمجھو۔ سوچنے میں ہرج ہی کیا ہے؟ ہماری زندگیوں میں آنے والا وقت خود ہی فیصلہ کرے گا۔ تم بھی انتظار کرو، میں بھی منتظر ہوں۔“ اس کا لہجہ بے حد نارمل تھا۔

”یعنی آپ میرے برے وقت کے منتظر ہیں۔“ وہ سوچتے ہوئے بولی۔
 ”منتظر نہیں ہوں۔ خود کو اس وقت کے لئے تیار کر رہا ہوں۔“ وہ نرمی سے بولا۔
 ”کہ مجھے آپ کی مدد کی ضرورت پڑے گی۔“ وہ سنجیدگی سے بولی۔ ”شادی ہی تمام دکھوں کا مداوا نہیں۔ اگر میں اور خرم اس بندھن سے دور رہتے تو بہتر تھا۔ ہم ایک دوسرے کے قریبی دوست ہونے کے ناطے آج اپنی زندگی کے تمام مسائل کو حل کرنے کے مشوروں پر دھیان دے رہے ہوتے۔ یہ شادی ہی ڈی زائسٹر ثابت ہوتی ہے۔ مجھے خرم اپنی زندگی سے ہمیشہ کے لئے نکال بھی دے تو میں پھر بھی آپ جیسے ہمدرد اور محسن دوست کو کھونا پسند نہیں کروں گی۔ آپ میری بات سمجھ رہے ہیں نا؟ یہ میری مجبوری سمجھیں یا پیار کی انتہا۔“ وہ پیار بھرے لہجے میں بولی۔ ”مجھے اپنی زندگی میں نئے دشمن کے اضافے کی قطعاً ضرورت نہیں۔“

”نہ جانے کیسا پیار ہے یہ۔ میری سمجھ سے بالاتر۔“ وہ سر کو جھٹک کر بولا۔
 ”پیار کی ان گنت قسموں سے آپ کی نا آشنائی مجھے ہر انساں و پریشان کر دیتی ہے۔ آپ کی سوچ کا محور محض جسمانی ضرورت کے گرد و پیش کیوں چکر لگاتا ہے؟ پیار اسے نہیں کہتے۔ اگر اس کو محبت اور عشق گردانا جاتا تو اس جہاں کے رنگ و بو میں طلاق کے نازیبا اور بدنام رنگ کا دخل ہرگز نہ ہوتا۔“ وہ پڑمردگی سے بولی۔ ”شادی سے پہلے پیار کا ڈھونگ نا سمجھی اور نا تجربہ کاری کی نشاندہی کرتا ہے۔ مگر آج آپ اور میں بے شمار تلخ تجربات کے بعد ایک دوسرے کو دھوکا کیسے دے سکتے ہیں؟ اور نہ ہی خوش فہمیوں کا شکار ہو سکتے ہیں۔ کیونکہ اب ہم نئے نہیں رہے۔ پلیز ہارون! آج کے بعد اس موضوع پر بات نہیں ہونی چاہئے۔ مجھ سے وعدہ کیجئے کہ آپ میری اس خواہش کو مد نظر رکھتے ہوئے اس رشتے کو بھانے کی کوشش کریں گے جو پہلے دن سے ہم دونوں کے درمیان استوار ہوا تھا۔ محبت ایک دفعہ خود بخود ہی اپنے ہونے کا احساس دلاتی ہے۔ اس کا احساس بہت سال پیشتر ہو چکا ہے۔ اب دوبارہ کیسے؟ یہ

دل ایک ہی تو ہے۔ اس میں کسی اور کی انٹری کیسے ممکن ہے؟ بس یوں سمجھئے کہ میری مجبوری ہے۔“



بچے اپنے دھن میں مگن اور شیریں اپنی سوچ میں محو، زندگی کوئی طرز اور نئے طریقے سے آسودہ و مطمئن بنانے کے منصوبے بناتی ہوئی ایک طویل سفر کے اختتام کا انتظار کر رہی تھی۔

جہاز نے کینیڈا ایئرپورٹ پر لینڈ کیا تو بیٹے نے ماں سے سوال کر کے اسے چونکا دیا۔

”ماما! آپ نے پاپا کو آنے کی اطلاع تو دی ہوگی۔“

”کیسی باتیں کرتے ہو بھیا؟ ماما کے پاس پاپا کا فون نمبر ہے، نہ ہی ایڈریس۔ وہ کیسے انفارم کرتیں؟“ بیٹی نے بڑی سمجھ داری سے بھائی کو جواب دیا۔ ”دادی اماں نے سب کچھ اپنے قبضے میں رکھا ہوا ہے۔ ہم بھی ڈھونڈ نکالیں گے پاپا کو۔“

”بہن ٹھیک کہہ رہی ہے۔ ہم تینوں پاپا کی تلاش میں ہی تو نکلے ہیں۔“ شیریں نے دھکی لہجے میں کہا۔ ”فی الحال ابھی تو کنول خالہ ہمیں ریسو کریں گی، پھر چند دن ان کے گھر میں رہیں گے۔ خوب انجوائے کریں گے۔ ان کے بھی دو بچے آپ دونوں کی عمر کے ہیں۔“

”خوب حزار ہے گا ماما! اب میری ماما کبھی نہیں روئے گی۔“ بیٹی نے خوشی میں ماں کو پیار کیا تو شیریں کے آنسو چھلک پڑے۔ وہ منہ دوسری طرف پھیر کر آنسو پینے کی کوشش کرنے لگی۔



”شیریں! کنول کا انتظار مت کرو۔ آج دیر سے ہی پہنچے گی۔“ تم تیار ہو۔ چلو میں تمہیں کمپنی دیئے دیتا ہوں۔“ کنول کے شوہر نے لگاؤ سے اس کے قریب بیٹھتے ہوئے کہا۔ ”چلو دونوں لہج پر چلتے ہیں۔ اس کے بعد تمہیں شاپنگ پر لے چلوں گا۔ جب تک کنول واپس آئے گی، ہم بھی واپس پہنچ چکے ہوں گے۔ کیا لگا آئیڈیا؟“

”یعنی ہم دونوں کنول سے چوری چھپے لہج کریں گے اور شاپنگ پر جائیں گے۔ خوب کبی آپ نے۔ ہر وہ عمل جو دنیا کی نظروں میں دھول جھونک کر کیا جائے، اس کا آغاز اور انجام نہایت عبرت ناک ہوتا ہے۔ مجھے ایسا گمان ہونے لگا ہے، جیسے آپ

مجھے ایک.....

”دانش مند اور دور اندیش خاتون سمجھ کر میرے قریب آتے جا رہے ہیں۔“ عثمان نے جلدی سے اس کا جملہ اُچک کر اپنی مرضی سے کپلیٹ کر دیا۔ وہ پریشانی کے عالم میں اس کی طرف دیکھنے لگی۔

”دو بچوں کی ماں ہو کر بھی نہ جانے مجھ سے کیوں خائف رہتی ہو؟ مجھے اوائیڈ کرنا، میری کسی بات کا جواب نہ دینا۔ مسئلہ کیا ہے؟“ وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر دباتے ہوئے بولا۔ ”آج اس سوال کا جواب حاصل کرنے میں جلد گھر آ گیا ہوں۔ کیونکہ ہم مہمان کو کمفرٹیل رکھ کر کارِ ثواب حاصل کرنے کے حق میں ہیں۔“

”کوئی مسئلہ درپیش ہے، نہ ہی خوف زدہ ہوں۔ اگر ایسا ہوتا تو یہاں کیونکر رُک جاتی؟ دراصل میں نے اپنی زندگی میں فریک نئس کے بہت بھیا تک نتائج دیکھے ہیں۔ میری اپنی مثال آپ کے سامنے ہے۔ دوسرا میں کنول کے احسانات کا بدلہ اسے شک اور پچھتاوے کی اذیت میں ڈال کر کیونکر دوں؟“ اس نے آہستگی سے اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ سے چھڑانے کی کوشش کی، جو ناکام رہی۔

”ہر حادثے کا رزلٹ انسان اپنی سوچ کے مطابق تشکیل دیتا ہے۔ جنہیں آپ بھیا تک تصور کر رہی ہیں، ہو سکتا ہے کسی اور شکل و صورت میں بھلے اور مناسب ہوں۔ تم بے فکر رہو۔ کنول کو تمہارے اور میرے تعلقات کی کانوں کان خبر نہیں ہوگی۔ تم ذرا ہمت پکڑو یا ر!“

اس نے اسے زبردستی اپنے سینے سے لگا کر مضبوطی سے جکڑ لیا۔ شیریں نے بھرپور چیخ ماری اور اس کے بازو میں اپنے دانت پوسٹ کر دیئے۔ وہ سرعت کے ساتھ پیچھے ہٹ گیا۔

”مجھے آپ سے ایسی امید ہرگز نہ تھی۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ آپ بھی ایک مجبور اور حاجت مند عورت سے اپنے مطالبات منوانے کے بعد اس کے کام آئیں گے۔ مہینہ ہونے کو آیا۔ نہ ہارون کا اتہ پتہ مل سکا، نہ ہی میرے الگ رہنے پر پیش رفت ہوئی۔ سب سے پہلے مجھے مٹھی میں کرنا مقصد تھا آپ کا۔ پھر.....“ وہ افسوس ناک لہجے میں بولی۔ ”کس قدر ناقابل اعتبار ہے یہ مرد کی ذات۔ نابلد اور ناقابل شناس۔ جسے عورت کی پہچان ہی نہیں۔ جسے ایک پاکیزہ اور نیک طینت عورت اور ایک کونے

پر مردوں کا دل بہلا کر پیسہ بٹورنے والی عورت میں کوئی فرق ہی محسوس نہیں ہوتا۔ اس کی نظر میں ہر عورت جسم فروش اور مطلب پرست ہے۔ میں ابھی اور اسی وقت یہ گھر چھوڑ کر جا رہی ہوں۔ کنول کو وجہ نہیں بتاؤں گی۔ کیونکہ وہ آپ پر اندھا اعتماد کرتی ہے اور آپ پر مکمل بھروسہ کرتے ہوئے میرے سامنے آپ کے پیار اور توجہ کی مدح سرائی کرتے نہیں تھکتی۔“

وہ تیزی سے کمرے کی جانب بڑھ گئی۔ وہ لاؤنج میں کھڑا غیظ و غضب سے اسے دیکھتا رہ گیا۔

چند منٹ میں ہی اس نے اپنے اٹیچی گھیٹ کر باہر نکالے اور بڑبڑاتی ہوئی مین ڈور کے پاس جا کر رُکی۔

”ایک مہینے کی لک آفٹر مجھ پر قرض ہے۔ یہ قرض اپنی زندگی میں ہی چکانے کی کوشش کروں گی۔ اگر میں یہ قرض ادا نہ کر سکی تو میرے بچے مجھے سرخرو کریں گے۔ میرا وعدہ ہے آپ سے۔“

”شیریں! ایک بات کان کھول کر سن لو۔ اگر اس راز کو اُگلنے کی کوشش کی تو گلا دبا دوں گا تمہارا اور تمہاری اولاد کا۔“ وہ چیخنے لگا۔ ”اگر تم ایسی ہی پاکباز ہوتی تو شوہر کھڑے کھڑے طلاق نہ دے دیتا؟ تم نے تو اپنے بھائی کو بھی نہ بخشا۔ بھوک اور پیاس مٹانے کے لئے کیا اس جہاں سے مردوں کا خاتمہ ہو گیا تھا جو بھائی کی داشتہ بنی رہی؟“

وہ تھملا اٹھی اور ایک زناٹے دار تھپڑ اس کے گال پر رسید کر دیا۔

”اس قدر گھٹیا سوچ؟..... تمہیں خدا کا خوف نہیں ہے؟..... ایسے ہی پراگندہ اعمال اس سوسائٹی کا حصہ ہیں۔ تم اپنے کلچر کو بھول گئے ہو، جہاں ان مقدس رشتوں کی کیا اعلیٰ و ارفع شان ہے۔ اللہ کرے تمہاری بہنیں تمہاری ہوس سے بچ سکیں۔ میری دعا ہے، تمہاری بیٹیاں تمہاری شیطانیت کے شکار سے محفوظ رہیں۔“

وہ اتنے زور سے چیخ رہی تھی کہ اس نے خاموشی میں عافیت سمجھی۔ وہ اپنے سامان کے ساتھ سڑک پر نکل آئی۔ ٹیکسی منگوائی اور سیدھی بچوں کے سکول چلی گئی۔

بچے اس کا انتظار کر رہے تھے۔ ان کو لے کر وہ ہوٹل کی جانب چل پڑی۔

بچے نئی جگہ پر ایکسائیڈ تھے۔ ہفتے میں یہ ایک کمرے کے اپارٹمنٹ میں شفٹ ہو گئی۔ قسمت نے یادری کی اور ساتھ ہی اسے ہاسپٹل میں بہترین جاب مل گئی اور

زندگی اپنے تناسب سے رواں دواں چل پڑی۔ آخر ان تھک کوشش کے بعد اس نے ہارون کو ڈھونڈ نکالا۔ وہ یہاں سے پانچ سو کلومیٹر دور ایک شہر میں اپنی ذاتی کمپنی کا مالک تھا۔ انٹرنیٹ نے تمام انفارمیشن اس کی نگاہوں کے سامنے کھل کر پیش کر دی تھی۔ کنول میسوں بار اسے لینے اس کے گھر آئی مگر اس نے مصروفیت کا بہانہ بنا کر ہر بال ٹال دیا۔ وہ کسی صورت عثمان کی شکل دیکھنے کی روادار نہ تھی، جس نے اس کی عزت و تحريم پر صرف ہاتھ ہی نہ ڈالا تھا، بلکہ اس سے الزام تراشی کا بدترین فعل بھی سرزد ہوا تھا۔ جو ناقابل فراموش اور اذیت ناک تھا۔



”خرم بیٹا!..... ماں کی جان! شیریں نے اپنی الگ تھلک دنیا بسالی ہے۔ اب تم اپنے بارے میں بھی سوچ لو۔“ ماں جی نے خوشامدی لہجے میں کہا۔ ”مجھے اپنا بستا گھر دکھا کر خوش کر دو بیٹا! ایسے آسانی سے موت کو گلے لگا لوں گی۔“

”ماں جی! ڈاکٹر طوبیٰ کو میں نے پسند کیا تھا، مگر وہ شادی کے سخت خلاف ہے۔“

وہ تاسف بھرے لہجے میں بولا۔

”ڈاکٹر طوبیٰ۔ بڑھی گھوڑی لال لکام۔ ساری برادری تمہارا تسنخر اڑائے گی۔ بے شک مجھے وہ بہت اچھی لگتی ہے۔ مگر بہو کے روپ میں ہرگز نہیں۔ اب کی بار تمہاری میں اپنی پسند سے شادی کروں گی۔ تمہیں عورت کا انتخاب کرنا سرے سے آتا ہی نہیں۔ پہلی نصیبوں جلی دس سال چھوٹی، دوسری پسند کر لی دس سال بڑی۔ تمہارا تو دماغ ہی چل گیا ہے۔ چھوٹی کو قابو میں نہ لا سکے، بڑی تو سر اسر تباہی و بربادی ہے تمہارے لئے۔ جب رشتے طے ہوتے ہی تو بہت سی خامیاں واضح طور پر نظر آتی ہیں۔ ہم چشم پوشی سے کام لے کر ایسے انجان بن جاتے ہیں کہ جیسے دوسری پارٹی میں کوئی نقص و خا می تو ہو ہی نہیں سکتا۔ جہاں ہمارا رشتہ جڑ گیا، وہ تو آسمان سے اترے ہوئے فرشتہ خصال لوگ ہیں۔ بعد میں پچھتاوا پیچھا نہیں چھوڑتا کہ اندرونی آنکھ پر یقین ہی کر لیا ہوتا تو آج یہ دن دیکھنا نصیب نہ ہوتا۔“ ماں فکر مندی سے بول رہی تھی اور وہ چپکے سے سن رہا تھا۔

”عمر نکلتی جا رہی ہے۔ تم ہو کہ نہ ایسی سوچ رکھتے ہو، نہ ہی مجھے کچھ کرنے کی اجازت دیتے ہو۔ اب تو شیریں کی بے جا ڈیما نڈ بھی دم توڑ گئی ہے۔“

”میری عمر کسی اسٹیج پر ایٹھو نہیں بن سکتی۔ میں لڑکی تو ہوں نہیں۔ عمر کے کسی حصے

میں بھی جیسی لڑکی کی خواہش کروں گا، حاصل ہوگی۔ کیونکہ یہاں کے والدین بیٹی کی پیدائش سے ہی اس سے جان چھڑانے کی کوشش میں ہوتے ہیں۔ ایک اسی سالہ نکلتا اور گھسیار امرد، سولہ سالہ بیوی حاصل کرنے میں کسی قسم کی محنت نہیں کرتا۔ با آسانی اُس کا پہلو آباد ہو جاتا ہے۔ اس لئے میری عمر کی فکر نہ کریں۔ اس لحاظ سے میں ابھی بچہ ہوں۔ سوچنے سمجھنے کے بعد ہی فیصلہ ہوگا۔ جلد بازی کا انجام تو آپ نے دیکھ ہی لیا ہے۔“ وہ ماں کو سمجھانے کے انداز میں بولا۔

”ٹھیک ہی کہہ رہے ہو۔ بس میں تو ایک مہینے میں چاندی بھولانے والی ہوں۔ انکار یا اعتراض کی گنجائش ہرگز نہیں۔“ وہ لاڈ و پیار سے بولی۔

”فیصلہ کرنے سے پہلے مجھ سے مشورہ ضرور کر لیجئے گا۔“ وہ سنجیدگی سے بولا۔

”پہلے تمہاری پسند کو اولیت دے کر بہت بڑے خسارے کا سامنا کرنا پڑا۔ اسے مجھ پر چھوڑ دو، پھر دیکھو کہ کتنے بڑے گھر کی بھولاتی ہوں۔ تُو تو میرا فرمانبردار بیٹا ہے نا۔ شیریں کی طرح خود سر، گستاخ اور بے لحاظ تو ہرگز نہیں۔ میری بات کو اہمیت دینے والی اولاد تو تم۔“ وہ اس کو پچکارتے ہوئے بولی تو اس نے ماں کے سامنے مسکرا کر سر جھکا دیا۔



”خرم! تمہارا خواب مجھے خوش آئند تعبیر کے ساتھ مکمل ہوتا نظر آ رہا ہے۔“ ماں نے خوشی سے مغلوب ہو کر کہا۔ ”اب تم دو سو کے بجائے ہزار بیڈز کا ہاسٹل بنا سکتے ہو۔ لیلیٰ اپنے والدین کی اکیلی اور بے حد لاڈلی بیٹی ہے۔ ان کی فیکٹریاں، ملیں، بے حساب رزق سب کچھ لیلیٰ ہی کا ہے۔ انہیں تم جیسے شریف اور تعلیم یافتہ لڑکے کی تلاش تھی۔ سو وہ انہیں مل گیا۔ پہلی بار میں ہی انہوں نے منہ میٹھا کرنا نہیں رخصت کیا ہے۔“

”ماں جی! آپ کی دور اندیشی کو داد دیتا ہوں۔ لیلیٰ اپنے نام کی مانند ہے۔ بس یہ قلق کھائے جا رہا ہے۔“ خرم نے قدرے پریشان ہو کر کہا۔ ”دوسرا شادی میں لاچ آگیا تو کہیں ناخوش ہی نہ ہوتا پڑے۔“

”ارے میرے ناسمجھ بیٹے! ویسے کے بعد گوری، کالی، حسین، بد صورت سب ایک ہی کیلگری میں آتی ہیں۔ پھر تو ان کی خصلتیں نمایاں ہو جاتی ہیں۔ جن کی لیلیٰ میں کمی نہیں۔“ وہ سمجھاتے ہوئے بولی۔ ”دوسرا دونوں فریقین رشتہ طے کرتے وقت

مفادات کو بہت اہمیت دیتے ہیں۔ اس میں لالچ کہاں نظر آتا ہے؟“
 ”ماں جی! مجھے تو تمھوڑی ناک چڑھی لگی ہے۔ گردن بھی تتی ہوئی۔ زبان میں بھی
 تلخی، اداؤں میں بھی کافی حد تک بگاڑ پن نظر آتا ہے۔“ وہ اپنے خدشات کا اظہار
 کرنے لگا۔

”ایسی بات تو نہیں ہے۔ دراصل ہے جو اکلوتی اور لاڈلی۔ اس کی کچھ نہ کچھ
 جھلک تو شخصیت میں نظر آئے گی نا۔“ وہ مسکراتے ہوئے بولی۔ ”ایسی لڑکیاں بے حد
 مستقل حراج اور شریف النفس ہوتی ہیں۔ کھری اور سچی اتنی کہ کوئی غیر مردان کے
 سامنے آنکھ اٹھا کر بات کرنے کی ہمت نہیں رکھتا۔ پیار کے چند بول میں ان کو اپنا
 گرویدہ بنانا تو دُور کی بات ہے۔ بیٹے! میرا پالا دنیا کے بھانت بھانت کے لوگوں
 سے پڑتا رہا ہے۔ میں چہرہ مہرہ دیکھ کر انسان کی فطرت کو پہچاننے میں دیر نہیں لگاتی۔
 حدیقہ کے بارے میں میری کوئی پیشین گوئی غلط ثابت نہیں ہوئی۔ اس بار میں بھی
 اول فول نہیں بک رہی۔ میرا دل بھلے کی گواہی دے رہا ہے۔“

”پھر مجھے آپ کی پسند منظور ہے۔“ وہ سوچتے ہوئے بولا۔ ”آپ نے جو بھی
 میرے لئے فیصلہ کیا ہے، اس کا انجام بہتر ہی نظر آ رہا ہے۔“

”مجھے تم سے یہی توقع تھی۔“ اس نے اس کے ماتھے پر بوسہ دیا۔ ”بس پھر دیر
 کس بات کی؟ اگلے مہینے کا پہلا ہفتہ شادی کے لئے بہتر رہے گا۔“

”جیسے آپ کی مرضی۔“ وہ مسکرا رہا تھا۔ یکدم چونک کر گویا ہوا۔ ”ماں جی! حدیقہ
 سے اجازت نامے کے بغیر شادی کرنا قانوناً جرم ہے۔ اس مسئلے کا کیا حل ہو؟ شرعی
 طور پر بھی اسے انکار کرنا ضروری ہے کیا؟“

”شریعت اور قانون کو میں نہیں جانتی۔ اتنا جانتی ہوں کہ میرا بیٹا بھی پگلا ہے
 نرا۔ یہاں کوئی شنوائی نہیں ہوگی اس کی۔ اُن گنت مثالیں میرے سامنے ہیں۔“ وہ
 مستحکم لہجے میں بولی۔ ”میں تو شادی کی تیاری ابھی سے شروع کرنے لگی ہوں۔ اگر
 زیادہ ہی خدشات نظر آ رہے ہیں تو اس گھوڑی بد بخت کو طلاق روانہ کر دو۔“

”طلاق تو نہیں دوں گا۔ وہ بھی کیا یاد کرے گی۔“ وہ دانت پیستے ہوئے بولا۔
 ”اسے تا حیات تنہائی کی مار دوں گا۔ ہارون کو حاصل کر سکے گی، نہ کسی اور کی ہو
 سکے گی۔“

”اس معاملے میں میرا بچہ اتنا دور اندیش ثابت ہوگا، مجھے یقین ہی نہیں آ رہا۔“

ماں خوشی سے نہال ہوتے ہوئے بولی۔

”ماں جی! میں نے بھی زندگی کے تجربات و مشاہدات سے بہت کچھ سیکھا ہے۔ شیریں کے تارک اور گھٹا ٹوپ سائے سے نکل کر دنیا کو پرکھنا سیکھ لیا ہے۔ اور آپ کی بے لوث محبت، مشعل بن کر میری زندگی کی راہوں میں کامیابی کے دیے روشن کر رہی ہے۔ ماں جی! میں بہت خوش قسمت انسان ہوں جسے آپ جیسی ماں نے جنم دے کر نہایت پیار سے پروان چڑھا کر اک مکمل انسان بنایا۔“

”جیتے رہو میرے بچے! دنیا تیری محتاج ہو۔“ ماں نے دل کھول کر دعائیں دیں۔

”بس شیریں کا دکھ کھائے جا رہا ہے، کیسے ہنستے کھیلنے پر باد ہو گئی۔ مجھ سے تو ایسی بدظن ہوئی ہے کہ کبھی مردنا بھی حال احوال پوچھنا گوارا نہیں کرتی۔ بھلا آپ ہی بتائیں کہ میں کیونکر قصور وار ٹھہرایا جا رہا ہوں؟“ خرم نے افسردگی سے کہا۔

”بیٹا جی! کبھی بہن بھائی ایک دوسرے سے کنارہ کشی اختیار کر کے خوش و خرم رہتے ہیں۔ اسے وقتی غصہ ہے، ہم پر۔ شادی کے بعد ہنی مون کے چند دن اس کے پاس گزار آتا۔ سب کچھ درست ہو جائے گا۔ بہت پیار کرنے والی بہن ہے تمہاری۔ تم بھی اپنا دل صاف رکھو۔ بدگمانی حرام ہے۔ کیونکہ فساد کی جڑ ہے یہ۔ اس جڑ کو تم دونوں اپنے وجود سے اکھاڑ پھینکو۔ ورنہ دُوری اتنی طوالت پکڑے گی کہ خون میں ٹھنڈک اور سفیدی آجائے گی۔“ ماں نے اپنے آنسو ضبط کرتے ہوئے بیٹے کو سمجھایا۔

”اس کے بغیر شادی کرنا بہت انوکھا اور عجیب لگ رہا ہے ماں جی! مجھے تو وہ آج بھی اسی طرح پیاری ہے۔ وہ ہی ذہنی مریضہ بن کر میری چاہتوں کو بھول گئی ہے۔“

خرم نے پریشان کن لہجے میں کہا۔

”بیٹے! دل کو نہ لگاؤ۔ وہاں گئی ہے تو بہتر ہو جائے گی۔ اب مجبوری ہے بیٹا! وہ ضد نہ کرتی تو کیا ہی اچھا ہوتا، گھر میں بھابی لا کر چلی جاتی۔ مگر وہ سنتی کب ہے کسی کی؟“ ماں نے دھیمی لہجے میں کہا۔ ”میرے جسم کا حصہ ہے وہ۔ ہر وقت اس کی کمی محسوس کرتی ہوں۔ اس خراب صحت اور بڑھتی ہوئی عمر میں مجھے تو تم دونوں کے دکھ ہی لے ڈوبے۔ میرا یہ وقت تو تمام فرائض سے سبکدوش ہو کر آرام کرنے کا تھا۔“

وہ سکتے ہوئے بولی۔ ”تقدیر کا لکھا مٹ سکتا ہو تو والدین اپنے ہر بچے کا نصیب اپنے ہاتھوں سے لکھ لیں۔ ہم کا تب تقدیر کے سامنے بے بس، مجبور اور لاچار جو ٹھہرے۔“

”ماں جی! آپ پریشان مت ہوں۔ میں شیریں کو یوں بے یار و مددگار کیسے

”چھوڑ سکتا ہوں؟ اس کے بغیر میرا سچا ہمدرد کون ہے؟ اس کا غصہ ٹھنڈا پڑنے کا انتظار کرتے ہیں، پھر مصلحت کی صورت نکلنے کے چانسز سامنے آئیں گے۔ بس آپ ریلیکس رہیں۔ وقت آنے پر سب کچھ درست ہو جائے گا۔“ بیٹے نے ماں کو تسلی دی تو وہ مسکرائے کی کوشش کرتے ہوئے بولی۔

”مجھے اللہ کی ذات پر یقین ہے۔ وہ ہماری مدد کرے گا۔ آپ کا مطمئن رہنا بہت ضروری ہے۔“ اس نے ماں کو اپنے گلے سے لگا لیا۔

”جب سے تمہارے ابا اس دنیا سے رخصت ہوئے ہیں، مصیبتوں کے پہاڑ ہی تو ٹوٹ پڑے ہیں۔ یہ گہرے سیاہ بادل کب چھٹیں گے؟ کب رات گزرے گی اور دن اپنی روشنیوں کے ساتھ نکلے گا؟“ وہ بیٹے کا پیار پا کر کرب سے پھوٹ پڑی۔



پاکستانی
ڈاٹ کام

”حدیقہ! گھر سے فون آیا ہے۔ ایک بہت بری خبر ہے تمہارے لئے۔“ اس نے اپنی چیز اس کی طرف گھما کر آہستہ سے کہا۔ دونوں ایک ہی آنس میں اپنا اپنا کام کیا کرتے تھے۔ حدیقہ ابھی تک انڈر ٹینگ تھی۔ تمام اکاؤنٹس کا نالج ہارون سے ہی حاصل کر رہی تھی۔ گوکہ اس کا پروفیشن مختلف تھا، مگر اسے اپنی کمپنی کے لئے یہ ذمہ داری اٹھانا قطعاً مشکل نہیں لگ رہا تھا۔ وہ جذبہ شوق سے ہارون کے ساتھ دن رات محنت و مشقت کر رہی تھی۔ حدیقہ اس کی بات سنی ان سنی کر کے اپنے کمپیوٹر کی جانب متوجہ ہو گئی۔ ہارون بھی اسے اس حد تک مصروف دیکھ کر اپنے کام میں لگ گیا۔

رات دیر تک دونوں کام میں اس قدر مصروف تھے کہ وقت کے گزر جانے کی خبر ہی نہ ہوئی۔ تمام ورکرز جا چکے تھے۔ آخر ہارون کو بھوک کی شدت نے ستایا تو وہ چونک کر کھڑا ہو گیا۔ دونوں ایک ہی ریسٹورنٹ میں کھانے کے لئے چلے گئے۔

جب تک کھانا پہنچا، حدیقہ کی دنیا ہی بدل چکی تھی۔ ہارون نے اسے خرم کی شادی کی خبر گوش گزار کر دی۔ وہ بے بسی سے اسے دیکھتے ہوئے میز پر سر رکھ کر رونے لگی۔

ہارون نے کھانا پیک کر دیا اور حدیقہ کو سہارا دے کر گاڑی تک لے آیا۔ وہ بھٹکل گاڑی میں بیٹھ پائی۔ آج کے غیر متوقع مڑھوہ نے اسے ذہنی اور جسمانی طور پر کمزور کر دیا تھا۔

گاڑی حدیقہ کے اپارٹمنٹ کے سامنے رکی۔ ہارون اسے سہارا دے کر اندر لے آیا۔ اسے صوفے پر بٹھا کر اپنے ہاتھ سے کھانا کھلانے کی کوشش کی۔ مگر حدیقہ نے ایک نوالہ بھی کھا کر نہ دیا۔ ہارون نے زبردستی اسے گرم دودھ پلایا اور ٹرائیکولا زر کھلا کر اسے بیڈ تک لے گیا۔ وہ بے چارگی کے عالم میں بے حس و حرکت لیٹی رہی۔

ہارون نے بیسیوں بار اس کی زبان سے چند الفاظ اُگھوانے کے لئے سینکڑوں باتیں کیں۔ مگر وہ تو سکتے میں چھت کو گھورے جا رہی تھی۔ اور اسی عالم میں اس کی آنکھیں نیم داہو گئیں۔

ہارون نے ٹیبل لیپ کی لائٹ آف کی اور اس کے ساتھ بیڈ پر نیم دراز ہو کر اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرنے لگا۔ انتہائے بے بسی میں وہ کچھ بھی نہ بول پائی۔ اسے اس کی شبیہ میں مسیحا نظر آیا تھا۔ آہستہ آہستہ اس کے ہاتھوں کے لمس میں سکون محسوس کرتی نیند کی گہری وادیوں میں کھوتی چلی گئی۔

آج اس کی کمزوری، کرب اور لاچارگی پر ہارون کی تمام ہمدردیاں شیطانی روپ دھار کر اس کی شخصیت پر غالب آ گئیں۔

صبح جب حدیقہ کی آنکھ کھلی تو خود کو ہارون کی بانہوں میں سوتا پا کر چونک کر اٹھا اور اس کا جائزہ لیا۔ گزشتہ رات کا دھندلا سا خاکہ ذہن میں اک ہو کر اکبر اور وہ بیڈ سے چھلانگ لگا کر حیرت و تاسف میں دور جا کر کھڑی ہو گئی۔

”آخر آج میری بے بسی کا تم نے فائدہ اٹھا ہی لیا ظالم درندے!“ وہ زور سے چیخی تو ہارون آنکھیں ملٹے ہوئے بیٹھ گیا۔

”ہارون! میرے اعتماد کا گلا گھونٹنے سے پہلے کچھ تو سوچ لیا ہوتا۔ تم نے اپنی بہن کی عزت لوٹ لی۔ تم مرکبوں نہ گئے وحشی کہیں کے؟..... تم پر اللہ کی لعنت ہو۔ تم نے میری بے بسی کو اپنی ہوس کا نشانہ بناتے وقت یہ بھی نہ سوچا کہ میں اس سانحہ کے بعد تمہارے بغیر کتنی اکیلی ہو جاؤں گی؟ کاش! تم میرا گلا ہی گھونٹ دیتے۔“

”آئی ایم سوری حدیقہ! یہ سب کیسے ہوا، کیا ہوا؟ آئی ڈونٹ نو۔“ اس نے آگے بڑھ کر اسے گلے لگا لیا۔ ”میرے لئے جو حکم صادر کرو گی، میں تعمیل کرنے میں تاخیر نہیں کروں گا۔“ لہجے میں بے پناہ ندامت تھی۔

”بس آپ یہاں سے چلے جائیں۔ میں آپ کو کبھی معاف نہیں کروں گی۔ اپنی منحوس شکل یہاں سے لے کر دفع ہو جائے۔“ وہ اس کے بازوؤں کی گرفت سے نکل گئی۔

”مجھ سے انجانے میں بہت بڑی غلطی سرزد ہو گئی۔ مجھے معاف کر دو۔ میں تم سے شادی کروں گا حدیقہ! مجھے تم سے بے پناہ پیار ہے۔ مجھے تم جیسی شریک حیات ڈھونڈنے سے بھی نہیں مل سکتی۔ اب خرم کا راستہ دیکھنا چھوڑ دو۔“ وہ اس کے قریب آ

کر مستحکم لہجے میں بولا۔

”میں مرتے دم تک خرم کا انتظار کروں گی۔ اور جو زیادتی مجھ پر آپ کی طرف سے ہوئی ہے، اس کا بدلہ ضرور لوں گی۔“ وہ پھر چیخ اٹھی۔ ”بس چلے جائیے یہاں سے۔“

”میں تمہیں اس حالت میں اکیلے چھوڑ کر نہیں جاؤں گا۔“ وہ ملائمت سے بولا۔

”بی پریکٹیکل میری جان! ہوش میں آؤ۔ پاگل پن میں زندگی گزارنا بہت مشکل ہے۔“

”تو کیا کروں؟“ وہ بے بسی میں مائی بے آب کی مانند تڑپ اٹھی۔

”میں کیا کروں؟ کہاں جاؤں؟..... ہارون! مجھے گولی مار کر ختم کر دیں۔ میں زندہ نہیں رہنا چاہتی۔ مجھے آپ نے بھی دھوکا دے دیا۔ آپ تو خرم سے بھی بدتر نکلے۔ بھلا کوئی بھائی اپنی بہن کے ساتھ ایسا گھناؤنا عمل کر سکتا ہے؟“

”میں نے تمہیں کئی بار کریکٹ کرنے کی کوشش کی ہے کہ منہ بولے رشتوں کو ہمارے مذہب میں کوئی اہمیت حاصل نہیں۔“ وہ نرمی سے بولا۔ ”ہم دوست ضرور ہیں لیکن بہن اور بھائی نہیں ہیں۔ اس رشتے سے باہر نکل کر دیکھو۔ میں تمہاری راہوں میں آنکھیں بچھائے بیٹھا ہوں۔“

”میں نے تو آپ کو اپنا محرم سمجھا تھا۔ آپ نے ہی میری عزت پر ڈاکہ ڈال دیا۔ مجھے کہیں کا نہیں چھوڑا۔ میں کس منہ سے خرم کا سامنا کروں گی؟“ وہ دھاڑیں مار مار کر رونے لگی۔

”او پگلی! اُس نے شادی کر لی ہے۔ پجوشن کو سمجھنے کی کوشش کرو۔“ اس نے اسے اپنے سینے سے نگالیا اور اس کی سسکیوں کی آواز اور بلند ہو گئی۔ ”میری جان! ہم ایک دوسرے کے لئے بنائے گئے ہیں۔ تمہیں میری بات سمجھ کیوں نہیں آتی؟ خرم کی یادوں کو اپنے دل سے نکال دو۔ طلاق کا مطالبہ کرنا تمہارا حق بنتا ہے۔ میں اللہ تعالیٰ کو حاضر و ناظر جان کر گواہی دیتا ہوں کہ میرے دل و جان نے تمہیں زندگی بھر کا ساتھی مان لیا ہے۔ تم بھی مجھ پر مکمل بھروسہ رکھو اور مجھے دل کی گہرائیوں سے اپنا مان لو۔ دونوں کی زندگی آسان اور کامیاب ہو جائے گی۔“ وہ اسے پیار کرتے ہوئے سمجھانے لگا۔

”نہیں ہارون! میں طلاق کا مطالبہ نہیں کروں گی۔ اگر اس نے خود مجھے اپنے نام سے آزاد کر دیا، میں پھر بھی آپ سے شادی کر کے اپنی ذات پر لگائی جانے والی

جھوٹی تہمت کو تسلیم نہیں کروں گی۔ آج میرا سرنگوں کر دیا ہے آپ نے۔ اُف میں کہیں کی نہیں رہی۔ ہم نے اپنی زندگی میں اُن گنت راتیں ایک ساتھ گزاری تھیں۔ آج کی پریشان کن رات اتنی سفاک اور جابر کیسے ہو گئی؟ آج آپ نے تہمت کو سچا کر دکھایا۔ اب تو قسم بھی نہیں اٹھا سکتی سب کے سامنے۔ میں یہاں نہیں رہوں گی۔ لٹی لٹائی اک لاوارث بیٹی آخر کار اپنی ماں کی آغوش میں ہی دم توڑنے کو چلی جائے گی۔“ وہ ابھی بھی تاسف میں روئے جا رہی تھی۔

”پاکستان واپس جانے کے تمام بند راستوں کو کیسے کھولو گی؟ وہاں کون ہے جو تمہارا انتظار کر رہا ہے؟ بتاؤ مجھے، کون تمہیں میرے جیسا پیار، ہمدردی اور سکيورٹی دے گا؟“ وہ اس کے آنسو صاف کرتے ہوئے بولا۔

”سکيورٹی۔“ وہ طنز سے مسکرائی۔ ”اس کی تو آپ نے ایک مثال قائم کر دی ہے۔ میں دنیا کی تمام حوا کی بیٹیوں کو چیخ چیخ کر بتاؤں گی کہ کبھی کسی مرد کو اپنی جان و مال اور عزت کا محافظ سمجھنے کی غلطی نہ کرنا۔ وہی تمہاری عزت کو داغ دار کرے گا اور جان و مال کا دشمن ثابت ہوگا۔ وہ مرد، جن پر تم نے بھروسہ نہیں کیا، ان میں نہ ہمت ہوگی اور نہ ہی اتنی جرأت کر سکیں گے۔ تمہارے قریب آنے سے خائف رہیں گے۔ یہی خوف زدہ اور تمہارے لحاظ و ادب میں سبے ہوئے مرد تمہارے محافظ ثابت ہو سکتے ہیں۔ میں نے اپنا سب کچھ گنوا کر زندگی کا کتنا اہم سبق سیکھا ہے ہارون! آج کے بعد میرا آپ سے نہ تو کوئی رشتہ ہے، نہ ہی کسی قسم کی سانجھ۔ میں کمپنی سے ودّرا کرنا چاہتی ہوں۔ کیونکہ میں ایک لمحے کے لئے بھی آپ کے ساتھ چلنے کی بے غیرتی نہیں کر سکتی۔“ وہ خود کو سنبھالتے ہوئے طولانی تمہید باندھے جا رہی تھیں۔

”تم سرے سے پاگل ہو گئی ہو حدیقتہ! تم نے اپنی زندگی میں ہر ایک کو کھو دیا اپنی سادگی اور سچائی کی وجہ سے۔ یہ زمانہ ایسی فطرت کے لوگوں کا ساتھ نہیں دیا کرتا۔ تم جیسے لوگ یہاں سانس تو لے سکتے ہیں مگر جینے کے مزے نہیں لوٹ سکتے۔ ابھی بھی میری بات مان جاؤ اور ایک فیصلہ کرو۔ کیونکہ ہم دونوں ایک دوسرے کے لئے مناسب ہیں۔ میں بارہا تمہیں سمجھا چکا ہوں، انزام کو سچائی کا روپ دینے میں ہمارا نہ نقصان ہے، نہ ہی ندامت۔ اذیت اور جان لیوا دکھ میں وہ دونوں بہن بھائی تا زیست مبتلا رہیں گے۔ تم اپنی سوچ کا دھارا بدل کر تو دیکھو۔ ہم دونوں کہیں سے بھی گھائلے میں نہیں ہیں۔“

وہ اس کے لئے کافی بنانے لگا اور وہ خاموشی سے سر جھکائے سوچنے لگی۔
 ”کیا آپ کا خاندان مجھے قبول کر لے گا؟“ وہ ایک طویل توقف کے بعد بولی۔
 ”ہرگز نہیں۔“ وہ سنجیدگی سے بولا۔
 ”اعتراضات آنے پر آپ مجھے با آسانی چھوڑ دیں۔“ وہ چونک اٹھی۔ ”جیسے میری ماما کے ساتھ ہوا۔“

”ایک تو ماما تمہاری سس ٹس میں بستی ہیں۔“ وہ مضطرب سا ہو گیا۔
 ”غلطی ایک کینسر کے موذی مرض کی مانند ہے۔ جب تک کینسر کا کثیر، انسان کے ہر عضو کو چاٹ نہیں جاتا، اس کی جان نہیں چھوڑتا۔ اور آخر یہ مرض موروثی بن کر کتنی ہی نسلوں کا خاتمہ کرتا چلا جاتا ہے۔ میں نہیں چاہتی کہ میرے بعد میری غلطی کا خمیازہ اگلی نسل بھگت رہی ہو۔“

”تم اپنے وجود میں کھے ہوئے اس ڈر سے چھٹکارا حاصل کرنے کی کوشش کرو حدیقہ! اگر تمہاری ماما کی زندگی کامیابیوں سے ہمکنار ہوتی تو کیا تمہارا نصیب ماں کے ساتھ منسلک ہوتا؟..... ایسا ہرگز نہیں ہوتا۔ ہر بچہ اپنی قسمت لے کر پیدا ہوتا ہے اور اسی کے مطابق زندگی گزارتا ہے۔“ وہ نرمی سے سمجھانے لگا۔

”میں اس تھیوری پر یقین نہیں رکھتی۔ والدین کے اخلاقیات، گھر کا ماحول اور گرد و پیش کے حالات ایک بچے کے مقدر کو سنوارنے میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ میری زندگی کے ہر لمحے پر غور کریں۔ میرے ساتھ زیادتیاں اور نا انصافیاں کیوں ہوتی رہیں؟ نہ تو والدین کی تکجہتی ہوئی، نہ ہی ان کے اخلاقیات اعلیٰ تھے۔ پچھتاوے اور ندامت کا جان لیوا احساس اور تنہائی اور مفلسی۔ ان تمام لعنتوں کے ساتھ احساس محرومی اور لاوارثی کے جان لیوا اثرات ذہنی طور پر مجھے اتنا کمزور اور لاغر کرتے گئے کہ دوسروں کے سہارے ڈھونڈنے لگی۔ سب چھوڑ گئے تو آپ کو اپنا بھائی مان لیا۔ مگر افسوس کہ آپ نے بھی وہی کیا جو زمانہ لاوارثوں، یتیموں اور بیواؤں کے ساتھ کرتا آیا ہے۔ لیکن آپ ایک بات یاد رکھیں۔ بعض اوقات گلیوں میں روندے جانے والے تینکے بھی بہت کارگر ثابت ہوا کرتے ہیں۔ آپ نے تو مجھے تینکے کا مقام بھی نہ بخشا۔ کس جرم کا بدلہ لیا ہے مجھ سے؟“ وہ پھر زار و قطار رونے لگی۔

”تم اپنے بارے میں ایسا کیوں سمجھتی ہو؟ میں تو تمہیں اپنا نام، اپنی زندگی عطا کرنے کا خواہش مند ہوں۔“ وہ افسردگی سے بولا۔

”اب آپ پر اعتماد نہیں کروں گی۔ آپ یہاں سے تشریف لے جائیں۔ آئندہ کے لئے میرا کیا پروگرام ہے؟ وہ میں جانوں اور میرا کام جانے۔ آپ سے نہ کوئی میرا تعلق ہے، نہ ہی کوئی رشتہ ہے۔ اُٹھیے یہاں سے۔“ وہ دروازے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی۔

”میں تمہیں اس حالت میں چھوڑ کر نہیں جاؤں گا۔“ وہ ڈھٹائی سے بولا۔

”میں جیوں یا مروں، آپ سے مطلب؟“ وہ غصے میں بولی۔

”بہت ضدی عورت ہو تم۔“ وہ بھی غصے میں بولا۔ ”مرد کے بغیر کوئی عورت مکمل نہیں ہے۔ جس دن تمہیں یہ احساس ہو گیا تو میرے پاس چلی آنا۔ میرے دل کے درپے تمہارے انتظار میں ہمیشہ کھلے رہیں گے۔“

وہ اٹھ کر باہر جانے لگا تو وہ اس کے سامنے کھڑی ہو گئی۔

”میری لوٹی ہوئی عزت کو واپس کرتے جاؤ ظالم کہیں گے۔“

”تم ہوش میں نہیں ہو حد یقہ!“ وہ اس کو تھام کر بولا۔ ”تیار ہو جاؤ۔ ہم دونوں آفس چلتے ہیں۔ مصروفیت لا علاج امراض کی دوا ہے۔ کیا اک بے وفا اور خود غرض شوہر کی خاطر اپنی تمام زندگی کو حسرت و یاس کے سپرد کر دو گی؟ بھول جاؤ اسے۔ جو سامنے ہے، اسے اپنا لو۔ پیشین گوئیاں کرنا چھوڑ دو۔ مستقبل میں کیا ہونے والا ہے؟ یہ علم نہ تمہارے پاس ہے، نہ ہی میں اس کا دعویٰ کرتا ہوں۔ مجھ سے جو غلطی انجانے میں سرزد ہوئی ہے، اسے بھی بھول جاؤ۔ آج سے مجھے آزمائے جانے کا پیمانہ بدل ڈالو۔ شاید تم مجھے اپنے مد مقابل محسوس کر سکو۔“

”نہ خرم کو فراموش کر سکتی ہوں، نہ ہی تمہاری بے باک غلطی کو۔ مجھے تنہا چھوڑ

دو۔ مجھے سوچنے دو کہ میرے ساتھ تم نے جو کیا ہے، اس میں، میں کہاں پر غلط تھی۔“ وہ بے چارگی سے بولی۔

”میں تمہیں اسٹامپ پیپر پر لکھ دیتا ہوں، غلطی مجھ سے ہوئی ہے، تم اس میں شریک تھی نہ ہی کبھی اشارتا مجھے خوش فہمی میں مبتلا کیا۔ آج مجھ پر اللہ تعالیٰ کے فرمان کا مقصد واضح ہو گیا ہے کہ جوان بہن اور بھائی کو علیحدگی میں بیٹھنے سے کیوں منع کیا گیا ہے۔ جب اس کے احکامات کو نظر انداز کر کے ہم خود پر اس حد تک بھروسہ کرنے لگ جائیں گے تو انجام یہی ہو گا۔ اور پھر ہمارا تو ایسا خونی رشتہ بھی نہ تھا۔ حد یقہ! مجھے صدقِ دل سے معاف کر دو۔ تم سے شادی کے بعد میں اس کمپنی کا واحد مالک تمہیں

ڈکیر کر دوں گا۔“ اس کے لہجے میں ندامت اور پچھتاوا، درد بن کر ابھر آیا تھا۔
حدیقہ کی نظریں جھک گئیں۔

”تیار ہو جاؤ۔ آفس چلتے ہیں۔ ناشتہ راستے سے ہی پکڑ لیں گے۔“ وہ پیار
بھرے لہجے میں بولا تو وہ اس کے کندھے پر سر رکھ کر پھر سے دھاڑیں مارنے لگی۔
ہارون کی آنکھیں بھی اشکبار ہو گئیں۔



”خرم! تم جانتے ہو کہ میں اپنے والدین کی اکلوتی اولاد ہوں۔ ان کی تمام
جائیداد کی مالک۔“ لیلیٰ نے کبر و پندار سے بھنوں میں چڑھا کر کہا۔
”جانتا ہوں۔“ وہ معمولی سا مسکرا دیا۔ ”مگر مجھے اس جائیداد سے کوئی سروکار
نہیں۔ نہ ہی تمہارے ابا کے بینک بیلنس سے واسطہ ہے۔“
”یہ درلڈ ٹورکس کا عنایت کردہ ہے، کچھ معلوم ہے؟“ وہ تن کر بولی۔
وہ خاموش رہا۔ وہ پھر رعب و دبدبے سے بولی۔

”اصولاً ہمیں ابا جان کے گھر شفٹ ہو جانا چاہئے۔ رشتہ طے کرتے وقت
میرے والدین نے آپ کو گھر داماد رکھنے کی خواہش کا اظہار ماں جی سے کروایا تھا۔
انہوں نے آپ کو نہیں بتایا؟“ وہ ڈائمنڈ کی چوڑیوں سے کھیلتے ہوئے بولی۔
اچھا..... تو اب سمجھ آئی کہ ماں جی بستر سے اٹھ کیوں نہیں رہیں؟ انہوں نے سر
کیوں باندھ رکھا ہے؟ کھانا کیوں نہیں کھا رہیں؟..... مجھ سے نظریں چرا کر درد دل
چھپا رہی ہیں۔ کیونکہ انہوں نے جو سوچا تھا، تمام اس کے برعکس نکلا۔ وہ دل ہی دل
میں سوچنے لگا۔ حدیقہ کا حسن، معصومیت اور الفت بھری باتیں اس کے کانوں میں
گوونجنے لگیں۔

”لگتا ہے، پہلی بیوی یاد آ رہی ہے۔ آخر تو میرج تھی۔ بھلا کیسے بھلائی جاسکتی
ہے؟“ وہ طنزیہ لہجے میں بولی۔

”ایسی کوئی بات نہیں۔“ وہ سر جھٹک کر بولا۔

”اچھا تو بتاؤ کب تک شفٹ ہونے کا پروگرام ہے؟“ وہ سختی سے بولی۔

”فی الحال ماں جی کی طبیعت ناساز ہے۔ اس وقت انہیں ہماری ضرورت ہے۔“

وہ صوفے سے اٹھتے ہوئے بولا۔

”میری بات کی کوئی اہمیت ہی نہیں۔ خرم! تم بچے نہیں ہو جو اٹھتے بیٹھتے ماں کے

درد میں ہلکان ہوتے رہتے ہو۔ میری شادی نا سمجھ، دودھ پیتے بچے سے ہرگز نہیں ہوئی۔ ہماری ہر بات میں تمہاری ماں ٹپک آتی ہے۔ اصل بات کو چھوڑ کر تم کسی اور ہی ٹریک پر نکل جاتے ہو۔ مجھے ایسی فضول گفتگو بالکل پسند نہیں۔ کیا ہنی مون منانے کے مقصد کو جانتے ہو؟ ایک دوسرے کو سمجھنے کا گولڈن چانس ہوتا ہے۔ اس وقت بھی ماں اور شیریں سر پر سوار رہیں۔ حدیقہ کے حُسن کے قصیدے سن سن کر میرے کان ہی تو یک گئے ہیں۔ اتنی ہی دماغ پر چھائی ہوئی تھی تو مجھ سے شادی کیوں کی؟“

”کیلی! تم میری شرافت کا ناجائز فائدہ اٹھانے کی کوشش مت کرو۔ منہ کی کھاؤ گی۔“ وہ تیز لہجے میں بولا۔

”میرے سامنے آج تک کسی نے آنکھ اٹھا کر بات تک نہیں کی۔ تم کس بل بوتے پر رعب جمانے لگے ہو؟ تمہاری بیوی ضرور ہوں لیکن باندی یا رکھیل نہیں ہوں کہ جب چاہو بے وجہ چڑھائی کرتے جاؤ۔ آئندہ منہ سنبھال کر بات کرنا۔“ وہ چیخ اُٹھی تھی۔ وہ کمرے سے باہر نکلنے لگا تو وہ سامنے آ کر بولی۔

”دفع ہو جاؤ اپنی ماں کے پاس۔ آئندہ اس کمرے کی جانب رخ کرنے کی گستاخی مت کرنا۔ ماں جی..... ماں جی ایک ڈرامہ بن گئی ہیں۔“

”بکواس بند کرو۔ ورنہ.....“ وہ چیخ اُٹھا۔

”ورنہ کیا کرو گے؟ مجھے مارو گے؟ تمہارے ہاتھ نہ تڑوا دوں؟“ وہ قریب آ کر بولی۔ ”اگر تم اپنے باپ کی اولاد ہو تو ذرا ہاتھ اٹھاؤ۔ وہ مزا چکھاؤں گی کہ تمہاری نسلیں یاد رکھیں گی۔“

”تم بیوی ہو میری۔ اپنی حیثیت پہچانو اور حد میں رہو۔“ وہ غصے میں کانپنے لگا۔

”نکل جاؤ یہاں سے۔ بڑے گھر کی بیٹی ہونے کے باوجود کس قدر حقیر اور گری ہوئی سوچ ہے۔ بڑا پن خصلتوں، کردار اور اخلاقیات سے شخصیت میں نمایاں ہوتا ہے۔ تم نے دین و ایمان صرف پیسے کو بنا رکھا ہے۔ میرے ساتھ یہ سب کچھ نہیں چلے گا۔ سوچ لو۔“ وہ پاؤں پٹختا ہوا ماں کے کمرے کی طرف بڑھ گیا اور وہ ہکا بکا اُسے جاتا ہوا دیکھتی رہ گئی۔ ایسا ردِ عمل تو اس نے زندگی میں پہلی بار دیکھا تھا۔ وہ کس نفرت اور حقارت سے اسے ٹھکرا کر چلا گیا تھا۔

وہ رات بھر انتظار کرتی رہی مگر وہ واپس نہ آیا۔ اور وہ اپنی اکڑ و غرور میں گرفتار اسے منانے کا تصور بھی نہیں کر سکتی تھی۔

ماں حالات سے سمجھوتہ کر کے اپنے بیٹے کے گھر کو آباد رکھنا چاہتی تھی۔ مگر خرم کسی صورت ہتھیار ڈالنے کے لئے تیار نہ تھا۔ گھر میدان جنگ بن چکا تھا۔ لیلیٰ نے کئی بار خرم کو غصے و نفرت سے جھنجھوڑا۔ ماں جی کی بے حرمتی میں کیا کچھ بکتی رہی۔ خرم نے اس کے والدین کو تمام حالات سے باخبر کیا تو وہ اس مسئلے کا حل تلاش کرنے لگے۔ اور آخر کار بات یہاں پر اختتام پذیر ہوئی کہ خرم اپنی ماں، اپنا گھر اور خاندان چھوڑ کر گھر داماد بن جائے۔ کھلے لفظوں میں ماں جی سے پہلے بھی کہا گیا تھا۔ جس کے بعد گھر میں ہر وقت کی چپقلش شروع ہو گئی تھی۔ خرم نے آج بھی انکار کر دیا تھا۔ ماں کی منت و سماجت کی پروا کئے بغیر وہ لیلیٰ کو اس کے میکے چھوڑ کر گھر واپس آ گیا۔

چند دنوں بعد لیلیٰ کا فون آیا۔ ہر بار خرم نمبر دیکھ کر فون بند کر دیتا۔ آخر تک آ کر اس نے سر پھری بیوی کی کال اٹینڈ کر لی۔

”خرم! میں تمہیں انفارم کرنا چاہتی ہوں کہ میں تمہارے بچے کی ماں بننے والی ہوں۔“ لہجے میں اکڑ و تکبر بدستور قائم تھا۔

”مبارک ہو لیلیٰ! تم کیسی ہو؟ اپنا خیال رکھو۔“ وہ بھرپور خوشی میں بولا۔ ”میں ابھی آتا ہوں۔ اتنی بڑی خبر چھپائے بیٹھی ہو۔“

”آنے کی قطعاً تکلیف نہ کرنا۔ کیونکہ میں تمہارے بچے کو جنم نہیں دینا چاہتی۔ بے چارہ باپ کے بغیر بل کرنا مکمل ہی رہے گا۔ اسے دنیا میں لانے کا کوئی حق نہیں پہنچتا مجھے۔“ وہ لا پرواہی سے بولی۔

”یہ کیا مذاق ہے؟ تم تیار ہو جاؤ۔ میں تمہیں لینے آ رہا ہوں۔ تم میری آنکھوں کے سامنے ہو گی تو مجھے اور ماں جی کو تسلی اور بے فکری رہے گی۔“ وہ اس کی بات کو نظر انداز کرتے ہوئے بولا۔

”اگر تمہیں بچے کی خواہش ہے تو اپنی کنیا کو چھوڑ کر میرے محل میں آ جاؤ۔ میں اپنے والدین کو تنہا چھوڑ کر تمہارے ساتھ ایک دن بھی نہیں گزار سکتی۔“ وہ بدتمیزی سے بولی۔

”یار! اب تو لڑائی جھگڑا چھوڑو۔ ہم پر تو اللہ کے فضل و کرم کے دروازے کھل گئے ہیں۔ شکرانہ ادا کرنے کا وقت ہے نہ کہ دنگا فساد کرنے کا۔“ وہ محبت سے سمجھانے لگا۔

”خرم! تم نے مجھے جس گھر سے توہین اور بے عزتی سے نکالتے ہوئے یہ بھی نہ

سوچا کہ میں تمہاری بیوی ہوں، میرے تم پر ان گنت حقوق ہیں۔ اگر میں نے اپنے تنہا والدین کے ساتھ رہنے کا نیک ارادہ کر لیا ہے تو کوئی ظلم نہیں کیا۔ اب اس گھر میں واپس آنا میری خودداری اور انا کی توہین ہے۔ میرے گھر کے دروازے تمہارے لئے ہر وقت کھلے ہیں۔ جبکہ میں تمہارے گھر میں بے وقعت اور بے حیثیت ہوں۔ جسے دھتکارتے ہوئے یہ خیال بھی نہ آیا کہ میں کس باپ کی بیٹی ہوں۔“ وہ افسردگی سے بولی۔

”چلو یار! غصہ تھوک دو۔ ہماری زندگی کا نیا سفر اپنی تمام تر رعنائیوں اور شادابیوں کے ہمراہ شروع ہونا چاہئے۔ اگر تم والدین کے پاس خوش اور مطمئن ہو جاؤ تو مجھے تمہارا وہاں رہنا منظور ہے۔ میں چکر لگاتا رہوں گا۔“ وہ پیار بھرے لہجے میں بولا۔

”اس احسان کی ضرورت نہیں خرم! آپ اپنی ماں کی خدمت گزاری کریں۔ میری نگہداشت کرنے والوں کی ایک فوج یہاں ہر وقت موجود ہوتی ہے۔“ اس نے زہر آلود لہجے میں کہا اور فون بند ہو گیا۔

”عجیب عورت ہے۔ ماں جی نے کہاں پھنسا دیا ہے؟“

وہ سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ اس کے کانوں میں حدیقہ کی فریادوں کی آواز گونجنے لگی۔

”خرم! مجھے بچ چاہئے۔ مجھے نامکمل اور بے کار عورت بن کر زندگی گزارنا پسند نہیں ہے۔ مجھے ماں بننے اور ماں کہلوانے کا شوق ہر وقت مضطرب رکھتا ہے۔“

”خرم بیٹا! کیا پریشانی ہے؟“ ماں نے کمرے میں جھانک کر پوچھا۔

”خوشخبری ہے ماں جی!“ وہ بتاؤٹی مسکراہٹ سے بولا۔

”جلدی بتاؤ بیٹا! یہ کان اچھی خبر سننے کو ترس گئے ہیں۔“ وہ بے چینی سے بولی۔

”آپ دادی بننے والی ہیں۔“ وہ سنجیدگی سے بولا۔

”ارے، دادی بننے والی ہوں؟..... بتانے میں دیر کیوں کر دی؟..... منہ میٹھا کراؤ۔ ایسے تو خلاصی نہیں ہوگی تمہاری۔“ وہ مسرت آگئیں لہجے میں بولی۔

”مگر ماں جی! ایک مسئلہ درپیش آ گیا ہے۔“ وہ دکھ بھرے لہجے میں بولا۔ ”اگر میں وہاں شفٹ نہیں ہوں گا تو وہ بچہ ضائع کر دے گی۔“

”ایسے ہی تمہیں دھمکی دے رہی ہوگی۔ یہ فیصلہ عورت تو کیا، کوئی ڈائن بھی نہیں کر سکتی۔“ وہ تسلی دیتے ہوئے بولی۔

”وہ عورت کے اوپ میں ڈائن ہے، چڑیل ہے، پھل پیری ہے ماں جی! یہ

آپ کس کو بہو بنا کر لے آئیں؟“ وہ تڑپ اٹھا۔

”تمہاری بہتری کے لئے ہی تو یہ قدم اٹھایا تھا۔ مجھے علم نہ تھا کہ وہ ہمیں اتنی چھوٹی نظر سے دیکھے گی۔ ہائے ہماری قسمت۔ چھوٹے گھر کی بیٹی کے لچھن بھی دیکھ لے اور بڑی گھر کی بیٹی کے طور اطوار بھی پرکھ لے۔“ وہ ہاتھ ملنے لگی۔

”ماں جی! کہیں اللہ تعالیٰ ہمیں سبق تو نہیں سکھا رہا؟ کیونکہ ہم نے حدیقہ کو جتنا حقیر اور ناتواں سمجھ کر ناروا سلوک کیا تھا۔ اس کی کبھی ایک نہ سنی۔ اپنے احکامات مسلط کر کے اپنی بڑائی اور توانائی کو منواتے رہے اور وہ سب کچھ سہتی رہی۔ مگر ہمیں کبھی احساس ہی نہ ہوا۔ کہیں ہماری پکڑ تو نہیں ہو گئی ماں جی؟“ لہجے میں تاسف تھا۔

”ایسی بھی بات نہیں بیٹا! اگر وہ بلند کردار ہوتی تو آج ان پریشانیوں کا سامنا نہ کرنا پڑتا۔ وہ تو ایسی مخوس نکلی کہ اس گھر کو تنکا تنکا کر گئی۔ میری بچی پرائے دیس میں بچوں کے ساتھ نہ جانے کس حال میں ہو گی۔ ہمارے ساتھ تو انہونی ہوئی ہے بیٹے! ہمارے گھر کی کہانیاں ہر فرد کی زبان پر ہیں۔ خاندان میں منہ دکھانے کے لائق چھوڑا، نہ ہی محلے میں عزت سلامت رہی۔ یہ سب اسی کا کیا دھرا ہے۔ اس لئے خود پر الزام تراشیاں لگا کر خود کو مزید پژمرده مت کرو۔“ ماں کڑواہٹ سے بھرپور لہجے میں بولی۔

”آپ درست فرما رہی ہیں۔ مگر لیلیٰ کا کیا، کیا جائے؟ وہ تو کسی صورت کوئی بھی بات سننے کو تیار نہیں۔“ وہ بے بسی سے بولا۔ ”بہت بے لگام اور منہ پھٹ عورت ہے۔“

”مجھے چھوڑ جاؤ۔ اپنا گھر اور خوشیاں اپنانے کی کوشش کرو۔ میری خیر ہے۔ ملاقات تو ہوتی ہی رہے گی۔“ وہ بمشکل بولی۔

”آپ کو کس کے سہارے چھوڑ دوں ماں جی؟ بیویاں بل بھر میں سینکڑوں مل جاتی ہیں۔ ماں صرف ایک ہی ہوتی ہے۔ آپ پر ایسی ہزاروں بیویاں وار دوں۔ آپ کیا بات کرتی ہیں؟“ وہ عقیدت سے بولا۔

”اتنے فرمانبردار بیٹے کی تقدیر تو سنہرے حروف سے لکھی جانی چاہئے تھی۔ یہ بے انصافی کیونکر ہو گئی میرے لختِ جگر؟ یہ سوچ کر کسی بھی بھید کی پردہ کشائی نہیں کر سکی۔ یہ راز اوپر والا ہی جانتا ہے۔“ وہ آنسو صاف کرتے ہوئے بولی۔

”آزمائشیں انسان کی اپنی نیت، ارادے اور اعمال سے رونما ہوتی ہیں۔ اس کے ذمہ دار ہم خود ہیں۔ خدا تعالیٰ کی طرف سے اچھائی ہے۔ برائی ہرگز نہیں۔“ خرم سوچتے ہوئے بولا۔ ”ہمیں اپنے اعمال کا موازنہ کرنا چاہئے۔ شاید اپنی غلطیوں اور

گناہوں کی کھوج لگا سکیں۔ اعتراف کے بعد استغفار کی قبولیت کا وعدہ کیا ہے میرے رب نے۔“

ماں خاموشی سے بیٹے کے خیالات اور اس کی فکر مند نظروں کا جائزہ لینے لگی۔
 ”بیٹے! اب نئے سرے سے زمانے کو خود پر ہنسنا عقل مندی نہیں ہے۔ ہمیں صبر و تحمل اور دُور اندیشی سے کام لے کر یہ فیصلہ کرنا چاہئے کہ یہ شادی اور آنے والا مہمان کس طریقے سے بچ سکتا ہے۔“ ماں نے طویل توقف کے بعد کہا۔ ”بیٹے تو میرے ہی ہو۔ جہاں بھی رہو۔ کینڈا بھی تو مجھے اکیلا چھوڑ کر چلے گئے تھے۔ اب ایک ہی شہر میں بیوی کے میکے رہ کر اپنا گھر آباد کر سکتے ہو تو کوئی مضائقہ نہیں۔ آتے جاتے اپنا چہرہ دکھاتے رہنا۔ بس تسلی رہے گی۔“

”ماں جی! دو سال کا عرصہ میری غیر موجودگی میں حدیقہ نے آپ کے ساتھ گزارا تھا۔ مجھے ہر لحاظ سے بے فکری تھی۔ اب بھی لیلیٰ کا آپ کے ساتھ رہنا فرض بنتا ہے۔ نہ کہ میں آپ کو اس بڑھاپے اور بیماری میں تنہا چھوڑ کر سسرال کا کتا بن جاؤں۔ میرے بس کا روگ نہیں ہے یہ۔“ وہ پریشانی میں بولا۔

”بیٹا! لیلیٰ کے گھر میں رہ کر اسے آزمانا تمہارے لئے بہت ضروری ہے۔ ورنہ پچھتاوے پیچھا نہیں چھوڑتے۔ کیا معلوم وہ والدین کے گھر میں رہ کر انسانیت اور شرافت کے جامے میں آجائے۔ تم میری فکر کیوں کرتے ہو؟ میں گھر کے ان پرانے ملازموں سے دل لگا لوں گی۔ ان سے گپ شپ، ہنسی مذاق میں اپنا وقت گزار لوں گی۔ ہاں، میرے دل کے دکھڑے سننے کبھی کبھار چکر لگایا کرتا۔“ ماں کی آواز بھڑائی۔

”ایسا کرنا ناممکن ہے ماں جی! میں خود کو تازیت معاف نہیں کر سکتا۔ اور مٹھ میں جینا بہت بڑی آزمائش ہے۔“ وہ سنجیدگی سے بولا۔ ”لڑکی بیاہ کر سسرال جاتی ہے نہ کہ لڑکا اپنا گھر چھوڑ کر بیوی کا غلام بن جاتا ہے۔ ہمارا کلچر اس کی اجازت نہیں دیتا۔ سراسر بے غیرتی اور بے عزتی ہے اس میں۔“

”ہے تو سہی۔ مگر کیا کریں؟ مجبوری بہت بڑی ہے۔ لیلیٰ کی کوکھ میں ہماری نسل پل رہی ہے۔ اس بچے کی خاطر ہم اس کی ہر شرط قبول کرنے میں عار نہیں سمجھیں گے۔ تم تیاری کرو۔ میری دعائیں تمہارے آگے پیچھے اور دائیں بائیں حصار میں رکھیں گی۔ تم فکر نہ کرو۔ یوں سمجھو کہ مہمان بن کر جا رہے ہو۔“ ماں نے اسے بوسہ دیتے

ہوئے کہا۔

”اگر آپ کی اس میں خوشی ہے تو میں ایسا عمل بروئے کار لانے میں دیر نہیں کروں گا۔ صبح آپ کی دعا لے کر آفس جاؤں گا اور شام بھی آپ کی دعاؤں کے سائے میں بسر ہوگی۔ آپ نے سچ کہا ہے کہ ہمیں بچے کی خاطر یہ قدم اٹھانا پڑے گا۔ لیکن کیا گارنٹی ہے کہ بچے کی پیدائش کے بعد وہ اس گھر میں آنا پسند کرے گی؟ اس کے والدین تو مجھے عمر بھر کے لئے گھر داماد بنانے کے خواہش مند ہیں۔“ وہ تذبذب کے عالم میں بولا۔

”بعد میں دیکھا جائے گا۔ فی الحال عافیت تمہارے شفٹ ہونے میں نظر آرہی ہے۔“ ماں نے بظاہر لاپرواہی سے کہا۔

”ماں جی! آپ نے دل اتنا بڑا کیسے کر لیا؟ اپنے گھر کے چراغ سے دوسروں کے گھر کو منور کرنے کا فیصلہ قابلِ آفرین ہے۔“ وہ حیرت و ستائش بھرے لہجے میں بولا۔

”بیٹے! وہ ماں ہی نہیں، جو اولاد کی مجبوریوں کے ساتھ ڈھل نہ سکے۔“ وہ اپنی آہ کو اندر دبا کر بولی۔ ”بیٹے تو میرے ہی ہوتا۔ دل چھوٹا کیا کرتا؟ اللہ تعالیٰ تمہاری عمر دراز کرے۔ تمہیں سات بیٹوں کا باپ بننا نصیب ہو۔ لیلیٰ میں بچپنا ہے۔ ماں بن کر شاید میچور ہو جائے۔“

”ایسی اُمید مت رکھیں ماں جی! بے جالاؤ و پیار اس کی ذہنی گردتھ پر غالب رہا ہے۔ کسی بات اور عمل سے وہ تیس سال کی نہیں لگتی۔ انوکھا لاڈلا کھیلن کو مانگے چاند۔ یہ عجوبہ میری قسمت میں لکھ دیا گیا ہے۔ میرے اعمال کی وجہ سے۔“ وہ شپٹا کر بولا۔

”بیٹے! قصور تمہارا نہیں ہے۔ میں نے تو تمہارے لئے بہتر ہی سوچا تھا۔ نہ اس کا منہ دیکھا نہ متھا، نہ عقل و شعور پر غور و فکر کیا۔ لالچ نے آنکھوں پر پٹی ہی تو باندھ دی تھی۔ اُف! یہ تو پاگل ہی نکلی۔“ وہ ہاتھ ملتے ہوئے بولی۔ ”اور اب ہماری نئی نسل کو اک پاگل ماں کی گود نصیب ہوگی۔ اس سے بڑھ کر ہماری اور کیا بد نصیبی ہو سکتی ہے؟ جہاں دادی بننے پر خوشی و سکون ملا ہے، وہاں ایک کاٹنا سا چیمتا ہوا محسوس بھی ہوتا ہے۔ میں دعا ہی کر سکتی ہوں تمہارے لئے۔ میں اللہ تعالیٰ کی رحمتوں سے نا اُمید ہرگز نہیں۔ اگر تم تسلی و تشفی میں ہو تو میں بھی اطمینان میں رہوں گی۔ ورنہ کل کی مرنی آج ہی مر جاؤں گی۔“

”ماں جی! منہ سے نکلے ہوئے ایسے الم ناک الفاظ مجھے بہت اذیت دیتے

ہیں۔ مجھے اپنے ہونے پر ندامت کا احساس ہونے لگا ہے۔ نہ میں پیدا ہوتا، نہ آپ ایسی آزمائش میں گھرتیں۔“ وہ ماں کی باتوں پر درد سے تڑپ اٹھا۔

”تم نہ ہوتے بیٹے! تو میں خود کو مکمل اور کامیاب عورت کیسے تصور کرتی؟ تمہارے وجود نے تو مجھ میں خود اعتمادی بھر کر جینے کے تمام طور و اطوار سکھائے تھے۔ ورنہ تمہارا ددھیال مجھے زندہ درگور کر دیتا۔ اور تمہارے ابا میری خاطر کچھ نہ کر سکتے۔ ان کی آنکھوں اور ذہن و قلب پر ماں کی محبتوں کی پٹی بندھی ہوئی تھی۔ ان کا حکم اور فیصلہ بیٹے کے لئے قرآن کا حرف ہوا کرتا تھا۔ میرا دایلا بالکل رائیگاں جاتا رہا۔ تم نے تو میری زندگی کو آباد و خوشحال کرنے کا جو رول ادا کیا ہے میرے بچے! اس کے صدقے تمہاری زندگی مسرتوں سے ہمکنار ہو جائے۔“ اس کی آواز بھرا گئی۔ ”آج کے بعد ایسی روح فرسا باتیں منہ سے نہ نکالنا۔ ورنہ ایسی ناراضگی جسے گی کہ یاد ہی رکھو گے۔“

”مجھے معاف کر دیجئے ماں جی! بس یونہی آپ کے دکھوں اور غموں نے نڈھال سا کر دیا ہے۔ جبکہ آپ تو مقابلہ کرنے کی ہمت رکھتی ہیں۔“ وہ ماں کے پیر دباتے ہوئے بولا۔ ”میرے لئے بھی آپ کا حکم اور فیصلہ قرآن کا حرف ہے۔“

”تو پھر لیلیٰ کے پاس شفٹ ہو جاؤ بچے کی پیدائش تک۔ ورنہ وہ پاگل اور جنونی لڑکی ضد اور غصے میں نہ جانے کیا ستم ڈھا دے۔ مجھے اس پر رتی بھر بھروسہ نہیں۔“

ماں نے فکر مندی سے کہا۔

”ٹھیک ہے ماں جی! حالانکہ میری غیرت و انا اس کی اجازت نہیں دیتی۔ کیونکہ مجھے علم ہے کہ بلی اپنے گھر میں شیر کے روپ میں چنگھاڑتی ہوئی سب کو خوف زدہ کئے رکھتی ہے۔ اور پھر لیلیٰ جیسی کبر و پندار میں پروان چڑھنے والی بیوی، شوہر کو جوتی کی نوک پر ہی رکھے گی۔ آج مجھے شیریں کی کمی نے کسی قدر پریشان کر دیا ہے۔ اس حکے مشورے اور نصیحتیں میری روح کی غنا تھیں۔ ہم دونوں کے درمیان اتنی طویل گہری خلیج حائل ہو جائے گی، میں نے تو کبھی سوچا تک نہ تھا۔ اور وہ بھی تو ایسی گئی کہ جیسے میری زندگی میں اس کا دخل تھا، نہ خونی رشتہ تھا۔“ لہجہ افسردہ تھا۔

”یہ تو سب کیا دھرا حدیقہ کا ہے۔ اس کا بیڑا ہی غرق ہو۔ میرا تو رواں رواں اسے بددعا ئیں دیتا ہے۔“ وہ نفرت بھرے لہجے میں بولی۔

”ماں جی! اُسے بددعا ئیں دینے کا فائدہ؟..... مجھے تو یوں محسوس ہوتا ہے، جیسے وہ تمام بددعا ئیں واپس پلٹ کر میرے دامن میں چنگاریوں کی صورت میں بسیرا کر

کے میری تقدیر کو راکھ بنا رہی ہیں۔ اس کے لئے دعا کیا کریں؟ بے شک اس نے میرے ساتھ دعا بازی اور شیریں کے ساتھ صریحاً دھوکا بازی کا ڈرامہ کھیلا ہے۔ جو ناقابلِ معافی ہے۔“ وہ اتنے کرب سے بولا کہ ماں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ ”میرے دل میں اتنی وسعت ہے نہ ذہن میں جگہ ہے کہ اس کی غلطیوں اور کوتاہیوں کو فراموش کر کے اس کے لئے دعا گورہوں۔ جس نے میرے جسم کے حصے کو تقویت دینے کے بجائے اذیت دی، اُسے کیسے دُعا دے سکتی ہوں؟“ وہ خاموش رہا۔ کیونکہ بات تو وہ ٹھیک ہی کر رہی تھی۔

”اس کم بخت کی نصیبوں جلی ماں کو تو دیکھو۔ اکڑ ایسی کہ جیسے نواب کی اولاد اور وزیرِ مشیر کی بیوی ہو۔ کیا مجال کہ دوبارہ مجھ سے رابطہ کرنے کی کوشش کی ہو۔ گھر اُجاڑنے میں ماں کی شہہ جلتی پرتیل کا کام کرتی ہے۔ وہی ہوا ہمارے ساتھ۔ اسے اپنی عزت و ناموس کی رتی بھر پروا نہیں، ہمارا کیا خیال کرے گی؟ چھوٹی اور حقیر عورت نے ہمیں بھی ریزہ ریزہ کر دیا۔ ایک خاوند کا اپنی بیوی اور بچی کو چھوڑ کر روپوش ہو جانا معمولی بات نہیں۔ بیوی کے کردار میں کوئی لمبا چوڑا گھپلا ضرور ہو گا۔“

”ماں جی! چھوڑیں ایسی باتیں۔ اب ہمیں اپنے مسائل حل کرنے کی طرف توجہ دینی چاہئے۔ آئندہ حدیقہ کا ذکر ہماری گفتگو میں نہیں آنا چاہئے۔ اضطراری کیفیت میں میرا سر گھومنے لگتا ہے، ہارٹ بیٹ تیز ہو جاتی ہے اور بے بسی کا احساس سر چڑھ کر بولنے لگتا ہے۔“ اس نے بے چارگی سے کہا تو ماں نے اسے اپنے سینے سے لگا کر اس کی آغوش دعاؤں سے لبریز کر دی۔ اور وہ بھی ایک ننھا منا، معصوم سا بچہ بن کر ماں کا پیار لینے لگا۔ اور ماں نے اپنے آنسو ضبط کرتے ہوئے کہا۔

”تو بیٹا! اُسے طلاق دے ڈالو۔ ہماری زندگی سے نکل جائے گی تو اس کا ذکر بھی زبان پر نہیں آئے گا۔ ورنہ بات بات پر میرا دھیان اس کی طرف جاتا رہے گا اور اسے بد دعائیں دے کر اپنا دل بھی جلاتی رہوں گی۔“

”نہیں ماں جی! طلاق نہیں دوں گا۔ ہاں، اگر کورٹ کے ذریعے طلاق لینا چاہے گی تو اگلے ہی دن یہ سیاہی اس کے چہرے پر چسپاں کر دوں گا۔ نہ کہ کورٹ کے چکروں میں خود کو پریشان کرتا رہوں گا۔“ خرم نفرت آگئیں لہجے میں بولا۔

”اس کی نوبت ہی کیوں آئے بیٹا؟ جان چھڑاؤ اس سے۔ کل تمہاری جائیداد میں حصے دار بن کر کھڑی ہو گئی تو پھر کیا کرو گے؟“ وہ سمجھانے لگی۔

”ایسا نہیں ہوگا ماں جی! وہ بہت غیرت مند لڑکی ہے۔ اس نے ہم سب کی بہت خدمت کی ہے۔ ابھی تو ہمیں اس کی قدر آجانی چاہئے۔ لیلیٰ نے ہمیں جو سبق سکھایا ہے، وہ کافی حد تک عبرت ناک ہے کہ آج مجھے آپ کو اس بڑھاپے میں چھوڑ کر اس کی خواہش کو پورا کرنا پڑ رہا ہے۔ یہ بہت بڑا ظلم ہے ماں جی! آپ پر اور مجھ پر۔ دنیا بھر کے طعنے ہمارا مقدر بن جائیں گے۔“ خرم کہہ کر سوچ میں ڈوب گیا۔

ماں اسے دیکھ کر دکھی ہوتی چلی گئی۔ آہستہ آہستہ کمر پر ہاتھ رکھ کر اٹھی اور خرم کے کمرے میں چلی گئی۔ اس کی وارڈ رو ب کھول کر اس کے کپڑوں کو اپنے چہرے پر پھیرنے لگی اور دل آزاری سے بڑبڑائی۔

”میرے بچے! میں تجھے کس دل سے رخصت کروں؟ میں تو اتنی بے حوصلہ ماں ہوں کہ بیٹی کو رخصت کر کے بھی نہ چھوڑا۔ اسے سسرال میں کس اپ ہونے دیا نہ ہی شوہر سے ایڈجسٹ ہونے کی تلقین کی۔ اب تم تو بیٹا ہو کر جا رہے ہو۔ میں خود تمہیں چلے جانے کی تلقین کرنے لگی ہوں۔ اُف! ایسے تو کسی ماں کے ساتھ نہیں ہوا کہ میرے آنگن کی رونق، سسرال کے گھر میں خوشیاں بھر دے۔“

ماں نے آنسو صاف کئے اور بجھے ہوئے دل سے اس کے کپڑے بیگروں سے اتار کر بیڈ پر رکھنے لگی۔

خرم دروازے میں کھڑا اماں کی یہ حرکت دیکھ کر جامد سا ہو گیا کہ آج ماں نے اس کی بہتری کے لئے دل سمندر سے گہرا اور وسیع کیسے کر لیا؟..... کاش حدیقہ کے لئے اس سنگیں دل میں نرمی آگئی ہوتی تو آج ہماری زندگی خوشیوں سے ہمکنار ہوتی۔ لیکن اب کیا ہو سکتا تھا؟

وہ بے بسی و لاچارگی میں سوچے جا رہا تھا۔ آہستہ سے ماں کے قریب آ گیا۔ دونوں کی آنکھیں چار ہوئیں اور دل جو سمندر جیسا گہرا تھا، دونوں کی آنکھوں سے باہر اُبل آیا تھا۔

نہ جانے دونوں کتنی دیر تک اسی حالت میں ایک دوسرے کے گلے لگے آہ و فغاں کرتے رہتے کہ ملازمہ کی آواز پر چوٹے، جواہری لے کر کمرے میں داخل ہوئی تھی۔ کیونکہ آج خرم کی پیننگ کرنا جو مقصود تھا۔ آج بیٹے کی رخصتی جو لازم ہو گئی تھی۔ بے بسی تھی اور کبھی نہ ختم ہونے والی اُداسی۔ لیکن ایک امید کی کرن روشن ضرور تھی۔

”ماما! اب میری برداشت اور صبر نے جواب دے دیا ہے۔ تنگ آگئی ہوں روز روز کی بک بک سے۔ دل چاہتا ہے خرم ایڈیٹ کو دھکے مار کر اپنے گھر سے باہر نکال دوں۔ دفع ہو جائے یہاں سے۔“ لیلیٰ نے غصے میں لال ہوتے ہوئے کہا۔

”وجہ تو بتاؤ میری جان! اُس سے ایسی کون سی غلطی سرزد ہو گئی ہے کہ نوبت دھکوں پر آگئی ہے؟“ ماما نے حیرت و تجسس سے کہا۔

”ماما! وہ ایڈیٹ ہر بات میں کبھی اپنی ماں، کبھی بہن کو ٹھیسٹ لاتا ہے۔ ہماری اپنی تو کسی قسم کی گفتگو ہی نہیں ہوتی۔“ وہ سختی سے بولی۔ ”اس ایڈیٹ کی اولاد اٹھائے پھر رہی ہوں۔ یہ بھی اُلٹو کا بیٹھا ہی ہو گا۔“

”بیٹا! غصہ اس حالت میں بہت نقصان دہ ہوتا ہے۔ اور پھر زبان کی تلخی اور سوچ کی کڑواہٹ کا بچے پر بہت برا اثر پڑتا ہے۔ خوش خوش رہو تا کہ بچہ بھی شگفتہ مزاج اور صحت مند ہو۔ اللہ کے ناموں کا ورد کیا کرو۔ اولاد نیک اور صالح ہوگی۔“ وہ پیار سے اسے تھپتھپاتے ہوئے بولی۔

”جب سے یہ ایڈیٹ راسکل میرے وجود میں آیا ہے، میری کسی کو کوئی پروا ہی نہیں رہی۔ ہر بات پر بچہ سامنے آ جاتا ہے۔ بچہ نہ ہوا، مصیبت کا پر کالہ ہو گیا۔“ وہ زور زور سے بولی۔

”بیٹا! ناشکری نہیں کرتے۔ اللہ تعالیٰ ناراض ہوتا ہے۔ تم پر اللہ کے بے شمار کرم ہیں۔ جاتے ہی ماں کا رتبہ حاصل کرنے کے لئے تیار کھڑی ہو۔ اور کیا چاہتے تمہیں؟ تمہاری خوشی کی خاطر ماں کو اکیلے چھوڑ کر تمہارے قدموں میں آ بیٹھا ہے۔ خدا کا جتنا شکر ادا کرو کم ہے۔“ ماما نے سمجھاتے ہوئے کہا۔ ”ہمارے معاشرے کا مرد ایسا کرنے کا تصور بھی گناہ سمجھتا ہے۔ اس لئے اسے برا بھلا مت کہنا۔ ورنہ وہ تمہیں ساتھ لے جانے پر بضد ہو سکتا ہے۔ اور ہمیں مجبوراً اُس کی ماننی پڑے گی۔“

”میں کوئی موم کی گڑیا نہیں ہوں کہ وہ جب چاہے اپنے مطابق ڈھال لے۔ انسانوں کی کیلگری میں آتی ہوں۔“ وہ تلخی سے بولی۔ ”میں اب اس کی ماں کے پاس جانے سے تو رہی۔ نہ جانے اس بڑھیا نے اپنے اس عاشق کی شادی کیوں کر دی؟ اب سمجھ آتی ہے کہ اس کی پہلی بیوی اسے کیوں چھوڑ کر چلی گئی؟“

”بیٹا! پاگل ہو گئی ہو؟ اٹھو جا کر آرام کرو۔ اس وقت تمہاری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا کہ کیا بولوں اور کہاں چپ رہوں۔“ ماں نے اسے پیار کرتے ہوئے کہا۔ ”اسے

اپنے گھر میں آزاد اور پرسکون رکھو گی، تب کہیں وہ اس ماحول میں اپنی بیوی اور سسرال کے ساتھ خوش و خرم بھی رہے گا۔ وہ خود کو کمتر بھی نہیں سمجھے گا۔ ورنہ اپنی ماں کے پاس چلا جائے گا، جس نے اپنی نسل کی بہتری کی خاطر بہت بڑی قربانی دے ڈالی ہے۔ ہم اس کے قدردان ہونا پسند تو نہیں کریں گے، کم از کم نامناسب باتوں اور گھریلو چپقلش سے تو پرہیز کر سکتے ہیں۔“

”اما! وہ مجھ پر رعب جماتا ہے۔ اور ہر بار کی گفتگو سے نصیحتیں ڈھونڈ نکالتا ہے۔ مجھے یہ سب ہرگز پسند نہیں۔ میں اس کی محتاج ہوں نہ حاجت مند۔ پھر کیونکر اس سے دب کر زندگی گزاروں؟ وہ خود کو کیا سمجھتا ہے اما! آپ نے رشتے کے انتخاب میں بہت بڑی غلطی کی ہے۔ وہ شوہر کے روپ میں سراسر اذیت ہے۔“ وہ حقارت سے بولی۔

”اے اپنے ہاتھ میں رکھنا چاہتی ہو تو صبر سے کام لینا پڑے گا۔ آرام کرو، خوش رہو، کھاؤ پیو اور ایک تندرست بچہ جنم دے کر اس پر حکمرانی کرو۔ خرم بہت نرم مزاج اور وسیع النظر ہے۔ خواہ وہ اس کی باتوں پر اپ سیٹ ہو کر ہم سب کا جینا حرام کر دیتی ہو۔ اپنے ابا کو دیکھو۔ آج تک مجھے اونچی آواز سے بات نہیں کرنے دی۔ اور ان کی خصلتوں کے بارے میں تمہیں کیا بتاؤں؟ بیٹا نہ ہونے کی جو سزا میں ابھی تک بھگت رہی ہوں، تم نہیں جانتی۔ خرم کے یہاں شفٹ ہونے کے اثرات کافی حد تک خوش آئند ہونے کے امکانات ہیں۔ تم حوصلہ رکھو۔ دیکھنا ایک دن وہ تمہارا نام چپتا پھرے گا۔ مگر اس کے لئے تمہیں خاموش رہنا ہوگا۔“ اما اسے دھیما کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔

”بابا کا تو جواب نہیں۔ بہترین شوہر اور باپ ہونے کے ساتھ ہمارے مخلص اور ہمدرد دوست بھی ہیں۔ یہ ایڈیٹ ان کے قدموں کی دھول تک بھی نہیں پہنچ سکتا۔ آپ ہیں کہ تعریفیں کئے جا رہی ہیں۔“ وہ عقیدت اور نفرت کے ملے جلے جذبات میں بولی۔

”بیٹا! تم نے کبھی میری بات کو اہمیت دی ہوتی تو آج تمہارا مزاج بہت دھیما اور فطرت بے مثال ہوتی۔ باپ کے لاڈ و پیار میں بگڑی ہوئی اولاد تمہارے جیسی ہوتی ہے جو کبھی سدھرنے کا نام نہیں لیتی۔“ وہ افسوس ناک لہجے میں بولی۔

”مجھے علم ہے، آپ مجھ سے جیلس رہتی ہیں۔ میں نے آپ جیسی ماں اپنی زندگی میں کہیں نہیں دیکھی۔“ وہ حقارت سے بولی۔ ”آپ میرے معاملے میں دخل اندازی

کرنا بند کر دیں تو بہتر ہے۔ ورنہ.....“

”ورنہ کیا باپ سے کہہ کر گھر سے نکلوا دو گی؟..... خدا کے لئے اب تو بڑی ہو جاؤ۔ ایسی دمکیوں سے اب تو کنارہ کشی اختیار کر لو۔“ ماں روہانسی ہو گئی۔ ”جیسا سلوک تمہارا مجھ سے ہے، میں دعا کرتی ہوں کہ ویسا ہی اپنی اولاد سے پاؤ۔ پھر تمہیں میری اذیت کا اندازہ ہو گا۔“

”آپ کی بددعاؤں کے نتیجے میں مجھے خرم جیسا شوہر ملا۔ کیسی مانتا ہے آپ کی، بتائیے؟ اور آپ کو تسکین دینے کے لئے کیا چاہئے؟ بدتمیز اور ذلالت سے بھرپور فقرہ میرے لئے نہ جانے کہاں سے ڈھونڈ لیا؟“ وہ بدتمیزی سے بولے جا رہی تھی۔

”تمہیں خاموش کرنا بہت مشکل ہے۔ کرو اپنی من مایاں اور ہٹ دھری۔ پھر مجھے مورد الزام نہ ٹھہرانا کہ میں نے تمہیں ماں ہونے کے ناطے نشیب و فراز کی سمجھ نہیں دی۔ جاؤ، جا کر اس کو گھر سے نکال دو۔ زندگی بھر پچھتاؤ گی۔ مجھے تو تم نری پاگل ہی لگتی ہو۔ بھلا کوئی عورت ایسے نازیبا کلمات منہ سے نکالتی ہے؟ نہ جانے یہ گالیاں تم نے کہاں سے سیکھ لی ہیں؟ جاؤ اپنی ساس سے ہی ٹریننگ لے لو۔ میں تو ہاری۔“ وہ نکی سے بولیں۔

”آپ کو بذات خود ایسی ٹریننگ کی ضرورت ہے۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ میٹرک اور ماسٹرز کی ایجوکیشن برابر ہو سکتی ہے؟ مجھ پر میٹرک کا رعب اور دبدبہ ڈالنے سے پہلے سوچ لیا کریں۔ میں اپنے فیصلے خود کرنے کی صلاحیتیں رکھتی ہوں۔ اپنا فیصلہ اور پسند آپ خرم کی صورت میں ملاحظہ تو فرمائیں۔ بابا کی آنکھوں پر بھی آپ نے پٹی باندھ دی تھی۔ نہ جانے کس گناہ کی پاداش میں آپ نے مجھ سے دشمنی کی ہے۔“ وہ برجستہ بولی۔

”خدا کا خوف کرو لیلی! تمہیں خرم سے بہتر شوہر نہیں مل سکتا تھا۔ خدا کرے اس سے نبھا کر سکو۔ جس کی مجھے رتی بھرا امید نہیں۔ تمہاری فطرت کی لڑکی کو شادی کی ذمہ داریاں اٹھانے سے پہلے سوچ بچار سے کام لینا چاہئے۔ مجھ سے بہت بڑی غلطی سرزد ہو گئی کہ خرم جیسے بچے کی زندگی تباہ کر دی۔ سوچا تھا، اپنے سسرال چلی جاؤ گی تو تمہاری جبلت میں تبدیلیاں رونما ہوں گی۔ شوہر کے ساتھ مل کر اپنا گھر بساؤ گی، اپنی فیملی مکمل کرنے میں فخر محسوس کرو گی۔ لیکن بد قسمتی سے تم میں عورتوں والی کوئی خُمو موجود ہی نہیں۔ شادی میں کیڑے نکالنا تمہارا مشغلہ تو تھا ہی، مگر ماں بننے پر اعتراض کیوں

ہے؟ مجھے سمجھ نہیں آتی تمہاری سائیکس۔“ وہ تذبذب کے عالم میں تھی۔
 ”مجھے بچے پسند نہیں ہیں ماما! تو پھر ماں بننے پر خوشی کیسی؟ زندگی سہل اور آرام دہ
 تھی، شادی نے اور اب اس پریکٹس نے ستیاناس کر کے رکھ دی ہے۔ آگے بچہ آنے
 پر نہ جانے کیسی آزمائش میں گرفتار ہونے والی ہوں۔“ وہ زہر آلود لہجے میں بولی۔
 ”میں یہ بچہ پیدا کرنے کے حق میں نہیں ہوں۔ خرم تو سراسر پاگل ہے۔“
 ”خدا کے لئے، کہیں غلط حرکت نہ کر بیٹھنا۔ اپنی بھی جان گنواؤ گی اور اس معصوم
 کی قاتل بن کر باری تعالیٰ کا سامنا کیسے کرو گی؟“ ماں پریشان ہو گئی۔
 ”ماما! آپ میرا ساتھ دیں تو سب کچھ ٹھیک رہے گا۔ مجھے بچہ نہیں چاہئے۔“ وہ
 نرمی سے بولی۔

”ذہن اولاد کے عورت کی نہ کوئی حیثیت ہوتی ہے، نہ ہی شوہر اسے عمر بھر کے
 لئے اپنے ساتھ رکھنے کا پابند رہتا ہے۔ بیٹا! میں تمہاری دشمن نہیں ہوں جو غلط پٹیاں
 پڑھا کر تمہاری ازدواجی زندگی کا قلع مع کر دوں۔ خدا کے لئے آئندہ ایسی سوچ بھی
 ذہن میں نہ لانا۔“ ماں نے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا۔
 ”آپ کے اس دقیانوسی پن کا میرے پاس کوئی علاج نہیں۔“ لیلیٰ نے تلخی سے
 کہا اور پرس اٹھا کر باہر نکلتے ہوئے بولی۔ ”میں اپنی دوست کے ہاں جا رہی ہوں۔
 آج رات اسی کے ساتھ ہوں گی۔“
 ”بیٹا! خرم سے پوچھ تو لو۔“ ماں فکر مند سی بولی۔

”وہ آج اپنی ماں کے چمنوں میں رات گزارنے جا رہا ہے، اس لئے مجھے اسے
 بتانے یا اجازت نامے کی ضرورت محسوس نہیں ہو رہی۔ اور ہاں، نہ ہی اس سے چھپانا
 ضروری سمجھتی ہوں۔ اگر اس کا فون آگیا تو بتا بھی دوں گی۔“ وہ غیہ میں بولی اور
 باہر نکل گئی۔ ماں سر پکڑ کر بیٹھ گئی۔



”شیریں! میں یہ مسٹری آج تک معلوم نہیں کر سکی کہ تم آنا فانا میرے گھر سے غائب کیوں ہو گئی؟ اگر مجھ سے کوئی غلطی انجانے میں سرزد ہو گئی ہے تو کیا مجھے معاف نہیں کرو گی؟“ وہ اس کے اپارٹمنٹ میں آ کر بیٹھ گئی۔ ”آج میں وجہ پوچھ کر ہی جاؤں گی۔“

”کنول! ایسی کوئی بات نہیں۔ میں تمہارا احسان زندگی بھر نہ بھولوں گی۔ اس ملک میں تین افراد کو ایک ماہ تک اتنی خاطر و مدارت سے پاس رکھنا اور پھر میری جاب، بچوں کے ایڈمیشن تک تمام ذمہ داری بخوشی قبول کرنا آسان کام نہیں۔ میں تمہاری مہمان نوازی کو سیلوٹ کرتی ہوں۔ بس بیٹھے بیٹھے ہی شفتنگ کا فیصلہ کر لیا۔ دیکھو! میرا یہ فیصلہ غلط نہیں تھا۔ آج اپنی روٹین میں سیٹ ہو گئی ہوں۔ ہارون کا حدود اربعہ بھی معلوم کر چکی ہوں۔ میرے جانے کے بعد تو اس کی لائری ہی نکل آئی۔ جس کمپنی میں جاب ملی آج اسی کا مالک ہے۔ حدیقہ کے ساتھ اس کا رابطہ یا تعلق ہے تو یہ بھی جانتی ہوں۔ اب کرسس کی چھٹیوں کی منتظر ہوں۔ اچانک ہی اسے رنگے ہاتھوں پکڑوں گی یا اپنے اس عمل پر مارے ندامت کے خود سے نظریں چرانے لگوں گی۔ کیونکہ میرا اُس پر نہ حق ہے، نہ اختیار ہے۔ وہ جو مرضی ہے کرتا پھرے۔ غالباً میری آمد کی خبر اس کے گھر والوں نے اسے خوب مریج مصالحوں سے پہنچا تو دی ہو گی۔ اس نے مجھے ڈھونڈنے کی کوشش ہی نہیں کی۔ مجھ سے تمام رشتے ٹاٹے ختم ہی سہی، کیا بچے بھی اسے یاد نہیں آئے؟“ وہ دُکھی ہو گئی۔

”ممکن ہے اس نے کوشش کی ہو یا اسے تمہارے آنے کی خبر ہی نہ ہو۔“ وہ تسلی دیتے ہوئے بولی۔

”اللہ کرے میری تمام غلط فہمیوں اور پیشین گوئیوں کی کوئی حقیقت ہی نہ ہو۔“

بدگمان، بے یقینی میں کوئی سچائی نہ ہو۔“ وہ سوچتے ہوئے بولی۔
 ”انشاء اللہ! سب کچھ تمہارے حق میں بہترین ہو گا۔ باقی ماں جی کیسی ہیں؟“ وہ نہایت ملائمت سے بولی۔

”کل ماں جی کا فون آیا تھا۔ لہجے سے مطمئن اور خوش تو بالکل نہیں لگ رہی تھیں۔ نہ جانے کیوں؟ کچھ بتایا نہیں۔ میں نے بھی گریڈ نے کی کوشش نہیں کی۔ شاید اپنے گھر کے مسائل مجھ سے شیئر نہ کرنا چاہتی ہوں۔“ وہ لاپرواہی سے بولی۔

”ایسا کیسے سوچ لیا تم نے؟ ماں اور بیٹی کا رشتہ بے تکلفی اور چاہتوں سے بھرپور ہوتا ہے۔“ کنول نے ہنستے ہوئے کہا۔ ”دراصل ہارون کی بے وفائی نے تمہیں ایک درس تو سکھا دیا کہ سگی ماں پر بھی بھروسہ نہ کرو۔ تمہارے گرد و پیش کے تمام رشتے بے ثبات اور بے معنی ہو سکتے ہیں، مگر ماں کا رشتہ تو چنانوں جیسا حوصلہ بخشتا ہے۔ مقابلہ کرنے اور سراونچا کر کے جینے کی ترغیب دیتا ہے۔ ان کے بارے میں ایسا سوچنا چھوڑ دو۔ تمہارے 90 فیصد مسائل تو یہاں ہی حل ہو جائیں گے۔“

”تم ٹھیک کہتی ہو۔ مگر کنول! میری ایک بات پر غور ضرور کرنا۔ شوہر کی دھتکاری ہوئی بیٹی، ماں کے لئے ناقابلِ برداشت بوجھ اور عذاب بن جاتی ہے۔“ اس نے آنسو ضبط کرتے ہوئے کہا۔

”اس کرب سے جلد از جلد نکلنے کی کوشش کرو شیریں! اٹ! اٹ! اٹ! اے ہیلدی سائن۔ یہاں ڈپریشن کی بیماری اتنی عام کیوں ہے؟ تم خود ڈاکٹر ہو، بخوبی جانتی ہو۔ ہماری سٹریتھ اپنے رشتوں سے قائم ہے۔ ماں اور بھائی سے اپنے دل کی ہر بات شیئر کیا کرو۔ کیونکہ غیروں سے، قریبی دوستوں سے نہ تو تم اتنا کھل سکتی ہو، نہ ہی ان سے ہمدردی وصول کر سکتی ہو۔ اگر ناجبھی میں اپنا مسئلہ ڈسکس کر بھی لوگی تو خود کو اتنا ناتواں محسوس کرنے لگو گی کہ جس کا علاج ہی ناممکن ہے۔ میری عقل تو یہی کہتی ہے۔“ وہ نہایت پیار سے بولی۔

”ایگزیٹ۔“ وہ ذرا سا مسکرائی۔

”ان رشتوں کی بحالی صبر و تحمل کی مرہونِ منت ہے۔ درگزر کرنے، دوسروں کی غلطیوں سے چشم پوشی کرنے میں ہی سکون ہے۔ میرے چار بھائی اور بھایاں ہیں۔ دو بہنیں ہیں۔ سب کو میں نے اپنے ہاتھ میں کیا ہوا ہے۔ میرا سسرال میرے گن گاتا ہے۔ کیونکہ میں نے اپنے منہ میں زبان کی جگہ مصری کی ڈلی فٹ کرا رکھی ہے۔“

دوسروں کی زیادتی پر نہ کبھی شکوہ کرتی ہوں، نہ ہی ان سے توقعات رکھتی ہوں۔ اس لئے سب میرے ہیں۔“ وہ فخر سے کہہ رہی تھی۔ شیریں کو اپنا آپ بہت ادنیٰ اور حقیر لگا جس میں ایسی کوئی خوبی نام کو بھی موجود نہ تھی۔

”تم نے برا تو نہیں منالیا؟“ وہ چوٹ کر بولی۔

”ہرگز نہیں۔“ وہ سنجیدگی سے بولی۔ ”کاش تم میرے حالات سے پہلے باخبر ہوتی

تو آج میں اس حال میں نہ ہوتی۔“

”ماضی ہمارے ہاتھ سے نکل کر ہمیں بے بس کر دیتا ہے۔ حال تو ہمارا ہے۔ اس کے ایک ایک لمحے پر ہم غالب ہیں۔ اسے اپنی رضا کے مطابق ڈھالنے کی کوشش تو کر دیکھو۔ یہ دنیا تمہارے قدموں کے نیچے ہوگی۔ سب سے پہلا قدم ماں سے معافی مانگنے کا ہے۔ انہیں آج ہی فون کرو۔“

اس کی باتوں سے اس کے بلند ہوتے حوصلے مزید بڑھتے جا رہے تھے۔ وہ واپس چلی گئی۔ لیکن اس کی شیرینی سے بھرپور باتوں کو ثبت طریقے سے سوچنے پر شیریں مجبور ہو گئی تھی۔

دن بھر کی تھکن کے باوجود نیند اس سے کوسوں دُور تھی۔ بیتے ہوئے وقت کا ایک ایک پل فلم کی مانند ذہن کے پروجیکٹر پر چل رہا تھا۔ فلم کے کیریئٹرز میں ہارون پیش پیش تھا۔ جس سے اس نے ٹوٹ کر پیار کیا تھا اور جواباً ہارون نے بھی کوئی کسر نہ چھوڑی تھی۔ فقط اس کی بے روزگاری ایک بہت بڑا معمہ بن گئی تھی۔ وہ اس کی نظروں سے گرتا چلا گیا تھا۔ بھائی کا اس سے لگاؤ اور اُلفت کی مثال ملنا مشکل تھا۔ سسرال ہمیشہ سے اس کی زندگی سے بہت دُور رہا۔ اور یہ ماں کی آنکھ کا نور اور دل کا سرور تھی۔ رشتوں کو فار گر انڈ لینے والی اس کی اپنی ہستی تھی۔ وہ اس نتیجے پر پہنچ کر بے کل ہو گئی تھی۔ فوراً ماں کو فون کیا۔ ماں اس کی آواز سن کر خوشی کے مارے رو پڑی۔

”شیریں! میری جان! تم ابھی تک سوئی کیوں نہیں؟ سب خیریت تو ہے؟ تم کہاں چلی گئی تھی؟ ماں کو کیسے بھول گئی؟“

اس نے آنسو پیتے ہوئے جواب دیا۔ ”نہیں ماں جی! ایسا تو نہ کہیں۔ بس مصروف

ہی رہی۔“

”بچے کیسے ہیں؟ آج ماں کی یاد کیسے آگئی؟ بولو!“ لہجہ حیران مکن تھا۔

”کل آپ کے لب و لہجہ میں انتہا کی اُداسی تھی۔ خرم تو ٹھیک ہے نا؟“ وہ

نہایت پیار سے بولی۔ ”سوچا، اُداسی کی وجہ ہی دریافت کر لوں۔“
 ”ہاں بیٹا! وہ خوش ہے۔“ وہ خود پر قابو پا کر بولی۔
 ”آج کل کیا مشاغل ہیں اس کے؟“ وہ آہستگی سے بولی۔
 ”بس وہی پرانی روٹین چل رہی ہے۔ ہاسپٹل اور گھر۔“ وہ آنسو صاف کرتے ہوئے بولی۔

”ماں جی! آپ رورہی ہیں نا؟“ وہ چونک کر بولی۔
 ”نہیں بیٹا جی! بس ذرا خوشی سے آنکھیں چھلک اٹھی ہیں۔ تم ٹھیک تو ہونا؟“ وہ اسے تسلی دیتے ہوئے بولی۔

”ماں جی! مجھے سچ بتائیں، مسئلہ کیا ہے؟“ وہ تجسس سے بولی۔
 ”بتا دوں؟..... خفا تو نہیں ہوگی؟..... کہیں فون کرنا بند تو نہیں کر دوگی؟“ آواز میں خوف تھا۔

”ہرگز نہیں ماں جی!“ وہ پیار بھرے لہجے میں بولی تو ماں کی سسکیاں بلند ہوتی گئیں اور اپنی تنہائی کی داستان گوش گزار کر دی۔
 وہ ہمت کر کے بولی۔

”ماں جی! آپ میرے پاس آجائیں۔ مجھے اور بچوں کو آپ کی اشد ضرورت ہے۔ خرم کی خوشی ہمیں عزیز ہے۔ اگر وہ اپنی نئی بیوی کے ساتھ رہنے میں قناعت محسوس نہیں کر رہا تو بہت اچھی خبر ہے۔“ وہ محل سے بولی۔ ”اس کا گھر آباد ہو جائے، اس سے بڑھ کر اور کیا خوشی ہوگی؟ بلکہ بہتر ہوتا کہ حدیقہ سے رابطہ کرتا، اسے واپس لے آتا۔ خیر اب تو بہت دیر ہو گئی ہے۔“

”تمہارے پاس آنا تو بہت مشکل ہے۔ ایک تو سفر بہت طویل ہے، دوسرا وہ ملک جوانوں کے کام کا ہے۔ ہم جیسے بوڑھوں کے لئے بیکار اور تکلیف دہ ہے۔ باقی حدیقہ کی غلطی کو معاف کرنا سراسر بے غیرتی ہے۔ خرم کو تو تم جانتی ہونا۔ تم اپنی سزا! آج تو تم نے مجھے نہال کر دیا ہے۔ اب میں تنہا نہیں ہوں۔“ وہ موضوع بدلتے ہوئے بولی۔

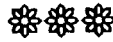
”میں اور بچے خیریت سے ہیں۔ بس جاب، ایڈمیشن اور گھر کی سیٹنگ میں اتنی مصروف رہی کہ آپ کو فون نہ کر سکی۔ معافی کی خواستگار ہوں۔“ لہجہ اتنا نرم تھا کہ ماں چونک کر بولی۔

”بیٹا! تم ٹھیک تو ہو؟ مجھے یقین نہیں آ رہا کہ یہ تم بول رہی ہو۔“
 ”ماں جی! یہ مسئلہ مجھے بھی درپیش ہے۔ میں بھی خود کو پہچاننے میں مشکل کا سامنا کر رہی ہوں۔ ہم دونوں ہی یقین کر لیتے ہیں کہ یہ میں شیریں ہی ہوں۔“ وہ شکستہ لہجہ میں بولی۔

”جیتی رہو میری بچی! تمہاری واپسی ہماری زندگی میں خوشیاں بھر دے گی۔ تم خرم سے بھی بات کر لینا۔ بے چارا کافی مضطرب ہے۔ اس بار جو بیوی اسے ملی ہے، عذاب اور سزا کے سوا کچھ نہیں۔ نباہ تو ناممکن ہی لگ رہا ہے۔“ وہ دکھی لہجہ میں بولی۔
 ”ایسے اخلاقیات سے گرے ہوئے لوگوں میں آپ کیسے پھنس گئی ہیں؟ ذرا نرمی سے ہی اس مسئلے کا تذکرہ کیجئے گا۔ جلد بازی اور بے مبری ایک مسئلے کو تو حل کر دیتی ہے مگر سینکڑوں مسائل کو جنم دے کر زندگی حرام کر دیتی ہے۔“ وہ نہایت نرمی سے بولی۔
 ”میری بچی اتنی سمجھ دار ہو گئی ہے۔ میں خوشی سے کہیں مر ہی نہ جاؤں۔“ ماں بچ بچ مسرت و انبساط سے جموم اٹھی۔

”اپنی زندگی جینے سے ہی دانش مندی اور دُور اندیشی کا سبق ملتا ہے۔ اب میں مطمئن ہوں۔ بیٹے ہوئے ماضی کو گرفت میں کر نہیں سکتی۔ جو ہوا، اسے بھول کر حال کو سنوارنے کی تنگ دود میں ہوں۔ آپ میرے لئے بہت فکر مند رہتی ہیں۔ اب اطمینان کا سانس لیں اور مجھے اُن گنت دعائیں دیں۔“ وہ تسلی سے بولی۔ ”ضد، اکثر اور غرور انسان کے مقدر کو جلا کر راکھ کر دیتا ہے۔ کیونکہ ”میں“ تو اللہ تعالیٰ کو قطعاً پسند نہیں۔“
 ”ماں جی! میں نے اپنے وجود کی کس کس نسل میں بسنے والی ”میں“ کا قتال کر دیا ہے۔“
 ”میں نہیں مانتی۔ شاید وقت مجھے ماننے پر مجبور کر دے۔“ ماں حیرت سے بولی اور فون بند ہو گیا۔

اس نے مسکرا کر موبائل ایک طرف رکھ دیا۔ کس قدر سکون ملا تھا اسے اپنی ماں سے بات کر کے۔ وہ سوئے ہوئے بچوں کے درمیان لیٹ کر پھر سے ماضی کے پرت اُلٹنے لگی۔ آج اُنکی طرف اٹھی ہوئی تھی۔ کیسے راز افشا ہو رہے تھے۔ وہ مارے ندامت کے کروٹیں بدل رہی تھی۔ اس نے اپنی زندگی کے کتنے سال کس قدر لا حاصل اور بے مقصد گزار دیئے۔ ہر ایک سے پیارا اور اہمیت کی توقع رکھی، خود سے کسی کے لئے کچھ کرنے کی تکلیف ہی گوارا نہ کی۔ خود غرضی، خود پسندی، خود پذیرائی کی انتہا ہی تو تھی۔ وہ بڑبڑاتے ہوئے بیٹھ گئی۔



”آئی! مجھے لیلیٰ کی سمجھ نہیں آتی۔ کس قدر غیر ذمہ دار عورت ہے۔ کہاں گئی ہے وہ؟ موبائل بند کیا ہوا ہے۔ دوسروں کو اذیت پہنچا کر شاداں رہتا اس کی فطرت کا خاص الخاص جز ہے۔“ خرم تذبذب میں بولا۔

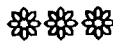
”دراصل آج تمہارا پروگرام ماں جی کے ساتھ رات گزارنے کا تھا۔ وہ اپنی بچپن کی سہیلی نوریہ کے ہاں اس کے گھر چلی گئی ہے۔ میں نے روکنے کی ضرورت محسوس نہ کی۔ ہو سکتا ہے، اس کا دل بہل جائے۔ صبح سے نہ اس نے کچھ کھایا ہے نہ پیا ہے۔ سخت طبیعت خرابی کی وجہ سے گھر بھر کی شامت آئی ہوئی تھی۔ نوکروں نے تو شکرانے کے نفل پڑھے ہوں گے۔ بے چارے مسکین کہیں کے۔“ ماما نے آہستگی سے کہا۔ ”بھیا! باپ کی لاڈلی ہے۔ میں سمجھانے کی اور روکنے کی ہمت نہیں کر سکتی۔“

”اگر اتنی ہی حالت ابتر تھی تو ہاسپٹل ہی آ جاتی۔ کم از کم ڈرپ سے کچھ انرجی تو مل جاتی ہے۔“ وہ فکر مندی سے بولا۔

”بیٹا! وہ من موبی لڑکی ہے۔ جو دل میں آئے گا، وہی کر کے چھوڑے گی۔ وہ میری ماننے سے تو رہی۔“ وہ بے بسی سے بولی۔

”آئی! اسے گھر واپس لے کر آتے ہیں۔ خدا نہ کرے کہیں طبیعت زیادہ ہی خراب نہ ہو جائے۔“ وہ پریشان ہو گیا۔

آخر دونوں نے نوریہ کے گھر پہنچ کر اسے واپس لانے کی حتی الامکان کوشش کی مگر وہ نہ جانے پر بہ ضد تھی۔ خرم کی ناراضگی کی پروا تھی، نہ ہی ماں کی عزت کا پاس تھا۔ خرم نے آئی کو ان کے گھر ڈراپ کیا اور خود اپنی ماں کے پاس چلا گیا۔



”ہارون! اب کام میں دل نہیں لگتا۔ نماز خشوع و خضوع سے ادا کرنا مشکل ہو گیا ہے۔ کھانے کا مزا بھی نہ جانے کہاں رخصت ہو گیا۔ نہ گھومنے پھرنے، نہ اوڑھنے میں دلچسپی رہی ہے۔ آج کس قدر خوشگوار موسم ہے۔ سب کہہ رہے ہیں۔ لیکن مجھے اُداسی اور مایوسی کی بو آتی ہے فضا میں۔ میں ہمت اور حوصلے سے اپنے حالات سے مقابلہ کر رہی تھی۔ آپ نے میرا کیا کچھ نہیں لُٹا۔ میرا رکھوالا ہی ڈاکو بن گیا۔ بتائیں میں کس پر آئندہ بھروسہ کرنے کی غلطی کر سکتی ہوں؟“ لہجے میں بے پناہ افسردگی تھی۔

”تم ڈپریشن کی جانب جا رہی ہو حدیقہ! خود کو سنبھالو۔ انسانوں سے غلطیاں

سرزد ہوا کرتی ہیں، پیغمبروں اور فرشتوں سے نہیں۔ تم جب تک مجھے معاف نہیں کرو گی، چین و سکون تمہاری زندگی میں آنے سے رہا۔ اور سچ بتاؤں، اس دن سے میں کون سا مسرتوں کے جھولے جھول رہا ہوں۔“ وہ سنجیدگی سے بولا۔ ”اس لئے تو بار بار ہاتھیں خلع لینے کی تلقین کرتا ہوں۔ تم سے فوراً نکاح کر لوں گا۔ شاید میری غلطی کا ازالہ ہو سکے۔“

”وہ تو ناممکن ہے۔“ وہ سختی سے بولی۔

”بے وقوف عورت! خرم نے شادی کر لی ہے۔ میری ماما نے بتایا ہے، وہ باپ بننے والا ہے اور بیوی کے گھر شفٹ ہو گیا ہے۔“ وہ نارٹل لہجے میں بولا۔

”ماں جی نے اجازت کیسے دے دی بیوی کے گھر شفٹ ہونے کی؟“ وہ چونک اٹھی۔ ”وہ تو خاصی پوزیو عورت ہیں۔“

”بہت بڑے باپ کی بیٹی ہے وہ۔ ویسے خرم نے ہاتھ خوب مارا ہے۔ اب تو اس کے وارے نیارے ہی تو ہو جائیں گے۔ اس کے دیرینہ خواب پورے ہوتے نظر آ رہے ہیں۔ تم خواخواہ اس کے انتظار میں بیٹھی ہو ماں کی طرح۔ بھولے بھٹکے مسافر کبھی واپس نہیں لوٹا کرتے۔ اسے بھول جاؤ۔“ اس کے لہجے میں حسد کی جھلک تھی۔

”میرا اپنا نصیب۔ لیکن ایک بات سن لیجئے۔ مجھے آپ سے نفرت ہو چکی ہے۔ گھن آتی ہے مجھے آپ کے کردار کے شرم ناک روپ پر۔“ وہ حقارت سے بولی۔ ”میری زندگی پہلے ہی ایک تپتا ریگستان تھی۔ آپ نے تو اس میں آگ ہی لگا دی۔ ہارون! کیا یہ ممکن نہیں کہ میں کمپنی سے اپنا شیئر نکال کر پاکستان واپس چلی جاؤں؟ شاید کہ ماں کو میری بے گناہی پر یقین آ جائے۔ میرا آپ کے ساتھ کام کرنا اور دن بھر لڑھکتے رہنے سے بھی نجات پا جاؤں گی۔“

”کیسی فضول اور ناقابل معافی سوچ ہے تمہاری۔ میں اکیلے یہ کمپنی کیسے چلا سکتا ہوں؟ نہ اتنا پیسہ ہے نہ ہی سڑتھ ہے۔“ وہ ایک دم گھبرا گیا۔

”میں ہر صبح آپ کی شکل مبارک کا دیدار کر کے دن کی شروعات ہی المنا کی اور مایوسی سے کرتی ہوں۔ میں بہت دور جانا چاہتی ہوں۔ جہاں آپ کی ہلکی سی جھلک بھی مجھے دکھائی نہ دے۔“ وہ خشکیں لہجے میں بولی۔

”تم جو بھی فرما رہی ہو، درست ہے۔ میں اس دن کا انتظار کرتا ہوں، جب خرم تمہیں خود طلاق روانہ کرے گا۔ مجھے پکار کر آزما لینا۔ ہارون تمہیں سر آنکھوں پر بٹھا

لے گا۔ تم تو میرے دل پر حکمرانی کرتی ہو حدیقہ! میں ٹین ایجر، جذباتی اور لا اُبابی لڑکا نہیں ہوں، ایک میچور مرد ہوں۔ تمہاری قدر دانی کرتا ہوں تو اس کی کچھ وجوہات ہیں۔“ وہ پیار بھرے لہجے میں بولا۔

حدیقہ نے گھڑی کی طرف دیکھا۔ شام کے چھ بج رہے تھے۔ وہ بات کئے بغیر کھڑی ہو گئی۔ اپنا بیک اٹھایا اور آفس سے باہر نکل کر گاڑی میں جا بیٹھی۔ اور اپنے اُلجھے ہوئے سانس کو درست کرتے ہوئے گاڑی اسٹارٹ کر دی اور بڑبڑانے لگی۔ ”تمہاری ان لمبی لمبی چھوڑی ہوئی باتوں پر اب حدیقہ بھروسہ کیسے کر سکتی ہے؟ تم مجھے بخش دو اور میری جان چھوڑ دو۔ مگر تم خرم سے ہزار درجے مخلص اور سچے ضرور ہو۔ مگر پھر بھی میں اسی کی وفادار ہوں۔“

اگلے دن حدیقہ آفس نہ جاسکی۔ دن بھر اپارٹمنٹ کی بالکنی میں بیٹھی سوچوں کی اُدھیڑ بُن میں مگن رہی۔ خرم کا اس سے رویہ اور سلوک اور نئی دوسری بیوی کے اشاروں پر ناپنے کی رپورٹ نے اسے بے کل ہی تو کر دیا تھا۔ ہارون کا محبت بھرا لہجہ اور اس پر جان چھڑکنے کے انداز میں سچائی ضرور تھی۔ اس کے ہر لفظ میں اپنائیت اور لگاؤ اس کا دل بہلانے لگی۔

خرم کے خیال اور یاد کو ذہن سے گھرچ کر نکالنے کی خواہش نے پہلی بار جنم لیا۔ پہلی بار اس نے ہارون اور خرم کے کردار اور شخصیت کو ایک دوسرے سے کمپیئر کیا۔ ہارون کا مقام آکاش کی وسعتوں کو چھو رہا تھا۔ اور خرم کی نفرت کے زہر میں ڈوبی ہوئی باتیں ایک ایک کر کے اسے بے کل کرنے لگیں۔ اس نے سر جھٹک کر ہارون کے بارے میں سوچنا شروع کر دیا۔

اس کے کانوں میں ہارون کی ہمدردانہ باتیں مٹھاس گھولنے لگیں۔ اس نے دوبار اپنی زندگی ختم کرنے کی کوشش کی تھی، ہارون نے اسے بچا لیا تھا۔ اس کے بعد اس کا سایہ بن کر نگہداشت کرنے لگا تھا۔

وہ حالات کے سامنے اتنی کمزور اور بے بس ہو جائے گی، اس نے کبھی سوچا بھی نہ تھا۔ تنہائی میں تا حیات تڑپنے اور بلکنے سے وہ نہ تو خرم اور شیریں کے خیالات، شک و شبہات کو بدل کر خود کو پرستائش چھکی دلا سکتی تھی، نہ ہی اپنی ماں کو اپنی پاکیزگی کا یقین دلا کر ماما کی ٹھنڈی چھاؤں میں پناہ دے سکتی تھی۔ ہر زاویے سے اسے ہارون کی آفر فائدہ مند لگ رہی تھی۔ دونوں کا میچ بے حد خوب تھا۔ مگر وفا آڑے آرہی تھی۔

آخر حدیث نے بے تھا سوج بچار لے بعد ہارون سے شادی کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ مناسب وقت ہارون لے اصرار پر اقرار کرنے کا سوج کر وہ قدرے مطمئن ہو گئی لیکن ہارون میں سرائت کر گئی کہ وہ خرم اور شیریں کے تمام شکوک کو دھماکے سے مٹا دے گا۔

ہارون نے ہارون کی آواز پر پوک کر ایسے اچھلی جیسے بچھو نے کاٹ لیا ہو۔

”نہایت ہے؟ آج تم آفس بھی نہیں آئی۔ کم از کم بیس بارفون کر چکا ہوں۔“ لی طرح تمہارا موبائل کمرے میں بٹکے کے نیچے آرام فرما رہا ہوگا۔ پڑھے لکھے ہاتھوں کے ساتھ گزارنا کتنا کس قدر مشکل ہے۔ مجھے یقین تھا کہ آج تم اس داری فانی سے کوچ کرنے میں کامیاب ہو گئی ہوگی۔“ وہ خوشگین لہجے میں بولا۔ ”مرنا چاہتی ہو؟ تو میرے لئے مرکز دیکھو۔ حسین زندگی پا لوگی۔ باہر ٹھنڈ ہو رہی ہے۔ اندر چلو۔ بیمار پڑ کر میرے لئے مصیبت کھڑی کر دو گی۔“

”آپ کو میری فکر کیونکر ہونے لگی؟“ وہ سنجیدگی سے بولی۔

”بھئی! تمہاری فکر تو فرسٹ ٹائم تمہیں دیکھ کر ہی ہو گئی تھی۔ یہ کوئی نئی تبدیلی نہیں ہے۔ پرانے کلاکار ہیں ہم۔“ وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر اندر آ گیا۔ ”تم ٹی وی آن کرو۔ میں تمہارے لئے چائے بنا کر لاتا ہوں۔ برف کی مانند بخت بستہ ہاتھ ہیں تمہارے۔ کس پاگل سے پالا پڑ گیا ہے۔ جو جان نثار کرنے کو تیار ہے، اس سے نفرت اور جسے پروا ہے نہ کوئی فکر و غم، اس کے لئے مرنے کو ہر دم تیار اور چاق و چوبند۔“

”آپ تشریف رکھیں۔ میں چائے بناتی ہوں۔“ وہ قدرے نرمی سے بولی تو ہارون نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔ چائے تو درکنار وہ تو اسے کھڑے کھڑے بیسیوں صلو اتیں سناتی باہر نکال دیا کرتی تھی۔

”تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟“ وہ تجسس سے بولا۔ وہ خاموشی سے کچن کی طرف بڑھ گئی۔ وہ بھی اس کے پیچھے ہوا۔

”لگتا ہے چوبیس برسوں سے ٹھنڈے پڑے ہیں۔ آج تم نے کھانا نہیں کھایا۔ چائے کی بھی ہوش نہیں رہی ہوگی۔ جی بھر کر غصہ کھایا ہوگا، نفرت کے انگاروں سے اپنی خاطر تواضع کی ہوگی۔“ وہ اس کے شانوں پر ہاتھ رکھ کر بولا تو وہ ایک جھٹکے سے پیچھے ہٹ گئی۔

”کیوں ڈرتی ہو مجھ سے؟..... مجھے پہچاننے کی کوشش کرو۔ تمہارا راہبر اور محسن ہوں۔ دشمن اور لیر انہیں ہوں۔“ وہ پیار سے بولا۔

”اب مجھے اپنے سائے سے بھی خوف آتا ہے ہارون!“ وہ روہانسی ہو گئی۔
 ”آئی ایم سوری سویٹ ہارٹ! خوف اور خفگی کی دنیا سے باہر نکل کر دیکھو۔
 خوشیاں تمہاری منتظر ہیں۔“ وہ ملائمت سے بولا۔ ”اور اُن اُن دیکھی مسرتوں کے سنگ
 ہارون بھی ہاتھ پھیلائے کھڑا ہے۔ خوش قسمتی سے اسے مرتے دم تک اسی حالت میں
 پاؤ گی۔“

”آپ میرا پیچھا کیوں نہیں چھوڑ دیتے؟ اس جہاں میں ایک سے ایک بڑھ کر
 حسین و جمیل لڑکی آپ حاصل کر سکتے ہیں۔ میں تو جھوٹن ہوں ہارون! ایک غلیظ گالی
 بن چکی ہوں۔ مجھے پالینے کے بعد آپ کو بہت جلد چھٹاوا ہونے لگے گا۔“ وہ دُکھ
 بھرے لہجے میں بولی۔ ”آپ بے گناہ اور میں قصور وار ٹھہرائی جاؤں گی۔“
 ”وہ کیوں؟..... لگتا ہے، بے تکی باتیں تمہاری گھٹی میں ہیں۔“ وہ سنجیدگی سے
 بولا۔ ”تم اتنی ڈر پوک کیوں ہو؟“

”کیا آپ مجھے اپنے خاندان میں لے جانے کی ہمت رکھتے ہیں؟ کہیں میرے
 پاپا کی طرح بزدلی اور کم ہمتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے آپ خاندان کی خاطر قبولیت سے
 انکار تو نہیں کر دیں گے؟“ وہ بھی سنجیدگی سے بولی۔

”ایک تو ہر وقت ماں کی وفا اور باپ کی دعا بازی کی مثالوں نے تمہیں ایسا زہر
 آلود کیا ہے کہ ہر ایک تمہاری نظر میں دھوکے باز، بزدل اور فریبی ہے۔ بھئی پانچوں
 اُگلیوں کی طرح دنیا کے تمام مکین ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ میں نے کہا نا کہ
 خوفزدہ رہنا چھوڑ دو۔ تم نے کبھی میرے بارے میں سوچنے کی تکلیف کی ہے، جس کا
 ہنسا بست گھر پل بھر میں اُجڑ گیا؟ تو کیا میں باقی ماندہ زندگی، بے یقینی اور خوف زدگی
 کے عالم میں دنیا سے کنارہ کشی اختیار کر کے گزار دوں؟ یہ زندگی ایک خوب صورت
 اور انمول تحفہ ہے۔ اس کا حق ادا نہ کیا تو باری تعالیٰ کے حضور ایسی پکڑ ہو گی کہ جہنم
 رسید ہونا پڑے گا۔“ لہجے میں کرب کے ساتھ ہی شکستگی عود کر آئی۔ وہ خاموش رہی۔

”اس وقت دُز کا ناٹم ہے۔ چائے وائے چھوڑو۔ چلو باہر چلتے ہیں، اچھا سا کھانا
 کھانے۔ آج تمام دن کڑھنے اور خود سے جنگ و جدل کرنے کا تمہیں کچھ تو صل ملنا
 چاہئے۔ جلدی سے اچھا سا تیار ہو جاؤ۔ سنا ہے، عورت جب بن سنور کر آئینے میں اپنا

جائزہ لیتی ہے تو اس کی دن بھر کی تھکن، اُداسی و مایوسی ایسے رفو چکر ہو جاتی ہے جیسے گدھے کے سر سے سینگ۔“
وہ یہ سن کر ذرا سا مسکرائی۔

”ناکس بے بی۔“ وہ چپک اٹھا۔ ”دنیا میں لڑکیوں کی کمی نہیں۔ وافر مقدار میں نظر آتی ہیں۔ مگر ان میں میری حدیقہ تو نہیں۔ اس کی غیر موجودگی میں چار سو تاریکی ہی تاریکی ہے۔“

”کوئی باتیں بنانا آپ سے سیکھے۔“ وہ پھر مسکرائی۔ اس تبدیلی پر وہ اسے دیکھتا رہ گیا اور وہ تیار ہونے کمرے میں چلی گئی۔ دل کچھ مطمئن تھا اور روح قدرے بہ آسکین تھی۔ مگر ذہن ابھی بھی اُدھیڑ بن میں مگن تھا۔ وفا سر چڑھے بول رہی تھی۔



”ہارون! ہم بڑا کھر ریٹ پر کیوں لیس؟ اس کی ابھی ضرورت نہیں۔ جب تک ہم بینک کا قرض ادا کر کے کمپنی کے مکمل اور نہیں بن جاتے، تب تک قدم سوچ سمجھ کر اٹھانا پڑے گا۔“ وہ اپنی الماری میں کپڑے لٹکاتے ہوئے بولی۔ ”یہ سنڈی میرے لئے کافی ہے۔ ہاتھ روم کا مسئلہ ہے۔ پھر بھی گزارہ ہو جائے گا۔ آپ براہ مہربانی ہاتھ روم کو استعمال کے بعد قابل قبول حالت میں چھوڑ بیٹے گا۔“

”خوب رہی۔ ابھی سے پابندیاں شروع ہو گئی ہیں۔“ وہ ہتھ لگا اٹھا۔
”ابھی سے آپ کی ٹریننگ ہوگی تو زندگی خوش و خرم گزرے گی۔“ وہ مسکرانے لگی۔

”یار! خرم کا نام نہ لو۔ محاورے میں بھی نہیں۔“ وہ بناوٹی خفگی سے بولا۔

”جی ابھی تو اس کا نام میرے ساتھ منسوب ہے۔ سننا پڑے گا وقتاً فوقتاً۔“ وہ

قدرے دھٹائی سے بولی۔ ”آخر میرے شوہر نامدار جو ٹھہرے۔“

”شوہر نامدار کہو۔ بد نصیب، چغند کہیں کا۔ سرال کا بھوکا اور پیاسا کتا۔“

”ہائے، ایسے تو نہ کہیں۔ جب تک اس کا نام میرے نام کے ساتھ جڑا رہے گا،

احترام لازم ہے۔“ وہ سنجیدہ ہو گئی۔ ”اس بات کا آئندہ خیال رکھئے گا۔“

”سرکار! ٹھیک ہے۔ چند دن اور برداشت کر لیتے ہیں۔“ وہ اس کے بیگ سے

کپڑے نکال کر اس کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا۔ ”یہ تمام ڈریسز کافی رن ڈاؤن

لگ رہے ہیں۔ اس ویک اینڈ پر شاپنگ کا پروگرام کیا رہے گا؟ کچھ میری پسند، کہیں

تمہارے مزاج کے مطابق۔ مل جل کر تمہاری وارڈروب کو سیٹ کرتے ہیں۔ کیا یاد کرو

گی کہ کس حاتم طائی سے پالا بڑا تھا۔“

”اس کی قطعاً ضرورت نہیں۔ اگر مرد فضول خرچ پیدا نہ کیا گیا ہوتا تو اس دنیا کا ہر مرد سونے کے محل کا مالک ہوتا۔ اللہ نے بھی کیا جہلت بنائی ہے کہ ایک سو کمایا، پانچ سو مصرف میں لے آیا۔ اور پھر بڑھا پانچ سو کمایا، پانچ سو مصرف میں لے آیا۔“ وہ قدرے سختی سے بولی۔

”تم ٹھیک کہتی ہو۔ کفایت شعاری بہت بڑا آرٹ ہے۔ ہمارے بس کا روگ کہاں؟ اس میں عورت نے ہی پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کر رکھی ہے۔“ وہ مسکراتے ہوئے بولا۔

”آج کے بعد کھانا بھی گھر میں تیار ہوگا۔ ہم دونوں کے مل کر رہنے کے فوائد تو بے شمار ہیں اگر آپ نے عمل کیا تو۔“ وہ سنجیدہ ہو گئی۔

”بھئی میری کیا مجال کہ حکم عدولی کر سکوں۔“ وہ اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولا۔ ”شادی کا جوڑا تو نیا ہونا چاہئے۔ پاکستانی اسٹائل تو پہن لیا۔ اب کی بار وائٹ ڈریس ہوگا۔ کیسا لگا آئیڈیا؟“

”خاص نہیں۔ ویری چیپ۔“ وہ ہنسنے لگی۔ ”حقیقی چیز انڈر اسٹینڈنگ اور ایڈجسٹ منٹ ہے۔ اسی میں خوشی پوشیدہ ہے۔ خدا کرے، آپ ہمیشہ مجھ سے مطمئن اور پرسکون رہیں اور مجھے آپ کو اپنانے کا بھی پچھتاوا نہ ہو۔“

”انشاء اللہ ایسا ہی ہوگا۔“ وہ یقین سے بولا۔ ”تم اپنی عمر سے بڑی باتیں کرتے ہوئے مجھے سر پر اڑ کر دیتی ہو۔“

”اگر اتنی عقل مند ہوتی تو آج اس حال میں نہ ہوتی۔“ وہ افسردہ ہو گئی۔

”سیلف ڈیٹ کی اجازت نہیں۔ اب تمہاری تقدیر میں اللہ تعالیٰ نے شادمانیاں اور کامرانیاں لکھ کر تمہیں اس حسین زندگی کی لطافت سے روشناس کرانے کا حکم صادر کر دیا ہے۔ اور میں نے اسے بخوشی قبول کر لیا ہے۔“ لہجے میں بے پناہ خوشی تھی۔ حدیقہ کے چہرے پر بظاہر اطمینان کی جھلک نمایاں تو تھی مگر دل خرم کی اس پریشانی اور حیرت کی طرف لگا ہوا تھا جو اسے خلع کا نوٹس وصول کرنے پر ہوگی۔ ذہن میں ماما بستی ہوئی تھیں۔ اس کے بعد اس فیصلے پر ان سے معافی مانگنے اور رضامندی حاصل کرنے کی رتی بھر گنجائش نہ تھی۔ وہ پہلے ہی اس کے کردار سے دل برداشتہ ہو کر قطع تعلق کر چکی تھیں۔ اب آمادگی ناممکن تھی۔

وہ سوچتے ہوئے سڑی کی چھوٹی سی الماری میں اپنے کپڑے سیٹ کر رہی تھی۔ وہ بچپن سے لے کر اب تک تنہائی سے خوف زدہ ہو کر عارضی اور وقتی سہارے ڈھونڈتی رہی۔ اس بار بھی اس نے تنہائی کے جان لیوا اثرات سے خائف ہو کر ہارون کا سہارا لیا تھا۔ اسے اس سہارے کی ہمیشگی کا بھروسہ تو نہ تھا۔ خرم کو بھلانے کی کاوش ناکام ہوتی نظر آرہی تھی۔

ہارون نے کافی کا کپ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے اپنائیت سے کہا۔
 ”زیادہ سوچ بچار تمہیں مزید ڈپریشن کر دے گی۔ اب اپنی نئی زندگی کے بارے میں سوچو، جس میں تمہیں بے حد پیار کرنے والا شوہر اور بچے ایسا مصروف رکھیں گے کہ تمام بے کار سوچیں فرار ہو جائیں گی..... اری تم تو رونے لگی۔ کیا ہوا؟ فوراً بتاؤ۔ ایک تو سمجھ نہیں آتی کہ عورت خوشی میں بھی روتی جیتی ہے اور غم میں بھی۔ تم بتاؤ کہ کس کیفیت میں مبتلا ہو؟“

”اپنے نصیب پر بھروسہ نہیں۔ کیا شوہر بدلنے سے قسمیں بدل جاتی ہیں؟ ایسے معجزات کسی دیکھنے میں نہیں آئے۔ تقدیر کی یہ لکیریں بتدریج اپنی جگہ پر بر اجماع ہیں۔ کیونکہ یہ پہل سے نہیں مٹنی گئیں۔ پہلے دن سے بے حد پختہ اور گہری ہیں۔ کیا آپ ان کے رخ بد سکتے ہیں؟“ وہ بے دلی سے دونوں ہاتھوں کی لکیروں کا جائزہ لیتے ہوئے بولی۔

”نا اُمیدی کی دنیا سے نکل آؤ۔ ورنہ تمہیں اپنے پاؤں لانے کا مقصد ہی ناکام ہو جائے گا۔ اگر تم مائنڈ نہ کرو تو کسی سائیکائرسٹ سے مل لیتے ہیں۔“ وہ فکر مندی سے بولا۔

”میں اس کی ضرورت اس لئے محسوس نہیں کرتی کہ میری ڈپریشن بگڑے ہوئے ناپسندیدہ حالات پر قابو نہ پانے کی وجہ سے ہے۔ اسے بیماری کا نام دینا زیادتی ہے۔ ہاں، اگر آپ کی قربت میں رہ کر بھی میں بدستور نا اُمید رہتی ہوں تو پھر ڈاکٹر کی ہیلپ ضروری ہے۔“ وہ سنجیدگی سے بولی۔

”تم دیکھنا کہ ماں تم سے بہت خوش رہیں گی۔ انہوں نے ہمیشہ تمہیں قابل آفریں نظروں سے دیکھ کر اپنی بہو کے ایسا ہونے کی وٹ کی تھی۔“ وہ اسے پیار سے سمجھانے لگا تو وہ مسکرا دی۔

”ہارون! تعریف میں کتنی سڑتھ ہے، آپ کو اس کا اندازہ تو ہو گا۔ تعریف

شخصیت کے تمام کیل کانٹوں کو سرے سے اُلھاڑ پھینکتی ہے۔ اور انسان اس تعریف کے مطابق خود کو ڈھالنے کی کوشش میں غیر ارادی طور پر محو ہو جاتا ہے۔ میرے ساتھ آپ کا ایسا رویہ اور اخلاص، مجھے ایک فرمانبردار بہو بنانے کی سوچ خاصی قابل ستائش ہے۔“ وہ ابھی بھی مسکرا رہی تھی۔

”میں تمہیں بے وقوف نہیں بنا رہا۔ تم اُن گنت خوبیوں کی مالک ہو۔ تمہاری تراش خراش کرنا بے کار اور وقت کا زیاں ہے۔“ وہ بھی مسکرانے لگا۔ اور دونوں کافی انجوائے کرنے لگے۔



”کنول! مجھے کرسس کی چھٹیاں پاکستانی مسلم ہونے کی وجہ سے نہیں مل رہیں۔ ان چھٹیوں کا مجھے کب سے انتظار تھا۔ بچوں کو بھی روزانہ بھلانا پھسلانا آسان کام نہیں رہا۔ وہ تو مجھ پر اعتماد کرنا ہی چھوڑ دیں گے۔ باپ سے ملنے کی چاہ میں مسلسل اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ اب انہیں کیا جواب دوں گی؟ وہ تو پوری تیاری کئے بیٹھے ہیں۔ بتاؤ، اب کیا کیا جائے؟“ شیریں نے کنول کو تمام صورت حال سے باخبر کیا۔

”میرے ساتھ تو ایسا ہرگز نہیں۔ اس میں پاکستانی مسلم ہونے کا کوئی دخل نہیں ہونا چاہئے۔“ کنول نے حیرت سے کہا۔

”مجھے لگتا ہے، اس ہاسپٹل کی جانب چھوڑنی پڑے گی۔ کیونکہ نئی ایڈمنسٹریشن کی پالیسی ناقابل قبول ہے۔ نہ جانے یہ سر پھر ڈاکٹر اس ہاسپٹل میں کہاں سے آ گیا ہے۔ تھر تھلی مچا دی ہے کجنت نے۔“ وہ سخت برہم ہو رہی تھی۔ ”اتنا سخت مزاج انسان میں نے آج تک نہیں دیکھا۔ ایک منٹ بھی لیٹ پہنچو تو طلب کر لیا جاتا ہے۔“

”اس کا حدود اور بعد تو معلوم کرو۔ پھر جاب چھوڑنے کی سوچنا۔ تم جانتی ہو، آج کل ہر تیسرا بندہ جاب لیس ہے۔“ کنول نے اسے ٹھنڈا کرنے کی کوشش کی۔

”کسی کے بارے میں معلومات حاصل کرنا کون سا مشکل ہے؟ اتنا خفیہ انسان ہے کہ کیا بتاؤں۔ لوگوں کی قیاس آرائیاں نہ جانے کہاں تک درست ہیں۔ انڈیا سے بی لاگ کرتا ہے۔ زندگی کا زیادہ ٹائم سعودی عرب میں گزار کر اب ہماری زندگی حرام کرنے کو پہنچ گیا ہے۔ مسلم لڑکی کو ننگے سر دیکھ کر تیخ پا ہو جاتا ہے۔ طالبان سے تعلق لگتا ہے اس کا۔“

”انفارمیشن پر یقین رکھتی ہو.....؟“ وہ مسکرا کر بولی۔ ”نفٹی پرسنٹ سکیئنڈلز، تمیں

پرسنٹ من گھڑت کہانیاں اور بیس پرسنٹ اصل حقیقت ہوتی ہے۔“ کنول نے ہنستے ہوئے کہا۔

”انسان کی ریپوٹیشن پہلے ٹریول کرتی ہوئی لوگوں تک پہنچ جاتی ہے۔ انفارمیشن 90 پرسنٹ درست ہی ہوا کرتی ہے۔ مجھے تو بہت سزا ہوا انسان لگا ہے۔“

”اس مسئلے کا حل ڈھونڈنا ضروری ہے۔ کیا کیا جائے؟“ کنول نے سوچتے ہوئے

کہا۔

”فی الحال مجھے ڈیوٹی پر جانا پڑے گا۔ جب مجھے چھٹی ملے گی، بچوں کے سکول کھل چکے ہوں گے۔ اور وہ دونوں ڈیولز میرا ناک میں دم کر دیں گے۔“ وہ بے قراری سے بولی۔

”تم ہارون سے رابطہ کرنے کی کوشش تو کرو۔ پھر بچوں کی بات کروا دینا۔ ہو سکتا ہے وہ خود ملنے پہنچ جائے۔“ کنول نے سوچتے ہوئے کہا۔

”تمہارا کیا خیال ہے کہ اسے میرے یہاں آنے کی خبر نہیں ہے؟ بچوں کی خاطر رابطہ کر لیتا مگر ایسا نہیں ہوا۔ اب میں بذات خود جا کر اپنے شک کو یقین میں بدلنا چاہتی ہوں کہ وہ کس حال میں کس کے ساتھ رہ رہا ہے؟ اور کن عیاشیوں کی بنا پر مجھے کھڑے کھڑے خود سے لاتعلقی قرار دے دیا؟ اگر مجھے ثبوت مل جائے تو اچانک اس پر چھاپہ مار دوں۔ کمپنی کا مالک اور گھر کا اوزر بننا کون سی مشکل بات ہے؟ ہر چیز خریدنے کا راستہ کریڈٹ کارڈ سے حل ہو جاتا ہے۔ میں اس سے امپریس نہیں۔ اس کی خاموشی نے مجھے نا اُمید کر دیا ہے۔“ وہ تجسس بھرے لہجے میں بولی۔ ”یہ سب جاننے کے لئے مجھے چھٹیاں چاہئیں۔ تب اسے فورس کر سکتی ہوں کہ طلاق کا وہ پروسیجر جو قانون کے عین مطابق ہے، اسے بروئے کار لائے۔ تاکہ میں اور بچے اس کے سرمایہ کے حصے دار ٹھہرائے جائیں۔ کنول! اس نے مجھ پر زیادتی اور ظلم کیا ہے۔ میں اسے جین سے نہیں رہنے دوں گی۔ ہم اپنے تمام حقوق اس سے جھین لیں گے۔ یہ پاکستان نہیں جہاں مرد اپنے گناہوں کی تمام تر غلاظت ایک پاک دامن بیوی کے حصے میں ڈال کر خود سرخرو ہو جاتے ہیں۔ یہاں کے قانون، انصاف پر تشکیل دیئے جاتے ہیں۔ میں اسی قانون کا سہارا لے کر یہاں آئی ہوں۔ اس لئے مجھے پراپر طریقے سے اس کیس کو ہینڈل کرنا ہوگا۔“ وہ نہایت سنجیدگی سے بولی۔

”تم درست کہہ رہی ہو۔ ایک بار اپنی مجبوری اپنے باس کے گوش گزار کر تو دیکھو۔

ہو سکتا ہے کسی اور کی ڈیوٹی لگا کر تمہیں چھٹی دے ڈالے۔“ کنول نے مشورہ دیا۔
 ”اپنے ذاتی مفاد کے بل بوتے پر چھٹیاں لینا مجھے پسند نہیں۔ باس بھی سراسر عذاب الہی ہے۔ مجھے ڈر ہے، میری مجبوری اور کمزوری کا ناجائز فائدہ اٹھانے کی کوشش ہی نہ کرنے لگے۔ آخر ہے تو وہ دیسی مرد۔ جب عورت پرائے مردوں سے ہمدردیاں وصول کرنے لگے تو جلد یا بدیر اپنی عزت کی ہولی کھیلنے پر مجبور ہو جاتی ہے۔ کیونکہ اسے ٹریپ کرنے کے تمام گر کارآمد ثابت ہوتے ہیں۔ اپنائیت و لگاؤ اور پیار و محبت پر بھروسہ کرتے ہوئے اُسے بے بس و لاچار بنا دیتے ہیں۔ میں اس قسم کے کسی عذاب میں پھنسا نہیں چاہتی۔ پہلے ہی زندگی دکھوں اور محرومیوں میں گھر چکی ہے۔ مزید اسے الجھانے کی ہمت نہیں۔ بس جو بھی کرنا چاہتی ہوں، ان بے گناہ معصوموں کے لئے کرنا چاہتی ہوں۔“ وہ بہت دکھی لہجے میں بول رہی تھی۔

”میری بات مانو، اپنے باس سے ریکویسٹ تو کرو۔ ہو سکتا ہے، تمہارا مسئلہ حل ہو جائے واپس آؤ گی تو ڈبل ڈیوٹی پکڑ لینا۔ اسے اپنا کوئی مسئلہ تو بنا کر بتانا ہو گا۔“ کنول نے پھر سمجھانے کی کوشش کی۔

”دیسی مرد کی منیٹیٹی کبھی چنچن نہیں ہوتی۔ عورت پر اجارہ داری کی اس کے خون میں آمیزش ہوتی ہے۔ وہ میری ایک نہیں سنے گا، اُنہیں کا۔“ وہ ایک لمبی سانس لیتے ہوئے بولی۔ ”میں اُس کے نمبر نو سے بات کرتی ہوں۔ وہ کینیڈین ہے۔ پولاٹ انسان ہے۔ اس بدتمیز اور تک چڑھے کا علاج اس کے پاس ضرور موجود ہو گا۔“

”اب تم نے ٹھیک سوچ لیا ہے۔ خدا کی بندی! بل بھر کو غصے سے باہر رہ کر سوچ لیا کرو۔ فیصلہ بھی بہترین اور عمل بھی لا جواب ہو گا۔“ کنول نے ہنستے ہوئے کہا۔
 ”مجھے اب قدرے اُمید ہو گئی ہے۔“ وہ تسلی بخش لہجے میں بولی۔ ”کہ وہ سر پھرا اس کینیڈین کی بات ضرور سن لے گا۔“

”انشاء اللہ! رات کو کھانے پر میری طرف آجانا۔ تمہاری relaxation کے لئے بہت ضروری ہے۔“ کنول نے نہایت پیار سے کہا۔

”کنول! میں نے تمہیں ہزار بار بولا ہے کہ مجھے تم دونوں کے درمیان ہڈی بننا بہت معیوب لگتا ہے۔ میں سنگل ہوں۔ میری زیادہ تر فرینڈز بھی سنگل ہی ہیں۔ ان کے ساتھ وقت اچھا گزر رہا ہے۔ تم اپنی فیملی کو انجوائے کرو۔ تھینک یو دیری مچ۔“ وہ نہ جانے کا بہانہ بتاتے ہوئے بولی۔ ”ویسے بھی تم سے ملاقات تقریباً روزانہ ہو ہی

جاتی ہے۔ گھر جانا مجھے قطعاً ضروری نہیں لگتا۔“
 ”اچھا بی مولائی! جیسے تمہاری مرضی اور جیسے تم خوش۔“ کنول نے ہنستے ہوئے کہا۔
 ”تم میری بہترین دوست ہو۔ دراصل تم فطرتاً بہت خوب ہو۔ اللہ تعالیٰ تمہیں
 ہمیشہ آباد رکھے۔“ شیریں کے لہجے میں بے پناہ پیار تھا۔

”بہت خامیاں ہیں مجھ میں۔ اللہ تعالیٰ میرے ہر عیب کی پردہ داری رکھ کر مجھے
 عزت جیسی دولت سے ہمکنار رکھے۔ بے مثال تو تم بھی حد درجہ کی ہو۔ تمہیں طلاق
 کیوں ہو گئی؟ یہ معمہ میری سمجھ سے بالاتر ہے جان! وہ ہارون جو تمہارا نام چیتا تھا،
 ایک دم ایسا دور ہوا کہ غلطی کی تلافی کی گنجائش ہی نہ چھوڑی۔“ وہ حیرت سے بولی۔

”جب دوسری عورت کا عشق سرمست کر دے تو پھر اپنی مکمل اور بھرپور شخصیت
 سے مزین بیوی کی حیثیت گلیوں کے تنکے سے بھی کمتر اور حقیر ہو جاتی ہے۔ وہ بیوی
 جو آئیڈیل بن کر اس کے ساتھ زندگی گزار رہی ہوتی ہے، اس کے پاؤں کی زنجیر بن
 جاتی ہے۔ بس یوں سمجھو، اسے اسیری نہیں، آزادی چاہئے تھی۔ وہ میری اور بچوں کی
 ذمہ داری اٹھانے کے قابل نہ تھا، سو چھوڑ گیا۔“ اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔

”اتنی باہمت اور بلند حوصلہ عورت کی آنکھوں میں آنسو زیب نہیں دیتے۔“ کنول
 نے قدرے سنجیدگی سے کہا۔ ”ابھی تو تمہاری زندگی کے خاردار سفر کی شروعات ہوئی
 ہے۔ تم نے ان کانٹوں کو پن کر اپنا راستہ پھولوں اور خوشبو سے معطر کرنا ہے۔ تمہاری
 آنکھوں سے اُبلتا پانی تمہارے راستے کو دلدل بنا دے گا جس میں ٹھکتی ہی چلی جاؤ
 گی۔ کوئی مدد کو نہیں پہنچے گا۔“

”یہ آنسو کم ہمتی کے نہیں، تاسف میں بہہ نکلے ہیں۔“ وہ آنسو صاف کرتے
 ہوئے بولی۔ ”میں چلتی ہوں۔ چھٹی کی کوشش کرتی ہوں۔ تم ابھی یہاں ہی بیٹھو۔
 اہمیتی ہوں، ڈاکٹر ڈیمن فری بھی ہے یا نہیں۔“

وہ ات کر کے اندر چلی گئی۔ اس کا مسئلہ ایسا گمبیر تو تھا نہیں کہ حل نہ ہوتا۔ اس
 نے اس لفون کر کے اسے اسی وقت چھٹی تو مل گئی مگر ڈیوٹی ایک اور پاکستانی لیڈی
 کی لگ گئی۔ پچھل ہونے کی وجہ سے وہ تمللا کر رہ گئی۔ کیونکہ کمرس کے اس کے
 اہلکاراں کر ام ستیاناس ہو کر رہ گئے تھے۔ مگر بحالتِ مجبوری اسے ان حالات کو قبول
 کرنا پڑا۔ شیریں اسے شکریہ کہہ کر اپنے آفس پہنچی تو کنول ابھی تک انتظار کر رہی تھی۔
 اس نے ہاتھ سے پر بھر اٹھا اطمینان دیکھ کر وہ مسکرا اٹھی۔

دونوں کی نگاہیں ملیں اور مسکراتے ہوئے دونوں ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے پارکنگ کی جانب چل پڑیں۔



”مجھے تمہارے یہاں آنے کی خبر تو کب کی مل چکی ہے۔ رابطہ کیسے کرتا؟ جب تمہارے اور میرے درمیان کوئی تعلق اور رشتہ ہی نہیں رہا۔ تم نے مشکل وقت میں مجھے شوہر کے بجائے ملازم بنا کر میری انا اور خود داری کو مجروح کیا تھا۔ زندگی بھر نہیں بھولوں گا۔ وہ وقت تھا جب عقل مند اور ذور اندیش بیوی اپنے سلوک و ردیے سے شوہر کے دل و دماغ کو جیت کر زندگی بھر اس پر حکمرانی کرتی۔ اب ایسی کڑوی کیلی باتوں کا کیا فائدہ؟ میں کیوں دماغ کھپا رہا ہوں تم سے؟“

ہارون نے شیریں کو اپنے آفس میں ہی بلا کر بات کرنا مناسب سمجھا۔ جبکہ دوسری طرف حدیقہ سکتے کے عالم میں بیٹھی ہوئی تھی۔

”تمہاری تمام باتوں کی کڑواہٹ کے پیچھے ہمیشہ اس ڈانک کا ہاتھ رہا ہے۔ تم ایک فاحشہ عورت کے سوا کسی بھی اسٹینس کی حامل نہیں۔ بغیر طلاق کے اور نکاح کے بغیر ہارون کی داشتہ بننے میں بہت فخر محسوس کر رہی ہو۔ چلو بھر پانی میں ڈوب مرو اگر رتی بھر بھی غیرت ہے۔ اور اگر اپنے باپ کی حلال اولاد ہو تو اس عمل میں دیر مت کرتا۔“ شیریں حقارت سے بولے جا رہی تھی۔

حدیقہ خاموش رہی۔ ہارون نے غیظ و غضب سے شیریں کی طرف دیکھا۔

”تمہاری زبان اور خونہ بدلی۔ بتاؤ، یہاں کیا کرنے آئی ہو؟ بچے چھوڑنے آئی ہو تو موسٹ ویلکم۔ اگر طلاق کے بعد مجھ سے اپنے حقوق و سوا کرنا مقصد ہے تو بسم اللہ۔ کیا چاہتی ہو؟“

”تمہیں کنگا نہ کر دیا تو میرا نام بھی شیریں نہیں۔“ وہ غصے میں بولی۔

”میرا خیال ہے، خاندانی پڑھ لکھے لوگوں کی طرح انسانیت اور شرافت سے ان مسائل کو حل کر لیں تو بہتر ہوگا۔ تمہارے اور بچوں کے لئے بھی اور میرے لئے بھی۔“ وہ سمجھانے کے انداز میں بولا۔

”مجھے تم پر بھروسہ نہیں۔ تم مجھے دغا اور فریب دینے سے باز نہیں آؤ گے۔“ وہ دانت چبا کر بولی۔

حدیقہ وہاں سے اٹھ کر باہر نکل گئی اور دونوں گرمی سردی کے ماحول میں آپس

کے باہمی معاملات پر تفصیلاً گفتگو کرنے لگے۔
 آخری فیصلہ شیریں کا اسی شہر میں شفٹ ہونے کا تھا۔ تاکہ بچے باپ کی شفقت
 کے سائے میں رہ کر پروان چڑھیں۔ حلیقہ نے سنا تو شٹنا کر رہ گئی۔ کیونکہ شیریں کی
 بدکلامی اس کے لئے قیامت کے عذاب سے کم نہ تھی اس کی موجودگی میں جینا دو بھر ہو
 جائے گا۔ آج ایک بار وہ پھر خود کو لاوارث اور تنہا محسوس کرنے لگی تھی۔
 ہارون نے اسے تسلی و تشفی دینے کی لاکھ کوشش کی مگر اس کی رگ رگ میں بے
 سکونی اور خوف سرایت کر گیا۔



”سسر حامی! ڈاکٹر صاحب آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔ کیونکہ آپ کے کنٹریکٹ
 کے ختم ہونے میں دس مہینے باقی ہیں۔ دو مہینے کام کرنے کے بعد چھٹی ملنا ناممکن ہے۔
 اور جاب چھوڑنا بہت مشکل۔ مسئلہ کیا ہے جبکہ یہاں آپ کو ہر طرح کی سہولت اور
 آرام میسر ہے؟“ سسر اکیلسن نے حیرت سے کہا۔
 ”اگر مجھے نوکری چھوڑ کر جانا پڑا تو بھی میرا جانا بہت ضروری ہے۔ ماں بیمار
 رہنے لگی ہیں۔ میں بھی بالکل تنہا۔“ وہ اس سے نظریں ملائے بغیر بولی۔
 ”تم چھٹی لے کر جاسکتی ہو۔ سرتہارے کام کو بہت سرائے لگے ہیں۔
 ایڈمنسٹریشن کو تم جیسے لوگوں کی بے حد ضرورت ہے۔ میری مانو تو اپنی چوائس اوپن
 رکھو۔ ماں تنہا اور بیمار ہے تو ساتھ لے آؤ۔ یہاں کے اولڈ پیپلز ہوم میں ان کا دل بھی
 بہل جائے گا۔ تم ان کی نگہداشت بھی احسن طریقے سے کر سکو گی۔“ وہ اپنی پُر خلوص
 رائے دینے لگی۔ جو اسے پسند تو آگئی کہ ڈے کیئر ہوم میں وہ محفوظ ہاتھوں میں ہوں
 گی۔ رات وہ ان کے سینے سے لگ کر میٹھی اور بے فکری نیند میں گزارے گی۔ تمام
 اندیشے اور وہم یکسر اس سے دور چلے جائیں گے۔ پھر ایک دن آئے گا، جب ماں
 صحت یاب ہو کر تمام وقت گھر پر میرے انتظار میں بتانے لگیں گی۔
 ”سننے میں آیا ہے کہ بہت اُن ریزن اسپتال انسان ہیں۔ اپنی بات پر اڑ جائیں تو
 کوئی مائی کال ل پیدا ہی نہیں ہوا جو بات کا رخ بدل سکے۔“ حلیقہ نے خوف زدہ
 ہوتے ہوئے کہا۔

”اوینٹ اور ہارڈ درکنگ لوگوں کی سب سے بڑی خامی یہی تو ہوتی ہے۔ ایک
 ماہ میں چھ ہسپتالز بدل چکے ہیں۔ ریسنگلی ایک مشہور ہسپتال کو چھوڑ کر آئے ہیں۔ آخر

کار اس ہاسپٹل کے اوپر نے تمام اختیارات ان کے ہاتھ میں دے کر انہیں ہمیشہ کے لئے حاصل کر لیا ہے۔ انہوں نے آتے ہی کتنے ہی وڈی مارڈاکٹرز کی چھٹی کرا دی ہے اور ان گنت نرسوں کو گھر بھیج دیا۔ انہوں نے اپنی پسند کے مطابق کمیٹی خود تشکیل دی ہے۔“ وہ نہایت عقیدت سے بول رہی تھی۔

”میری طبیعت کئی دنوں سے خراب ہے۔ میں ان کی ڈانٹ ڈپٹ کے لئے قطعاً تیار نہیں۔ بس، میں نے جو فیصلہ کیا ہے، وہ بدلنا ناممکن ہے۔ اگر انہوں نے میری درخواست کو رد کر دیا تو میں بتائے بغیر بھاگ جاؤں گی۔“ وہ سختی سے بولی۔

”ایسی غلطی کرنے سے پہلے سوچ لینا کہ رزق اور اسٹیشن کولات مارنے والا انسان ناشکرے پن اور بدنصیبی کے زمرے میں آتا ہے۔ پھر سر پہلے ہی پاکستانی کمیونٹی کے سخت خلاف ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس ہاسپٹل میں تم واحد نرس ہو جس کا کام پاکستانی ہونے کے ناتے بھی انہیں بے حد پسند ہے۔“ وہ رازداری سے بولی۔

”کیوں تاپسند ہیں پاکستانی؟ یہ بات درست ہے۔ یہ سن کر میرا ان کے ساتھ کام کرنے کا تمام نشہ ہرن ہو گیا ہے۔ میرا خیال ہے، ملاقات ہو جانی چاہئے۔ دیکھوں تو سہی، جناب خود کتنے پانی میں ہیں۔“ وہ خفگی سے بولی اور کسی بھی فارغ وقت میں ان سے ملنے کا وعدہ کر کے ہوشل چلی گئی۔

دوسرے دن اس کی درخواست پر ڈاکٹر صاحب نے اسے آفس بلا لیا۔ وہ غور سے اس کا جائزہ لیتے ہوئے نہایت سنجیدگی سے بولے۔

”پلیز ریلیکس۔ آرام سے بیٹھئے اور میرے چند سوالوں کا جواب دیجئے۔ ہاں تو سسٹر! جاب چھوڑنے کی وجہ جاننا چاہوں گا۔“ سر نے سختی سے کہا۔ ”کنٹرکٹ کا پیریڈ مکمل کرنا پڑے گا۔ یہ ہماری پالیسی ہے۔“ لہجے کی درشتی سے وہ قدرے خائف سی ہو گئی۔

”مجبوری ہے سر!“ اس نے ڈرتے سمہتے ہوئے کہا۔ ”پاکستان میں میری ماں بالکل تنہا ہیں۔ بیمار بھی رہتی ہیں۔ سوچتی ہوں واپس چلی جاؤں یا انہیں اپنے ساتھ یہاں ہی لے آؤں۔ ہو سکتا ہے وہ ماحول کی تبدیلی میں تندرست ہو جائیں۔ میں بھی مطمئن ہو کر جاب کر سکوں گی۔ ہم دونوں ماں بیٹی ایک دوسرے کے بغیر نامکمل ہیں۔“

”اگر تمہاری ماں یہاں آنے پر رضامند نہ ہوئی..... تو پھر.....؟“ وہ سوالیہ نشان بن گیا۔

”تو وہ ان ویک آپ کو انفارم کر دوں گی۔ پھر میرا یہاں رہنا بہت محال ہے۔“ وہ سنجیدگی سے بولی۔

”مجھے تمہاری کسی بات کا بھروسہ نہیں۔ تم چھٹی کی خاطر کوئی بھی کہانی گھڑ سکتی ہو۔“ وہ بے لحاظی سے بولا۔

”میں آپ کے پاس محض جاب کرتی ہوں۔ میں نے آپ کو اپنی ذات پر کچھ اچھالنے کا حق نہیں سونپا۔ میں ابھی اور اسی وقت ری زائن دیتی ہوں۔ رزق دینے والا وہ ہے، آپ نہیں۔“ وہ تمللا کر بولی۔

”تم مجھے کردار سے پاکستانی معلوم نہیں ہوتی۔ ایشین تو نوکری کی خاطر اپنی اتا اور غیرت کو بالائے طاق رکھ کر ڈور میٹ بن کر زندگی گزار دیتے ہیں۔ تم کس دنیا کی باسی ہو؟“ وہ حیرت سے بولا۔

”میری مزید انسلٹ کرنے سے پہلے یہ ضرور سوچ لیجئے کہ آپ بھی اسی زمرے میں آتے ہیں۔“

”ایسی بھی بات نہیں۔ میرا اس خطے سے دور پار کا واسطہ نہیں رہا۔ میں تمہیں آج بتاتا ہوں کہ میں کیوں یہ بات اتنی خود اعتمادی سے کہہ رہا ہوں۔ سسٹر حادی! پاکستانی نیشن گرے ہوئے اخلاقیات کا دوسرا نام ہے۔ میں نے ایم بی بی ایس کنگ ایڈورڈ سے کیا تھا۔ میرے لئے ہوشل میں رہنا محال تھا۔ آخر میں نے ایک جھوٹا سا گھر لے کر دو جگہری دوستوں کے ساتھ وہاں رہ کر اپنی تعلیم مکمل کی۔ ان دوستوں کی موجودگی میں، میں خود کو بہت سیکو رفیل کرتا تھا۔ مگر انہوں نے بھی مجھے خوب لوٹا، میری مجبوری کا فائدہ اٹھایا۔ میں نے ہاؤس جاب کے دوران ان کے مشورے سے اتنا بڑا بلنڈر کیا کہ جس سے چھٹکارا حاصل کرنا ناممکن ہو گیا تھا۔ میرا ہر ایک سے اعتماد اٹھ گیا تھا۔ کیونکہ میں استعمال کیا گیا۔ ہر لمحے اور ہر قدم پر۔ اس کا احساس مجھے اس وقت ہوا جب میں اپنوں میں واپس گیا۔ پھر میں نے جانے کا نام نہ لیا۔ پھر زندگی میں نے اس اصول پر گزار دی کہ پاکستانی کے سائے سے بھی بچ کر رہو ورنہ وہ اپنی میٹھی چڑی باتوں میں پھانس کر تمہیں ایسا بے وقوف بنائے گا کہ تم اپنے ہاتھوں خود کے قاتل بن جاؤ گے۔ پھر تمہارا ساتھ کوئی نہیں دے گا بلکہ تمہارا مسخر اڑایا جائے گا۔“

لہجے میں بے پناہ افسوس اور دکھ تھا۔

حدیقہ نظریں جھکائے تمام باتیں سن رہی تھی۔ نیبل پر رکھی نیم پلیٹ پر نظر پڑی تو

چونک اٹھی۔

”ڈاکٹر آصف زیدی۔“

وہ ٹیبل پر رکھے ہوئے ہاتھوں کا بغور جائزہ لینے لگی۔

ان ہاتھوں نے میری ماں کا ہاتھ پکڑ کر زندگی کا آغاز کیا تھا۔ جب یہ ہاتھ چھوٹا تو آج تک ماں سنبھلی نہ میں..... گل و گلزار اور خاردار راستے کی پہچان کرنا اپنے بس کا روگ نہ رہا۔ ہر بار راہ کا چناؤ غیر موزوں اور ہر موڑ نا کامیوں و مایوسیوں کی آماجگاہ کی طرف مڑتا رہا۔ تحت شعور میں فقط قدم اٹھانے اور بڑھانے کا درس پنہاں تھا۔ جو زندگی اُلجھنوں کا گھر وندا بن گئی ہے۔

”تم خاموش کیوں ہو؟..... تمہارے دل نے پاکستانی نیشن کے اس گھناؤنے کردار کو تسلیم تو کر لیا ہوگا۔ یہ الگ بات ہے کہ میرے سامنے شکست کھانے میں عار سمجھ رہی ہو۔“ وہ طنز سے بولا۔

”خوش فہمی ہے آپ کی۔ مجھے اس سوال کا جواب دیں کہ آپ نے پاکستان کو اپنی تعلیم کے لئے اہم کیوں سمجھا؟“

”بس جوانی میں ایسے غیر مناسب فیصلے نہ کئے جائیں تو جوان کیسے کہلائیں؟ وہ نشہ و سرور تو سوچنے سمجھنے کی تمام قوتوں کو سلب کر لیتا ہے۔ اور دل پر جو گرہ لگتی ہے، اس کی خبر ہی نہیں ہو پاتی۔ اس نے دل ہی دل میں جواب دیا اور حدیقہ کے غصے میں لال بھسوکا چہرے کو پڑھنے لگا۔

وہ اُس سے امپریس ہو گیا تھا جو پرلے درجے کی کھری اور سچی لڑکی تھی۔ پاکستان سے پیار اور فخر کرنے والی۔

”آپ نے میرے سوال کا جواب نہیں دیا سر!..... اگر آپ کے پاکستانی نیشن کے بارے میں ایسے گھٹیا خیالات ہیں تو آئی ایم سوری۔ میں آپ کے ساتھ کام نہیں کر سکتی۔“ وہ عقیدت بھرے لہجے میں بولی۔ ”میں اپنے وطن کی مٹی سے بنی ہوں۔ اس کا نمک کھا کر پروان چڑھی ہوں۔ وہ دھرتی میری ماں ہے۔ جس کی آغوش میرے لئے تحفظ کا سامان بنی، میں اس کے ساتھ بے وفائی نہیں کر سکتی۔“

”آپ برا مان گئیں؟“ وہ مسکراتے ہوئے بولا۔

”جی۔ اس میں کیا شک ہے آپ کو؟“ وہ تلخی سے بولی۔

”آئی ایم ایکسٹریملی سوری۔ مقصد آپ کو ہرٹ کرنا ہرگز نہ تھا۔ اچھا، اصل

بات کی طرف آتے ہیں۔ کتنے ہفتے چاہئیں چھٹی کے لئے؟“ لہجہ بہت نرم تھا۔
 ”مجھے چھٹی نہیں چاہئے سر! میں آپ جیسے تعصب زدہ انسان کے ساتھ کام کرنا تو
 درکنار، ایک لمحے کے لئے زکنا بھی گناہ عظیم سمجھتی ہوں۔ آپ خود کس مٹی سے تشکیل
 دیئے گئے ہیں؟ ذرا اپنے گریبان میں جھانک کر اپنا موازنہ کرنے کی کوشش کیجئے۔
 آپ کے سینے میں دل ہے، نہ ہی اس میں کسی قسم کے جذبات ہیں۔ آپ کی اس
 خامی نے نہ جانے کتنے لوگوں کی زندگیوں کو اجیرن کیا ہوگا، ذرا سوچئے گا۔ کتنی معصوم
 اور پاکیزہ ہستیوں کو جہنم رسید کیا ہوگا؟ آج میری اس بات پر جمع و تفریق کر کے کسی
 نتیجے پر پہنچنے کی کوشش ضرور کیجئے گا۔“ وہ غصے میں بولی اور باہر نکل گئی۔
 وہ تذبذب کے عالم میں اسے جاتا دیکھنے لگا۔

’مذہب، خاندان اور قوم پر تنقید کرنے کی سزا بہت جان لیوا ہوا کرتی ہے۔ ایک
 بچی مجھے سبق سکھا گئی، وہ بڑ بڑایا۔‘ جس نے نوکری کی پروا کی، نہ ہی میرے اسٹیشن کا
 لحاظ و پاس رکھ کر بات کی۔ دو ٹوک بات اور مستحکم فیصلہ کیا اور میرے منہ پر ٹھوک کر
 چلی گئی..... یہ کون تھی؟ کہاں سے آئی تھی؟‘ وہ بڑ بڑایا۔ ’جو بھی تھی، بے مثال تھی۔‘



نہ جانے حدیقہ کہاں غائب ہو گئی ہے؟..... نہ فون اٹھاتی ہے، نہ میٹج کا جواب دیتی ہے۔ لگتا ہے وہ شیریں اور بچوں کو دیکھ کر بہت بڑے شاق میں مبتلا ہو گئی ہے۔ ہارون سر پکڑ کر بیٹھا سوچے جا رہا تھا۔

شیریں کے آنے سے شادی کا ہونا بھی کھٹائی میں پڑتا لگ رہا ہے۔ وہ اب نہ تو طلاق لے گی، نہ ہی شادی کے لئے رضامند ہوگی۔ غیرت مند عورت ہے۔ شیریں کا سامنا کیونکر کرے گی؟ خود پر لگی ہوئی تہمت کی تصدیق کیونکر کرے گی؟ اُس نے ایک لمبی آہ بھری اور بے دلی سے آفس جانے کی تیاری کرنے لگا۔

شیریں ایگری منٹ کے مطابق ہارون کے سامنے والے اپارٹمنٹ میں بمعہ بچوں کے شفٹ ہو گئی۔ وہاں ہی اسے ہاسپٹل میں جاب بھی مل گئی۔ بچے سکول میں سیٹل ہو گئے۔ ہارون اپنی کمپنی حدیقہ کی غیر موجودگی میں بھی خوب چلا رہا تھا۔

رات کا کھانا شیریں اپنے ہاتھ سے بناتی اور ہارون اسی کے گھر بچوں کے ساتھ کھانا تناول کرتا اور سونے کے لئے اپنے اپارٹمنٹ میں آ جاتا۔ شیریں کو اپنے کھوئے ہوئے حقوق حاصل کرنے کے لئے کورٹ جانا پڑا، نہ ہی بچوں کے سامنے دنگا فساد کر کے اپنی حیثیت منوانی پڑی۔ ٹیبل پر آئے سامنے بیٹھ کر تمام مسائل کو ہر طرح کے جذبات سے عاری ہو کر حل کر لیا گیا تھا۔ جس میں شیریں اور بچے بھی محفوظ رہے اور ہارون بھی مطمئن اور پرسکون ہو گیا۔

مگر حدیقہ ایک بار پھر ایک مرد کے ہاتھوں ہر طریقہ سے لٹ گئی تھی۔ اس سے اسے نہایت مقدس اور پاکیزہ پیار کے ساتھ ہمدردی کی غرض تھی۔ وہ تنہا روتی تھی تو یہ اس کے آنسو پونچھ لیا کرتا تھا۔ وہ اپنا زخم دکھاتی تو یہ اس پر مرہم رکھ کر اس کے اکیلے پن کے احساس کو ختم کیا کرتا تھا۔ ہارون کو اس سے ہمدردی کرتے کرتے بے پناہ پیار ہو گیا تھا۔ اس کے میلان میں کئی بار حدیقہ نے ہوس و پیاس کو محسوس کیا تھا۔ مگر

وہ اسے اپنی سوچ کا فور سمجھ کر ٹال جاتی۔ کچھ دن اس سے کھینچی رہتی مگر مانوسیت کی کشش میں اس حد تک حدت تھی کہ وہ پھر اس کے قریب ہو جاتی۔ اور وہ نہال ہو جاتا۔ مگر بچوں کو پا کر اس کی دیرینہ خواہش اور شب و روز کی محنت بر آئی تھی۔ اس نے اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا کہ بچے اس کی نظروں کے سامنے تھے۔ شیریں اس ٹوٹے ہوئے رشتے کو دوبارہ بحال کرنے کے تمام قانون جان چکی تھی۔ دونوں کی مدامت عروج پر تھی۔ کیونکہ حلالہ کا تصور ہی شیریں کے لئے بے حیائی اور ہارون کے لئے بے غیرتی کے مترادف تھا۔ طلاق کے حق کا غلط استعمال مذاق تو تھا نہیں۔ اللہ تعالیٰ کے ناپسندیدہ فعل کے مرتکب ہونے کی جہاں سزا تجویز کر دی گئی تھی، وہاں اپنی جلد بازی پر چھوٹ کا راستہ بھی دکھا دیا گیا۔ حلالہ کے بغیر یکجائی ناممکن تھی۔



آج اس نے باب کو اپنی آنکھوں سے دیکھ کر اس بات کا یقین کر لیا تھا کہ ماں اس کے بارے میں جو تفصیل بتایا کرتی تھی، وہ بالکل دیا ہی تھا۔ وہ ان کی ناجائز اولاد ہرگز نہ تھی۔ صدیقہ بیبیوں بار اپنا نکاح نامہ اسے دکھا کر لوگوں کی پیشین گوئیوں کو جھوٹا ثابت کیا کرتی تھی۔ اور وہ اپنی ماں پر پورا بھروسہ کر کے اثبات میں اسے گلے لگا کر تسلی و شفی دیا کرتی تھی۔

آج وہ خدا کا شکر ادا کر رہی تھی کہ اس سے ماں کے کردار پر شک کرنے کا گناہ سرزد نہ ہوا تھا۔ ڈاکٹر آصف زیدی ایک جیتا جاگتا انسان تھا۔ ماں کے ذہن کی جھوٹی تخلیق تھی، نہ ہی فریب تھا۔ اُس کا دل کیا کہ وہ زمانے کو چیخ چیخ کر بتا دے کہ میں نے ایک گمشدہ ہستی کو پایا ہے۔



’اس وقت مجھ بدنصیب کے گھر کون آ سکتا ہے؟‘ صدیقہ نے بمشکل گرم کمرے میں ایک طرف کرتے ہوئے سوچا۔ ’یہ وقت بے وقت تو زیدی آیا کرتا تھا۔ مدتیں گزر گئیں، اس وقت اس گھر میں نیل کی آواز نہ گونجی۔‘

وہ آہستہ آہستہ چلتی گیٹ تک پہنچی۔ باہر ٹیکسی کھڑی تھی۔

’کیا معلوم، زیدی ہی بھولا بھٹکا پہنچ گیا ہو۔ ایسے مسافر کو بھولا بھٹکا نہیں کہتے، معاف کر دیا کرتے ہیں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ..... لیکن حدیقہ کے لئے یہ دروازہ کبھی نہیں کھلے گا۔ درگزر کی اُس نے گنجائش ہی نہیں چھوڑی۔ وہ تو بے غیرت نامراد

میرے لئے مرگئی ہے۔ میری تمام زندگی کی محنت و تربیت اکارت چلی گئی۔
اس نے گیٹ کا تالا کھولا تو سامنے حدیقہ کو پا کر شہنشاہ گئی۔

”تم کیا کرنے آئی ہو یہاں؟..... میں حدیقہ کو کب کا دفن کر چکی ہوں۔“

”میں اسی روح کا سایہ ہوں ماما! روچیں مرتی ہیں، نہ ہی دفن ہوتی ہیں۔ وہ اپنے پیاروں کا پیچھا کرتی ہوئی وقتاً فوقتاً ملنے ضرور آتی ہیں۔ آج آپ کی بیٹی کی روح اپنی ماں سے ملنے آئی ہے۔ تھوڑی دیر میں واپس چلی جائے گی۔“ حدیقہ نے ماں کے تہور دیکھ کر نہایت ملاطمت سے کہا۔ اسے اپنی ماں کی ضد اور قہر کا بخوبی اندازہ تھا۔ وہ کسی صورت ماں کو طیش نہیں دلانا چاہتی تھی۔ ورنہ یہ دروازہ اُس پر بند کرنا مامتا کے لئے مشکل نہ تھا۔

وہ بیک کھینچتی ہوئی گیٹ سے اندر آ گئی۔ ماں خاموشی سے پٹی اور آہستہ آہستہ چلتی ہوئی گھر کے اندر داخل ہو گئی۔ وہ بھی مؤذبانہ انداز میں سر جھکائے ساتھ چلتی ہوئی اندر چلی گئی۔

”یہاں رات گزار سکتی ہو۔ صبح ہوتے ہی یہاں سے نکل جانا۔ میں بدکردار بیٹی کی ماں نہیں ہو سکتی۔ آج کے بعد اپنی شکل بھی نہ دکھانا مجھے۔“ اس نے زہریلے لہجے میں کہا اور اپنے کمرے میں چلی گئی۔

حدیقہ خاموشی سے کمرے کی طرف ہوئی۔ بحث و مباحثے میں پڑنے کا وقت نہ تھا۔ اپنی صفائیاں بیان کرنے میں منہ کی کھاتی۔ وہ ماں کے مزاج کو مدِ نظر رکھتے ہوئے خاموشی پر اکتفا کر گئی۔

کمرے میں اس کی بچپن کی ہر چیز موجود تھی۔ اسے یوں لگا جیسے اس کمرے میں ابھی تک اس کی خوشبو رچی بسی ہے۔ ڈرائنگ ٹیبل پر اس کا استعمال شدہ میک اپ کا سامان، ہیز برش، ہیز بینڈز، ہیز ڈرائیو سب کچھ موجود تھا۔ الماری میں اس کے پرانے کپڑے لٹکے ہوئے تھے۔ شو ریک میں جوتے، ہاتھ روم میں اس کے استعمال شدہ تولیے، استعمال شدہ صابن، شیمپو، ٹوتھ پیسٹ اور برش موجود تھے۔

مامتا کا یہ روپ حدیقہ کے بے اولاد ہونے کے باوجود ماں کے پیار و محبت اور انتظار کی غمازی کر رہا تھا۔

اُس نے فرش پر سجدہ ریز ہو کر شکرانہ ادا کیا۔ اور دُکھی دل سے بڑبڑائی کہ اس آشیانے سے نکلنے کے لئے میں کس قدر بے تاب تھی۔ ماں میں ہر وقت کیڑے نکالنا

میرا مشغلہ بن چکا تھا۔ اس کو بے قصور مان کر اس کے چرنوں کی پجارن بننے کے بجائے اسے گناہگار ٹھہرا کر اذیت دینے کا جو خمیازہ میں نے بھگتا ہے، اسے آخری سانس تک یاد رکھوں گی۔

ڈہائی دے کر ہر ماں کی اولاد کو یہ ضرور سبق دوں گی کہ کبھی ماں کا دل نہیں دکھانا۔ اسے ناراض نہیں کرنا۔ اسے اُف تک کہنے کی بھی ہمیں اجازت نہیں دی گئی۔ پھر، ام لیوں بھول جاتے ہیں باری تعالیٰ کے احکامات کو؟..... کتنی بد نصیب ہے وہ اولاد کہ جس کے سامنے اپنی تقدیر لکھنے کے لئے ایک رجسٹر کھلا پڑا ہے اور اس نے اپنی کم سمجھی اور جذباتی پن میں اس پر اپنی قسمت تاریک اور بے ترتیب لفظوں سے لکھ ڈالی۔ جس کو تا حیات وہ بھی سمجھنے اور پڑھنے کی کوشش میں ہی لگی رہی۔

وہ مسلسل سجدے میں گری بڑبڑاتے ہوئے روئے جا رہی تھی۔ آج اسے یقین ہو چلا تھا کہ اس دنیا میں ماں کے علاوہ کوئی بھی ایسا رشتہ نہیں جو فراخ دلی سے معاف کر دیتا ہو۔ اسی امید پر وہ ہمت کر کے سیدھی بیٹھ گئی۔ اس کے ذہن میں گزرے ہوئے وقت کا ایک ایک لمحہ گھوم گیا کہ اس کی ماں نے کن مشکلات میں اس کی پرورش کی تھی۔ اس نے دنیا کو پرکھ کر اسے سمجھایا تھا کہ اپنے جیسے لوگوں میں حدیقہ کا رشتہ طے کر کے عمر بھر کے لئے سرخروئی حاصل کر لے گی۔ مگر وہ ایک نہ مانی تھی۔ خرم کا اسٹیٹس اس کے دماغ پر ایسا سوار تھا کہ اُترنے کا نام نہ لے رہا تھا۔ ماں کی کسی نصیحت کا اثر نہ ہوا۔ اور آج وہ ایسی آگ کے شعلوں میں گھر گئی تھی کہ جس سے ماں کے علاوہ کوئی نجات نہ دلا سکتا تھا۔

ابھی تو ماں کی خفگی نے جس طریقے سے استقبال کیا تھا، وہ جانتی تھی، سب وقتی ہے۔ بھلا ماں کے روئے میں منفی اثرات برپا کیسے ہو سکتے ہیں؟ صبح تک ماں بھی قدرے نارمل ہو چکی ہو گی۔ تھوڑا لعن طعن، کچھ شکوے شکایتیں کرنے کے بعد میرے دل کی صدا پر کان ضرور لگائیں گی۔ میری زبان سے نکلے ہوئے دکھی کلمات پر اپنے کرب کو کیسے چھپا سکیں گی؟ میری زندگی کی ٹریجڈی پر تڑپ اُٹھیں گی اور مجھے گلے لگا کر معاف کر دیں گی۔ اور پھر میری قسمت کا ستارہ چمک اُٹھے گا۔ یہ میرا ایمان ہے۔ میرا یقین محکم ہے۔

وہ سوچتی ہوئی کھڑی ہو گئی۔

مجھ سے میرا گھر، میری جنت کیا چھوٹی کہ دنیا ہی روٹھ گئی۔ میرے رب کی اُن

گنت رحمتیں اور بے پناہ فضل و کرم کا سایہ ہی مجھ سے اٹھ گیا۔

لبے سفر کی تھکان میں اس کے جسم کا انگ انگ درد کے مارے چیخ رہا تھا۔ گرم گرم پانی سے اس نے غسل کیا اور الماری سے پرانے کپڑوں کو نکال کر سینے سے لگایا اور پہن کر آئینے میں خود کا جائزہ لینے لگی۔ وہ بھی تو حدیقہ مگردن رات کی مشقت و خواری اس کے چہرے پر چسپاں ہو کر رہ گئی تھی۔ اک پُر تسکین آہ بھر کر وہ جہانِ نماز پر کھڑی ہو گئی۔ نہ جانے کتنے ہی نفل شکرانے کے پڑھ ڈالے کہ ماں نے ناراضگی کے اظہار میں اسے اندر آنے سے روکا ہے، نہ ہی مار پھٹکار سے خوش آمدید کہا ہے۔ ماں ہے۔ بھلا کب تک ناراض رہ سکتی ہے؟ اُس نے خود کو تسلی دی اور اپنے پرانے بیڈ پر نیم دراز ہو کر سائیڈ ٹیبل کا دراز کھول کر اپنی پرانی چیزوں کو دیکھنے لگی۔

اُس کے ہاتھ کی رکھی ہوئی تمام چیزیں موجود تھیں۔ ایک پرانی سی ڈائری ہاتھ لگ گئی۔ وہ اسے کھول کر پڑھنے لگی۔ یہ اس کی ماں کی ڈائری تھی جو اس نے آصف زیدی کی مدح سرائی میں لکھ ڈالی تھی۔ اسے حاصل کرنے کے بعد مسرتوں اور اُمٹنگوں کی چاشنی میں ڈوبے ہوئے الفاظ اور پھر اس کے اچانک چلے جانے کا دکھ اور آج تک کے انتظار کا ہر لمحہ اس میں مقید تھا۔ ماں کی سوچ کے مطابق حدیقہ آج جس اسٹیج پر تھی، اُسے مورد الزام نہیں ٹھہرایا گیا تھا۔ بلکہ اُس کے لئے رحم و ترس اور ہمدردی و لگاؤ کے چاروں طرف سے دروازے کھلے تھے۔ ہاں، صدیقہ نے ہر پل خود کو مجرم تسلیم کیا تھا۔ کہیں سے بھی آصف زیدی پر الزام تراشی کا گمان نہ ہوا تھا۔ وہ والدین کی نافرمانی پر سزا ملنے پر پشیمان ہو کر ان کی بخشش اور اپنی معافی کی دعا مانگا کرتی تھی۔ صبح تک اس نے ڈائری کا ہر لفظ چھان کر ماں کی وفا و چاہت کا بخوبی اندازہ لگا لیا تھا۔ اس کی عظمت اور بڑھائی کے روبرو اسے اپنی حیثیت تنکے سے بھی کم تر اور بیکار لگی۔ وہ اضطرابی کیفیت میں ڈائری کو اپنے بیگ میں چھپا کر بستر پر لیٹ کر سوچتی رہی۔ تھکاوٹ کے باوجود نیند نے نہ آنے کی قسم ہی کھالی تھی۔ وہ کروڑوں بدلتی رہی۔ آنسو گرتے رہے۔

صبح حدیقہ نے گھر کا جائزہ لیا۔ اسے یوں لگا کہ جیسے اس گھر میں شگفتگی اور رعنائیوں نے بسیرا کر لیا ہے۔ دو بیڈ روم، ڈرائنگ روم اور انچجڈ ڈائننگ روم کا یہ گھر حدیقہ کی محنت سے کی ہوئی کمائی سے خریدا گیا تھا۔ صدیقہ نے اسے اپنا ذاتی گھر سمجھ کر خوب سجایا بھی تھا، آرام دہ بھی بنالیا تھا۔ مگر اب اس کی توجہ سے محروم تھا۔

لان میں خالی کئیا ریاں، برآمدے میں جھلے ہوئے پودے اس بات کی گواہی دے رہے تھے کہ اس گھر کے مکین موت کے انتظار میں ہیں انہیں زندگی کی رونقوں اور لذتوں سے کوئی دلچسپی نہیں۔

صبح اُٹھتے ہی صدیقہ نے اپنی ملازمہ کے ساتھ لگ کر گھر کو چکا دیا۔ ساتھ والوں کے مالی سے ان کی گھاس کٹوائی اور کئیا ریاں میں موسمی پودوں کی پئیری لگوا دی۔ گملے رنگوا کر برآمدے میں سیٹ کرا لئے۔ اور پھر ملازمہ کے ساتھ مل کر حدیقہ کی پسند کا لسانا پکانے لگی۔ دل خوش تھا مگر اظہار پر پابندی لگائے وہ کچن میں تیزی سے کام کر رہی تھی۔ آج جسم میں ازرجی سرایت کرنی ہوئی اسے بہت بھلی لگ رہی تھی۔



ڈاکٹر زیدی نے ٹیبل پر رکھی ہوئی میل کو دیکھنا شروع کیا۔ بھاری پیکٹ دیکھ کر اس نے تیزی سے لفافہ کھولا۔ پرانے دنوں اور بیتے ہوئے سالوں کی خستہ حال ڈائری، جس پر صدیقہ آصف زیدی لکھا ہوا تھا، پڑھ کر ٹھنکا۔

یہ ڈائری عموماً صدیقہ کے ہاتھ میں دیکھ کر آصف سوال کیا کرتا تھا۔
”افسانہ لکھ رہی ہو کہ حقیقت؟“
وہ مسکرا کر جواب دیا کرتی تھی۔

”ڈائری میں حقیقت نامے لکھے جاتے ہیں زیدی صاحب! افسانے نہیں۔“
وہ کھلتی شوخ آواز اس کے کانوں میں گونجنے لگی۔ اُس نے سر جھٹک کر اپنی سوچ کے دھارے کو بدلنا چاہا مگر تجسس و حیرت سر پر سوار تھی۔ کون ہے یہ ڈائری مجھ تک پہنچانے والا؟ اور صدیقہ کو میرے یہاں رہنے کی خبر کس نے دی ہے؟ وہ اسی عالم گھبراہٹ میں ڈائری لے کر آفس سے باہر چلا گیا۔ لان میں لمبے لمبے سانس لے کر خود کو سنبھالتے ہوئے سوچنے لگا۔

’اس ڈائری کو پڑھنے کی ضرورت ہی کیا ہے؟ کسی کا پراپیگنڈہ ہی نہ ہو۔ جب صدیقہ اسے لکھا کرتی تھی، مجھے اس وقت پڑھنے اور دریافت کرنے کا شوق نہیں ہوا تھا۔ اب تو صدیقہ سے تعلق و ربط ٹوٹے مدتیں گزر گئیں۔ اب اسے پڑھنے کا کیا فائدہ؟‘
اُس نے ڈائری بے دردی سے ٹریش کین میں پھینک دی۔ چند لمحے وہاں کھڑا رہا۔ صدیقہ کا معصوم اور خوب صورت چہرہ اس کی نگاہوں کے سامنے گھوم گیا۔
’مجھے نہ سہی، میرے لفظوں کو ہی اہمیت دے کر حقیقت کو سمجھنے کی کوشش کرو۔‘

’میرے بعد گاؤں والوں نے اس کے ساتھ کیا کیا ظلم کئے؟ جہاں شادی ہوئی تھی، اس کا کیا بنا؟ صدیقہ نے اس میں ضرور مینشن کیا ہوگا۔ کیونکہ اسے ڈائری لکھنے کا خبط جو تھا۔ چینک بھی ماری تو ڈائری کھل جایا کرتی تھی۔‘ وہ ٹریش کین میں پھینکی ہوئی ڈائری کو دیکھ کر سوچنے لگا۔

اُس نے لپک کر ڈائری ٹریش کین سے اٹھا کر اپنے سینے سے لگالی اور گاڑی کی جانب چل دیا۔

’صدیقہ کا مجھ سے رشتہ پردہ داری میں استوار ہوا تھا۔ ماسوائے چند لوگوں کے کسی کو اس کی خبر نہ تھی۔ مگر کس نے کھوج لگا کر مجھے اس رشتے کی یاد دہانی کرانے کی کوشش کی ہے؟‘ وہ گاڑی ڈرائیو کرتے ہوئے سوچے جا رہا تھا۔

اپنے محلِ نما گھر کے سامنے لچہ بھر کو رک کر بھاری قدموں سے چلتا ہوا وسیع و عریض لان کو عبور کر کے مین ڈور کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا۔ گھر میں خاموشی اور تنہائی کا جان لیوا احساس ہمیشہ کی طرح اس کے ساتھ تھا۔

وہ بڑبڑایا۔ ’آج تو اس اکیلے پن کو قوت گویائی مل گئی ہے۔‘

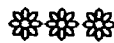
وہ سیدھا اپنی لائبریری میں چلا گیا اور اپنی دنیا میں ایسا کھویا کہ وقت گزر جانے کا احساس ہی نہ ہوا۔ شام کے سائے گہرے ہوتے گئے۔ لائبریری میں کھڑکیوں سے جھانکتی ہوئی روشنی سیاہی کا روپ دھارنے لگی تو وہ چونک اٹھا۔ حقیقت و سچائی پر مبنی اُس کی وہ زندگی جسے وہ فراموش کر چکا تھا، ماضی اس کے سامنے اک کھلی کتاب کی طرح موجود تھا۔

’صدیقہ نے گاؤں کا ذکر کیا نہ ہی اپنی دوسری شادی کے بارے میں کچھ لکھا ہے۔ اپنی جاب کا رونا۔ نہ جانے چاچا اور ماسی کون ہیں؟ حدیقہ ان کی بیٹی ہے؟ کچھ گڈمڈ ہے۔ الفاظ مٹے ہوئے ہیں، کچھ سمجھ نہیں آرہا۔‘

اس نے پڑھنے کی کوشش کی مگر آخری صفحے پھٹے ہوئے تھے۔ تحریر مٹی ہوئی تھی۔ ہر جگہ چاچا کی مہربانیوں اور ماسی کی خدمت کا تذکرہ تھا۔ اور آصف کی ہر بل کی یاد اور انتظار کا داویلا تھا۔ اس کو جی بھر کر دی گئی دعائیں بھی درج تھیں۔ اور اس کو معاف کرنے کی التجا بھی موجود تھی۔

اسے آج احساس ہو رہا تھا کہ اس نے جو بے انصافی اور زیادتی صدیقہ پر کی تھی، اس گناہ کا کفارہ اس نے بھی ادا کیا تھا۔

اللہ تعالیٰ نے اسے اس دنیا میں ہی جزا و سزا کا سبق سکھانے کا تہیہ کر لیا تھا۔ وہ لرز اٹھا تھا۔ اسے صدیقہ کے ساتھ بیٹے ہوئے ماہ و سال کا پیار اور لگاؤ تڑپانے لگا۔ اس کا وہاں سے واپس آنا اور صدیقہ کا رونا اور پلکنا قلم کی مانند آنکھوں کے سامنے گھوم گیا۔ بے دردی اور سنگ دلی سے اُسے ایک اجنبی شہر کے انجانے لوگوں میں دھاندلی اور بے لگامی سے خالی ہاتھ چھوڑ کر لندن آ جانا اور پھر خبر تک نہ لینا ظلم ہی تو تھا۔ پھر طویل وقفے کے بعد شمینہ سے رابطہ اور اس کی باتوں پر یقین کر لینا نادانی اور احمقانہ پن ہی تو تھا۔



”ماما جانی! میری التجائیں اور منتیں آپ کے سامنے بالکل بے معنی ہو کر رہ گئی ہیں۔ میں آپ کو ساتھ لے جانا چاہتی ہوں۔ یہاں آپ اکیلی، وہاں میں تنہا۔ ماں بیٹی مل کر رہیں گے۔ بالکل اسی طرح جیسے ہم پہلے رہتی تھیں۔“ وہ ماں کے قدموں میں بیٹھ کر خوشامدی لہجے میں بولی۔

”مجھے تمہاری شکل دیکھ کر خود پر غصہ آ جاتا ہے۔ میں نے تمہیں جنم دے کر بہت بڑی غلطی کی ہے۔ تمہارے سسرال میں ہر ایک کی زبان پر میرے لئے منوں بھاری گالی ہر وقت گردش میں رہتی ہے۔ ان کا قصور نہیں۔ تم نے لوگوں کی پیشین گوئیوں پر اپنے کردار کی غلاظت چڑھا کر یہ ثابت کر دیا ہے کہ تمہارے ناجائز تعلقات تہمت نہیں۔“ وہ قہر آلود لہجے میں بولی۔ ”میں نے تمہیں اس گھر میں پناہ صرف اس لئے دی ہے کہ ورنہ تم مزید میرا منہ کالا کرنے سے دریغ نہیں کروں گی۔ جب تک تم واپس نہیں چلی جاتی، مجھے چین و سکون ملنے والا نہیں۔“

”ماما! کاش آپ نے مجھ سے پوچھ ہی لیا ہوتا کہ مجھ پر آپ کے بغیر کیا گزری؟ ماما! آپ کی بیٹی لاوارث ہونے کی سند ہاتھوں میں لئے پھرتی رہی۔ نہ خرم نے خود کو میرا وارث ڈیکلئر کیا، نہ سسرال نے، نہ ہی باپ اور ماں نے۔ اس کا انجام کیا ہوا؟ سنا چاہتی ہیں تو بتاؤں۔“ وہ سر جھکائے رونے لگی۔

”مگر ماں پتھر کا بت بنی بیٹھی رہی۔“

”مجھ سے استوار تمام رشتوں کی بے مہری، بے رخی اور لا پرواہی نے نہ میرے پاس عزت چھوڑی نہ پیسہ۔ میں کتنی دفعہ اُجڑی ہوں، آپ کو کچھ علم ہے؟ آپ فقط مجھے گناہگار کہہ کر مجھ سے کنارہ کشی اختیار نہیں کر سکتیں۔ آج میں آپ کو اپنی آپ بیتی

سنا کر دم لوں گی۔ اگر پھر بھی مجھے بجرم کا خطاب دیا تو زہر کھا کر مر جاؤں گی آپ کے سامنے۔“ اس نے زہر کی شیشی ماں کے سامنے کرتے ہوئے کہا۔ ”مجھے نہیں جینا ماما! میں بے قصور ہوتے ہوئے بھی قصور وار ہوں۔ ایک بار میری زبانی ایک سچی داستان سن کر جو فیصلہ کریں گی، مجھے منظور ہوگا۔ ماما! میں آپ کی عدالت کے کٹہرے میں کھڑی ہوں۔ اپنی صفائی میں دلائل دینا میرا حق بنتا ہے۔ اور سن کر سزا تجویز کرنا یا درگزر کرنا آپ کے اختیار میں ہے۔“

ماں نے اس کے ہاتھ سے زہر کی شیشی بھٹ کر کہا۔ ”تم اتنی بزدل بھی ہو، میں سوچ بھی نہیں سکتی۔ جاؤ، میری آنکھوں سے دُور ہو جاؤ۔ مجھے زندہ درگور کرنا چاہتی ہو، اس لئے آئی ہو؟“

”میں چلی جاؤں گی۔ مگر پہلے آپ کو میرے ماضی کے ہر لمحے سے باخبر ہونا پڑے گا۔ قرآن مجید لے آئے۔ میں اللہ کی اس مقدس کتاب پر ہاتھ رکھ کر قسم اٹھاتی ہوں کہ اپنی صفائی میں ایک لفظ کا بھی ہیر پھیر کروں تو مجھے خدا کی مار پڑے۔“ وہ سرعت سے اٹھی اور قرآن اٹھالائی۔

”خبردار! جو اپنی گندگی، غلاظت اور ناپاکی کے درمیان خدا کی مقدس کتاب کی بے حرمتی کرنے کی کوشش کی۔ تم کیا جانو اس کے احکامات اور طریقہ حیات اور ذریعہ نجات کو۔ کبھی اسے پڑھنے کی کوشش کی ہے تم نے؟ اگر اس کو پڑھ کر سمجھنے کی کوشش کی ہوتی تو آج تمہارا یہ حال نہ ہوتا۔“ وہ غصے میں چیخ کر بولی۔

”ماما! اگر آپ کی تربیت میں کھوٹ ہوتا تو بالکل ایسا ہی ہوتا جیسا آپ فرما رہی ہیں۔ اس کی رفاقت نے مجھے کوہِ ہمالیہ کی مانند مضبوط رکھا۔ آج میں جس حال میں ہوں، اپنے نصیب کی دھنکاری ہوئی ہوں۔ جو بینیاں پیچھے سے کمرور ہوں، ان کے ساتھ معاشرہ یہی سلوک روا رکھتا ہے۔ آپ کی اپنی مثال سامنے موجود ہے۔ میں نے آپ کی کوکھ سے جنم لیا ہے ماما! میں بختوں والی کیسے ہو سکتی تھی؟“ وہ ماں کے گھٹنوں پر سر رکھ کر رونے لگی اور بیتی ہوئی زندگی میں ظلم و تشدد، نا انصافی اور زیادتی کی آمیزش کو ماں کے گوش گزار کر دیا۔

ماں تڑپ اٹھی۔

”مجھے معاف کر دو بیٹی! کاش میں نے تم پر بھروسہ کر کے تمہاری ازدواجی زندگی میں رونما ہونے والے تمام حادثات کے بارے میں جان لیا ہوتا۔ میں آج تک

”ہمارے باپ کو نہ بھلا پائی اور نہ ہی اس کی آمد کے انتظار میں گلہ شکوہ کیا ہے۔ مگر آج میرے جسم کا زواں زواں زبان بن کر اُسے بددعائیں دینے لگا ہے جس کی غیر مہربانی۔ یہ وہالی اور غیر امانہ داری نے مجھے تو ذلیل و رسوا کیا ہی تھا، تم بھی اُس اداکارہ کے ساتھ نہ چلو! وہاں ملازمی۔ مجھے معاف کر دو میری بچی! اس کرب میں میں نے تمہیں کہا تھا کہ اگر تمہاری عزت سے ہاروں کو کھیلنے کا موقع فراہم کر دیا۔ اہم بدلہ دے گا۔ میں تمہاری اہم ہوں۔“ صدیقہ ہاتھ جوڑے بیٹی سے التجائیہ انداز میں بولی۔ ”میری جان! اہم لینڈ انہیں جائیں گے۔ ہم اس گھر میں بھی نہیں رہیں گے۔ ہم دونوں اپنے گاؤں کے کچے کونٹوں میں بہت پرسکون زندگی گزار لیں گے۔ ہمیں اس دنیا سے کچھ نہیں چاہئے۔ ہم دونوں اطمینان اور تسکین کی پیاسی ہیں۔ آج تم نے میری کمر توڑ دی ہے میری بچی! تمہارے باپ کے جانے کے بعد میں کسمپرسی میں خود کو کھسکتی رہی۔ لیکن اب تمہارے دکھ و غم میں یہاں ایک بل کے لئے نہیں رک سکتی۔ میں والدین کی قبروں پر جا کر معافی مانگ لوں گی۔ شاید ان کی نافرمانی کی سزا مجھ سے اٹھالی جائے اور میں سکون سے ہسکتا ہو کر تمہیں خوشیاں دے سکوں۔“

”اما! وہ لوگ ہمیں قبول نہیں کریں گے۔ لوگ خاندان میں رونما ہونے والے بھیا تک واقعات کو صدیوں تک یاد رکھتے ہیں۔ خصوصاً بیٹی کے چال چلن کا گہرا اور سیاہ دھبہ تا قیامت نہیں مٹتا۔“ حدیقہ نے ہمت کر کے ماں کو سمجھانے کی کوشش کی۔

”وہاں ہمارے اپنے خونی رشتے بستے ہیں بیٹا! تم دیکھنا، ہمیں سینے سے لگا لیں گے۔ میں اب یہاں رہ کر اُس شوہر کا انتظار کیوں کروں جس نے کبھی مڑ کر نہ دیکھا۔ میں کس قدر نادان اور احمق ہوں کہ سر کے بال سفید ہو گئے، چہرے پر زمانہ گزرنے کے آثار ہویدا ہو گئے مگر اپنے شوہر کی واپسی کے انتظار میں آج بھی پُر امید ہوں۔ کیا معلوم وہ کسی حادثے کا شکار ہو گئے ہوں یا کسی بہت بڑی مصیبت میں گرفتار ہو گئے ہوں۔ یہ تو میں آج تک نہ مان سکی کہ وہ مجھے دل سے دھوکے باز اور خود غرض تصور کرتے تھے۔ جذباتی انسان تھے۔ لیکن اب تو خون بھی سرد پڑ گیا ہوگا۔ اب تو آہی جاتے۔ میں نے والدین کو ان کی خاطر چھوڑا تھا۔ کیا ابھی تک سمجھ نہیں پائے؟..... میرا دل کہتا ہے، وہ زندہ نہیں ہیں۔ ہاں دونوں صورتوں میں یہاں رکتا بے سود ہے۔“ وہ کچھ ہوئے دل سے سوچتے ہوئے بولی۔ ”انہوں نے چاہے سرسری طور پر واپس آنے کا وعدہ کیا تھا، اسی پر بھروسہ کر گئی۔ زندگی کی مشکلات اور کمینوں میں بھی

انہیں نہ بھول سکی۔ میں نے ایسا کیوں کیا حدیقہ؟ خود پر ظلم کیا اور تمہارے لئے ایک گڑھا کھود دیا، جس سے تمہارا نکلتا مشکل ہو گیا ہے۔“

”ماما! آپ پھر فینٹسی کی دنیا میں پہنچ گئی ہیں۔ حقیقت کچھ اور بھی تو ہو سکتی ہے۔ خرم ایک انسان تھا تو کیا ڈاکٹر آصف زیدی فرشتہ تھے؟ ہرگز نہیں ماما! انہیں اس ملک اور یہاں کے باشندوں سے نہ لگاؤ تھا، نہ ہی انس تھا۔ وہ انڈین اور آپ پاکستانی۔ آپ کی یکجائی عارضی اور وقتی تو ہو سکتی تھی، لیکن ابدی اور ہمیشگی جدائی میں ہی پوشیدہ تھی۔ انہوں نے آپ سے ہی بے وفائی اور دغا بازی نہیں کی، آپ کے پاکستانی ہونے کے ناطے آپ سے بے پناہ نفرت کی ہے۔ جب کہ آپ کہا کرتی تھیں کہ انہیں پاکستان بہت پسند تھا۔ لیکن وہ سارا ڈرامہ تھا۔ ان کا وہ جذبہ وقتی تھا۔ وہ لگاؤ سچا نہ تھا۔ ورنہ یوں نہ چھوڑ جاتے۔ ایک بار تو مڑ کر دیکھ لیتے کہ آپ کس حال میں ہیں۔“ وہ سنجیدہ تھی۔

”تم ٹھیک ہی کہتی ہو۔“ وہ تذبذب میں بولی۔ ”شاید مجھے چھوڑنے کا بہانہ ہی تھا۔ پھر بھی دل نہیں مانتا۔ وہ تو مجھ پر مرتے تھے۔“

”تو پھر بقیہ زندگی بھی اسی خوش فہمی میں گزار لیں۔“ وہ چڑی گئی۔

”میں خوش فہمی کی دنیا سے باہر نکل آئی ہوں تمہاری زندگی کی اُن گنت ناکامیوں اور محرومیوں کا سن کر۔ اس لئے تو سوچنے پر مجبور ہو گئی ہوں کہ شہر کی بے رحم و بے مروت زندگی سے دور بہت دور اپنے گاؤں چلی جاؤں۔ جہاں کی زندگی سادہ اور سہل ہے۔ بناوٹ ہے نہ مقابلہ بازی میں سبقت لے جانے کی اُمنگ میں دوسروں کی حق تلفی ہے۔ جہاں غلطیوں کو درگزر کر کے دل کو فراخ اور سوچ کو مثبت کر لیا جاتا ہے۔ جہاں گرے ہوئے کو سہارا دے کر کھڑا کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اور کھڑا کرنے کے بعد قدم اٹھانے پر مجبور کر دیا جاتا ہے اور زندگی پھر سے چل نکلتی ہے۔ دل تو چاہ رہا ہے کہ اسی جنت کو اپنی پناہ گاہ کیوں نہ بنا لیں۔“ لہجے میں ایک قلمی بخش رمت نمایاں تھی۔

”ماما! سوچ سمجھ کر فیصلہ کرنا اشد ضروری ہے۔ کہیں یہ کہاوت ہم پر صادر نہ آ جائے کہ دور کے ڈھول سہانے۔ آپشن اوپن رکھنے میں کوئی قباحت نہیں۔ ہم وہاں جس کی تلاش میں جانا چاہ رہی ہیں اگر لالچئی اور لالچ حاصل ہوا تو واپسی کے تمام راستے کھلے ہونے چاہئیں۔ یہاں ہم اپنی زندگی کی ذمہ دار خود ہیں۔ وہاں ہماری ہر سانس

ہاں۔ ہر فرد کا اختیار ہو گا۔ ہمیں ان کے اشاروں اور فیصلوں پر سرنگوں ہونا پڑے گا۔ لیونہ گاؤں کا پلجر ہی یہی ڈیمانڈ کرتا ہے۔ کیا آپ اور میں ایسے ماحول میں ایسا نہ ہو سکیں گی؟ جبکہ آپ کو اس گاؤں کے رسم و رواج کو خیر باد کہے مدت ہو گئی اور میں نے کتابوں اور فلموں سے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ وہاں کا نوکر بھی آپ کی طرح ہی ہے۔ کیا میں وہاں سکون و اطمینان سے رہ سکوں گی؟ اے اے ایسے ماحول میں ایک لمحہ بھی نہ گزارا ہو؟“ وہ ماں کے ساتھ نہایت مؤدبانہ انداز سے بات کر رہی تھی۔

”وہاں قدم قدم پر تمہاری عزت و ناموس کے رکھوالے موجود ہوں گے۔ ہارون جیسے شیطان کو کیڑے کی طرح کچل کر ٹوڑے کے ڈھیر پر پھینکا ان کے لئے مشکل نہ ہو گا۔ وہاں ماں بہنوں اور بیٹیوں کی عزت کے دعوے دار موجود ہیں۔ وقت نے مجھے بہت کچھ سکھا دیا ہے۔ اپنوں کو بتائے بغیر شادی کرنے کے نتائج تو تم نے دیکھ ہی لئے ہیں۔ کاش وہ وقت واپس پلٹ آئے۔ اب میں اپنی خالہ کی بہو بننے میں فخر محسوس کروں گی۔ بے شک اس کا بیٹا جاہل، گنوار اور مار پیٹ کرنے والا ہی کیوں نہ ہو لیکن میری عزت پر جان نثار کرنے میں گریز نہیں کرے گا۔ میرا محافظ اور ذمہ دار ہو گا۔ آہ! وہ وقت تو واپس آنے سے رہا۔ اب کم از کم اپنے جیتے جی اپنی بیٹی کی زندگی ہی سنوار جاؤں۔“ وہ حسرت و یاس سے بولی۔

”ماما! کیا آپ وہاں میری شادی کرنا چاہیں گی؟“ وہ چونک اٹھی۔

”اب یہ کیسے ممکن ہے؟ تم خرم کی امانت ہو۔ دوسرا پنجرے سے نکلی ہوئی آزاد چڑیا کے پر کاٹ کر قید کرنا زیادتی ہے۔ سراسر ظلم ہے۔ میرے کہنے کا مقصد ہے کہ تم وہاں اکیلی بھی باعزت طریقے سے زندگی گزار سکتی ہو۔ ہم اس شہر کی فریب کاریوں کو نہیں سمجھ سکتیں۔“ وہ سوچتے ہوئے بولی۔ ”ہمیں اپنی اس کمزوری کو مان لینا چاہئے۔ وہ سہیل اور ٹرسٹنگ لوگ ہیں۔ مجھے تو بس تمہاری فکر کھائے جا رہی ہے۔ اپنی تو گزر گئی۔“

”ماما! آپ کینیڈا میرے ساتھ ہوں گی تو سب کچھ درست رہے گا۔ وہاں کی تنہائی میں، میں نے سہارے ڈھونڈے اور دھوکا کھا گئی۔ گاؤں میں سیٹل ہونا ہم دونوں کے لئے آزمائش ہے، بہت کٹھن امتحان ہے۔ وہاں ہمیں سکون نصیب نہیں ہو گا۔ ہار مان کریں بھاگنے سے نصیب میں کامیابیاں لکھ دی جائیں تو کوئی ذی روح

اس کارِ جہاں میں مضطرب اور حالات کا ستایا ہوا نظر نہ آئے۔“ وہ بہت سمجھداری سے بات کر رہی تھی۔

”میری بیٹی اتنی دُور اندیش اور دانش مند ہوگی، میں نے تو کبھی سوچا بھی نہیں۔ تم ہر طرح کے جذبات سے عاری ہو کر نہایت پریکٹیکل بات کر رہی ہو سچ مچ ہم نہ تیرے نہ بیڑ۔ ہماری تو نسل ہی نرالی ہے۔ اب وہاں ہمیں کوئی نہیں پہچانے گا۔ اور وہ ہمارے لئے سُرخیجڑ ہوں گے۔“ وہ ہاتھ ملتے ہوئے بولی۔ ”میں تو وہاں کے لوگوں کے لئے مرجھی ہوں۔ وہ مجھے دیکھ کر ان بیٹے ہوئے بے شمار سالوں کا حساب مانگیں گے تو میں کیا جواب دوں گی؟ والدین قبروں میں بھی تڑپ اٹھیں گے۔“

”پریشان مت ہوں ماما! اب نہ آپ تنہا ہیں، نہ میں اکیلی ہوں۔ آپ نے کیسے سوچ لیا کہ وہ ہمیں گلے لگا لیں گے؟ اگر ایسا ہوتا تو نانا آپ کو مُردہ قرار دے کر آپ پر ہمیشہ کے لئے وہاں کے دروازے بند نہ کرتے۔ اب اپنی بقیہ زندگی کا فیصلہ ایک دوسرے کے مشورے اور سوچ بچار سے کریں گے تو یہ گھنے اور سیاہ بادل چھٹ جائیں گے۔“ ماں کو پا کر اس کے حوصلے بلند ہو چکے تھے۔

”انشاء اللہ۔“ ماں نے خوشی سے مغلوب ہو کر بلند آواز میں کہا اور اسے گلے لگا لیا۔



”سر! میں اس کی ذاتی زندگی کے اُتار چڑھاؤ کو قطعاً نہیں جانتی۔ وہ حد درجہ کم گو اور پرائیویٹ لڑکی تھی۔ عموماً اپنی ماں کا ذکر بڑی ہی عقیدت اور احترام سے کیا کرتی تھی۔ ماں کی بیماری اور تنہائی کی وجہ سے بہت پریشان رہتی تھی۔ اس لئے تو یہاں سے چلی گئی۔“

حدیقہ کی کوئیگ نے آصف زیدی کو سوال کا جواب دیا۔

”واپسی کے بارے میں کچھ بتا کر گئی ہے کہ نہیں؟“ وہ تجسس سے بولا۔

”کہہ رہی تھی کہ اگر ماں یہاں آنے پر رضامند ہو گئیں تو اس صورت میں واپسی کے امکان ہیں۔ لیکن وہ جاب کسی اور ہسپتال میں کرنے کی خواہش مند نظر آ رہی تھی۔“ وہ سنجیدگی سے بولی۔ ”اب میں جاسکتی ہوں سر؟“

”کبھی اس نے اپنی شادی اور بچوں وغیرہ کا ذکر کیا ہو؟“ اس نے کریدا۔

”شادی شدہ تو تھی۔ میاں ڈاکٹر ہے۔ یہاں جاب کرتا تھا مگر کسی مجبوری کے

تحت واپس چلا گیا تھا۔ وہ یہاں رہ گئی تھی۔ کیوں رہ گئی تھی؟ آئی ڈونٹ نو۔ نہ اُس نے بتایا، نہ ہی میں نے پوچھنا مناسب سمجھا۔ میں اس سے زیادہ کچھ نہیں جانتی۔ بہت غصہ لڑی تھی۔ میں نے کئی بار اسے آنسو بہاتے دیکھا۔ وجہ پوچھی تو یہ کہہ کر ٹال جاتی تھی کہ آٹھیں خراب ہیں آج کل، اس لئے ہر وقت پُر آشوب رہتی ہیں۔“ وہ اندر وہی ہو گئی۔ ”نہ جانے کس غم کا شکار تھی۔ کبھی کھل کر ہنسی نہ ہی گپ شپ کی آٹھیں تھیں۔ صرف اپنے کام سے مطلب رکھا۔ نہ کسی کے اچھے میں نہ برے میں۔ سراسر! آپ سے پوچھ سکتی ہوں کہ آپ اس کی ذاتی زندگی کے بارے میں کیوں جاننا چاہتے ہیں؟“ وہ حیرت و اشتیاق سے بولی۔

”در اصل مجھے کام سے انصاف کرنے والے لوگ بے حد پسند ہیں۔ اس کے چلے جانے کا دکھ ہوا ہے۔ خیر کئی لوگ جاب پر آئے اور چلے گئے۔ اس کے رخصت ہونے کو بھی اسی سوچ کے ساتھ ختم کرنا ہی بہتر ہے۔ لڑکی بہت کھری تھی۔ امپریس ہو گیا ہوں۔ آپ جا سکتی ہیں۔ تھینک یو ویری مچ انفارمیشن دینے کا۔“

”ویلم سر!“ وہ اتنا کہہ کر آفس سے باہر نکل گئی۔

’نہ جانے کون تھی؟..... پاکستان سے بھیجی گئی یہ ڈائری وہ کیونکر بھیجے گی۔ میرا وہم ہے سب۔‘ اُس نے سوچ کو ذہن سے نکالنے کی کوشش کی مگر بے سود۔ ڈائری کے صفحات کو بے مقصد ہی الٹ پلٹ کر دیکھتا رہا، جسے وہ ابھی بھی پڑھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ذہنی رد و کد میں معاملے کو سمجھ ہی نہ سکا تھا۔

صدیقہ کے پیار و محبت اور اس کے انجام کی تفصیل کو بار بار پڑھا۔ دل پر قیامت کے گزر جانے کی تحریر سے آگ کے شعلے بھڑکتے معلوم ہوتے تھے۔ شوہر کے انتظار میں شب و روز کی دعاؤں میں فریادیں اور پکار تھی۔ اور اس اُمید و نیم کے جذبے میں وہ آج تک ملوث تھی۔

’مجھے صدیقہ کی زندگی کو جہنم رسید کرنے کا قطعاً حق نہیں پہنچتا تھا۔ میں نے اپنی جوانی کے نشے میں اپنی سوچ پر گرہ لگا کر ایک زندگی کو تباہ کر دیا ہے۔ میں ظالم ہوں۔ اللہ تعالیٰ مجھے کیسے معاف کر سکتا ہے؟ میں بے انصاف تھا تو پیدا کرنے والے نے تو انصاف برتا۔ مجھ پر اپنی ہر نعمت و فضل و کرم اور رحمتوں کے دروازے بند کر دیئے۔ نہ بیوی اپنی نکلی، نہ بچے میرے بنے۔ اس سے بڑی سزا اور کون سی ہو سکتی تھی کہ میری نسل ہی بے دین نکلی۔‘

وہ کمرے میں ٹھہتا رہا اور آنسو سیلاب کی مانند اس کے گریبان کو بھگوتے رہے۔ جب دل ذرا ہلکا پڑا تو ذہن نے کام کرنا شروع کر دیا۔ رات بھر کی سوچ ایک نقطے پر منجمد ہو گئی اور اس نے اس کے سامنے سر جھکا لیا۔ ہو نہ ہو یہ سسٹر حادی ہے کا کام ہے۔ اس کا صدیقہ سے کیا رشتہ ہے، جس نے ڈائری مجھے بھیج کر ماضی کی یادوں کو تازہ کرنے کی کوشش کی ہے؟



”شیریں! مجھے تمہارے پیار اور وفا پر یقین اور اعتماد تو ہمیشہ سے تھا، تمہاری پاکیزگی اور شرافت پر حد درجے کا مان تھا۔ تم بخوبی جانتی ہو کہ بچے مجھے کس قدر عزیز ہیں۔ ان کی خاطر میں کچھ بھی کرنے کو ہر وقت تیار رہتا تھا۔ وہ گھر جس کو تم نے اپنی کاوش سے آباد کیا تھا، میرے چاب لیس ہونے پر تم نے اس گھر کی خوشحالی میں رتی بھر فرق نہ آنے دیا۔ میں تمہارا قدر دان رہا ہوں۔ کبھی احسان فراموشی نہیں کی۔ ہمیشہ تمہاری عزت و تحريم کا خیال رکھا۔“ وہ اس کے سامنے کھانے کی ٹیبل پر بیٹھا پُرسٹائش لہجے میں بول رہا تھا۔

”تو آنا فانا اتنا بڑا طوفان کیسے آگیا؟“ وہ بے حد سنجیدہ تھی۔

”اس طوفان کی وجوہات بے شمار تھیں۔ ایک ہوتی تو نوبت یہاں تک کیوں پہنچتی؟ انسان دوسروں کی غیر معیاری غلطیوں کو نظر انداز بھی کر سکتا ہے اور درگزر کرنے میں زیادہ مشکل بھی نہیں ہوتی۔ تم جانتی ہو ہمارے درمیان غلط فہمیوں کا ٹھائیں مارتا سمندر موجزن ہو چکا تھا۔ اس کا حل سوچنے کے بجائے میں نے جلد بازی سے کام لے کر تمہارے اور اپنے خوبصورت اور پُر اعتماد رشتے کی دھجیاں ہی تو اڑا دیں۔“ اس کے لہجے میں پچھتاوا تھا۔ شیریں نظریں جھکائے سن رہی تھی۔

”تمہاری سوگوار شکل دیکھ کر میں بہت پشیمان ہو رہا ہوں۔ اٹھو..... بی بیو۔ خوبصورت لباس پہنو، اچھا سا تیار ہو جاؤ۔ بچوں کے ساتھ کھانے کے لئے باہر چلتے ہیں۔“ وہ پیار بھرے لہجے میں بولا۔

”دل نہیں چاہ رہا۔“ دو موٹے آنسو اس کی آنکھوں سے نکلے اور اس کے رخسار بھگو گئے۔

”بگئی کہیں کی۔“ وہ کرسی سے اٹھا اور اس کا سراپے ساتھ لگا کر بولا۔ ”آج تو خوشیاں منانے کی رات ہے جان! تم ہو کہ سوگ منار ہی ہو۔“

”ہارون! مجھے خود سے گھن آنے لگی ہے۔ نفرت ہو گئی ہے مجھے اپنی ذات سے۔“
 ”تیرے اور کتنے ہو گئی ہوں۔ تمہاری جلد بازی کا خمیازہ مجھے بھگتنا پڑا۔“ وہ آنسو صاف
 لڑتے ہوئے بولی۔

”میں بھی اس سزا میں برابر کا شریک ہوں میری جان! یہ سوچ کر میری تڑپتی
 ہوئی غیرت اور انا کو تسکین مل جاتی ہے کہ بچوں کے لئے یہی مناسب تھا۔ ہماری
 غلطیوں کی پاداش میں ان معصوم بچوں کی زندگیاں کیونکر داغ دار ہو جائیں؟“ وہ اسے
 پیار کرتے ہوئے بولا۔ ”اب تم رانی بن کر میرے دل پر حکمرانی کر دو گی۔ مگر ایک شرط
 ہے کہ تم اپنے رول کو نبھانے میں کوتاہی نہیں برتو گی۔ میں اپنا رول پہچاننے سے نہیں
 بھاگوں گا۔ اب تمہارا شو ہر میلینئر ہے۔ تمہیں گھر کی چار دیواری میں ہر شے فراہم
 کرنے کی ہمت رکھنا ہے۔ مسکرا دو جان!“ لہجے میں خوشی تھی۔

”ہارن! آپ مجھے تھوڑے عرصے کے لئے میرے حال پر چھوڑ دیں۔ مجھے حلالہ
 کی کلفتوں اور اذیتوں سے نکلنے کا موقع تو دیں۔ میرے وجود کا ذرہ ذرہ مجھے بے
 حرمتی کا احساس دلا کر زمین کی پستیوں میں دفن کر رہا ہے۔ فی الحال میں نارمل نہیں
 ہوں۔ نہ ذہنی طور پر اور نہ ہی جسمانی طور پر۔“ وہ دھاڑیں مارنے لگی۔

”اس سانحہ کو گزرے چار مہینے بیت گئے ہیں شیریں! ہمت سے کام لو۔ اللہ تعالیٰ
 کی بے حساب رحمتوں کے راز اور اس کے فضل و کرم کے بھیدوں سے ہم نا آشنا ہیں۔
 ہماری عقل اس ہستی کی دُور اندیشی کو نہیں سمجھ سکتی۔ مگر آج مجھے اس ذات پر بے پناہ
 پیار آ رہا ہے۔ اور میں اتنا سا سمجھ پایا ہوں کہ اس کے تمام قوانین جو ہم پر لاگو آتے
 ہیں، اہمیت کے حامل ہیں۔ اس میں بشر کے فوائد سوچ و بچار اور غور و فکر کرنے سے
 نظر آتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا ہم جتنا شکر ادا کریں کم ہے جس نے ہمیں دوبارہ ملانے کا
 راستہ دکھا دیا۔ ہمارے شیطانی نفس کو ملیا میٹ کر کے ہمیں حسین و جمیل اور مقدس نفس
 کے ساتھ تزئین کر دیا۔ اگر ہم اس حقیقت اور سچائی کو فراموش کر بیٹھے تو پھر نفس کی
 شیطانیت اور بھول بھلیوں میں کھو جائیں گے۔ لیکن اپنی نئی زندگی کا آغاز اس کے
 جان لیوا احساس سے مغلوب ہو کر کرنا چپقلش اور الزام تراشیوں کو آواز دینے کے
 مترادف ہے۔“ وہ پیار سے اسے سمجھا رہا تھا۔ ”اُٹھو! آج سفید ڈریس پہن کر اپنے
 پیار کے لئے تیار ہو جاؤ۔“ اس نے خوب صورت ڈریس جو پاکستانی ڈیزائنر سنسٹور سے
 اس کے لئے بڑے چاؤ سے خریدا تھا، اسے تھماتے ہوئے کہا۔ ”اس میں تم جل پری

”لگو گی۔“

اٹ ازا مپاسیل ہارون! کیا ازدواجی رشتہ جسمانی تعلق کے بغیر نہیں چل سکتا؟ آپ نے تو گریٹ نیس کی حد دکھا دی ہے۔ مگر میں ایسی ہرگز نہیں ہوں۔ میں ہر روز مرتی اور جھتی ہوں۔ بچے جینے کا سبب بن جاتے ہیں اور اپنے فرائض سے سبکدوشی موت کا سایہ بن جاتی ہے۔ ہارون! مجھے معاف کر دیجئے گا۔ میں ایک چھت کے نیچے آپ کے ساتھ تمام عمر گزار سکتی ہوں مگر.....“

وہ جملہ مکمل کرنے سے پہلے رونے لگی۔ اور بھرائی آواز میں بولی۔

”مجھے خود پر فخر نہیں رہا ہارون! ایک کا ہو کر رہنے میں ہی میری شان تھی۔ بچوں کی خاطر ہم دونوں نے قربانی دے ڈالی۔ اس ایثار کا بدلہ ضرور ملے گا۔“

”جیسے تم خوش اور مطمئن ہوں، ویسے ہی ہو گا۔ اب مسکرا دو۔“ وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر بولا تو اس کی آنکھوں کے سامنے حدیقہ ردتی بلکتی ہوئی گھوم گئی۔ جو بھروسے اور یقین پر تکیہ رکھے بیٹھی تھی اور اس کے ہاتھوں بے آبرو ہو گئی۔ اور پھر یہ اپنے بچوں کو پا کر اسے فراموش کر بیٹھا تھا۔ نہ اسے ڈھونڈنے کی کوشش کی، نہ ہی پچھتاوا ہوا۔ وہ مارے ندامت کے سر جھکا کر بیٹھ گیا۔

عورت موم کی گڑیا نہیں کہ حالات کے مطابق اسے سانچے میں ڈھال لو۔ وہ تو کالج سے بھی زیادہ نازک ہے۔ ٹوٹ گئی تو پھر جڑ نہ پائے گی۔ وہ دل ہی دل میں سوچتا ہوا باہر نکل گیا۔



”ہارون! ہر کام کی ایک حد ہوتی ہے نا۔“ شیریں نے نرمی سے کہا۔

”بالکل درست۔“ وہ بھی آہستگی سے بولا۔ ”کیا کہنا چاہتی ہو؟“

”میں نے آپ کے پیسے پر دو ماہ بہت عیاشی بھی کی، آرام بھی کیا۔ اب ایسی روٹین سے اکتا گئی ہوں۔ اگر آپ اجازت دیں تو جا ب پکڑ لوں، ہفتہ کے تین دن کے لئے۔ اپنے پروفیشن سے ان رچ رہنا بھی تو بے حد ضروری ہے نا۔ یہ ایسی فیلڈ ہے جس کی تعلیم دن بہ دن مشروط ہوتی چلی جاتی ہے۔ کبھی مکمل نہیں ہوتی۔“ وہ بیٹھے لہجے میں بولی۔

”اگر اس میں تمہاری خوشی ہے تو مجھے اعتراض کیوں ہو گا؟ اب تمہاری جا ب ہماری ازدواجی زندگی پر برے اثرات نہیں چھوڑے گی۔“ وہ ہنستے ہوئے بولا۔ ”بیوی

کمائے، میاں کھائے۔ اس رول میں وہی کچھ ہوتا ہے جو ہمارے ساتھ ہوا تھا۔ اب ایسا کوئی اندیشہ نہیں۔ میری طرف سے ہفتے کے پانچ دن کام کرو۔ اپنی ڈگری کا زیاں کہاں کی عقل مندی ہے؟“

وہ تشکر آمیز نگاہوں سے اسے دیکھنے لگی۔ ”ہارون! آپ کا جواب نہیں۔ یو آر گریٹ۔ میں ہی ناسمجھ نکلی۔“

”ایسا مت سوچو میری جان!“ وہ یہ کہہ کر کہیں دُور سوچوں کی وادیوں میں بھٹکنے لگا۔

”ہارون! میں جب بھی آپ کو گریٹ کا خطاب دیتی ہوں، آپ نہ جانے کس سوچ میں گم ہو جاتے ہیں۔ آپ میری بات کا یقین کریں، میں سچ کے سوا کچھ نہیں کہوں گی۔“ وہ مسکراتے ہوئے بولی۔

”میں تمہاری نیت میں رتی بھر کھوٹ کی آمیزش محسوس نہیں کرتا۔ میرا دھیان حدیقہ کی طرف چلا جاتا ہے۔ وہ معصوم اپنے ناکردہ گناہوں کی سزا کیوں بھگت رہی ہے؟ کیا یہ ممکن نہیں کہ خرم اور حدیقہ کا بیچ آپ کرا دیں؟“ وہ سنجیدگی سے بولا۔

”نیکی اور پوچھ پوچھ۔“ وہ سوچتے ہوئے بولی۔ ”لیکن مجھے ڈر ہے، حدیقہ رضا مند نہیں ہوگی۔ کیونکہ خرم شادی بھی کر چکا ہے۔ آج کل میں باپ بھی بننے والا ہے۔ اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ خرم ہی انکار کر دے۔ حدیقہ سے صلح جوئی میں خرم مشکلات میں گھر سکتا ہے۔ کیونکہ اس کی بیوی بہت اُن ریزن اہل عورت ہے۔ ماں جی بتا رہی تھیں، مینٹلی نارمل نہیں وہ۔ اور سسرال تو ہے ہی پاگل۔ دولت نے اس خاندان کے ہر فرد کا دماغ ہی خراب کر دیا ہے۔ اور آپ تو جانتے ہیں کہ خرم کمزور کے لئے اڑدھا اور طاقت ور کے سامنے بل میں چھپ جانے والے چوہے کی مانند ہے۔ اسے حالات سے نمٹنا آتا ہے، نہ ہی مقابلے کی ہمت ہے اس میں۔ بالکل بزدل مرد ہے۔ کسی بھی رشتے کے ساتھ انصاف نہیں کر سکا۔“ وہ حقارت سے بولی۔

”میں جانتا ہوں، وہ بچپن سے ہی ایسا ہے۔ پھر بھی کوئی مصلحت کا راستہ نکالو۔ ہمیشہ کی طرح مجھے آج بھی حدیقہ پر بے پناہ ترس اور رحم آتا ہے۔ اس بے چاری کا کہیں بھی کوئی قصور نظر آتا ہے، نہ ہی غلطی۔“ دکھ اس کے لہجے میں عود کر آیا تھا۔

”ہارون! اُلجھی گتھیاں سلجھاتے ہوئے کہیں ہماری ازدواجی زندگی میں پھر سے گرہیں نہ پڑ جائیں۔ میں کسی کے معاملات میں دخل اندازی کرنا چاہتی ہوں، نہ ہی

کسی قسم کا تعلق اور واسطہ رکھنا چاہتی ہوں۔ میں نے اپنی حماقتوں اور دوسروں پر بے جا توقعات قائم کرنے کا سبق اپنی ذات کو بے نشان و بے وقعت کر کے سیکھا ہے۔ وہ ناقابل فراموش ہے میرے لئے۔“ لہجے میں خود غرضی کی جھلک نمایاں تھی۔

”اگر تم اجازت دو تو میں خرم سے بات کر لیتا ہوں۔ کیونکہ میں یہ سوچ کر خوف سے لرز جاتا ہوں کہ بے بنیاد شک پر اس کا اور تمہارا گھر جہنم کا ایندھن بن گیا تھا۔ تمہارے گھر کی واپسی اور سلامتی میں حدیقہ برابر کی شریک ہونی چاہئے۔ ورنہ اس کا صبر اور خاموشی ہمیں بھسم کر دے گی۔ شیریں! آخر اوپر والا ہماری نیت اور ارادوں کو پرکھ تو رہا ہے۔ میں آج دولت کی ریل پیل میں حدیقہ کے احسانات کو فراموش کر کے گناہ عظیم کا مرتکب نہیں ہونا چاہتا۔ میرا اسٹیشن، اس ملک میں میری کمپنی کی شہرت اور پھر میرے بچوں کا سیکور فمچر اسی کی وجہ سے وجود میں آیا ہے۔ کیا تم شک کی دنیا سے باہر نکل کر میرے ہر لفظ پر اعتبار کرتی ہونا؟“ وہ سوالیہ نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے بولا۔

”جی!“ اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

”تو پھر حدیقہ تمہارے لئے تھریٹ نہیں ہونی چاہئے۔ وہ دین باپ اور دین شوہر کے بہت تنہا ہے، بہت دکھیااری اور اس زمانے کی ستائی ہوئی مظلوم ہستی ہے۔ اپنا دل کشادہ اور اپنی سوچ فراخ کر کے اس کی بہتری کے بارے میں غور و خوض کرو۔ تم راستہ تلاش کرنے میں کامیاب ہو جاؤ گی۔ کیونکہ وقت کے ہچکولوں نے تمہیں بہت دور اندیش اور دانش مند بنا دیا ہے۔“ وہ قابل آفریں لہجے میں بولا۔

”وہ کیسے؟“ وہ حیرت میں مگی مگر قہقہہ لگا اٹھی۔

”میں خوشامد نہیں کر رہا۔ نہ ہی منافقت میرا شیوہ ہے۔ تم جیسی کپڑا مازنگ عورتیں شاذ و نادر ہی دیکھنے میں آتی ہیں۔ ورنہ عورت مرتے مرتے مرجاتی ہے، اپنی ضد اور ہٹ دھرمی سے ایک انچ بھی نہیں سرکتی۔ تمہارا اٹھایا ہوا قدم تمہاری دور اندیشی کی دلیل ہی تو ہے۔ اس لئے مجھے امید ہے کہ تم خرم اور حدیقہ کے لئے بھی ایک مناسب اور موزوں زندگی کا انتخاب کر سکتی ہو۔ اس نے شادی کی ہے تو کیا ہوا؟ حدیقہ کو سمجھایا جا سکتا ہے۔ حدیقہ میں خرم پر حاوی ہونے کی تمام صلاحیتیں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہیں۔ حدیقہ کو آخری چالیں ملنا بے حد ضروری ہے۔“ وہ اپنی بات پر اڑا ہوا تھا۔

”سوچتی ہوں۔“ اس نے آہستہ سے کہا اور اپنی ہی سوچ میں گھر گئی۔ وہ کیسے بتاتی کہ تم سے دور رہ کر میں نے خرم اور ماں کا وہ روپ دیکھا ہے جس میں خود غرضی، بے لحاظی اور زودکھا پن حد سے تجاوز کر گیا تھا۔ بیٹیاں اپنے سرتاج کے سائے میں ہی قابل احترام ہوتی ہیں۔ ان کی اپنی ذات کی شناخت شوہر سے وابستہ ہے۔ چاہے شوہر نام کا ہی کیوں نہ ہو۔ میں اس دن کی منتظر ہوں، جب میں اپنے میکے میں اپنا کھویا ہوا مقام حاصل کر لوں گی۔ اس بار اس عالیشان مقام کا ناجائز استعمال اور بے جا فائدہ اٹھا کر اپنی اور بھائی کی زندگی کہ جہنم رسید نہیں کروں گی۔ ماں کو دو بچوں کے درمیان بے بس اور لاچار بنا کر دکھی کروں گی، نہ ہی نت نئی آزمائش میں ڈال کر ان کی مامتا کی جمع و تفریق کروں گی۔ اس وقت میں جس پوزیشن میں ہوں، خرم تک رسائی بہت مشکل ہے۔ دلوں کے شفاف آئینے پر ایک بار دراڑ پڑ جائے تو وہ کبھی جڑتی نہیں۔ خونی رشتوں میں ازراہ مجبوری قبولیت کے باوجود اس کے ہونے کا احساس حادثے کی یاد دہانی کرا کر اذیت سے ہمکنار ضرور کرتا رہتا ہے۔ میرا خیال ہے اب مجھے پردھان منتری بننے کا کوئی حق حاصل ہے، نہ ہی خرم میری زندگی میں دخل اندازی کر سکتا ہے۔

”بہت گہری سوچ میں چلی گئی ہو۔“ ہارون نے اس کی سوچ میں ڈوبی ہوئی آنکھوں میں جھانک کر کہا۔
 ”ہوں۔“ مگر سوچیں بدستور قائم تھیں۔

”کوئی راہ بھائی نہیں دے رہی۔“ طویل توقف کے بعد سرد آہ بھر کر بولی۔
 ”خرم تو ایسا ناہنجار شوہر ہے، جس پر حدیقہ کی معافی کی عرضداشت، منت سماجت اور خوشامد کا اثر ہونا ناممکن ہے۔ کیونکہ حدیقہ کی لاوارثی اُس کی بد نصیبی ہے۔ مثال آپ کے سامنے ہے کہ دوسری بیوی پاگل اور ایتار مل ہونے کے باوجود اسے با آسانی گھر داماد بنانے میں کامیاب ہو گئی۔ کیونکہ وہ بڑے باپ اور بڑے خاندان کی بیٹی تھی۔ معاملہ اتنا گنبد ہے کہ آپ اس کے اثرات کا سوچ ہی نہیں سکتے۔ اب خرم جانے اور حدیقہ۔ ہم اس میں پڑنے والے نہیں۔ خوانخواہ کوکلوں کی دلالی میں منہ کالا کر بیٹھیں گے۔ ہماری کنارہ کشی میں ہی عافیت ہے۔“

اس نے اپنا معاملہ نہایت صلح جو انداز میں پیش کیا۔ ورنہ پہلے والی شیریں اگر زندہ ہوتی تو آسمان سر پر اٹھا کر ہارون کی بے عزتی سب کے سامنے کر دیتی۔ اور وہ

اس سے جاں بخشی اور معافی مانگ مانگ کر بڑھال ہو جاتا مگر وہ بخش کر نہ دیتی۔

اس کے حراج میں ایسا ٹھہراؤ آ گیا تھا کہ ہارون دل ہی دل میں ہنس پڑتا اور سوچتا کہ تمام مردوں کو حلالہ کے فوائد پر ایک لبا چوڑا لیکچر دے کر ازدواجی زندگی میں شوخ و شنگ رنگوں کے اضافے کا گُر ضرور سکھا دے۔ جبکہ ہارون نے بھی تو جھوک کر چاہا تھا، کس جبر و صبر سے۔ دونوں کی نوعیت میں زیادہ فرق نہ تھا۔ گھر جنت کا گہوارہ بن چکا تھا۔ ادب و احترام، عزت و لحاظ زندگی کا اہم جزو جو بن گئے تھے۔ جو ہر رشتے کو پایہ تکمیل تک پہنچانے میں ایک مستحکم اور مضبوط ستون کا کردار ادا کرتے ہیں۔

ہارون، شیریں کی منطقانہ باتیں سن کر سوچ میں پڑ گیا کہ وہ حدیقہ پر ہونے والی اپنی زیادتی کا کفارہ کس صورت میں ادا کر سکتا ہے۔ اس کے شب و روز بے سکون اور ہر لمحے کی کسک اور تڑپ اسے چین کا سانس نہ لینے دیتی تھی۔ یہ ایسا دکھ تھا اور ایسا راز تھا جسے وہ کسی کے سامنے اُگل نہیں سکتا تھا۔ اپنے دل پر گراں اس گلٹ کو کم نہیں کر سکتا تھا۔ اسے حدیقہ کے بارے میں صرف اتنی ہی خبر تھی کہ وہ کسی ہاسپٹل میں جاب کر کے گزر اوقات کر رہی ہے۔ کہنی میں اس کا شیر تو تھا ہی۔ وہ پرافٹ قانونی طور پر اس کے اکاؤنٹ میں جمع ہو جاتا تھا۔ مگر اس سے رابطہ کرنے یا سامنا کرنے کی اس میں ہمت ہی نہ تھی۔ وہ اس شادی سے ہر گز رضامند نہ ہوتی اگر یہ ان سی ڈنٹ اس کی زندگی میں رونما نہ ہوتا۔ وہ تو بہتر ہو گیا، حدیقہ کی کوئی نیکی خدا تعالیٰ کو پسند آگئی کہ طلاق کا مطالبہ کرنے میں دیر ہوتی چلی گئی۔

بے شک وہ ایک گھر کی چھت کے نیچے رہ رہے تھے۔ درمیان میں حائل ہونے والی حدیں برقرار تھیں۔ ہارون اپنے کئے پر پہلے ہی پشیمان اور تادم تھا۔ اپنی غلطی کا ازالہ کرنا چاہتا تھا۔ اب جب کہ ہارون نے شیریں کے ساتھ دوبارہ نکاح پڑھوایا تو حدیقہ کے لئے ہمدردی اور بھی بڑھ گئی تھی جس کا اظہار کرنے سے وہ کتراتا تھا۔ اُس سے رابطہ کرنے کا سوچ کر ہی دہل جاتا تھا۔

بڑی سوچ بچار کے بعد اس نے شیریں سے نہایت التجائیہ انداز میں ڈرتے ڈرتے معمولی سی ہمدردی کا اظہار تو کر دیا تھا مگر خاطر خواہ نتیجہ نہ نکلا تھا۔ اب وہ نئی تجویز کے بارے میں سوچتا رہتا کہ وہ خرم سے کھل کر اس موضوع پر بات کرے تاکہ وہ اس کے ارادوں کو معلوم کرنے کے بعد حدیقہ سے رجوع کر سکے۔ شاید اس طرح اس کی غلطی کا ازالہ بھی ہو جائے اور حدیقہ خلوص دل سے اسے معاف بھی کر دے۔

اور دونوں بھول جائیں کہ ماضی میں کبھی کمزور لمحے بھی آئے تھے جو اس مقدس رشتے پر غالب آگئے تھے۔ چاہے رشتہ منہ بولا ہی کیوں نہ تھا، اس کی پاکیزگی اور تقدس تو اپنی جگہ برقرار رہنا چاہئے تھا۔



”نہ! نرس! نرس! نے رازداری کے انداز میں کہا۔ ”ڈیوری کیس میں ماں کی ماں بھی ہالٹ ہے۔ آپ کا ہمارے ساتھ ہونا بہت ضروری ہے۔ ڈاکٹر ماہم آپ کا انکار کر رہی ہیں۔“

وہ تیزی سے آفس سے نکل کر آپریشن تھیٹر کی طرف چل پڑا۔ باہر لیلیٰ کے والدین اور اس کی ماں انتظار میں بے حد بے قرار اور فکر مند ملے۔

”فکر کی بات نہیں۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ سائنس کا دور ہے، اب ایسے مس ہیپ کم ہی سننے میں آتے ہیں۔“

وہ انہیں تسلی دیتے ہوئے آگے بڑھا ہی تھا کہ لیڈی ڈاکٹر گھبرائی ہوئی باہر نکلی۔ ”ڈاکٹر خرم! آئی ایم سوری۔ ہم لیلیٰ کو بچا نہ سکے۔ البتہ بچی کو معائنے کے لئے لے گئے ہیں۔ ماشاء اللہ ہیلدی اور نہایت حسین بچی ہے۔“ اس نے خرم سے آنکھیں جراتے ہوئے کہا اور دوسری جانب ہوئی۔

خرم ہکا بکا اسے جاتے ہوئے دیکھنے لگا۔ ”لیلیٰ کیسی ہے خرم؟“ اس کی ماں نے قرآن پڑھتے ہوئے پوچھا۔

”بیٹی کو پیدا کر کے اپنے حقیقی خالق کے پاس چلی گئی ہے۔“ خرم نے آزرده لہجے میں کہا تو لیلیٰ کی ماں وہی غشی کی حالت میں صوفے پر گر گئی۔

ننھی مٹی سی پری بن ماں کے نانی کے ساتھ چلی گئی۔ خرم لیلیٰ کے چالیسویں تک تو وہاں رہا، اس کے بعد اپنی ماں کے پاس آ گیا۔ لیلیٰ کے چلے جانے کا غم اپنی جگہ پر ہی تھا، لیکن بچی کے ماں کی مامتا اور محبت کی شناخت سے پہلے ہی محرومی کا ڈکھ خرم کو چھین نہ لینے دیتا تھا۔ روزانہ بلا ناغہ وہ گھر جانے سے پہلے اپنی بیٹی زینب کو دیکھنے جایا کرتا تھا۔ وہ اسے اپنے گھرا کر ماں کی بے لوث محبت اور باپ کی بے پناہ شفقت کا سایہ بن کر اسے پروان چڑھانا چاہتا تھا مگر ماں کی طرف سے اجازت نہیں مل رہی تھی۔ کیونکہ وہ اپنی پیاری اور بڑھا پے کی کمزوری اور نقاہت میں اتنی گراں ذمہ داری اٹھانے کے قابل نہ تھی۔ نہ ہی وہ نینی کو سونپ کر چوبیس گھنٹے سپر ویزن کر سکتی تھی۔

اس لئے زینب کا نانی کے زیر سایہ پروان چڑھنا زیادہ تسلی بخش لگا تھا۔ جب ہارون نے اتنے عظیم سانحہ کی خبر سنی تو اس نے فوراً خرم کے دکھ میں شرکت کے لئے فون کیا۔ شیریں بھی بہت اپ سیٹ ہو گئی تھی۔ بھائی کو تسلی دیتے ہوئے اس نے زینب کے لئے اپنی خدمات پیش کر دیں۔ خرم کو پیش کش پسند تو آگئی، مگر اس کا دل تسلی میں تھا، نہ ہی روح کو قرار ملا تھا۔ آخر ہارون نے موقع غنیمت جانا اور ایک اور چوائس سامنے رکھ کر بولا۔

”خرم یار! حدیقہ کے بارے میں کیا خیال ہے؟ زینب کی ماں بننے کی سب سے پہلی حق دار وہ ہے۔“

”اس کا نام بھی نہ لو میرے سامنے۔“ وہ تلخی سے بولا۔

”خرم! ہم نے شک کی بنیاد پر اپنے ہتے ہتے گھروں کو کھنڈرات میں بدل دیا تھا۔ مجھے ہارون کے ہر لفظ پر بے تحاشا اعتماد ہے۔ تم آج پہلی اور آخری بار میری بات دھیان سے سن کر غور و فکر کرنا۔ شاید میری سچائی پر یقین آ جائے۔ جس دن وہ شادی کے بعد ہمارے گھر آئی تھی، تب سے ہارون کا اس سے رشتہ ہمدردی، رحم و ترس کی بنیاد پر قائم ہوا تھا۔ وہ دین باپ اور ایک مجبور و بے کس ماں کی بیٹی تھی، جسے ہمارے خاندان نے بھی بحالتِ مجبوری قبول بلکہ زہر مار کیا تھا۔ ہارون ان تمام حالات کے پیش نظر اس پر بے پناہ ترس کھانے لگا تھا۔ بلکہ وہ اسے بھائی کا درجہ دیتی تھی۔ اس کے علاوہ ان میں اور کوئی رشتہ استوار نہ تھا۔ اس لئے حدیقہ کو واپس لانے کے بارے میں سوچنا ہرگز غلط نہیں ہوگا۔ بلکہ ہمیں اس کی خوشی ہوگی کہ تمہارا گھر ایک ایسی عورت کی رفاقت میں آباد ہو جو باہمت اور پاکیزگی کا شاہکار ہے۔“ شیریں نے سمجھاتے ہوئے کہا۔

”اگر تم کہہ رہی ہو تو مان لیتا ہوں۔ کیونکہ اعتماد اور بھروسہ ہی اس رشتے کو پھر سے جوڑ سکتا ہے۔“ خرم ایک دم سے بے چین ہو گیا۔ ”کیا حدیقہ مجھے معاف کر دے گی؟ میری زیادتیوں کو درگزر کر دے گی؟ مجھے لگتا ہے، ہرگز معاف نہیں کرے گی۔“

”معافی کے سوا عورت کے پاس چارہ ہی کیا ہے؟ اور پھر حدیقہ جیسی لڑکیاں تو چکی کے دو پاٹ میں پس کر بھی مکمل اور ثابت رہتی ہیں۔ اب تم خود ہی فیصلہ کرنے کے اختیارات کے مالک ہو۔“ وہ سنجیدگی سے بولی۔ ”اس کا دل اک سمندر ہے جس کی تہہ کے مد و جزر کی کسی کو خبر تک نہیں ہوتی۔“

”دوست! فکر مجھے مدد کی ضرورت ہے۔ تم دونوں ہی اس کے پاس جا کر میری طرف سے دعا کی درخواست پیش کر دینا۔ میں اس کے بعد بات کروں گا۔“

”ابلیس! اس کا۔“ مجھے اب احساس ہوا ہے کہ شاید ایک بے گناہ اور کمزور آدمی، ان باتوں کی وجہ سے ہم لمبے عرصے کے لئے بری طرح آزمائشوں میں گرفتار رہے۔ ہمارا اور میرا پیارا ایک مثال تھا خاندان کے لئے اور دوست احباب کے لئے۔ اس پیار میں وہ بات نہ رہی۔ بس ہمارا گھر نفرتوں اور جھگڑوں کا اکھاڑہ بن گیا تھا اور میرے امتحان بڑھتے ہی چلے گئے۔ ایسی جیسا زندگی کا ساتھی سوائے pain کے کچھ نہ تھا۔ طرہ یہ کہ میری بچی، ماں کی گود کی خوشبو سے بھی نا آشنا رہ گئی۔ ذرا ماضی میں جھانک کر دیکھو کہ ہمارا گھر انہ کیسا تھا۔ خوشیوں اور کامرانیوں کا سرچشمہ۔ اب وہاں اُنہ بولتے ہیں یا خاموشی کا سناٹا زبان بن گیا ہے۔“ وہ پشیمردگی سے بولے جا رہا تھا۔

”خرم! ایسی باتیں مت کرو۔ میں رات بھر سو نہیں سکوں گی۔“ وہ تڑپ اُٹھی۔

”مل جل کر اس مسئلے کو خوش اسلوبی سے حل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ میں حدیقہ کی طرف سے بے فکر ہوں۔ وہ بہت عظیم عورت ہے خرم! اب بھی سب کچھ ہماری خواہش کے مطابق ہی ہوگا۔ ہماری آرزو میں حدیقہ کی آمادگی کی آمیزش بہت ضروری ہے۔ اب ہم اس کی مجبوریوں اور بے بسی سے ناجائز فائدہ اٹھانے کا خیال اپنے دل سے نکال دیں اگر ہمیں اپنی سلامتی اور اطمینان چاہئے۔“

خرم نے سختی سے کہا۔ ”ہم اسے سوچ سمجھ کر فیصلہ کرنے کا وقت دیں گے اور اس کے جواب کا انتظار کریں گے۔ اسے پریشاں نہ کریں گے۔ تم نے بالکل درست سوچا ہے۔ اب کی بار فیصلے کے اختیارات حدیقہ کے پاس ہوں گے۔“ شیریں نے بھی ہاں میں ہاں ملائی۔

ہارون دونوں کی باتیں سنتے ہوئے سوچ رہا تھا کہ باری تعالیٰ کی شان کہ وہ چاہے تو گداگر کو بادشاہ بنا دے۔ چاہے تو ایک ناتواں سے کارِ عظیم لے لے۔ واہ میرے مولا! تیرا بھی جواب نہیں۔ کبر و پندار کو مٹی میں ملانا چاہے تو پیل نہ لگائے۔ انسانی قلب و ذہن کا رخ یک جہت سے بدل ڈالے۔

”ہارون! خرم بات کرنا چاہ رہا ہے۔“ وہ موبائل اس کی جانب بڑھاتے ہوئے بولی تو اس نے اچنبھے سے اس کی طرف دیکھا۔

”بات کر لیتے ہیں جی۔“ وہ خوشگوار لہجے میں بولا۔ ”جی فرمائیے!“

”ہارون! اگر مجھے معاف کر سکتے ہو تو یہ احسان زندگی بھر نہ بھولوں گا۔“ انداز التجائیہ تھا۔

”کیسی باتیں کرتے ہو؟ ہر رشتے سے بڑھ کر تم میرے بچپن کے جگری یار بھی ہو۔ تم بھی مجھے معاف کر دینا۔ نہ جانے مجھ سے بھی انجانے اور بے وقوفی میں کتنی غلطیاں سرزد ہوئی ہوں گی۔“ وہ ندامت بھرے لہجے میں بولا۔ ”بعض اوقات نہ چاہتے ہوئے بھی نا سچھی میں غلطی سرزد ہو جاتی ہے۔ حالانکہ نیت اور ارادہ تو غلطی کا ہرگز نہیں ہوتا۔ ایسی غلطیوں کو تو اللہ تعالیٰ بھی معاف فرما دیتے ہیں۔ سوچ سمجھ کر اور پلان کے مطابق زیادتی کر گزرنے کی بہت پکڑ ہے۔“

”تم ٹھیک کہتے ہو۔ پھر پچھتاوا کیسا؟ جب ایک دوسرے کو اذیت دینے کا منصوبہ ہی نہ تھا تو پھر غلطی کیسی اور معافی کیسی؟“ خرم ہنستے ہوئے بولا۔ ”ماضی کی تلخیوں کو بھلا کر نئی زندگی کا آغاز کرتے ہیں جس میں پرانی محبتوں کی چاشنی کی آمیزش ہو، ایک دوسرے کی قربت میں لطافت اور چاہت ہو۔ اور وقت گزرنے کا احساس تک نہ ہو۔ لیکن زندگی اپنی اپنی ہو۔ اس میں انٹرفیرنس نہ ہو۔ نصیحتیں اور فضیلتیں نہ ہوں۔ توقعات ہوں، نہ ہی شکوے شکایت کا دخل ہو۔ یعنی ہیلڈی ریلیشن شپ ہو۔“

”ٹھیک ہے جی..... ٹھیک ہے۔ ابھی بیگم آئی نہیں اور لیکچر سننے کو مل گیا۔“ ہارون نے مذاقاً کہا تو دونوں قہقہہ لگا اٹھے۔

آج کی شب کتنی پرسکون تھی کہ نینوں گھوڑے بیچ کر سوئے۔ کتنے عرصے بعد ٹوٹے ہوئے رشتے جڑے تھے۔ مگر حدیقہ ابھی تک سین سے غائب تھی۔ اسے حاصل کرنے کی چاہ نے سب کو ایک دوسرے کے قریب کر دیا تھا۔ معافی تلافی کا چانس بھی اس کو واپس لانے کی وجہ سے پیدا کیا گیا تھا۔ ورنہ ہارون اور خرم کبھی ایک دوسرے کے قریب ہونے کا تصور بھی نہ کرتے۔

آج کی صبح کس قدر انوکھی اور نرالی تھی۔ صلح جوئی، اتفاق اور اتحاد نے دلوں میں جینے کی نئی اُمنگ جگا کر چہروں پر شادمانی کی چھاپ لگا دی تھی۔ ہارون نے حدیقہ کے بارے میں ہاسپٹل سے دریافت کرنے اور بات کرنے کی بے انتہا کوشش کی۔ یہ خبر سن کر وہ غم و ترس کے مارے بھج گیا کہ حدیقہ کو پاکستان گئے کئی مہینے ہو چکے ہیں۔ وہ واپس آنے کا وعدہ کر کے گئی تھی مگر ابھی تک اس کی جانب سے کسی قسم کی کوئی اطلاع نہیں تھی۔

ہارون نے فوراً خرم سے رابطہ کر کے تمام انفارمیشن گوش گزار کر دی۔ خرم یہ سن کر
نہیں اُٹھ سکا کہ حدیقہ چند کلومیٹر دُور اپنے شہر میں موجود ہے۔ لیکن وہ اس مختصر
اور محدود راستے کو کیسے طے کر سکتا ہے؟ سوچ کر ہی عداوت سے اس کی پیشانی پر پسینے
لے قطرے نمودار ہو گئے۔

اگر اُس نے مجھے معاف نہ کیا تو؟

یہ سوال اسے بے کل کئے جا رہا تھا۔ اسی حالت میں دل کے ہاتھوں مجبور وہ
حدیقہ کے گھر کی طرف چل پڑا۔ راستے سے اس کی پسند کا چیز کیک اور ریڈ روزز
خریدے۔ شرمندگی اور خوشی کے طے جملے جذبات کو دل کے نہاں خانوں میں
چھپائے گھر کے باہر گاڑی روک کر بال درست کئے اور ٹائی ٹھیک کرتے ہوئے گیٹ
تک پہنچا۔ ڈور بیل بج تو رہی تھی مگر جواب نہ اُدا۔

یک دم نظر گیٹ پر لگے ہوئے تالے پر پڑی۔ منہ چڑاتا ہوا تالا..... اس کا تسخیر
اُڑاتا ہوا تالا۔ جی چاہا اسے تو زکر اندر چلا جائے۔

’حدیقہ کہاں چلی گئی؟..... ہو سکتا ہے شاپنگ کے لئے نکل گئی ہو‘ اُس نے دل
ہی دل میں سوال کا خود ہی جواب دے ڈالا۔

”بیٹا! آج صبح کی فلائٹ سے ماں بیٹی کینیڈا چلی گئی ہیں۔“ وہ خاتون کی آواز پر
چونکا۔

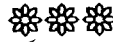
”گھر کرائے پر چڑھا گئی ہیں۔ بہت ہی اچھا ہوا کہ بیٹی اپنی ماں کو ساتھ لے
گئی۔ ان دونوں کا ایک دوسرے کے بغیر بھلا تھا بھی کون؟“

خرم اس کی باتیں سنتے ہوئے بولا۔

”کینیڈا بہت بڑا ہے۔ انہیں تلاش کرنا آسان ہرگز نہیں۔ کسی کو اپنا اتہ پتہ تو دیا
ہوگا۔“

”وہ کسی سے ملتی ہی کب تھی کہ اپنا ٹھکانہ بتا کر جاتی؟ اپنی جوانی نوکری کے بعد
گھر میں قید ہو کر ایسے گزار دی کہ کسی کو تہمت بازی کا موقع ہی نہ دیا۔ اور پھر بیٹی
ایسی بھلے مانس اور ماں سے بھی دو ہاتھ بڑھ کر نیک اور شریف۔ جاتے ہوئے سب
سے مل کر ایسے شکریہ ادا کر رہی تھیں، جیسے ہم نے ان کے قدموں میں قارون خزانہ
ڈھیر کر دیا ہو۔ بیٹا! یقین مانو، ماں بیٹی نے کبھی بل تک جمع کروانے کا احسان بھی کسی
سے نہ لیا تھا۔ کیا غیرت مند اور خود دار خون تھا۔ خاندانی اور زیرک عورت تھی۔ اللہ

تعالیٰ اسے اپنی بچی کی بے شمار خوشیاں دکھائے۔ آمین!“
وہ صدیقہ کے گن گاتی اسے وہیں اکیلا چھوڑ کر آگے بڑھ گئی۔ اسے اندازہ ہی نہ ہوا کہ خرم اس کا داماد ہے۔ اس محلے کے لوگ اس سے نا آشنا تھے کیونکہ اس نے کبھی یہاں آنے کی تکلیف ہی گوارا نہ کی تھی۔
وہ بھاری قدموں اور منوں بوجھ دل پر لئے گاڑی تک پہنچا اور زنب سے ملنے سسرال کی طرف مڑ گیا۔



”ماما! مجھ سے بوڑھوں والا ایٹی ٹیوڈ تو نہ رکھیں۔ آپ بھی بالکل جوان ہیں۔ اس لئے کینیڈا کا چپہ چپہ نہ دکھایا تو نام حدیقہ نہیں۔“ وہ ماں کو پیار کرتی ہوئی بولی۔ ”آپ کے ساتھ ٹورنٹو دیکھنے کا جو مزہ آرہا ہے، وہ خرم کے ساتھ کہاں؟ پھر ہم جائیں گے رحمن دہل۔ جہاں ہم ماں بیٹی ایک ہفتہ قیام کریں گی اور اتنا گھومیں گی کہ نیچے کی مٹی اوپر اور اوپر کی مٹی نیچے کر کے چھوڑیں گی۔“ حدیقہ دلتواز مسکراہٹ کے ساتھ بولے جا رہی تھی۔ ”ماما! مجھے کینیڈا کبھی بھی اتنا خوب صورت، شفاف اور دل پذیر نہیں لگا جتنا آپ کی قربت میں لگنے لگا ہے۔“
”مسک نہ لگاؤ۔“ صدیقہ تہقہ لگا کر چھیڑتے ہوئے بولی۔

”مام! سچ ہی تو کہہ رہی ہوں۔ خوب صورت جگہوں کی اہمیت چار گنا زیادہ بڑھ جاتی ہے، جب دل کے ساتھی کا ساتھ ہو۔ کوئی روک ٹوک اور ڈانٹ ڈپٹ کرنے والا نہ ہو۔ مام! بی لیومی۔ اب مجھے کینیڈا کی سرد بخ بستہ صبحیں بھی تمازت اور حدت سے بھرپور معلوم ہوتی ہیں۔ پتہ ہے کیوں؟“ وہ ماں کے ہاتھوں کو چومتے ہوئے بولی۔
”مجھے علم ہے۔“ صدیقہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”سینٹرلی ہیٹ انگ کا کمال ہے۔“

”او ماما جانی! آپ چھیڑ خانوں سے باز نہیں آئیں گی۔“ وہ خوشی سے پھولی نہ سا رہی تھی۔ سچ سچ ایک طویل مدت کے بعد دونوں ٹھل کر ہنس رہی تھیں۔

”اور ماما! راتوں میں مجھے خوف آتا تھا، آنکھ کھل جاتی تھی تو پھر دوبارہ لگ نہ پاتی تھی۔ اب جو بستر پر کر لگتی ہے تو خراٹے بھرنے لگتی ہوں۔ آپ کو علم ہے، ایسا کیوں ہے؟“ وہ ماں کو شونہ سے دیکھتے ہوئے بولی۔

”بیٹا جی! دن بھر لو رلو پھر گے تو انجام یہی ہوگا۔“ وہ بھی شونہ سے بولی۔

”بھہ کی۔“ وہ ہنسنے لگی۔

”ہاں تو اگلا پروگرام نہیں بتایا۔“ صدیقہ نے اس کی شوخی کو انجوائے کرتے

”ہا ہا۔“

”اگلا پروگرام ہے.....“ وہ ڈائری کھول کر پڑھتے ہوئے بولی۔ ”ڈے آفٹر ٹو مارو
دی ول کومسی ساگا۔ وہاں تین دن کا قیام ہے۔ وہاں سے مارگھم کا رخ کریں گے۔
آپ بھی کیا یاد کریں گی کہ کس حاتم طائی کو جنم دیا ہے آپ نے۔“

”اری میں نے تو مونٹ کو جنم دیا تھا، یہ مذکر کہاں سے آٹکا؟“ وہ کھل کر ہنس

پڑی۔

”اس وقت مذکر پر ہی اکتفا کرنا پڑے گا۔ کیونکہ رول جو وہی ہے۔ ہاں، تو پھر
اگلا پروگرام ہے، اپنی پیاری ممی کو نیا گرافال دکھانے کا۔ وہاں سے واپس آنے کو دل
نہیں چاہتا۔ بس ماما! یوں سمجھیں کہ اپنی زندگی پہلے بیٹھے اور سرور سے بھرپور ہنچکولے
کھاتی ہوئی بوٹ میں چٹانے کو جی چاہنے لگا ہے۔ کیا سیزری ہے ماما!..... کیا دلکش اور
دلربا نظارے ہیں کہ عقل دنگ رہ جاتی ہے۔“ وہ مزے لے کر بول رہی تھی۔

”اچھا جی۔ مجھے مانٹریال دیکھنے کا بھی تو شوق ہے۔ وہاں کب جا رہے ہیں؟“

صدیقہ نے بات کو آگے بڑھانا چاہا۔

”ویسے ماما! آپس کی بات ہے، آپ کچھ زیادہ پھیلتی نہیں جا رہیں؟“ وہ چھیڑنے

کے انداز میں بولی۔

”ابھی کہاں جناب! آگے آگے دیکھئے ہوتا ہے کیا؟“ وہ بھی اسی انداز میں

بولی۔ ”میں نے CN Tower کے بارے میں بہت کچھ پڑھا ہے۔ وہاں جانا تو

انتا ضروری ہے جیسے جینے کے لئے کھانا۔“

”تیرھواں عجوبہ ہے وہ۔ آپ دیکھ کر مبہوت رہ جائیں گی۔ شکر کریں کہ میری

رقابت میں گھوما گھمائی ہو رہی ہے۔ خرم ساتھ ہوتا تو پھر آپ اس کی حرکتوں پر

مبہوت رہ جاتیں۔“ وہ ہنسنے لگی۔ ”دیکھنے کے بعد میں فیصلہ آپ پر

چھوڑ دوں گی کہ ہم دونوں ماں بیٹی کہاں سیٹ ہوں۔ جاب کا کوئی مسئلہ ہے نہ پیسے

کا۔ بھلے وقتوں میں کمپنی میں شیر ڈال کر آپ کی بیٹی نے عقل مندی کا ثبوت دیا

ہے۔ ذرا تعریف ہی کر دیں۔“

”یہ تو میں مانتی ہوں۔“ وہ فخریہ انداز میں بولی۔ ”مگر زیادہ تعریف کا دوسرا نام

ہے خوشامد۔ ہاں، تو امپریس ہو گئی ہوں۔ کتنا وسیع و عریض ملک ہے۔ اس کی مینٹنس کا جواب نہیں۔ صفائی نے تو جیسے دل جیت لیا ہے۔ نہ دھول نہ دھواں۔ چار سو نکھری اجلی فضا۔ حد نظر ہریالی ہی ہریالی۔ ایسے گمان ہوتا ہے جیسے حد نگاہ گرین ویلوٹ بچھا دیا گیا ہو۔ آبشاروں کے مدھر سر دل کو لبھا جاتے ہیں۔ حقیقہ! تم نے تو مجھے جنت کی ہلکی سی جھلک دکھا دی ہے۔ میری بچی! میری دعا ہے تمہیں دونوں جہانوں میں جنت الفردوس کے اعلیٰ درجے نصیب ہوں۔“ وہ اسے دعائیں دینے لگیں۔

”ماما! میں نے کہا تھا تا کہ ہم مل کر اپنی زندگی کی تمام راہوں کے تمام کانٹے اور نوکیلے پتھر چُن کر وہاں پھولوں کی چادر بچھالیں گے، اگر ایک دوسرے کے ہاتھ میں ہاتھ رہا۔“ وہ سرشار ہو کر جھوم اُٹھی۔ ”ماما! آپ ڈاکٹر آصف کے قابل ہی نہیں تھیں۔ جیسے میں خرم کے لئے تو بنی ہی نہ تھی۔ ماما! ہم دونوں ایک دوسرے کے لئے بنائی گئی ہیں۔ یہ بات پلے باندھ لیں۔ آپ اور میں چلیں گے ساتھ ساتھ تو زمانہ چلے گا سنگ ہمارے۔“

”بات تو پتے کی کر رہی ہو۔ جب تک ہم دونوں کا ساتھ رہا، نہ کسی کی محتاجی نہ ضرورت محسوس ہوئی۔ ہماری اپنی محسوس، دو پہریں اور شامیں ہوتی تھیں۔ راتوں میں تنہائی کا احساس رُلاتا نہیں تھا۔ تمہیں پردان چڑھانا مقصد حیات تھا۔ تم رخصت کیا ہوئی، ایسا لگا جیسے زندگی بوریٹ کی ہم سفر بن گئی ہو۔ وقت ٹھہر گیا ہو۔ ہوا رُک گئی ہو۔ فضا ماتم کنار ہو کر زندگی کے مقصد کے ختم ہونے کا سند یہ دے رہی ہو۔“ ہ رقت آمیز لہجے میں بولی۔

”ماما! ہم ایسی دل آزرہ باتیں نہ تو سوچیں گے اور نہ ہی ان کی ادائیگی سے پُر ملال ہوں گے۔ ہم نے اپنی بقیہ زندگی میں شوخ و شنگ رنگ بھر کر ماضی کو یکسر بھلا دینے کی کاوش کرنی ہے۔“ وہ ماں کو پیار سے سمجھانے لگی۔ ”آئندہ میں آپ کی آنکھوں میں آنسو تو درکنار، ہلکی سی نمی بھی نہ دیکھوں۔ ہم دونوں نے اپنے رونے کا کوئی اپنی زندگی کے بیتے ہوئے سالوں میں پورا کر لیا ہے۔ اب مسرتیں ہماری منتظر ہیں۔“

”انشاء اللہ۔ لیکن بیٹے! میرے بعد تمہاری زندگی تنہائی کا شکار ہو جائے گی۔ اس کے لئے کیا سوچا ہے؟“ ماں سوچ کر لرز گئی۔

”ماما! ہم جیسے لاوارث لوگوں کا اللہ حامی و ناصر ہوتا ہے۔ میں آپ کے ساتھ ہی اٹھالی جاؤں گی۔“ اُس کی آواز بھڑا گئی۔

”ایسی بد فال منہ سے مت نکالو۔ میرا دل ڈوبنے لگا ہے۔“ وہ اپنی چھاتی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولی۔ ”سینے میں آگ لگ گئی ہو جیسے۔“

”ماما! ہم ماضی کی یادیں اور مستقبل کی پیشین گوئیاں نہیں کریں گے۔ حال میں رہیں گے، اس کے بارے میں سوچیں گے اور زندگی کو انجوائے کریں گے۔ مجھ سے وعدہ کریں کہ آپ رنگ میں بھنگ ڈالنے سے باز رہیں گی۔“ اس نے فوراً لہجہ خوشگوار کر لیا تو صدیقہ ہنسنے لگی۔

”ویسے انسان ہر حال میں ناشکرا ہے۔ بے صبرا اور ناخوش ہی رہا ہے۔ خوشی میں بھی ماضی کی یادوں پر ٹوسے بہا کر اچھے وقت کو پتا دیتا ہے۔ مستقبل کے خوف اور ڈر سے حال کی تمام تر رعنائیوں اور شگفتگی کو داغ کر اپنا سامنہ لے کر رہ جانا کوئی ہم سے سیکھے۔ تم بہت اچھا کرتی ہو۔ مجھے عین وقت پر پکڑ کر ٹوک دیتی ہو۔ مجھے اپنی اس دیرینہ عادت کو چھوڑنے میں کچھ وقت چاہئے۔ جیسے ایک چرسی اور افنی نشتے میں رہنے کا عادی ہو جاتا ہے، اسی طرح دکھیا رے لوگ بھی کرب اور اذیت میں رہنے کے ایسے عادی ہوتے ہیں کہ خوشیوں میں بھی دکھوں کے متلاشی رہتے ہیں۔“ ماں بے حد سنجیدہ ہو گئی تھی۔

”چلیں جی چھوڑیں ایسی باتیں۔ فائیو اسٹار ہوٹل میں رہنے کا مزہ لوٹنے نیچے چلتے ہیں اور complimentry بریک فاسٹ انجوائے کرتے ہیں اور زندگی سے خوش ہوتے ہیں۔“ حدیقہ نے ماں کو بہلانا چاہا۔ ”آپ کے ان خوب صورت ہونٹوں پر کلیاں کھلتی رہنی چاہئیں۔ ابھی تو میں نے سوچا ہے کہ کمپنی سے اپنے شیررز نکال کر ہم دونوں اپنا بزنس کرنے کا پروگرام بناتی ہیں۔ بے شک ہارون ایک ایک پائی کا حساب کر کے مجھے ای میل کر دیتا ہے اور پرافٹ میرے اکاؤنٹ میں جمع ہو جاتا ہے۔ اس لحاظ سے سب درست جا رہا ہے۔ لیکن میں ہارون کی شکل دیکھنا چاہتی ہوں، نہ اس سے کسی قسم کے مراسم رکھنے کا شوق ہے مجھے۔ اللہ کرے شیریں شوہر اور نیچے باپ کے ساتھ سیٹ ہو جائیں۔ ان کا اُڑا ہوا گھر پھر سے شاد و آباد ہو جائے۔“

وہ ماں کے کپڑے نکالتے سنجیدگی سے بولی۔ ”ماما! میں اس دنیا کے پھیکے، شوخ و شنگ اور گہرے رنگوں کی سچائی اور مزاج کو جتنا سمجھ گئی ہوں، آپ اس عمر میں بھی اس کا اندازہ نہیں لگا سکتیں۔“

”بیٹے! میں نے سر جھکا کر، خود کو پردے میں رکھ کر چاب کی۔ اس کے بعد گھر

میں بندرہ کروقت گزارنے میں مصلحت جانی۔ تمہارا واسطہ ہر قماش کے لوگوں سے رہا ہے۔ اور تم نے ہر جگہ کا کھارا، بیٹھا اور نمکین پانی پیا ہے۔ تمہارا ایکسپویر مجھ سے کہیں زیادہ ہے۔ اس دنیا کے رنگ ڈھنگ تم نہیں سمجھو گی تو کیا میں جان پاؤں گی؟ اگر ایسا ہوتا تو تمہارا ساتھ کیونکر چھوڑتی؟ دوسروں کی باتوں پر یقین کرنے سے پہلے تم سے حقیقت معلوم تو کر لیتی۔ تمہاری بدنامی اور رسوائی کو اپنی اگیو تصور کر کے تمہیں زمانے کی تیز و تند ہواؤں میں تنکے کی مانند چھوڑ دیا۔ اور کیا ہوا اس کا انجام۔“ وہ روہانسی ہو گئی۔

”ہم ماضی کو نہیں گریڈیں گے۔“ وہ نہایت پیار سے بولی۔ ”اما! آج آپ کو یہاں کے سب سے وسیع و عریض شاپنگ مال لے کر چلوں گی۔ آج آپ کے لئے باپردہ مغربی طرز کے ڈریسز خریدے جائیں گے۔ یہاں کے بدلتے موسم میں ہمارا روایتی لباس خاصا پین فل ہے۔“

”ٹھیک ہے۔ ڈگڈگی تمہارے ہاتھ میں ہے۔ میری مجبوری ہے۔“ وہ مزاحیہ انداز میں بولی۔ ”بندریا تو تاجے گی نا۔“

”ممی..... میری جان!“ وہ خوشی سے چپک رہی تھی۔

دونوں تیار ہو کر تاشتے کے لئے نیچے چلی گئیں۔

”اما! دودھ میں شس ملا کر کھائیں۔ ویری ڈی لیشیر، ٹیسٹی اینڈ ہیلدی۔ خوب انجوائے کریں گی۔ آج آپ کی تھکن کی پروا نہیں کی جائے گی۔ ڈنر کے بعد کمرے میں آئیں گے۔ اس لئے ذرا کھاپی کر مارچ کے لئے تیار ہو جائیں۔“ وہ چھیڑتے ہوئے بولی۔

”حذیقہ! اس ڈائننگ ہال میں قدم رکھتے ہی من خوشبو سے اور دل بے حساب کھانے کی ورائٹی دیکھ کر ہی بھر جاتا ہے۔ میں کل ہی سوچ رہی تھی کہ غریب اور مفلس ایک جگہ پر بیٹھ کر دس روٹیاں کھا کر بھی بھوکے پیاسے کیوں رہتے ہیں؟ ان کی نظروں میں اور پیٹ میں ہر وقت کھانے کی بھوک انہیں ہاتھ پھیلائے پر مجبور کیوں کئے رکھتی ہے۔ کیونکہ تنگ دستی، بے روزگاری اور کمپرسی ان کی ذہنی ساخت کو بدل کر رکھ دیتی ہے۔ اور جسم کی گہرائیوں میں احساس کم مائیگی مسلسل بڑھ کر انہیں خودداری کی دنیا سے دور، بہت دور لے جاتی ہے۔ ہم اللہ تعالیٰ کا جتنا شکر ادا کریں کم ہے۔ ہماری نظروں میں بھوک ہے نہ پیٹ بھرنے کی چاہ۔ کمال ہمارا نہیں، شان اوپر والے

کی ہے جس نے بے حساب عطا کر کے وجود کی نس نس سے لالچ و طمع کو جڑ سے اکھاڑ پھینکا ہے۔“

”ماما! آپ پھر علاقہ ممنوعہ کی جانب چل پڑی ہیں۔“ وہ قہقہہ لگا اٹھی۔ ”اس لئے تو تمام بیگمات ڈاننگ کے پلین، جم کی ایکس سائز کے بارے میں ہر وقت سرگرداں رہتی ہیں اور ہمیشہ ہی فرمائیں گی، کچھ نہیں کھاتی۔ بس کھانا سونگھتی ہوں۔ پانی بھی کھی بن کر جسم پر چربی کی صورت میں نمودار ہو جاتا ہے۔ ان اللہ مارے فقیروں کو دیکھو۔ جو پیسہ کماتے ہیں، کھاپی کر بھی سوکھے سڑے ہی نظر آتے ہیں۔ جیسے پیدائش سے ہی فاقہ ششی میں مبتلا ہیں۔ ان کی آنکھ کی بھوک پیاس اور پیٹ کی آگ صرف اللہ تعالیٰ ہی بجھا سکتا ہے۔ ان کو بھی بے حساب ملے، پھر انہیں پتہ چلے کہ کم ہونے میں جو کھانے کی لذت ہے، وہ بے حساب ہونے میں نہیں۔ ذرا نوٹ تو کریں، ماں بیٹی کی سوچ میں کتنی ہم آہنگی ہے۔“ وہ آنکھیں منکارتے ہوئے بولی۔ ”بی پی ماما!..... اٹھیں جی۔“

دونوں گرد و پیش سے بے خبر ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑ کر ناشتے کی طرف چل پڑیں۔



”آپ کو ٹورنٹو رہنا پسند ہے۔ بہت خوب۔“ حدیقہ نے خوش ہو کر کہا۔ ”مونٹریال کے بارے میں کیا خیال ہے؟ مجھے وہ رہنے کے لحاظ سے نہیں، بزنس پوائنٹ آف ویو کے لحاظ سے پسند ہے۔ میں وہاں اپنی کمپنی بنانا چاہتی ہوں، میڈیسن سے ری لیڈ۔ مثلاً آپریشن تھیٹر، لیبارٹری اور پیشدہ کے استعمال میں آنے والی ہر قسم کی equipment جو ملک کے مختلف ہسپتالوں میں ڈیلیور کی جائے۔ میں نے چائنیز کے ساتھ ڈیل سائن کر لی ہے۔“

”اگر تم سمجھتی ہو کہ مونٹریال ہمارے لئے بہتر ہے تو ویل اینڈ گڈ۔ مجھے کیوں اعتراض ہو گا؟“ ماں نے خوش ہوتے ہوئے کہا۔

”وہاں میرے لئے آفس بنانا آسان رہے گا۔ ٹورنٹو ازاے ہیوج اینڈ ایکسپنسو سٹی۔ ہارون انجینئرنگ سے ری لیڈ کمپنی چلا رہا ہے۔ میں نے اسی سے ٹریننگ حاصل کی تھی۔ میرا تعلق میڈیکل سے ہے، میں اس میں کامیاب ہو سکتی ہوں۔ انجینئرنگ میری فیلڈ نہیں۔ بس دعا کریں کہ ہارون سے اپنا بزنس الگ کرنے میں مسائل نہ

کھڑے ہو جائیں۔“ وہ بہت سنجیدہ تھی۔ ”اسے دو مہینے پہلے وارن کرنا پڑے گا۔ میں آج ہی اسے ای میل کر دیتی ہوں۔ تاکہ وہ میرا شیئر آسانی سے الگ کر سکے۔“

”اگر وہ نہ مانا تو؟“ ماں ایک دم پریشان ہو گئی۔

”قانونی طور پر دو مہینے کے پیریڈ میں اگر وہ میرا شیئر خود خریدنا چاہتا ہے تو فرسٹ چوائس اُس کی ہوگی۔ ورنہ کسی اور کو شیئر دے سکتے ہیں۔ لیٹ سی کہ وہ کیا جواب دیتا ہے۔“ وہ پُرسکون لہجے میں بولی۔ ”پریشانی کی کوئی بات نہیں۔ یہاں بزنس کے اصول اور قانون بہت فیئر ہیں۔ یہ پاکستان نہیں کہ جو جتنا جھوٹا، چور اُچکا اور منافق ہوگا، دوسرے کا شیئر کھانے میں اتنی ہی جلدی کامیاب ہو جائے گا۔ یہاں دیانت داری اور راست بازی پر سودے ہوتے ہیں۔“

وہ لیپ ٹاپ کھول کر بیٹھ گئی۔ اور ماں نے قرآن مجید کھول لیا۔

جونہی ہارون کو ای میل ملی، اُس نے اُسے فوراً تسلی بخش جواب دیا۔ اُس نے اُس سے دو مہینے کے بجائے چار مہینے کی مدد کی ریکویسٹ کی تھی۔ کیونکہ شیئر وہ خود خریدنا چاہ رہا تھا، وہ بھی شیریں کے نام سے۔ اس نے اسے تفصیلاً تمام حالات لکھ کر خرم کے حالات سے بھی روشناس کیا تھا۔ لیکن اگلی بات نہ لکھ سکا تھا کہ وہ حدیقہ کو ڈھونڈ رہا ہے اور اسے اپنے پاس واپس لے جانے کا خواہش مند ہے۔

وہ ای میل پڑھ کر چکرا گئی۔ لیکن ہلکی سی خوشی کی لہر اس کے پورے جسم میں دوڑ گئی کہ شیریں کا گھر آباد ہوا اور بچے ماں اور باپ کی شفقت میں پروان چڑھنے لگے اور یہ خود بال بال بچ گئی ہر طرح کی آزمائش سے۔

اس نے ماں کو بھی تفصیل بتائی اور دونوں دیر تک تبادلہ خیالات کرتی رہیں۔ حدیقہ نے اپنے باپ کو صیغہ راز میں رکھا ہوا تھا کہ وہ ٹورنٹو کے سب سے بڑے ہاسپٹل کے ہیڈ ہیں اور وہ ان کے ساتھ کام بھی کر چکی ہے۔ وہ انہیں پہچان کر بھی انجان بنی رہی۔ کیونکہ اس کو ایسے بے جس باپ پر نہ فخر تھا، نہ ہی دیکھ کر خوشی کی لہر وجود میں دوڑی تھی۔

ماں کی لکھی ہوئی ڈائری وصول کرنے کے بعد ان کا کیا ری ایکشن تھا، اس سے بھی وہ بے خبر تھی۔ اتنا بڑا راز اپنے اندر چھپانے کا اک مقصد تھا۔ وہ ماں کے رنجوں کے کھر بند کھرچ کر اسے نئے سرے سے درد کی کیفیت میں مبتلا نہیں کرنا چاہتی تھی۔ زندگی میں پہلی بار تو اس نے ماں کو اپنی قربت میں اتنا خوش اور پُرسکون دیکھا تھا۔

اسے ضد تھا کہ وہ لڑیں یہ وہ فائدہ ہے۔ ملنے کی چاہ میں مضطرب ہی نہ ہو جائے۔
اور صدیقہ ایسے بہادر اور بہادر انسان سے ملاقات کروانے کے حق میں ہی
نہ تھی۔

دن گذر گیا۔ صدیقہ نے اپارٹمنٹ ریٹ پر لے کر اسے ضروری سامان
سے ہاں والی اجازت سے ہسپتال میں پارٹ ٹائم نوکری کر لی۔ جب کا مقصد
تواہ کا مسئلہ لڑیں تھا، بلکہ دوسرے ہسپتال سے ان بچ رہنا تھا۔

ہاں والی کا عرصہ گزر جانے کے بعد اسے دوسرے شہر ہارون اور وکیل کے
ساتھ تمام ڈاکومنٹس پر دستخط کر کے کمپنی کے شیئرز سے دستبردار ہونا تھا۔ ہارون نے
بیسویں بار اسے ہوٹل کے بجائے گھر پر رکنے کی دعوت دی۔ جس کو اس نے شان
بے نیازی سے مسترد کر دیا اور ماں کے ساتھ ہوٹل میں قیام کیا۔

ماں کو شہر کا چپہ چپہ دکھانے کے بعد اس نے ماں کو اپنا سابقہ اپارٹمنٹ دکھایا۔
وہاں تک جانے والی سڑک کھلے وسیع ہریالی سے ڈھکے ہوئے خوب صورت پارک اور
بہتے ہوئے جھرنے اسے مضطرب کر گئے۔ یہاں پر بیٹا ہوا ہر لمحہ اسے کچوکے لگا رہا
تھا۔ اس جگہ اس کی عصمت دری کا جو نالک ہارون نے کھیلا تھا، وہ آنکھوں کے
سامنے گھوم رہا تھا۔

ماں جہاندیدہ خاتون تھی، اس کے اعصاب کے کھچاؤ کو محسوس کر سکتی تھی۔ مگر وہ
خاموش ہی رہی۔

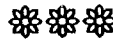
ڈنر کے بعد دونوں ہوٹل کے کمرے میں آ گئیں۔ حدیقہ کروٹیں بدلتی رہی۔
صدیقہ اس کے لئے دعائیں مانگتی رہی اور صبح ہو گئی۔ شب بیداری سے آنکھیں لال
ہو کر اور خوب صورت ہو گئی تھیں۔

وہ دیر تک باتھ ٹب میں بیٹھی خود کو سنبھالنے کی کوشش کرتی رہی۔ آنکھوں میں
ٹھنڈے پانی کے آن گنت چھینٹے ڈال کر اس نے اپنا چہرہ آئینے میں دیکھا۔ کس قدر
اُداسی اور مایوسی تھی۔ وہ بالوں کو تو لیے سے خشک کرتے ہوئے سوچنے لگی کہ اس کا
ایمان ہے کہ ماں کی آمدگی اور معافی کے بعد اس کی تقدیر بدل جائے گی۔ یہ ایک
روشن ستارہ بن کر فلک پر چمک اٹھے گا تو پھر پریشانی اور نا اُمیدی کیسی؟

”جیڑ اپنا سمجھ لڑکی۔ اس وقت تم اللہ تعالیٰ کی رحمتوں کے سائے تلے ہو۔ پھر
کفر سے ہمکنار کیوں ہو؟ جاؤ اپنی ماں کی ٹھنڈی چھاؤں تلے لاتعداد دعائیں اپنے

دامن میں بھرے زندگی کے نئے موڑ کو ہنستے مسکراتے کر اس کر جاؤ۔ آج وقت تمہارے ساتھ ہے اور خوش آسند فوج بانہیں پھیلائے تمہیں دیکھ کہنے کو بے تاب کھڑا ہے۔ ہمت کرو اور بلند حوصلے اور خود اعتمادی سے حالات کا مقابلہ کرو۔ اور جو فیصلہ کرو، اسے دل کی گہرائیوں سے سوچ کر کرو اور اللہ سے مدد مانگو اور اپنی بے کس اور بے گناہ ماں کی دعا لو۔ تمہاری زندگی کی کامیابی اسی میں پوشیدہ ہے حدیقہ! یہ اپنا گولڈن رول کبھی فراموش نہ کرنا۔ اس کو دل کے نہاں خانوں میں آباد کر لو۔“

وہ خوشی خوشی تیار ہونے لگی۔



”حدیقہ! کیا آج یہ ہماری آخری ملاقات ہے؟“ ہارون نے سامنے خاموشی سے بیٹھی حدیقہ سے سوال کیا۔

”اللہ کرے ایسا ہی ہو۔“ وہ قدرے تلخی سے بولی۔

”حدیقہ! تم نے مجھے معاف نہیں کیا؟“ وہ پریشانی کے عالم میں بولا۔ ”غلطی کے اعتراف کے بعد تو یہ خدا تعالیٰ بھی قبول کر لیتا ہے۔ شیریں کی قبولیت بچوں کی وجہ سے ہے۔ ہماری نالائقیوں اور تلخیوں کے اثرات ان معصوم اور بے گناہ بچوں پر کیوں پڑیں؟ پلیز حدیقہ! مائنڈ نہ کرنا۔“

”مجھے خوشی ہے۔ کیونکہ میں خود بروکن فیملی کی بچی تھی۔ میری زندگی کے شب و روز اور ماہ و سال کیسے گزرے؟ آپ کے سامنے ہیں۔ باقی رہی معافی تو وہ خدا ہے جس نے ہمیں بنایا ہے، وہ معاف نہیں کرے گا تو کیا میں معاف کروں گی؟ بہت حقیر اور ناچیز ہوں۔ انسانوں کی مثال دیں تو بات بھی بنے۔ لگے ہیں کمپیئر کرنے اتنی بڑی ذات تھی۔“ وہ غلطی سے بولی۔

”ایک انسان کی مثال تمہارے سامنے موجود ہے۔ دل کو بڑا نہ کرتا تو سوچو خاندان میں کتنی بڑی تباہی آ جاتی۔ تم بھی گھر آباد کرنے کا سوچو۔ باقی یہ راز ہم دونوں کے درمیان رہے گا۔ اللہ تعالیٰ جب عیبوں پر پردہ ڈال دیتا ہے تو ہم اپنے عیب کا ڈھنڈورا دنیا کے سامنے کیوں پڑائیں؟ میری اس غلطی کے انکشاف پر نہ جانے کتنے ہی جوان دلوں میں گناہ کرنے کی جس بڑھ جائے۔ ایک بات یاد رکھو! مصلحتاً جھوٹ بولنا بھی واجب ہے۔ میں تم سے پاک رشتے کے توسط سے معافی کا خواستگار ہوں۔“ وہ ملاحت سے سمجھاتے ہوئے بولا۔

”شاید وقت اور حالات مجھے معاف کرنے پر مجبور کر دیں۔“ وہ سوچتے ہوئے بولی۔

”میرا دل کہتا ہے حدیقہ! وہ وقت آئے گا۔“ وہ سنجیدگی سے بولا۔ ”میں اس احسان کا بدلہ ضرور اتاروں گا حدیقہ! میں نہ تو احسان فراموش ہوں، نہ ہی مطلب پرست ہوں۔ میں تمہیں تا حیات یاد رکھوں گا۔ میں آج جس مقام پر کھڑا ہوں، تمہاری نوازشات اور عنایات کی وجہ سے ہوں۔ تم نے جس پیارے اور حسین رشتے میں مجھے دیکھا ہے، اگر اللہ نے چاہا تو وہ بن کر دکھاؤں گا۔ منہ بولے رشتے بھی اپنی پاکیزگی اور تقدس کے حامل ہوتے ہیں۔ میں تمہاری زبان کی لاج رکھوں گا حدیقہ! میرا وعدہ ہے تم سے۔ خرم کو اپنالو۔ اُس کی ستم گری کو معاف کر دو حدیقہ!“

”کیسے بھول جاؤں اپنی عصمت دری، بے حرمتی اور اپنے پیار کی بے قدری کو؟ اب خرم کے ساتھ بیچ آپ ہونا بہت ڈیفنی کلٹ ہو گیا ہے۔ کیونکہ میں نے زندگی میں کبھی جھوٹ بولا ہے، نہ ہی کسی کو دھوکا دیا ہے۔ اور پھر آپ کے سامنے شرمندگی میں بھیا نک اور تاریک شکل لے کر کیسے آؤں گی؟ کیونکہ یہ تو میں جان گئی ہوں، آپ کی نظر جب بھی مجھ پر پڑے گی، آپ کو ایک برہنہ، بے بس لڑکی یاد آ جائے گی۔ اور وہ شیطانی ایکٹ ذہن میں سما جائے گا۔ اس لئے اب اس خاندان میں دوبارہ انٹری دینے کے تمام راستے بند ہو گئے ہیں۔ میں آپ کو معاف کروں یا نہ کروں، کچھ فرق نہیں پڑنے والا۔“ اس کی آنکھیں اشکبار ہو گئی تھیں۔

”یار! جتنا سوچو گی تا بس اُلجھتی چلی جاؤ گی۔“ وہ بے تکلفی سے بولا۔ ”اس معاملے میں عقل کو ایک طرف کر دو یار! مت جاؤ اتنی گہرائی میں۔ وہاں تمہیں گھٹا ٹوپ اندھیروں کے سوا کچھ نہیں ملے گا۔“

”یار..... یار..... یار.....“ اس نے نخوت سے یہ لفظ تین بار دہرایا اور رُکھائی سے بولی۔ ”جو لوگ اپنے اسلام کے اصول اور قانون فراموش کر کے دوسرے کلچر کا حصہ بن جائیں، میرا ان سے کوئی لینا دینا نہیں۔ اور نہ ہی ایسے لوگوں کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے معافی مل سکتی ہے۔ یہ بے ہودہ لفظ ”یار“ جو بیٹا، ماں کے لئے خفگی میں بولتا ہے، بہن بھائی کے لئے تملہاٹ میں اور میاں بیوی کو کم عقلی کا احساس دلاتے وقت غصے میں گرج کر ادا کرتا ہے۔ مجھے آپ کس کیلگری میں ڈال کر بول رہے ہیں؟ جبکہ میرا تو آپ سے کوئی رشتہ نہیں۔“

”بھائی کا رشتہ تم نے خود ہی استوار کیا تھا۔ بھول گئی ہو؟“ وہ اپنائیت سے بولا۔
 ”وہ سب بکواس اور فضول نکلا۔“ وہ برہمی سے بولی۔
 ”تم بہت میچور عورت ہو۔ اور عقل میں بھی لا جواب ہو۔ پلیز میری بات کو سمجھنے کی کوشش کرو۔“ لہجہ انتہا کا شکستہ اور پڑ مردہ تھا۔
 حدیقہ نے اس کی طرف رحم سے بھرپور نظر ڈالی۔ مزا جائز تو تھی ہی، اس سے پہلے اس غلبے میں آ جاتی، فوراً کھڑی ہو گئی۔
 ”حدیقہ! مجھے گلٹ میں ہی چھوڑ کر سزا دینا چاہتی ہو تو مجھے منظور ہے۔“ افسردگی اس کی آنکھوں سے چھلک پڑی تھی۔
 ”اس دنیا میں جسے کھرے اور کھوٹے کی پہچان نہیں، اسے میں کیا نام دوں؟ بولیں۔ کاش مجھے کھوٹا اور بے کار سکھ کر پھینک دیا ہوتا۔ کیوں چل نکلے تھے قارون کے خزانے کا سودا کرنے؟“ وہ ذومعنی بات کہہ گئی۔ ہارون کی آنکھیں جھک گئیں۔
 ”کاش میں نے اپنی ماں کی حسرت زدہ زندگی سے ہی سبق سیکھ لیا ہوتا۔ مگر اب ایسی بے معنی اور بے وقعت باتیں کرنے کا کیا فائدہ؟ آپ کل تمام ڈاکومنٹس کے ساتھ پہنچ جائیں تاکہ لائبر کے سامنے تمام حساب کتاب کلیئر ہو جائے۔“ وہ اتنی سنجیدہ اور اتنی مضبوط نظر آ رہی تھی کہ وہ ہکا بکا اسے دیکھنے لگا۔ کیونکہ وہ تو فطرتاً بے لحاظی کی وجہ سے کمزور نظر آیا کرتی تھی۔ زمانے کے رنگ اسے سمجھ آنے لگے تھے۔
 وہ سوچے جا رہا تھا اور وہ آفس سے جا چکی تھی۔



حدیقہ نے جونہی آفس کا دروازہ کھولا تو وہ چکر اسی گئی۔ اچنبھ سے ہارون کی طرف دیکھا اور چہرے پر ناگواری اور ٹینشن کی لکیریں ابھر آئی تھیں۔

”حدیقہ! آؤ۔“ ہارون نے اسے ریسو کیا۔ وہ بوجھل قدموں سے ساتھ ہوئی۔
 ”ڈاکٹر خرم سے ملے۔ آپ نے ضرور پہچاننے میں غلطی کی ہوگی۔“ ہارون نے مودبانہ انداز میں کہا۔ وہ خاموش رہی اور لائبر کے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گئی۔

گفت و شنید کے بعد دونوں نے پیپرز سائن کئے۔ جبکہ خرم خاموشی سے اسے گھورتا رہا۔ وہ کتنی بدل گئی تھی۔ جذباتی اور چھوٹی موٹی سی حدیقہ تو نہ جانے کہاں کھو گئی تھی۔ کیا وہ اسے تلاش کر کے حاصل کرنے کی سکت بھی رکھتا ہے یا نہیں؟

حدیقہ نے بھی اسے ایک نظر دیکھ کر سوچا۔ خرم کتنے بدل گئے ہیں۔ بالوں میں چاندی کے چمکتے ہوئے تار عمر کے ساتھ خود سے بے پروائی برتنے کی داستان پیش کر رہے تھے۔ پیشانی پر لائنوں کا بچھا ہوا جال بچتے ہوئے ماہ و سال کی پریشانیوں اور کلفتوں کی غمازی کر رہا تھا۔ چہرے پر بلا کی سنجیدگی اور خاموشی چونکا دینے کو کافی تھی۔ پُرسوج نگاہیں نہ جانے کہاں کھوئی ہوئی تھیں۔

”تھینک یو ہارون! آپ نے غیر متوقع طور پر میرے ساتھ جو سلوک کیا ہے، لین دین، حساب کتاب میں جو راست بازی دکھائی ہے، امپریس ہو گئی ہوں۔ ہر انسان کے اندر اللہ تعالیٰ نے برائیوں کے ساتھ بے پناہ خوبیوں کی بھی آمیزش ڈال رکھی ہے۔ اسی سے انسان کمپلیٹ ہوتا ہے۔“ وہ خرم کو انور کرتے ہوئے بولی۔ ”میں چلتی ہوں۔ ایک بار پھر شکریہ۔“

”خرم آپ سے اکیلے میں بات کرنا چاہتے ہیں۔“ ہارون نے سوچ میں ڈوبے

ہوئے خرم کی طرف دیکھ کر کہا۔

”کیا ابھی کہنے کو کچھ باقی رہ گیا ہے؟“ وہ طنزیہ لہجے میں بولی۔ ”چار سال کے عرصے میں مجھ تنہا عورت پر کیا کچھ نہیں گزر گیا۔ طوفان، آندھیاں اور جھکڑ۔ اس کے گواہ آپ ہیں۔ تب یہ صاحب کہاں تھے؟ مجھے ان سے کوئی سروکار نہیں ہارون! آج میرا ربط و تعلق آپ سے بھی ٹوٹ گیا ہمیشہ کے لئے۔ میرے ساتھ ہمدردی کا رشتہ قائم کرنا ایک جرم بن گیا تھا ہم دونوں کے لئے۔ ہمارے آشیانوں نے آگ پکڑ لی۔ میں جل کر راکھ ہو کر فضاؤں میں تحلیل ہو گئی۔ اور آپ سب نے خود کو بھسم ہونے سے محفوظ کر لیا۔ گھائے میں کون رہا؟ میں..... حدیقہ زیدی۔ اپنے دوست کو سمجھا دیجئے کہ حدیقہ کو زمانے نے جو سبق سکھائے ہیں، اپنی تنہائی اور اکیلے پن میں، میں جن تجربات سے گزری ہوں، ان کو مد نظر رکھتے ہوئے آپ کے سالار صاحب کو مجھ سے بات کرنے کا کوئی حق نہیں پہنچتا۔“ وہ طیش میں آ کر بولی۔

”حدیقہ! بعض اوقات زندگی میں ایسے واقعات رونما ہو جاتے ہیں، جن کے بارے میں نہ سوچا ہوتا ہے، نہ ہی ان کے ہونے کا تصور کیا جاتا ہے۔ مگر ان کے ظہور پذیر ہونے پر انسان حیرت میں ڈوب جاتا ہے کہ یہ ڈیزاسٹر میری سیٹلڈ لائف کو ڈسٹرائے کرنے کیوں آ گیا۔ بدگمانی اور بے صبر اپن اس کی جڑ ہے۔ خرم اپنی ہستی میں سے ایسے تمام بیج نکال کر تمہارے سامنے آیا ہے۔ کم از کم اس کی بات تو سن لو۔“ ہارون نے التجائیہ انداز میں کہا۔

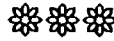
”جب میرے دل نے اعتماد اور بھروسے کے رشتے کو خیر باد ہی کہہ دیا ہے تو ایک نئی الف لیلیٰ کی داستان کا مجھ پر کیا اثر ہوگا؟ میں اپنی زندگی میں بہت مطمئن بھی ہوں اور بے پناہ خوش بھی ہوں۔ مجھ پر آپ کا احسان ہوگا کہ آپ آئندہ مجھے تنگ کرنے کی کوشش مت کریں۔ میرے پاس ایسی بے ہودہ باتیں سننے کے لئے وقت ہے، نہ ہی مجھ میں ہمت ہے۔“ اس نے بے اعتباری سے کہا اور بے حد روکھائی سے سامنے کھڑے خرم کو اس کا راستہ چھوڑنے کا اشارہ کیا۔ باڈی لینگویج میں اس قدر بے نیازی تھی کہ وہ چونک اٹھا۔

”حدیقہ! پلیز۔“ خرم نے اسے پکڑنے کی کوشش کی۔

”ڈونٹ ٹچ می۔ میں اب آپ کی کسی بات میں آنے والی نہیں ہوں۔“ اس نے تنہی سے کہا۔ ”تھینک یو خرم! آپ کے سلوک نے مجھے پاؤں پر کھڑا ہونا اور چلنا سکھا

دیا۔ آپ کیا چاہتے ہیں کہ میں پھر سے ہینڈی کیپ ہو جاؤں؟ ایسے لوگوں کو جو تے ہی پڑتے ہیں۔ اگر میں کوڑے کے ڈھیر سے پھینکی ہوئی بیساکھیوں کو اٹھانا بھی چاہوں تو کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ کیونکہ اتنے سالوں میں وہ بھی گل سڑ کر اسی کا حصہ بن چکی ہوں گی۔“

”لوں مجرم بنے اسے جاتے ہوئے دیکھتے رہ گئے۔ نہ ایک بولا، نہ دوسرے کی بات ہوئی کہ اسے روک سکتا۔“



”خرم! حدیقہ ان بچوں سے بے پناہ محبت کرتی تھی۔ ویسے آپس کی بات ہے، آپ دونوں میری اس بات سے ایگری ضرور کریں گے کہ اس نے زندگی میں ہر ایک کو بے پناہ پیار اور عزت دی ہے۔ ہم نے اسے چھوٹے گھر کی لاوارث لڑکی سمجھ کر بہت زیادتیاں اور بے انصافیاں کی ہیں۔ مزے کی بات کہ اس نے ہمیں اپنا اسٹینس ہی نہیں بلکہ ہارون کو جس طریقے سے سیٹل کیا ہے، انشاء اللہ ہماری نسلیں اُس کی ڈیڈیکیشن کو سنہری لفظوں سے یاد کریں گی۔ مال و دولت، عزت و ناموس کی فراوانی نے تمام دلدردور کر دیئے ہیں۔ ہم سے بہت بڑی بھول ہو گئی، گھر میں آئی ہوئی لکشمی کو ہم نے کس بے دردی سے لات مار دی۔ ایسا کون سا طریقہ اپنائیں کہ اپنے مراسم اس سے درست ہو جائیں۔ سنا ہے، آج کل اس کی والدہ بھی یہاں تشریف فرما ہیں۔ شاید اُن کی وساطت سے ہی ہم حدیقہ کو حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائیں۔“ شیریں نے پڑمردگی کی سیاہی خرم کے چہرے پر پھیلی ہوئی دیکھ کر کہا۔ ”پریشانی کی بات نہیں ہے۔ حدیقہ طبعاً بہت بہترین لڑکی ہے۔ اس کا غیر مناسب ری ایکشن بھی نارمل ہے۔ مگر ہے عارضی اور وقتی۔“

”تمہاری خوش فہمی ہے یہ۔ میں نے آج حدیقہ کی نگاہوں میں بے باکی اور خود اعتمادی کی جو جھلک دیکھی ہے اور اس کے اندازِ گفتگو میں جو استقامت دیکھی ہے، وہ قابلِ دید تھی، قابلِ آفرین تھی۔ بے شک اس کے اس روئے نے مجھے دہلا کر رکھ دیا ہے۔ لیکن روح میں خوشی کی لہر بھی دوڑ گئی ہے۔“ خرم کی آواز کسی گہرے کنوئیں سے آ رہی تھی۔ ”نو کپور و ماز، نور بش ٹاک۔ دونوں ٹاپک اس کے چہرے پر چسپاں تھے شیریں!“ وہ کسمسایا۔

”مجھے تو محسوس ہونے لگا ہے کہ خاندانی شان و شوکت اور نسوانی عزت و نفس کی

مالک عورت تو وہ نکلی۔ میں تو اس کے قدموں کی دھول ہوں، جو خود کو ہر لحاظ سے اس سے برتر گردانتی تھی، آج اپنی ہی نظروں میں خاک کا معمولی اور بے وقعت سا ذرہ بن کر رہ گئی ہوں۔“ شیریں کی آنکھوں سے ساون کی گھٹا برس اُٹھی۔

”شیریں! تم نے جو بھی فیصلہ کیا ہے، اس میں بچے سرفہرست آتے ہیں۔ ورنہ باپ کی شفقت کے علاوہ انہیں ہم نے ہر وہ نعمت فراہم کی جو گریڈ پیئرٹس طوعاً و کرہاً یا خوشی سے ان کی جھولی میں ڈالتے ہیں۔ اس لئے آج کے بعد تمہارے لہجے میں پچھتاوے کی ہلکی سی رفق بھی نہیں ہونی چاہئے۔ میں نے اتنے سالوں کی تنگ و دو سے یہ سبق تو سیکھ لیا ہے کہ کپڑے مارے کے بیس پر استوار ہونے والے رشتے کبھی کامیاب نہیں ہوتے۔ ازراہ مجبوری، ازراہ رحم اور ترس کے احساسات پر طے ہونے والے رشتے جلدی یا بدیر ٹوٹ جاتے ہیں۔ اس لئے پلیز بی کیئرفل۔ پہلے ہی ہم نے پرلے درجے کی ذلالت اور رسوائی سے اپنے منہ کالے کر لئے ہیں۔ اب اللہ تعالیٰ نے ہمیں اس سیاہی کو مٹانے کی مہلت دی ہے۔ اور یاد رکھو! اللہ تعالیٰ اپنے ان بندوں کو ایسے مواقع فراہم کرتا ہے جو آنکھیں بند کئے اس کے فیصلوں پر ایمان لے آتے ہیں۔“

خرم نے شیریں کو نہایت پیار سے سمجھایا تو وہ آنسو صاف کرنے لگی۔

”اب میرے اس گمبیر اور ناقابل حل مسئلے کے بارے میں کچھ سوچو، کوئی راہ نکالو۔ سوچتا ہوں کہ جب کسی چیز کی قدر نہیں کی جاتی، اس کی کیئر اور نگہداشت نہیں کی جاتی، وہ مٹھی سے ایسے نکل جاتی ہے، جیسے ریت۔“ وہ بے قراری سے بولا۔

”یار! اسے اٹھا لاتے ہیں۔ آخر ہے تو تمہاری منکوحہ۔“ ہارون نے اندر آتے ہوئے کہا۔ ”تمہاری ملکیت اور پراپرٹی پر تمہارا ہی قبضہ لازم ہے۔“

”ٹھیک ہے۔ تمام انہونی، نازیبا اور بھونڈی حرکتیں ہم ہی تو مقدمہ میں لکھوا کر لائے ہیں۔ اب اسی کی کسر باقی رہ گئی ہے کہ اسے ہوٹل سے اغوا کر کے تمام زندگی جیل کی سلاخوں کے پیچھے گزار جائیں۔ ایسی تری اور زبردستی صرف پاکستان میں ہی چل سکتی ہے جہاں فقط تم اور میں معاشرے کا اٹوٹ انگ ہیں۔ جن کی شنوائی اور رسائی میں کوئی مسئلہ حائل نہیں۔ آخر ہم ہی سے تو معاشرے کے تمام قوانین اور اصول محفوظ رہ سکتے ہیں۔ پھر ہمیں وہاں کا لاء سپورٹ کیوں نہیں کرے گا؟“ وہ طنزیہ لہجے میں بول رہا تھا۔ ہارون اس کی اس تبدیلی پر ہنس پڑا اور دل میں سوچنے لگا کہ

”ماں ہی بی بی مخلوق ہے کہ کشتیاں جلانے میں بھی بے صبرا اور عاقبت ناندیش اور ہمتا نے میں بھی اپنی مثال آپ۔“

”ایسے مجھے یہ کہنے میں فخر محسوس ہو رہا ہے کہ تم نے اپنی زندگی میں صرف ایک ایسے مصل مندانہ فیصلہ کیا ہے، حدیقہ سے ناطہ قائم رکھنے کا۔ یار! چھانگئے ہو۔“ ہارون نے ہنستے ہوئے چھیڑا۔

”حدیقہ کی عقلمندی کا جواب نہیں جس نے ان چار سالوں میں ایک بار بھی دھمکی لے طور پر بھی طلاق کی ڈیمانڈ نہ کی۔ فنانشلی سپورٹ کرنے پر شور شرابا نہ کیا۔ میں نے دوسری شادی اس کی رضامندی کے بغیر ہی کر لی۔ مجھ سے رابطہ کر کے لعن طعن کرنا اور کورٹ میں جا کر مجھے ذلیل و رسوا کرنا اُس کا حق بنتا تھا۔ مگر وہ نہ جا۔ نے کیسے برداشت کر گئی۔“ خرم سوچتے ہوئے بولا۔

ہارون کے ذہن میں اس رات کا کرب اور تڑپ بجلی کی طرح گونجی اور وہ حسرت و یاس سے اسے دیکھتے ہوئے بولا۔

”اٹ وا زیری پین فل فار ہر۔ جب اُسے تمہاری شادی کی خبر پہنچی تھی، اُس کے قریب میں نہ ہوتا تو وہ خود کو ختم کر دیتی۔ خرم! شئی از اے گریٹ لیڈی۔ آئی ریسپیکٹ ہر سوئچ اینڈ سیلوٹ ہر۔“ وہ خود کو سنبھالتے ہوئے شگفتہ لہجے میں بولا۔ ”اس کے وسیع دل کا کوئی بھی اندازہ نہیں لگا سکتا۔ وہ اس سمندر سے گہرے، بے حدود بے کراں دل میں اُنھنے والی تلاطم خیز موجوں پر بند باندھنے کا گر جانتی ہے۔ وہ اپنے کلچر کو ہر گز نہیں بھولی۔ وہ جانتی ہے کہ اس کی شنوائی کہاں ہے۔“ وہ دکھ سے بولا۔

”وہ میری شادی پر کھلم کھلا اعتراض کر سکتی تھی۔“ خرم نے برجستہ جواب دیا۔ ”خدا کے لئے۔ کلچر اور قرآن، اصول و قوانین کو ایک ہی کیلنگری میں ڈال کر ہم گناہ کبیرہ کے مرتکب کیوں ہوتے ہیں؟ جیسے تم نے اپنے اختیارات کا بے جا استعمال کر کے تین دفعہ طلاق کا لفظ استعمال کیا اور روپوش ہو گئے۔ قرآن میں مجھے ڈھونڈ کر دکھاؤ کہ کہاں لکھی ہے یہ بے انصافی اس عورت پر جو اس رضامندی میں شامل حال ہی نہیں۔ اُسے احسن طریقے سے تحائف دے کر رخصت کرنے کا مطلب ہے کہ یہ ناپسندیدہ فعل دونوں کی رضامندی سے ڈیسا ئڈ ہوا ہے۔ اس میں عورت پر ظلم و ستم ڈھانا اور اسے جہاں بھر میں ذلیل و خوار کرنا کہاں کا انصاف ہے؟ عورت کو بھی طلاق کا یکطرفہ فیصلہ کرنے کے حقوق ملنے چاہئیں۔ اگر وہ یہ لفظ تین دفعہ ادا کرنے کے

بعد طلاق دینے کا دعویٰ کرتی ہے تو اسے پاگل اور جنونی کہہ کر چپ کر دیا جاتا ہے۔ اس کی ریکویسٹ کو جب تک شوہر ایکسپٹ نہیں کرتا یا کورٹ پکھریوں کے اُن گنت چکروں کے بعد قانون زبردستی شوہر سے یہ بات منوانہیں لیتا، عورت اس کے چنگل میں گرفتار رہتی ہے۔ مرد کی طرح عورت کے کہنے پر بھی طلاق ویلڈ ہونی چاہئے۔ جبکہ بوقت نکاح دونوں جانہیں سے گواہوں کی موجودگی میں ان کی رضامندی لے کر دونوں کو ایک دوسرے پر حلال کر دیا جاتا ہے تو پھر طلاق کی صورت میں تمام اختیارات صرف شوہر کو کیوں دیئے گئے ہیں؟ ہمارا کلچر اور سوسائٹی مذہب کے نام پر عورت پر زیادتی کیوں کر رہا ہے؟ جبکہ ہمارا دین بہت ماڈرن مذہب ہے۔ عورت کو انسانوں کی کیلگری میں ڈالنے والا سب سے پہلا مذہب ہے۔ کیا کانوں کو عجیب سا نہیں لگتا یہ سن کر کہ رشتہ جڑنے پر دونوں کی آمادگی نہایت اہم لیکن ٹوٹنے پر فقط مرد کے اختیارات کو اولیت کیوں؟ اے حوا کی بیٹیو! لمحہ فکر یہ ہے۔“

”واہ، واہ، واہ..... مان گئے۔ مگر پلیز! اس جرح میں مت پڑو۔ احکام الہی کے آگے سربمحو درہو گے تو تمام مسئلے حل ہو جائیں گے۔ اور اس کے بھیدوں کو گریڈ نے کی ضرورت بھی نہیں ہمیں۔“ ہارون نے امپریس ہو کر کہا۔ ”تم تو بہت کچھ جان گئے ہو خرم! خدا کے لئے اپنے خاندان کے شوہروں کو جمع کر کے درس دینا شروع کر دو۔ اپنی علمیت کا فائدہ دوسروں تک منتقل کر کے ثواب کماد۔“

”اب میں بمعہ اس کی تمام شرائط کے اسے واپس لانا چاہتا ہوں۔ اس بات پر مغز کھپائی کرو یا ر! کہ کیا، کیا جائے۔ وہ میری باتوں پر یقین نہیں کرے گی۔ ویری سیڈ۔“ وہ بے تابی سے بولا۔ ”میں حدیقہ سے فزیکلی سٹرانگ ہونے کے ناطے برتر ہوں۔ اس میں اسٹینس کا کوئی رول نہیں۔ وہ مجھ سے کمتر کیسے ہو سکتی ہے جس کے پاؤں تلے جنت ہونے کی خوشخبری ہے۔ جس نے رسولوں، پیغمبروں اور انبیاء کو جنم دے کر معاشرے کو بہتر بنانے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔“

”مجھے تمہارے انداز گفتگو میں سچائی نظر آتی ہے۔ لیکن حدیقہ تو یہی سمجھے گی کہ تمہیں تمہاری بچی کے لئے آیا چاہئے، ماں کے لئے نرس کی بھی ضرورت تو بہت ہے۔ تم اسے پاکستان لے جا کر پھر سے خاندان بھر کی چالپوسی اور خاطر داریاں کراؤ گے، اس کی تمام آسائشات کو تہ تیغ کر کے ایک پاکستانی شوہر بن کر اس پر حکمرانی کرو گے۔ معاشرہ اس پر راجدھانی کرے گا۔ اور پھر پہلی بیٹی کے ہوتے ہوئے تم اسے

اے زبانی سے گریز کرو گے۔ اور وہ منہ پر پہلے کی طرح پٹی باندھے، سر جھکائے
 اٹھانے کی کوشش کر رہا ہے۔ شب و روز جیسے تیسے گزار کر بھی تمہاری مشکور رہے گی۔ یہ تمام خدشات
 اس نے ذہن سے گھرچ کر کیسے نکال سکتے ہو؟ خرم! اٹ! ازمپاسیل۔ کیونکہ وہ
 اپنے معنوق سے آشنا ہو چکی ہے۔ کیا تم کو اینڈ ٹیک کا رشتہ نئے سرے سے استوار
 کرنے کی ہمت رکھتے ہو؟ تمہاری پرسنالٹی کے اس چیلنج میں کہیں عارضی پن تو نہیں؟
 یہ نہ ہو کہ اسے مار پیٹ کر پھر سے سائبان اس کے سر سے چھین لو۔ سوچ لو، یہ سب
 کچھ اب مذاق ہے، نہ ہی کوئی ڈرامہ ہے۔ سوچ لو۔ نہیں تو اس معاملے کو یہاں ہی
 ٹھپ رہنے دو۔ خواخواہ اس کے آگے دامن پھیلا کر بھیک بھی مانگیں اور تنگ نظری
 اور مردانگی کی جھوٹی انا وغیرت ادھر کی ادھر ہی براجمان۔ سوچ لو۔“ وہ اپنی لے میں
 بولے جا رہا تھا۔

”یہ تمام خدشات بالکل بے معنی ہیں یار! ذرا سوچو کہ جن لوگوں کی خاطر میں
 نے اپنی زندگی کی خوشیوں کی بھینٹ چڑھا دی تھی، آج وہ سب کہاں ہیں؟ اپنی اپنی
 دنیا میں خوش و خرم اور کامیاب ہیں۔ ناکامی تو میرے حصے میں آئی۔ کیونکہ میں
 آئیڈل سک اور امپریکینکل تھا اپنے ویوز میں۔ اب وہی ہوگا، جو حدیقہ چاہے گی۔ غور
 سے سن لو۔ اگر اس نے تمہیں چھوڑنے کی تمنا بھی کی تو ہنستے مسکراتے اس کا ساتھ
 دوں گا۔“ وہ ہنستے ہوئے بولا۔ ”اب کی بار جو رو اور ساسوجی کا فرمانبردار اور وفادار
 غلام بن کر نہ دکھایا تو بات نہیں۔“

”یار! یہ تو تم نے اپنی فطرت کے خلاف سوچ لیا۔ یہ بھی تو درست نہیں۔ خرم!
 رشتوں میں ٹیلنس کرنا ہی مرد کی شان اور آن ہے۔ تمہارا ون سائیڈ رو رجمان ہی تو
 ناکامی بن کر تمہارا سامنا کرتا ہے۔ خدا کے لئے اب یہ نہ کرنا۔“ ہارون نے بے اختیار
 ہو کر کہا۔

”یہی کروں گا۔ دیکھو تو سہی۔“ خرم مسکرا اٹھا۔

”ایک عورت کے لئے اولاد کا رشتہ سب سے اعلیٰ اور اہم ہونے کی وجہ سے وہ
 اپنے تمام خونی رشتوں کو اس پر واردیتی ہے مگر کیا مجال کہ اُف تک کر جائے۔ مرد میں
 اتنا حوصلہ اور ہمت کہاں؟ وہ چغدا اپنی نسل کی خاطر تمام رشتوں کو نبھانے کے گڑھی
 نہیں جانتا۔ کبھی بیوی کو چھوڑ دیا تو کہیں انہوں سے کنارہ کشی۔ یار! اب کی بار ایسا
 نہیں ہونا چاہئے۔ یوٹڈ لرن دس لیس۔“ ہارون تھوڑا سیریس ہو گیا تھا۔ ”کہ زندگی

کے ہر موڑ اور ہر رشتے کو اس کے مطابق پیمانے میں مقید کر لینا مردانگی ہے۔ اپنی اس ذمہ داری کو پیچانو، اسے ابھی لے آتے ہیں۔“

”بات ایسے کر رہا ہے، جیسے وہ ساتھ والے کمرے میں براجمان ہو۔“ خرم نے مذاقاً کہا۔

”انشاء اللہ وہ وقت بھی جلد ہی آنے والا ہے۔“ شیریں نے تسلی دیتے ہوئے کہا۔

”مجھے اس کی قطعاً امید نہیں۔ وقت میرے ہاتھ سے نکل چکا ہے شیریں!“ وہ اداس ہو گیا۔

”خرم! میری بات مانو تو ماں جی اور ننب کو لے کر یہاں ہی سیٹ کیوں نہیں ہو جاتے؟ تمام مسائل یکے بعد دیگرے سلجھتے چلے جائیں گے۔ کچھ وقت تو چاہئے تا تمام ڈیزاسٹرز سے نمٹنے کے لئے۔“ ہارون نے نہایت نرمی سے کہا۔ ”نیا گھر بنانا آسان ہے، ایک زلزلے میں تباہ شدہ گھر کو ری نوویٹ کرنا خاصی سہل دردی ہے۔ اس کے لئے تیار ہو؟“

”ہاں بھی۔ گواہوں کی موجودگی میں اسٹامپ پیپر پر لکھ کر دوں کہ آئی ایم سیرلیس۔ میں اپنے تباہ شدہ گھر کی ری نوویشن سے پہلے اسے پہلے سے زیادہ آرام دہ اور خوب صورت بنانا چاہتا ہوں۔“ وہ اضطراری کیفیت میں بولا۔ مگر شیریں خاموش رہی۔ کیونکہ وہ اتنے تلخ تجربے کے بعد پھر سے کسی کی بھی زندگی میں کسی دخل اندازی کے حق میں نہ تھی۔ اس لئے وہ ان دونوں کی گفتگو میں سوائے سر ہلا کر ہاں اور نہ کرنے پر اکتفا کئے خاموش بیٹھی تھی۔ کسی وقت حسبِ عادت لقمہ دینے کی کوشش ضرور کرتی مگر اگلے لمحے وہ کیئرفل ہو کر دونوں کی باتوں پر مسکرا کر انہیں محفل میں شامل ہونے کا احساس دلا دیتی۔



”بیٹا! کیا بات ہے؟ تم رات بھر سوئی بھی نہیں، نہ ہی ناشتہ کرنا چاہ رہی ہو۔ مسئلہ کیا ہے؟“ ماں حدیقہ کی سوچ میں ڈوبی ہوئی آنکھوں کا بغور جائزہ لیتے ہوئے بولی۔ ”میں تمہاری ماں ہی نہیں، دوست بھی ہوں۔ بتاؤ کیا بات ہے؟“

”کوئی خاص بات نہیں۔“ وہ موضوع بدلنے ہوئے بولی۔ ”ہمیں بارہ بجے چیک آؤٹ ہونا ہے۔ پیکنگ کر لیتی ہوں۔ آپ تیار ہو جائیں۔ ناشتے کے لئے نیچے ہی چلتے ہیں۔“

”تم موضوع سے ہٹ گئی ہو۔ مجھے بتاؤ، کیا کہا ہارون نے؟ کہیں تمہارا پیسہ ہی لاپرواہ نہیں کر گیا؟ اگر ایسا ہے تو ہم اسے نہیں چھوڑیں گے۔ یہاں کا قانون ہمارا ماتھ دے گا۔ نہ کہ اس کا۔ یہاں سب کا وارث نیلی چھت والا اور ان کا قانون ہے۔ جبکہ وہاں جس کی لانچی اس کی بھینس کے مصداق شریف اور معصوم لوگوں کو ہانک کر انہیں بے زبان مخلوق کی فہرست میں لکھ دیا جاتا ہے۔“ وہ ایک دم سے پریشان ہو گئی تھی۔

”ماما! ایسی کوئی بات ہی نہیں۔ آپ خود پر قابو پائیں۔ یقین مانیں، ہارون میں ہزار ہا عتیں سہی مگر ہے وہ دیانت دار اور ایمان دار۔ وہ حساب کتاب میں بہت فیئر رہا ہے میرے ساتھ۔“ حدیقہ نے اپنے چہرے پر مسکراہٹ بکھیرتے ہوئے کہا۔

”تو پھر تم رات سے مرجھا کیوں گئی ہو؟ تمہیں میری قسم اگر نہ بتاؤ تو۔“ ماں دھمکی کے انداز میں بولی۔

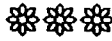
”ایسے مت بولیں ماما! بعض اوقات اولاد اپنے بہت پیارے رشتوں کو اپنے مسائل بنا کر انہیں دکھی نہیں کرنا چاہتی۔ بس یوں ہی سمجھیں۔ ہم یہاں سے جائیں گے تو مونٹریال میں اپنے کام میں مصروفیت کی وجہ سے کوئی پریشانی میرے قریب نہیں پھٹے گی۔ ٹورنٹو میں، میں نے بہت مشکل وقت کاٹا ہے نا، بس وہی وقت افسردہ سا کر گیا ہے۔“ اس نے آنسو پیتے ہوئے ٹالنے کے انداز میں کہا۔

”بیٹی! تم ماں کی آنکھوں میں دھول نہیں جھونک سکتی۔“ وہ اس کا جائزہ لیتے ہوئے بولی۔ ”تمہاری آنکھوں میں اک راز چھپا لگ رہا ہے۔ بولو، مجھ سے چھپانا نہیں۔ کیونکہ ایسا کرنے سے دکھ بڑھتا ہے، کم نہیں ہوتا۔“

”جی ماما! بات یہ ہے، جب میں ہارون سے ملنے اس کے آفس گئی تو خرم وہاں موجود تھا۔ اپنے طور طریقے سے بہت صلح ہو اور مہذب لگ رہا تھا۔ لیکن میں اس پر بھروسہ کرنے والی نہیں۔ خود کو کیا سمجھتا ہے؟ جب دل چاہا گلے لگا لیا، جب دل بھر گیا تو آسمان سے زمین پر لا پٹھا۔ اب میں ایسی بھی بچی اور جذباتی نہیں رہی کہ اس کی مسکین اور آزرده شکل دیکھ کر موم کی مانند پگھل جاؤں گی۔ میں نے اسے ایک لفظ بھی ادا نہیں کرنے دیا۔ جب میں نے اس کے ساتھ نہ رہنے کا تہیہ کر ہی لیا ہے تو پھر اس کی بک بک کیونکر سنوں؟ اور خواخواہ قیل و قال میں پڑ کر خود کو پریشان کیوں کروں؟ کیوں ماما! میں نے ٹھیک کہا ہے نا؟“ وہ اپنی ہاتھوں کی لکیروں میں ڈوبتی اُبھرتی

بولے جارہی تھی۔

جب ماں کی طرف سے کوئی جواب نہ ملا تو اس نے چونک کر ماں کی طرف دیکھا جو صوفے پر ہی بے ہوش ہو چکی تھی۔ کیونکہ اب صدیقہ اعصابی طور پر اتنی کمزور اور لاغر ہو چکی تھی کہ وہ کسی قسم کا شاق برداشت کرنے کی قوت ہی نہ رکھتی تھی۔



آئی سی یو میں وہ ابھی تک شوگر لیول ڈاؤن ہو جانے کی وجہ سے سیسی تو ماں میں تھی۔ حدیقہ کے ساتھ ڈاکٹر آصف زیدی، نرس کو ہدایات دے رہے تھے۔ حدیقہ نے باپ پر بیٹی ہونے کا انکشاف نہ کیا تھا۔ نہ ہی آصف کے سلوک اور رویے میں ایسی جھلک تھی۔ ڈاکٹر ہونے اور حدیقہ کے اس کے ساتھ کام کرنے کی وجہ سے ہمدردی اور حد سے زیادہ کیئر کی جو ایکٹنگ کر رہا تھا، اس میں سچائی بھی پنہاں تھی۔ اور حدیقہ اس کی بے تابی اور فکر مندی سے اس قدر محفوظ ہو رہی تھی کہ اسے ماں کی بے ہوشی کی پرواہی نہ رہی تھی۔ وہ دُور بیٹھی تمام سین کو آنکھوں کے ذریعے اپنے ذہن میں سمو کر مسرت و انبساط سے جھوم رہی تھی۔ وہ زندگی میں اتنی ریلیکس کبھی نہ ہوئی تھی۔ اسے آج ایسا لگ رہا تھا، جیسے وہ تمام ذمہ داریوں سے فارغ البال ہو گئی ہے۔ اب ماں کی کیئر اور نگہداشت کرنے والا اس کا شوہر اس کے سر پر دن رات کھڑا ہے۔ اب اس کی موجودگی کی ضرورت ہی نہ رہی تھی۔

ایک ہفتہ تو ماں میں رہنے کے بعد وہ غیر متوقع طور پر ہوش میں آ گئی۔ رات کا وقت تھا۔ حدیقہ کو آصف زیدی نے ہوٹل آرام کرنے کے لئے زبردستی بھجوا دیا تھا اور خود صدیقہ کے قریب کرسی ڈال کر بیٹھ گیا۔ سسڑنے کئی بار اسے واپس جانے کا کہا، مگر وہ ایک نہ مانا۔ یہ مرد بھی کیسی عجیب ذات ہے کہ پیار پر آئے تو اپنے تحت و تاج کو تیاگ کر دے۔ اس کی نفرت ایسی بھیانک اور جان لیوا کہ عورت سوچتی ہی رہ جائے کہ وہ کہاں پر بے وفا تھی؟ کون سی غلطی سرزد ہو گئی تھی کہ تمام ناتے ہی توڑ ڈالے؟ اور جب لا پرواہ بننے پر آئے تو ایسا لا ابالی اور غیر ذمہ دار کہ پلٹ کر دیکھنا بھی گوارا نہ کرے۔

حدیقہ نے اسی ہسپتال سے مانوسیت اور جان پہچان کی وجہ سے رابطہ کیا تھا۔ چند منٹوں میں ایسبولینس ہوٹل کے دروازے پر کھڑی تھی۔ اور اس اطلاع پر آصف زیدی اللہ تعالیٰ کے سامنے سجدہ ریز ہو گیا۔ وہ ڈائری پڑھنے کے بعد صدیقہ کو پانے کی جتو

میں وہاں اور ہونی تو ہو ہی گیا تھا۔ کسی طرف سے اسے کوئی مژدہ راحت نہیں مل رہا تھا۔ اس نے ہاسپٹل میں اس کا ایڈمیشن ہی مسز ڈاکٹر آصف زیدی کے نام سے کرا دیا تھا۔ جسے حدیقہ ہر بار پڑھ کر اگنور کر دیتی۔ آصف پر اپنی فیملنگو کا اظہار کر کے، اسے پاپا بھار کر گلے لگ جانا بالکل ایک فلمی سین کی طرح لگ رہا تھا۔ اس لئے وہ اپنے ہڈیات پر پوری طرح غالب آ چکی تھی۔ بس باپ کی بے چینی اور تڑپ پر حیران و شادماں تھی۔

جب صدیقہ نے آہستہ آہستہ آنکھ کھولی اور بلب کی مدھم روشنی میں اپنے قریب ایک مردانہ سایہ محسوس کیا اور پھر اس کے ہاتھ کی انگلیاں اس کی نبض پر رک گئیں۔ اور آصف کی بے چین نظریں صدیقہ کی بجھی ہوئی آنکھوں میں اس صدیقہ کو ڈھونڈنے لگیں، جسے اس نے ٹوٹ کر پیار کیا تھا۔ یہ تو زمانے کی ستائی ہوئی نہ جانے کون عورت تھی۔

آنکھیں من کی زبان ہیں۔ جو بیل بھر میں زندگی کی تمام تر داستانیں بیان کرنے میں بہت ماہرانہ طریقے سے کام کرتی ہیں۔ عقل و شعور رکھنے والے لوگ اس کی بولی کو سمجھنے میں تاخیر نہیں کرتے۔ وہ کھلی آنکھوں سے گرد و پیش کا جائزہ لے رہی تھی کہ وہ ہے کہاں؟

طویل توقف کے بعد اس نے محسوس کیا کہ وہ ہاسپٹل میں آئی سی یو وارڈ میں ڈاکٹروں اور نرسوں کی نگہداشت میں ہے۔ پھر اگلا خیال حدیقہ کا تھا۔ اس کے لبوں نے جنبش کی تو آصف زیدی کا چہرہ اس کے چہرے کے اتنا قریب آ گیا کہ صدیقہ اس کی سانسوں کی حدت اور مخصوص خوشبو کے جھونکے سے چونک اٹھی۔ یہ ماضی میں ابھرنے والی محبت سے لہریز سانسوں کے ساتھ پولو کا دل فریب بھبکا بیتے ہوئے دنوں کی یاد دلا گیا۔ اس نے ملجائی سی روشنی میں اسے پہچاننے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے بیٹھنے کی کوشش کی۔ مگر سر بری طرح چکرا رہا تھا۔ وہ پھر سر تکیے پر رکھ کر بے بسی و لاچارگی سے اس ہیولے کو دیکھتے ہوئے لرزش زدہ آواز میں بولی۔

”آپ کون؟..... اور میری حدیقہ کہاں ہے؟“

”آپ آرام فرمائیں۔“ اس نے سرگوشی کے انداز میں کہا۔

”ڈاکٹر..... ڈاکٹر آصف.....“ مانوس آواز اور پسندیدہ مانوسیت سے بھرپور خوشبو پر چونک کر بولی۔ ”آصف زیدی.....“ اس نے ٹوٹے پھوٹے لفظوں سے نام ملل کیا۔

”ہاں صدیقہ! تمہارا مجرم، تمہارا گناہ گار تمہارے سامنے کھڑا ہے۔ اس کے لئے جو سزا تجویز کرو گی، اسے قبول ہے۔“ وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر ندامت سے بولا۔

”آصف!..... آصف آپ..... کہیں یہ خواب تو نہیں؟“ وہ پھر تذبذب کے عالم میں اٹھنے کی کوشش کرنے لگی مگر اٹھ نہ سکی۔

آصف نے اسے پیار بھرے لہجے میں لیٹے رہنے کی تلقین کی۔

”آئی کانٹ بی لیواٹ۔ میرا دم گھٹ رہا ہے۔“ وہ اپنے سینے پر ہاتھ پھیرتے ہوئے اسے دیکھتے ہوئے بولی۔ ”مجھے بچالیں۔ میں جینا چاہتی ہوں۔ آپ کے ساتھ اپنی بقیہ زندگی بتانا چاہتی ہوں۔ کہاں ہے ہماری بچی؟“ وہ نڈھال سی ہو کر اس کے چہرے کی طرف دیکھنے لگی۔

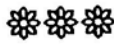
”کچھ نہیں ہونے والا۔ خود کو سنبھالو۔“ وہ جلدی سے اس کا بلڈ پریشر چیک کرنے لگا جو اتنا گر چکا تھا کہ اس کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔

”صدیقہ! مجھے معاف کر دو۔ ورنہ میں گھٹ میں ہی مارا جاؤں گا۔ میری غلطیوں کو فراموش کر کے مجھے صدق دل سے معاف کر دو۔ جوانی کے نشے، دولت کی حرص، والدین کی عزت و لحاظ اور اسٹیٹس کے جنون میں، میں نے تمہیں جن خطابات سے نوازا تھا، سب غلط تھے۔ پھر بھی تم نے میرا انتظار کیا ہر پل اور ہر ساعت۔ مجھے معاف کر دو..... مجھے معاف کر دو صدیقہ!“ وہ تڑپ اٹھا تھا۔ اس کے سینے پر سر رکھے وہ بچوں کی طرح رو رہا تھا کہ اسے محسوس ہوا جیسے صدیقہ کا دل خوشی سے دھڑکنے لگا۔

بھول گیا ہو۔ ساکت و جامد ہو کر اپنے پیار کو پالینے پر تشکر آمیز ہڈیاں ہا ہو۔

وہ چونک کر اٹھا اور صدیقہ کے چہرے پر نظریں گاڑ دیں۔ اس کے لبوں پر کلیوں کی سیا مسکان، چہرے پر سمندر کی گہرائیوں کا سا سکون اور آنکھوں میں اپنے پچھڑے ہوئے دیوتا کی پرستش کی طلب میں حسرت زدگی دیکھ کر اس نے اس کی نبض مٹولنے کی کوشش کی۔ آنکھیں خدا حافظ کہہ رہی تھیں مگر وہ جا چکی تھی۔ سچ بچ اس سے یہ خوش برداشت کرنا اور ہضم کر لینا ناممکن ہو گیا تھا۔ حالانکہ وہ مرنا نہیں چاہتی تھی، مگر موت کے سامنے ہار گئی تھی۔ پل بھر میں ہی اپنے یار سے مل کر پچھڑ گئی۔ ایسا لگا جیسے اس نے اپنی زندگی کے اُن گنت حسرت و یاس میں ڈوبے ہوئے ماہ و سال فقط اتنی سی ملاقات کے لئے گزارے ہوں۔ اس کے سرسری عہد پر بھروسہ کر کے ملنے کی امید پر سانس کی ڈوری بندھی رہی ہو۔ نشیب و فراز اور بیماریوں کے مد و جزر میں بھی مرنے کا تصور نہ

۱۱۔ اور آج رخصت ہونے کی خبر ہی نہ ہونے دی۔ جس کے لئے زندگانی کاٹ دی۔ ۱۰۰ سالے منہ موجود تھا۔ مگر بے بسی سے وہ روتا بلکتا ہوا چھوڑ کر منوں مٹی کے نیچے پڑا۔ لے لئے چھپ کر آصف کو حسرت و یاس کا مجسمہ بنا گئی۔



صدیقہ کی زندگی لاتعداد حسرتوں اور پچھتاؤں کی آماجگاہ تھی۔ کم سنی میں والدین کی یاد دہانی کرنے پر وہ اپنی نظروں سے اس حد تک گر چکی تھی کہ اس نے دنیا کو تیاگ لیا تھا۔ جب کسی آزمائش میں گرفتار ہوتی تو اس کی اذیتوں اور تکلیفوں سے دوچار ہو کر مطمئن ہوا کرتی تھی۔ شوہر کی جدائی کے کرب میں وہ انتظارِ بہیم کے جان لیوا لحوں میں تھنوں اپنے باپ سے مخاطب ہو کر اپنے گناہ کبیرہ کی معافی تلافی کرنے کی کوشش کیا کرتی تھی۔ آج اس کی خواہش رنگ لے آئی۔ اس نے آصف زیدی کو اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ اس کی سانسوں اور اس کے جسم کی مخصوص خوشبو کو محسوس کیا تھا۔ بس سارا ناک یہاں تک ہی تھا۔ انہی لحوں کا انتظار تھا۔ اپنے من کی تمام حسرتیں اور پچھتاوے شوہر کے دامن میں ڈال کر وہ پل بھر میں یہ جاوہ جا ہو گئی۔ جس پر تجربہ کار ڈاکٹر ہونے کے باطن آصف زیدی بھی بے اختیار اور بے بس ہو گیا تھا۔ اس نے اپنے ہاتھوں سے اسے لحد میں اتارا اور اس کے کان میں سرگوشی کی۔

”میرا دل بھی اسی طرح صدقِ دل سے انتظار کر کے دعائیں مانگتی رہتا۔ میں جلد ہی تمہارے پاس ہمیشہ کے لئے آ جاؤں گا۔ اور اللہ تعالیٰ سے سفارش کرنا کہ کہیں ہمیں جدا کر کے جنت اور جہنم کا باسی نہ بنا دے۔ ہم نے جدائی کا کوڑا اس دنیا میں پورا کر لیا ہے۔ تم تو جنتی روح ہو، اس جہنمی کی سفارش کر دینا..... صدیقہ! تم نے والدین کی نافرمانی کی جو غلطی کی تھی، اس کا خمیازہ یہاں ہی بھگت کر اپنے رب کے سامنے سرخرو ہو کر جا رہی ہو۔ میں تو کالے منہ اور عداوت سے اس کا سامنا کیسے کروں گا؟“

سب کے ہجوم میں گاڑی تک آیا تو صدیقہ کو سینے سے چٹا کر پھٹ پڑا۔ سب حیران رہ پڑے۔ یہ اتنا اتنے مضبوط قلعے کو زمین بوس ہوتا دیکھتے ہی رہ گئے۔ چند لوگ جو ان کے ازدواجی حالات سے بے خبر تھے، تمسخرانہ انداز میں بولے۔

”بیوی پر جو نبی دھرتی کا بوجھ پڑتا ہے، شوہر ہلکا پھلکا ہو جاتا ہے۔ آج رات ہی دوسری کے خواب دیکھنے لگے گا۔ نئی نویلی دوشیزہ اور ماڈرن الہڑ میار۔“

ایک نے کہا۔ ”کہنی کی چوٹ ہے بیوی کی موت۔ گھر پہنچتے ہی مزاج درست اور نئے سنے اُٹ آئیں گے۔“

یہ گفتگو پڑھے لکھے پاکستانی اور انڈین ڈاکٹروں کی تھی۔ جاہل اور گنوار مردوں سے کیا گلہ۔

باپ بیٹی گھر پہنچے تو حدیقہ لاؤنج میں ہی صوفے پر گر گئی۔ آصف اس کے قریب ہی کارپٹ پر سر نیچے کئے بیٹھا رہا۔ آج اس کی نظروں کے سامنے ماضی میں صدیقہ کے ساتھ گزرے ہوئے چھ مہینے فلم کی طرح گھوم گئے۔ اس دورانیے میں ان کی ایک دفعہ بھی معمولی سی جھڑپ یا بحث مباحثہ نہ ہوا تھا۔ آصف کے منہ سے نکلی ہوئی ہر بات اہمیت کی حامل ہوا کرتی تھی۔ پھر گھر میں چیقلش یا بے سکونی کیوں ہوتی؟

حدیقہ نے ماما کے پرس سے نکاح نامہ نکالا اور آصف کو دکھاتے ہوئے بولی۔
”میری ماں زندگی بھر یہ نکاح نامہ دنیا کو دکھا کر مجھے جائز اولاد ہونے کا ثبوت دیتی رہی۔ اسی خوف میں یہ آج بھی ان کے پرس میں محفوظ ہے۔ کس گناہ کی پاداش میں انہیں یہ سزا سنائی تھی آپ نے؟“

یہ سن کر وہ بری طرح تڑپ اٹھا تھا۔ مگر کسی بات کا جواب نہ تھا۔ مجرم اور قاتل کی طرح ندامت اور خوف سے سر جھکا ہوا تھا۔

اس نے حدیقہ کو دیکھا جو خاموش تھی مگر آنکھیں قوت گویائی کے روپ میں ملوث تھیں۔ وہ ماں کی طرح کتنی خوب صورت تھی۔ اس نے اپنا بچپن جن محرومیوں اور خواہشوں کی توڑ پھوڑ میں گزارا تھا، وہ کیفیت اس کے چہرے پر ثبت تھی۔ جوانی میں وہ کس دھوکے اور فریب کا شکار ہوئی تھی، باپ کو اس کی قطعاً خبر نہ تھی۔
”حدیقہ بیٹا! ہمت تو کرنا پڑے گی۔“ وہ ملائمت سے بولا۔

”تو کیا مجھے اپنی ماں کی یاد میں دو آنسو بھی بہانے سے پہلے آپ سے اجازت لینا ہوگی؟ تو میں چلتی ہوں۔ مجھے آپ کے ساتھ رہنے کا شوق ہے، نہ ہی میں آپ کی شکل دیکھنے کی خواہش مند ہوں۔ آپ میری ماں کی خوشیوں کے قاتل ہیں ڈاکٹر آصف زیدی صاحب!“ وہ تلخی اور درشتی سے بولی۔

”تم جو بھی کہو، سننے کو تیار ہوں۔ جو چاہے کہو، لعن طعن کرو، گالی گلوچ سے مجھے بے عزت کرو میرے بچے! مجھے سب منظور ہے۔ کیونکہ میں صدیقہ کا اور تمہارا مجرم ہوں۔ مجھے ایسی سزا دو کہ دنیا میرے عبرت ناک انجام کی مثالیں دے۔ ممکن ہے کہ

اس طریقے سے کتنی ہی معصوم لڑکیوں کی زندگی عذاب بننے سے بچ جائے۔“ وہ تڑپ اٹھا۔

وہ اور کیا کہتی؟ اسے کون سی سزا سنائی جبکہ وہ خود کو عدالت میں اقبالِ جرم کے ساتھ پیش کر چکا تھا۔ اور یہ عدالت تو بیٹی کی تھی۔ باپ کو خاموشی سے دیکھتی رہی۔

”میں معافی کی عرضداشت لے کر کبھی بھی تمہارے پاس نہیں آؤں گا۔ مجھے سزا سنا دو۔“ وہ پھر گویا ہوا۔

”اگر میری ماں نے آپ کو معاف کر دیا ہے تو میں کون ہوتی ہوں سزا سنانے والی؟ ماں کے لبوں کی مسکان اور چہرے کی طمانیت اور سکون سے مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ انہوں نے آپ کو معاف کر دیا ہے۔ وہ آپ کو پا کر خوشی سے ہی چل بسیں۔ کیسی بیوی تھیں وہ اور کیسا ان کا شوہر تھا۔“ حدیقہ نے روتے ہوئے باپ کو آہستگی مگر ذرا طنزیہ لہجے میں کہا۔

”شوہر تو رسوائیوں کے سوا کچھ نہ دے سکا۔“ وہ بھڑائی ہوئی آواز میں بولا۔

”حالانکہ بہت پیار تھا اُس سے۔ چند مہینوں بعد ہی میں نے خمینہ سسٹر سے اس کا اتہ پتہ پوچھا تھا مگر وہ جھوٹ بول گئی۔ اس کی کیا دشمنی تھی تمہاری ماں سے؟ اس کی باتوں کا میں نے ہر بار ایسا اثر لیا کہ گھرتباہ کر کے چھوڑا۔ پاکستانی فرینڈز نے پہلے شادی پر اکسایا، پھر اس سے جان چھڑانے کے ہتھکنڈے سکھانے لگے۔ ایسا کیوں ہوا؟“

”جیسی تھی۔ ماما کے اسٹینس بدل جانے کا دکھ اور بغض تھا سب کو۔ لیکن آپ نہ

سمجھے۔ اپنی عمر کے اتنے سال نہ جانے آپ نے کہاں گزارے تھے کہ آپ سمجھ ہی نہ پائے کہ غریب گھر کی بیٹی کو نیکم صاحبہ کا رتبہ راس نہیں آتا۔ لوگ اسے ڈائجسٹ نہیں کر پاتے۔ مجھے ماما کے بارے میں اور بھی انفارمیشن چاہئے۔ ورنہ میں بے سکون رہوں گی۔ ان کی بے گناہیوں سے پردہ آپ اٹھائیں اور ان کا مقام میری نظروں میں اور بلند و بالا کر دیں۔ جبکہ وہ ہستی میرا اوڑھنا اور بچھونا تھی۔ متاعِ حیات اور کائناتِ کل تھی۔ میری زندگی کے تمام رنگ اور رونقیں اس کے دم سے تھیں۔ آج ان کی ناگہانی موت نے مجھے بالکل لاوارث اور تنہا کر دیا ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے جیسے ایک تنہا درخت کی ٹھنڈی، میٹھی اور گھنی چھاؤں میرے سر سے اٹھ گئی ہے اور میں برہنہ تپتے ریگستانوں میں بھٹکتی ہوئی اس سائے کو ڈھونڈ رہی ہوں۔“

اس کی باتوں میں اذیت کا پیمانہ اتنا وسیع و عریض اور گہرا تھا کہ آصف کی آنکھوں

سے آنسو بہہ نکلے۔

”ڈاکٹر صاحب! یوں لگتا ہے، جیسے انہیں نہ پا کر میرا دم ٹھٹھ جائے گا۔ کاش! آپ میری ماں کی زندگی میں نہ آتے۔ ابھی تو ماں نے خوش رہنا شروع ہی کیا تھا.....“ اُس کی آواز رک گئی۔ آصف نے جلدی سے اسے پانی پلانا شروع کر دیا۔

”ڈاکٹر صاحب! انسان بھی کتنی ڈھیٹ چیز ہے۔ اپنے پیارے رشتوں کو کفن پہنا کر سپردِ خاک کر کے بھی زندہ رہتا ہے۔ غم سے ٹڈھال اور لاغر ہوتا ہے تو دوسرے اس کے منہ میں پانی پٹکا کر اسے پھر سے دکھوں اور غموں سے مقابلہ کرنے کے لئے تیار کرنے لگ جاتے ہیں۔ آپ کا یہ ردِ عمل میرے لئے مزید باعثِ اذیت ہے۔ مجھے مر جانے دیجئے۔ مجھے اسی مانوسیت سے بھرپور آغوش کا گھر وندا، وہی پھیلی ہوئی بانہوں کے حصار میں احساسِ تحفظ اور مامتا کی بے لوث محبت و چاہت میں مسرت اور طمانیت چاہئے۔ مجھے ماں کے پاس جانے سے مت روکنے۔ ہم دونوں ایک دوسرے کے لئے لازم و ملزوم ہیں ڈاکٹر صاحب!“ لہجے کی المناکی نے چار سو سوگواری بکھیر دی تھی۔

”ماں عمو! کہا کرتی تھی۔ بیٹا! جس گھر ڈول جائے، وہاں سے جنازے میں نکلنا عورت کی عزت و تحریم ہے۔ یہی اس کا نسوانی وقار اور آن بان ہے۔ آپ ماما کو بیاہ کر لائے تھے، آج آپ کے کندھوں پر وہ قبر میں اتر گئیں۔ وہ کتنی خوش ہوں گی۔ جس کا تمام عمر انتظار کیا، اُسے پالیا ہمیشہ کے لئے۔“ وہ بولے جا رہی تھی۔

میڈ دونوں کے لئے چائے لے آئی تو آصف نے پیالی اس کی طرف بڑھادی۔ وہ بے چارگی سے بولی۔

”مجھے کچھ نہیں کھانا۔ اب میرا کھانا ماں کے ساتھ ہی ہو گا ڈاکٹر صاحب! مجھے ایسی ہمدردی اور توجہ نہیں چاہئے جو مجھے ماما سے دور کر دے۔ آئی ہیو ٹو گو۔“

آصف اس کی بہکی ہوئی باتیں سن کر چونک اٹھا۔ اسے انکشن دے کر سہارا دے کر اٹھایا اور اپنے کمرے میں لے گیا۔ بیڈ پر لٹا کر اس کے سر ہانے بیٹھ کر اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرنے لگا کہ یکدم اسے وہ رات یاد آگئی، جب ہارون نے اگیزگی سے اسی طریقے سے دکھ درد کی کیفیت سے نکالنے کی کوشش میں اس کی عصمت دری کر دی تھی۔ وہ سرعت سے اٹھی اور باہر نکل گئی۔ آصف بھی اس کے پیچھے باہر لپکا۔ اسے اندر لا کر فکر مندی سے بولا۔

”حذیقہ! مائی سویت ہارٹ! ہوش میں آؤ۔ آرام کرو میرے بچے! طبیعت سنبھل جائے گی۔“ لہجے میں پدرانہ شفقت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔
 ”ڈونٹ بچ گی۔“ وہ تقریباً چیختے ہوئے بولی اور صوفے پر ڈھیر ہو گئی۔

آصف اور میڈ نے اسے مل کر اٹھایا اور بستر پر لٹا دیا۔ آصف نے رات آنکھوں میں ہی کاٹ دی۔ وہ کئی راتوں سے ٹھیک طرح سے سونہ پایا تھا۔ مگر آج بھی نیند نہیں آ رہی تھی۔

صبح ہوئی تو حذیقہ کی آنکھ کھل گئی۔ گرد و پیش کا جائزہ لے کر اس نے اپنا جائزہ لیا۔ وہ کہاں ہے اور کس حال میں ہے۔ آصف فجر کی نماز پڑھ رہا تھا۔ اسے پرتسکین پا کر لمبا سانس لیا اور کروٹ بدل کر لیٹ گئی۔ اس کی سماعتوں میں آصف کی آواز گونجی تو اس نے ہلکی سی جنبش سے بیداری کا اظہار کیا۔

”میرا بیٹا جاگ گیا ہے..... ہاؤ ٹائس۔“ وہ اس کے قریب بیٹھ گیا۔ ”اٹھو میری جان! منہ ہاتھ دھو لو۔ میں اپنے بچے کے لئے چائے لاتا ہوں۔“ لہجے کی شیرینی پر اسے ماں یاد آ گئی۔ اور آنسو نرم و ملائم تکیے میں جذبے ہونے لگے۔

آصف کچن میں جا چکا تھا۔ اس نے دو مگڑ میں چائے دم دی۔ ساتھ دو ڈونٹس رکھے اور کمرے میں آ گیا۔ وہ ابھی تک لیٹی ہوئی تھی۔ وہ اس کے قریب بیٹھتے ہوئے بولا۔ ”مائی لفل بے بی! گٹ اپ۔ چائے کی طلب ہو رہی ہے۔ باپ بیٹی مل کر نوش کرتے ہیں۔ آج اس چائے کا مزہ ہی مختلف ہو گا۔ اٹھو نا۔“ اُس نے اُس کی پیشانی پر محبت بھرا بوسہ دیا تو وہ چونک کر بیٹھ گئی۔

”ڈونٹ ڈونٹ اگیٹ لائک دس۔ آئی ڈونٹ وائٹ ٹو۔ جسٹ ری میمبر۔“
 ”میں تمہارا پاپا ہوں جان! اور تم میرے وجود کا حصہ۔“ اس نے پھر اس کی پیشانی پر بوسہ دیتے ہوئے کہا۔ ”ایکسپٹ کرنا مشکل ہے تمہارے لئے، آئی نو۔ بٹ یوسی، آئی ایم یور فادر۔ بی ریلیکس۔“

اُس نے اثبات میں سر ہلایا اور ہاتھ روم میں چلی گئی۔ جب باہر نکلی تو آصف کو انتظار میں پا کر آہستگی مگر لائقیت سے بولی۔

”آپ چائے پیجئے۔ میرا انتظار کیوں؟“

”دونوں مل کر پیئیں گے تو مزہ آئے گا۔“ وہ سوچتے ہوئے بولا۔

صدیقہ کو چائے بہت پسند تھی۔ لیکن چائے اکیلے پینا قطعاً پسند نہ تھا۔ ہمیشہ

آصف کے انتظار میں رہتی۔ جونہی وہ گھر میں قدم رکھتا تھا، چائے دم پر ہوتی اور دونوں اسے انجوائے کیا کرتے تھے۔ وہ پھر ماضی میں کھو گیا۔

”چائے۔“ حدیقہ نے اُس کی طرف مگ بڑھایا تو اُس نے چونک کر مگ پکڑ لیا۔ ”آپ مجھے اپنے ماضی کے طویل سفر کے بارے میں جب تک سچائی سے نہیں بتائیں گے، میں آپ کو باپ کیسے تصور کر سکتی ہوں؟ آپ مجھے انجان، نا آشنا اور نامحرم معلوم ہوتے ہیں، جس کے ساتھ رہنا مجھے معیوب ہی نہیں بلکہ اذیت ناک بھی لگتا ہے۔“ وہ چائے کا گھونٹ مہرتے ہوئے بولی۔ ”میں آپ کو قطعاً نہیں جانتی۔“

”اگر تم میری زندگی کی حادثوں کو سن کر مجھے باپ کے روپ میں قبول کرنا چاہتی ہو تو بیٹا! میں تمہیں ایک پرانی داستان جس کا انجام نہایت عبرت ناک اور روح فرسا ہے، سنائے دیتا ہوں۔ تمہیں میری کہانی سن کر میری سچائی پر رتی بھر شک و شبہ نہ ہو گا۔ کیونکہ من گھڑت اور جھوٹی کہانیوں میں اتنی پائیداری اور طاقت نہیں ہوتی کہ گرفت میں رہ سکیں۔ ڈھیلی پڑ کر جھوٹ کو نمایاں کر دیتی ہیں۔“

”جی۔“ اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

”بیٹا! ہماری شادی کو چھ مہینے ایسے بیت گئے، جیسے آنکھ کا جھپکنا۔ ہر دن ہنی مون کا گمان ہوتا تھا۔ میرے والدین کو اس شادی کی خبر تھی، نہ ہی کسی طرف سے انہیں اطلاع ملی تھی۔ وہ اسی میں خوش تھے کہ بیٹا ایک کامیاب ڈاکٹر بن کر واپس آئے گا تو وہاں دھوم دھام سے کسی ہندوستانی لڑکی سے شادی کر دی جائے گی۔“ وہ تفصیل بتاتے ہوئے مسلسل آنسو صاف کر رہا تھا۔ حدیقہ انہماک سے سن رہی تھی۔

آصف جسے مجبوری کا نام دے رہا تھا، اس میں خود غرضی کی جھلک نمایاں تھی۔ قبل و قال کے بغیر ہی وہ اس گفتگو کے تمام پہلوؤں کے بارے میں سوچنے لگی۔ باپ نے نہایت سچائی کا مظاہرہ تو کیا تھا مگر کیا کوئی مرد اتنا بے بس بھی ہو سکتا ہے؟ کاش مائیں اپنی طاقت کا غیر مناسب استعمال نہ کریں تو اس دنیا کے بے شمار مسائل خود بخود ہی حل ہو جائیں۔ وہ متذبذب سی ہو کر سوچ رہی تھی۔ آصف بھی اٹھ کر اس کے پاس آکر بیٹھ گیا تھا۔

”اب تو آپ مجھے پاپا کہنے میں ہچکچاہٹ محسوس نہیں کریں گی؟“

”آپ کی ایک غلطی نے آپ سے وابستہ ہر رشتے کو تہ و تیغ کر دیا۔ آپ نے ایسا کیوں کیا؟ اگر غلطی سرزد ہو ہی گئی تھی تو پھر اپنے فیصلے پر ثابت قدم رہتے۔ اللہ

تعالیٰ نے مرد ذات کو مجبور اور بے بس پیدا نہیں کیا۔ آپ کیسے مجبور ہو گئے؟“ وہ پشیمردگی سے بہت آہستگی سے بول رہی تھی۔

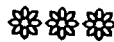
”بیٹے! میں تمہاری باتوں سے متفق ہوں۔ میری ایک بات غور سے سننا۔ بڑے بڑے سوراہا اپنی ماں کے سامنے کمزور اور مجبور پڑ جاتے ہیں۔ میں تو ایک ناچیز اور حقیر سی ہستی ہوں۔ ماں کو کورٹ میرج کا بتا کر دکھی کرنا میرے بس میں نہیں تھا۔“

حدیقہ کے ذہن میں ماں کی ناراضگی پر برپا ہونے والی قیامت کا ایک ایک لمحہ گھم گیا۔ اگر اس رات ہارون تسلی و تشفی نہ دیتا تو یہ اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھتی۔

”تو پھر آپ ماں کی آمادگی حاصل کر کے ماما سے شادی کرنے کا فیصلہ کرتے۔“ وہ دکھ سے بولی۔

”وہ پاکستان کے خلاف تھیں۔ میں اپنی خواہش کا اظہار کر کے انہیں دکھی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ انہیں مجھ سے بے پناہ محبت تھی اور مجھے حدیقہ سے بے پناہ محبت تھی اور حدیقہ کو مجھ سے عشق تھا۔ ہم ایک دوسرے کے بغیر جینے کا تصور بھی نہ کر سکتے تھے۔ اس لئے کورٹ میرج کر لی۔ جب تمہاری ثانی اسی دکھ میں چلی گئیں تو اپنی ماں کے تصور میں میرے ذہن نے ایسا پلٹا کھایا کہ میں اندھا اور بہرہ ہو گیا۔ تمہارا کیا خیال ہے کہ میں نے اس کے بغیر پُرسرت زندگی گزاری ہے؟ کھٹی فیملنگ کو درد ایسا عجیب ہے کہ جیتے جی دل و دماغ کو مردہ کر دیتا ہے۔ انسان ایک چلتی پھرتی لاش بن کر رہ جاتا ہے۔ میں نے موت اور زندگی کی یکجائی اپنی ذات میں محسوس کی ہے۔ دن میں کئی بار عزرائیل کو خود پر حاوی ہوتے اور میری روح کو وہ کن کن طریقوں سے قبض کرنے کی کوشش میں دیکھا تھا۔ اور کتنی ہی بار میں اپنے ناتواں وجود کو سڑتا گھٹتا محسوس کرتا تھا۔ یہ ہیں میری زندگی کی راتیں، دن، جسیں اور شامیں۔“

باپ کا شرمندگی میں جھکا ہوا سر اور آنکھوں میں جل تھل حدیقہ کو مزید آزر دہ کر گیا۔ آخر وہ اسی کا خون تھی خونِ حدت میں جوش کیسے نہ مارتا۔ مگر خود پر مکمل کنٹرول تھا۔



جب سے حدیقہ چھین و سکون کی سفید چادر اوڑھ کر ان دنیا کی کلفتوں اور آزمائشوں سے آزاد ہوئی تھی۔ آصف کی بے قراری، افسوس و حسرت میں اضافہ ہی ہوا تھا جو مختلف بیماریوں کی صورت میں ابھر کر سامنے آنے لگی تھیں۔ اگر حدیقہ باپ

کو معاف کر کے اس کے گھر میں آ جاتی تو معاملہ بالکل مختلف تھا۔ اس نوید کے انتظار میں اس کے شب و روز گزر رہے تھے۔

حدیقہ کی بھی باپ سے نہ چاہتے ہوئے بھی جذباتی وابستگی کا ہونا قدرتی امر تھا۔ لیکن باپ کی ملکیت میں آنے سے گریز کر رہی تھی۔ اور آخر وہ واپس مونٹریال جا کر اپنے آفس کی اوپننگ سیریمنی میں مصروف ہو گئی۔

دل تھا کہ دُکھوں اور غموں سے لبریز، ذہن تھا کہ کئی بار اُلجھ اُلجھ جاتا۔ عام سی بات سر سے گزر جاتی۔ مگر ہمت اور کچھ کر جانے کے جذبے سے بہرہ اندوز تھی۔ ایک ہی ٹول تھا جو اسے قدم اٹھانے اور آگے بڑھنے پر مجبور کرتا تھا۔ ہارون کا کئی بار فون آیا تھا، جسے اس نے کبھی اینڈ کرنے کی تکلیف ہی گوارا نہ کی تھی۔ خرم ایک بے حوصلہ انسان ہونے کے ساتھ اتنا رنجیدہ ہو چکا تھا کہ تمام دن شیریں کے گھر میں بھوکے پیاسے ٹی وی دیکھتے گزار دیتا تھا۔ ہارون کو اس کی اس حالت پر رحم بھی آیا اور بے پناہ غصہ بھی در آیا تھا۔

ہارون صبح آفس جانے کے لئے تیار ہو رہا تھا۔ گھر کا اندرونی نمبر پچر نہایت کمفرٹبل تھا۔ جبکہ باہر گاڑی تک جانے کے لئے اچھی خاصی تیاری کرنی پڑتی تھی۔ وارم ہیوی کوٹ، گلوز اور کانوں کو کور کرتی ہوئی اونی کیپ پہن کر کھڑا تھا کہ شیریں نے گرما گرم کافی کا مگ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

”ہارون! خرم کی فکر کھائے جا رہی ہے۔ مجھے اس کے بیمار ہونے کا خدشہ چھین نہیں لینے دیتا۔ کیوں نہ اس ویک اینڈ پر حدیقہ سے ملنے چلیں۔“

”فی الحال خاموشی پر اکتفا کرنا بہتر ہے۔ غیرت اور ضد کی کبھی نیشن سے بنی ہوئی حدیقہ کو میں آپ سب لوگوں سے زیادہ بہتر جانتا ہوں۔ دوسرے کے دکھوں، غموں اور خوشیوں کے پھانے کا اندازہ لگانے کے لئے اس کی ذات کے کھنڈرات میں کودنا پڑتا ہے۔ مجھے علم ہے کہ وہ اس وقت بہت مشکل میں ہے۔“ لہجے میں فکر مند تھی۔

”مشکلات میں ہی تو اپنوں کی قربت کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ مجھے امید ہے وہ ہمیں ضرور معاف کر دے گی۔“ وہ ابتر ہو کر سنبھل کر بولی۔

”تمہاری خوش فہمی ہے یہ۔“ وہ مسکرا کر بولا اور گاڑی کی چابی اٹھا کر باہر نکل گیا۔ شیریں، بچوں کو تیار کر کے ناشتہ کرانے لگی۔

خرم انگڑائی لے کر بستر سے اٹھا اور فیملی روم میں آ کر بیٹھ گیا اور سگار نکال کر پیشانی پر بکھرے ہوئے بالوں کو انگلیوں سے ٹھیک کرنے لگا۔ سگار کے کش لیتے ہوئے وہ کچن کی جانب مڑا اور اپنے لئے ناشتہ بناتے ہوئے سوچنے لگا کہ حدیقہ نے کبھی اٹھ کر پانی تک تو پینے نہ دیا تھا۔ جب سے گئی ہے، میری تو دنیا ہی بدل گئی ہے۔ ایک بار مجھے صدق دل سے معاف کر کے دیکھو۔ تمہیں جو مجھ پر بے شمار گلے و شکوے ہیں، تمام کا کفارہ ادا کر دوں گا۔ ایک بار میرے جیون کی رونق تو بن کر آماؤ۔“

اسی سے شیریں بچوں کو سکول چھوڑ کر واپس آ گئی۔ اس نے بھائی کو ناشتہ بناتے ہوئے دیکھا تو نظر انداز کرتی ہوئی کچن میں چلی گئی۔

”آلیٹ کھاؤ چاہے فرائی اٹھا۔ بریڈ لو یا پراٹھا۔ میں کون ہوتی ہوں تمہاری پسند

میں انٹرفیر کرنے والی۔ اپنی اپنی لائف اور اپنی اپنی چوائس ہے۔“ وہ بڑبڑاتی ہوئی پرس ڈرینک ٹیبل پر رکھ کر بیڈ پر لیٹ گئی اور تھوڑی ہی دیر میں گہری نیند میں چلی گئی۔



اسٹوڈیو اپارٹمنٹ کی ٹیل پر حدیقہ چونک گئی۔ وہ لیپ ٹاپ پر اپنی اور ماں کی تصویریں دیکھنے میں اتنی محو تھی کہ ٹیل کی آواز پر تقریباً اچھل پڑی تھی۔ کیونکہ اس کے دروازے پر نہ کبھی کسی نے آنے کی ضرورت محسوس کی تھی، نہ ہی ٹیل کا استعمال ہوا تھا۔ وہ سنبھلتی ہوئی دروازے تک گئی اور سوچنے لگی کہ کون ہو سکتا ہے۔ ساتھ ہی اس نے دروازہ کھولا اور ٹھٹک گئی۔

ڈاکٹر آصف زیدی ہینڈ کیری کے ساتھ اس کے سامنے کھڑے تھے۔ اس کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا اور جسم کا ہر عضو دل کی دھڑکن بن کر بول اٹھا۔ ”اندر آنے کو نہیں کہو گی؟“ وہ افسردگی سے بولا تو اس نے باپ کو گہری نظروں سے دیکھا۔ وہ کس قدر کمزور اور لاغر لگ رہے تھے اور کتنے ہی بے ضرر۔

”کیوں نہیں کہوں گی؟“ وہ سنجیدہ تھی۔ ”گھر آئے مہمان کے لئے دروازہ نہیں کھولوں گی تو گھر کی تمام برکتیں مجھ سے روٹھ جائیں گی۔ آپ اندر تشریف لائیں۔“ وہ صوفے پر بیٹھ گیا اور لیپ ٹاپ کو بے چینی سے پکڑ کر فونو گرافس دیکھنے لگا۔

حدیقہ کچن میں چائے بنانے چلی گئی۔ اس کا دل چاہ رہا تھا، جن راستوں سے باپ ہوتا ہوا آیا تھا، وہاں پھولوں کی چادر بچھا دے اور اس پر پھول نچھاور کرے۔ جس

رشتے کی تڑپ اور کسک نے اسے چڑچڑاپن بخشا تھا، آج وہ اس کے گھر میں قدموں سے چل کر آیا ہے۔ وہ چائے اور ساتھ بلیک فارسٹ ایک سامنے رکھ کر خاموشی سے بیٹھ گئی۔

”اپنے بیٹے سے ایک بار پھر التجا کرنے آیا ہوں۔ مجھے معاف کر کے سکون دے دو۔ صدیقہ تب ہی مجھے درگزر کرے گی۔“ وہ ہاتھ جوڑ کر بولا۔

”پاپا! مجھے گناہ گار مت کیجئے۔ ورنہ میری ماں جو آپ کی پرستار تھی، مجھ سے خفا ہو جائے گی۔ مجھے معاف نہیں کرے گی۔ لیکن میں آپ کے پاس رہنا نہیں چاہتی۔“

”اس مقدس ہستی اور بے لوث محبت کرنے والی ماما کے صدقے مجھے معاف کر دو اور مجھے اکیلا مت چھوڑو۔ تم صدیقہ کی بیٹی ہو۔ بے حس اور خود غرض نہیں ہو سکتی۔ میں مانتا ہوں کہ میں نے تمہارا بچپن محرومی کی اتھاہ گہرائیوں میں دھکیل دیا۔ لڑکپن حسرت و یاس کی آگ میں جھونک کر تمہاری جوانی کا تماشا بنا دیا ہے۔ یہ ناقابلِ تلافی جرم ہے۔ پھر بھی میری عرض پر غور کرو۔ اپنے ساتھ زندگی گزارنے کا شرف بخش دو۔ میری زندگی کی آخری تمنا پوری کر سکتی ہو۔ کیونکہ تمام اختیارات کی تم مالک ہو۔ میری بچی! میں نے زندگی میں جو بھی پایا، گنوانے کے لئے حاصل کیا تھا۔ اب میں اپنی تقدیر میں لکھی ہوئی اس ٹریجڈی کو بدل دینا چاہتا ہوں۔ تمہیں پا کر کھونا نہیں چاہتا۔ اگر ایسا ہو گیا تو میں بہت جلد یہ دکھ سینے میں چھپائے تمہاری ماں کے پاس چلا جاؤں گا۔“

وہ اس کے سامنے گڑگڑا رہا تھا۔ اموشل بلیک میلنگ قدرے کامیاب ثابت ہوئی۔

صدیقہ نے باپ کے منہ پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ ”اللہ نہ کرے۔ ایسا مت کہئے۔“

آصف نے آگے بڑھ کر اسے سینے سے لگا لیا اور صدیقہ باپ کی بے پناہ شفقت میں ڈوبی ہوئی خوشبو میں سرشار ہو اٹھی۔ تحفظ اور مضبوطی کے احساس کا مزہ ہی کچھ اور تھا۔ اسے یوں لگا جیسے اب وہ ایک ایسے سائبان کے نیچے آ کر رک گئی ہے جہاں گرم اور بخ بستہ ہواؤں کا گزر تک نہیں۔



”بیٹے! تم اپنا آفس، اپنا بزنس یہاں سے اسٹارٹ کرتی تو بہتر تھا۔ ٹورنٹو بڑا شہر ہے۔ اپرچونٹیر کے لحاظ سے بھی بہترین مانا جاتا ہے۔ دوسرا میں بھی تمہاری مدد کر سکوں گا۔ تیسرا باپ بیٹی مل جل کر رہیں گے۔ اب تو میرا دل چاہتا ہے تمہارے بغیر

ایک لڑکے کے اراں شاید اتنی طویل بدالی کا لرب لم ہو جائے۔ وہ کھانا کھاتے ہوئے بولا۔

”آپ درست فرما رہے ہیں۔ لیکن پاپا! مجھے وہ شہر جہاں نفساںی کا عالم ہے، ہاکم و وز میں ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کی کوشش اور بے تحاشا شور شرابے کی سہولت پسند نہیں۔“ وہ سوچتے ہوئے بولی۔ ”پھر بھی، سوچا جا سکتا ہے۔“

”نوب سوچ کر فیصلہ کرو۔ ایک بات پوچھنا چاہتا ہوں۔ بیٹے! میں تمہاری ذاتی زندگی کے بارے میں کچھ بھی معلوم کرنے کا حق تو نہیں رکھتا، مگر ایسے فرینڈ کچھ جاننا چاہوں گا۔ شاید کچھ مدد ہی کر سکوں۔“ وہ ہچکچاہٹ سے بولا۔ ”مانڈ نہیں کرنا۔ میری اولاد ہونا، اس لئے ہر وقت فکر مند رہتا ہوں۔“

”یہ فطری امر ہے پاپا! آپ نہ تو اپنے پدرانہ جذبات مجھ سے چھپا سکتے ہیں، نہ ہی مجھ سے بالکل بے تعلقی برت سکتے ہیں۔ میں آپ کو اپنی زندگی کی کہانی اس لئے نہیں بتانا چاہتی کہ آپ اس رشتے کے ناطے دکھی اور بے بس ہو جائیں گے۔ جیسے بیٹیوں کے باپ ہوا کرتے ہیں۔“ وہ مودبانہ انداز میں بولی۔ ”اور کوئی خاص وجہ نہیں چھپانے کی۔ اگر آپ جاننا چاہے ہیں تو میری ناکامیوں اور محرومیوں سے بھری ہوئی سرگزشت سن کر برداشت نہیں کر سکیں گے۔ جیسے ماں کو آپ کی جدائی اور میری قسمت کا لکھا ہوا تاریک باب دن بہ دن بیمار کرتا گیا، میں نہیں چاہتی کہ میری تقدیر کا کھیل ہوا تاکہ آپ کو بھی ذہنی مریض بنا دے۔ میرے ساتھ جو بھی ہوا، میں نے نوشتہ تقدیر کے فیصلے پر صبر و شکر کر لیا۔ کیوں پاپا! ہر وقت کا رونا دھونا اور آہ و بکا اور جگہ جگہ اپنی داستان سنا کر لوگوں کو خود پر ہنسانے کا کیا فائدہ؟ پاپا! کسی کی کیا مجال کہ کسی کی تقدیر بدلنے کی جرأت کر سکے۔ جیسے ہم ماں کے پیٹ میں جینڈر نہیں بدل سکتے، موت اٹل حقیقت ہے، اسے ٹھکرانے کی سکت نہیں رکھتے۔ اس لئے آپ میری ازدواجی زندگی کو جاننے سے نا بلند ہی رہیں تو بہتر ہے۔ آپ کے اختیارات میں کچھ بھی نہیں۔“

”تم نے میری ستم گیریوں کی داستان تو سن ہی لی ہے۔ ماں کی بیٹی ہوئی زندگی کے بارے میں بتا سکتی ہو۔“ وہ خجالت سے بولا۔

”وہ بھی سن کر کیا کریں گے؟ بس انہوں نے اس دنیا سے جاتے جاتے آپ کو دیکھ لیا، یہی ان کی خوشیوں بھری داستان ہے۔ باقی جو بیت گیا اگر بتا دیا تو برداشت نہیں ہو گا۔ نہ آپ سے اور نہ ہی مجھ سے۔ چنگاریوں کو کریدنے سے اور ہوا دینے

سے آگ بھڑک اٹھتی ہے۔ بند زخموں کو کریدنے سے خون بہہ نکلتا ہے۔“
 ”جس آگ میں وہ ہر لمحہ راکھ بنتی رہی، میں اس راکھ کو اپنے دامن میں بھرتا چاہتا ہوں۔ شاید کچھ سکون نصیب ہو جائے۔“ وہ لاچارگی سے بولا۔ ”شاید ضمیر کی خلش میں کمی واقع ہو جائے۔“

”پاپا! سکون تو یادِ الہی سے وابستہ ہے، اسی کے سامنے التجا کریں۔ وہی غفور و رحیم ہے۔ اور ماما کی مغفرت کے لئے دعا گور ہیں۔ اسی میں ہی آپ کے لئے سکون ہے۔“ وہ پیار سے بولی تو باپ نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ اسے ایسا محسوس ہوا جیسے صدیقہ کی روح اس میں سرایت کر گئی ہو۔ لہجے میں وہی پیار اور وہی مٹھاس تھی۔ وہی لحاظ داری اور رشتے کی پاسداری۔

آہ! اپنی جنت کو اپنے ہاتھوں سے ہی جہنم میں بدل دیا۔ میں کتنا بد قسمت ہوں۔ صدیقہ سے کہیں زیادہ میری بربادی ہوئی ہے۔ وہ تو اللہ تعالیٰ کے حضور عیش و طرب میں ہوگی۔ مجھے ابھی اپنے گناہوں کی پاداش میں نہ جانے کیا کچھ سہنا ہوگا۔



ٹورنٹو میں اپنی کمپنی سٹارٹ کرنے سے پہلے وہاں کے تمام ہاسپٹلز کا وزٹ کر کے اس نے فیزی تھلی ریپورٹ تیار کر لی۔ آصف زیدی نے اسے فون پر اس خبر کی اطلاع دی کہ ریموٹ ایریا میں حال ہی میں ایک چیریٹی ہاسپٹل تعمیر ہوا ہے۔ وہاں کے بارے میں بھی غور و فکر کرے تاکہ ایک نیک کام کو پایہ تکمیل تک پہنچانے میں اس کی توجہ اور محنت کا ہاتھ ضرور ہوتا چاہئے۔

یہ کنٹریکٹ ملتے ہی اس نے اپنے مقصد اور ارادوں کو عملی جامہ پہنانے کی تمام تر محنت کو تیز کر دیا۔ آئے دن چائنہ کے ٹرپ لگنے لگے اور ایک دن اس کی کمپنی وجود میں آ کر کینیڈا پر چھا گئی۔

خبروں کے وجود میں پُر بہت اہمیت رکھتے ہیں۔ جیسے انسانوں کے دو پاؤں، جانوروں کے چار پاؤں کا استعمال۔ کہتے ہیں کہ فرشتے بھی آسمان سے اترنے میں پردوں کا استعمال کرتے ہیں۔ اسی طرح ہر خبر کے ساتھ ونگز کا وجود میں آنا غیر فطری ردِ عمل نہیں ہے۔ یہ خبر صدیقہ اور آصف کے کانوں تک مسافت طے کرتی ہوئی پہنچ گئی کہ خرم نے یہاں کسی ہاسپٹل میں جاب پکڑ لی ہے اور اپنے لئے الگ اپارٹمنٹ لے کر بسر اوقات کر رہا ہے۔ پیسے کی طمع اور اشیئس کا لالچ تو اس کی ٹھٹھی میں تھا ہی، وہ

اپنی طبعاً آن سیٹیلیٹی کی وجہ سے زندگی میں بہت پیچھے رہ گیا تھا۔ ہارون بھی اپنی مستقل مزاجی کی وجہ سے دن بدن ترقی کی راہوں پر گامزن تھا۔ شیریں بھی اپنی جاب میں مطمئن اور خوش تھی۔ بلکہ ان کی زندگی میں ایک ٹھہراؤ اور اطمینان آ گیا تھا۔ اب شیریں نے بھی میکے کی طرف سے اپنا میلان کم کر کے سرال کے ساتھ اپنے مراسم مستحکم کر لئے تھے۔ نندوں اور جیٹھ کے بچے چھٹیاں گزارنے اس کے پاس آنے لگے۔ ساس بھی چھ مہینے کا عرصہ نہایت پرسکون اور طمانیت سے گزار کر گئی تھی۔ شیریں اپنی اس سوچ پر ایسے کار بند تھی کہ اگر دنیا میں عزت و تحريم اور آفرین کمائی ہے تو شادی سے پہلے تمام وفاداری والدین کے ساتھ اور بعد میں تمام ایثار و وفا کے حق دار سرال ہوتے ہیں۔ وہی بیٹیاں اپنی ازدواجی زندگی کی مسرتوں کو آگ کے بلند شعلوں کی نذر کر دیتی ہیں جن کا دھیان پیچھے اور دل میکے میں الٹا رہتا ہے۔ اور پھر طرہ یہ کہ سرالی رشتوں کو فوقیت یا اولیت دینا اپنی ہنگ اور توہین تصور کیا جاتا ہو۔ وہ جان چکی تھی کہ سرال سے ہی میرا نام اور میرا خاندان تشکیل میں آتا ہے۔ قائد اعظم اور فاطمہ جناح جیسے بہن بھائی کے اپنائیت و لگاؤ کے رشتے کا امیج حقیقت کی اتھاہ گہرائیوں میں جا چھپا تھا۔ حالات کے نشیب و فراز سے نکلی ہوئی شیریں ایسی دنیا دار اور بالفاظ بن چکی تھی کہ اسے دیکھ کر ماضی اور حال کو یکجا کرنا بے یقین اور محال ہو گیا تھا۔ سچ مچ یہ اس کا دوسرا جنم ہی تھا۔ وہ خرم کو کوئی اونچ نیچ سمجھانے کی کوشش نہ کرتی کیونکہ اس نے اپنے تجربات سے یہ بات پلے باندھ لی تھی کہ کسی کو نصیحت کرنا اور اس پر عمل کرنے کا انجام بتانا اور طرح طرح کے مشوروں سے اسے بہتری کی طرف مائل کرنا سب بے کار ہے۔ بائی دی اینڈ آف دی ڈے فیصلہ کرنا اسی کے اختیار میں ہوتا ہے۔ اپنے ہمدرد کی تمام مغز کھپائی اور فکر مندی دھری کی دھری رہ جاتی ہے اور وہ اس کے انٹرفیرنس سے چڑنے لگتا ہے۔



حرم ہاسپٹل سے اپنے اپارٹمنٹ میں پہنچا تو اپنی جائے قیام کا جائزہ لینے لگا۔ اجڑے پن کے ساتھ ہر طرف منتشر استعمال شدہ چیزیں اس کا منہ چڑا رہی تھیں۔ لوگ روم میں حسب ضرورت نہایت ہلکی کوالٹی کا سامان اس کا مذاق اڑا رہا تھا۔ حدیقہ کی سیٹل منٹ نے پہلے ہی اسے مضطرب اور ہراساں کر دیا تھا۔ اب اپنی حیثیت کا احساس کم مائیگی ابھر کر اسے سکون دل سے محروم کر رہا تھا۔

اس نے بیک کندھے سے اتارا، بے دلی سے صوفے پر پھینکا، ٹائی کی ناٹ ڈھیلی کی اور اپنے کمرے میں چلا گیا۔ ڈنر کئے بغیر ہی وہ بے سدھ اور بے ترتیب ہو کر بیڈ پر لیٹ گیا۔ اس کی حالت اس کے وجود کی توڑ پھوڑ کے شور کو نمایاں کر رہی تھی۔ کروٹیں بدل کر، کبھی گھبرا کر کھڑکی میں کھڑے ہو کر باہر کی سٹریٹ لائٹس اور پارک شدہ گاڑیوں کو بے مقصد گھورتا اور منٹوں فریق کھول کر اپنے جھانکنا جیسے اس عمل سے فریق اسے من و سلوی فراہم کر دے گا۔ آخر پانی پی کر وہ لی وی کے سامنے خالی الذہنی کی کیفیت میں بیٹھ گیا کہ موبائل کی رنگ پر چونکا۔

”خرم بیٹے! کہاں ہو تم اور شیریں؟“ ماں کی آواز میں شکایت تھی۔

”میں یہاں ہوں۔ اور شیریں کا مجھے علم نہیں ماں جی! اس سے ملاقات کم ہی ہوتی ہے۔ ہم دونوں ہی بے حد مصروف ہیں آج کل۔ میری نئی جاب نے تو تھکا کر رکھ دیا ہے۔ کم بخت یہ لوگ تنخواہ دے کر اسے حلال کرنے کے ماہر ہیں۔“ وہ بہت سنجیدگی سے بولا۔

”ماں کو بھولنا ایک فطری امر ہے بیٹا! تم تو اپنی دین ماں اولاد کو بھی فراموش کر بیٹھے۔ میری تربیت میں نہ جانے میں نے کہاں خود غرضی سے کام لیا تھا کہ تم دونوں

ہی ماں کی طرف سے اپرو اور بے توجہ ہو گئے۔ اس معصوم کو تو اپنے سائے کے نیچے رکھ کر پروان چڑھا لو۔ بے چاری گورنس کے ہاتھوں سے بل کر نکلے گی تو نہ جانے اس کی ذہنی ساخت کیسی ہوگی؟“ وہ پڑمردگی سے بولی۔

”جب تک حدیقہ گھر نہیں آ جاتی، اسے یہاں لانا کیسے ممکن ہے ماں جی؟“ وہ الجھ کر بولا۔

”کیا دنیا میں صرف حدیقہ ہی رہ گئی ہے؟ خدا کے لئے اس کے سحر سے باہر نکل کر دیکھو، لڑکیوں کی بھرمار ہے۔ اور پھر وہ بھی ڈاکٹر کے لئے تو مرتی ہیں۔“ وہ خفگی سے بولی۔

”مجھے اخلاقیات سے گری ہوئی شریک حیات نہیں چاہئے ماں جی! آپ کے بیٹے کے ساتھ صرف حدیقہ ہی گزارہ کر سکتی ہے۔ جیسے شیریں کے ساتھ ہارون۔ بار بار ساتھی بدلنے سے کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ دن بہ دن مسائل بڑھتے چلے جاتے ہیں۔ ورنہ ہارون اور شیریں کو بھی اپنے ساتھی کے انتخاب میں ہرگز مشکل درپیش نہ ہوتی۔“ وہ سمجھانے کے انداز میں بولا۔

”تھوک کر چاٹنا مجھے قطعاً پسند نہیں۔ وہ تو نہ جانے کس مٹی سے بنی ہے۔ ماں کی تو ہوا بھی چھو کر نہیں گزری۔ بے غیرت اور بے عزت کہیں کی۔ بھائی سے بگاڑ لیا۔ ماں کو اپنے رشتوں کی فہرست سے نکال دیا۔ اب اس کے لئے سسرال اہم ہو گیا ہے۔ بہت بے فیض اور بے مروت نکلی ہے۔ میری تو اولاد ہے، مانتا مجبور ہے ورنہ اسے بتیس دھاریں نہ بخشوں۔ ایک تم ہو کہ تمہاری پیتا مردہ ہو گئی ہے۔ میری بات کان کھول کر سن لو! اب میں تمہاری ذمہ داری اٹھانے والی نہیں۔ میری بڑھی بڈیوں میں نہ تو طاقت ہے، نہ ہی مجھ سے سرکھپائی ہوتی ہے۔ ثانی تو جیسے اس دنیا میں موجود ہی نہیں۔ تمام ذمہ داری مجھ پر ڈال کر نہ جانے کہاں دفع ہو گئی ہے۔“ وہ فیصلہ سنا کر چپ ہو گئی۔

”آپ درست فرما رہی ہیں۔ میں اسے ڈے کیئر تو چھوڑ ہی سکتا ہوں۔ مگر آپ کو تھوڑا سا انتظار کرنا ہوگا۔ ماں جی! آئی ایم ایکسٹریملی فیلنگ بیڈ۔“ وہ تادم سا ہو گیا۔

”بس تم حدیقہ کا انتظار چھوڑو۔ جس کے باپ کی بھی کسی بندہ بشر کو خبر تک نہیں۔ نہ جانے کس کا گند ہم اٹھالائے تھے۔“ وہ سختی سے بولی مگر وہ خاموش رہا۔

”میں جانتی ہوں کہ اب میں کس قدر بے وقعت ہو گئی ہوں۔ اس لئے میری بات ماننا تمہیں اپنی توہین محسوس ہوتی ہے۔ کرو گے تم اپنی ہی مرضی۔ میری بات مان کر چلتے تو آج یہ دن دیکھنا نصیب نہ ہوتا۔ لوگ اولاد کو ترستے ہیں، اسے حاصل کرنے کے لئے کیا کیا پاپز نہیں بیلتے۔ ایک تم ہو کہ پرلے درجے کے ناقد رہے اور ناشکرے۔“ وہ غصے میں بولتی فون بند کر گئی۔ غصہ عروج پر تھا۔

خرم کی نیند، چین اور سکون تو پہلے ہی نیست و نابود ہو چکا تھا، اب اس میں بچھتاؤں کی آمیزش نے اس کے وجود کے ہر انگ کو ندامت کے مرجھائے پن کے سپرد کر دیا۔

صبح نکھری، اُجلی اور روشن تھی۔ شب بیداری اور غم خواری آنکھوں سے جھلک رہی تھی۔ اس کے اندر ابھرتی ڈوبتی تلاطم خیز موجوں نے سرودِ سحر کے نغموں پر غلبہ پا لیا تھا۔ اسے یہ جہاں سراسر بے معنی اور لالچینی لگ رہا تھا۔

جب دل خوشیوں کے ہلکورے لے رہا ہو تو خزاں میں گرتے ہوئے پیلے اور سوکھے پتوں کی آواز دل میں مدھر موسیقی بن کر ابھرنے لگتی ہے اور اس کے برعکس بند کلیوں کے چنچنے کی آواز، کوئل کی کولو، آبشاروں کی جھنکار سوگ میں شریک ماتم کناں کا سماں پیش کرتی ہے۔ خرم ذہنی و قلبی کیفیت سے دوچار اپنے گرد و پیش کے ماحول کا اپنے موڈ کے مطابق یقین کئے ہا سپنل پہنچ کر پیشد کی لسٹ پڑھنے لگا۔ پچاس پیشد کے ناموں کی فہرست دیکھ کر وہ چکرا گیا۔ خدمتِ خلق، ہمدردی اور رحم سے لبریز اس پروفیشن کو ان لوگوں نے اتوار بازار کا روپ دے کر اپنی خود غرضی اور فائدہ مندی کے روئے کو خوب اُجاگر کر رکھا تھا۔ ایشین ڈاکٹروں کا عرق نکالنا تو کوئی اس قوم سے سیکھے۔ وہ غصے میں بڑبڑا رہا تھا۔ برداشت کا مادہ کم ہو چکا تھا۔ اس کا جی چاہا کہ فوراً یہاں سے اٹھ کر واپس چلا جائے۔ مگر ایسا جذباتی اور بے وقوفانہ فیصلہ کرنے کی اس میں سکت ہی نہ تھی۔

سر جھکائے اس نے بے دلی سے پیشد کو بلانے کے لئے نرس سے کہا۔ اور شام اسی مصروفیت میں سر پر آکھڑی ہوئی۔ نقاہت سے برا حال تھا۔ رات بھر سے بھوکا اور پیاسا تو تھا ہی، دن میں فقط ایک بلیک کافی پی کر خود کو ہشاش بشاش رکھنے کی کوشش کی تھی۔ وہ اپنے بیابان اور اُجڑے ہوئے اپارٹمنٹ میں جانے کے بجائے سدھا اسٹیک باؤڈر، چلا گیا۔ وہ گہری سوچ میں غرق تھا کہ وہ نہیں کھائے گا تو کوئی

اصرار کر کے کھلانے پر رضامند نہیں کرے گا۔ کپڑے جیسے مرضی ہیں، زیب تن کر لوں۔ کوئی ہے جو اپنی پسند کے کپڑے تیار کر کے میری دس خوشامدیوں کے مجھے پہنانے کی کوشش کرے گا؟ دن بھر کی تھکن ہے کوئی سا بھی جو اپنے اندر سمو کر مجھے میٹھی اور پرسکون نیند سلائے گا؟

اُس کا سرنفی کے انداز میں ہلا اور ویر کی آواز پر چونکا۔ کھانا آرڈر کر کے اس کی نگاہیں سامنے کھلنے والے مین ڈور پر جم گئیں۔ حدیقہ ریڈ اینڈ بلیک لاٹک سکرٹ اور بلاؤز میں ملبوس نہایت خوب صورتی سے بنا ہوا ہیمیز اسٹائل اور تین انچ کی ہیل میں قد اور دراز لگ رہا تھا۔ ایسا لگا جیسے کوئی ماڈل گرل نے تلے قدم اٹھاتی سب کو اپنے حسن و نزاکت سے امپریس کرتی شان بے نیازی سے چلتی ہوئی اس کے ساتھ والے ٹیبل پر آ کر بیٹھ گئی۔ وہ ایک دم سے یہ دیکھ کر چونک اٹھا کہ ایک ادھیڑ عمر کھجڑی نما بالوں والا ڈبلا پتلا مرد اس کے ساتھ مسکراتا ہوا بیٹھ گیا۔ اسے وہ شکل و شاہت سے ایشین ہی لگ رہا تھا۔ مگر اس کی حرکات و سکنات اور انداز گفتگو کے طور طریقے اس بات کی غمازی کر رہے تھے کہ وہ پیدائشی طور پر یہاں سے تعلق رکھتا ہے۔ وہ مسلسل حدیقہ کو پیار بھری نظروں سے دیکھ کر مسکراتے جا رہا تھا۔

خرم کے تن بدن میں جیسے کسی نے انگارے بھر دیئے ہوں۔ اندر ہی اندر کھولتا ہوا بڑبڑایا۔ ”اب سمجھا کہ محترمہ اتنی بڑی کمپنی کی مالک کیسے بن گئیں۔“

وہ غیر ارادی طور پر حدیقہ کی طرف چل پڑا بغیر کسی پلاننگ کے، مگر ذہن میں سوچوں کے مد و جزر برپا تھے۔ اس کی ملکیت پر کسی اور کا قبضہ کیسے ممکن ہے؟ وہ اندر ہی اندر کھول رہا تھا۔

ماں جی کی جہان دیدہ نگاہوں اور عقلمندانہ سوچ کا بھی جواب نہیں۔ اس کی رگ رگ سے واقف ہیں۔ ان کی نفرت و حقارت کسی وجہ کے بغیر نہیں ہے۔ انہیں اس کا نام سننا گوارا نہیں۔ سچی تو ہر وقت کسی اور لڑکی کا تذکرہ کرتی ہیں۔ اب وہی کروں گا جو ماں جی چاہیں گی۔ یعنی کمزور تو ہمیشہ سے تھا، حال ابھی بھی ویسا ہی تھا۔

اب وہ ان کے قریب پہنچ چکا تھا۔ دونوں کی نظریں یکجا ہوئیں، حیرت کی پرچھائیوں کے ساتھ اُن گنت شکوے اور شکایتیں ابھریں اور حدیقہ نے منہ دوسری طرف پھیر کر اس سے گفتگو نہ کرنے کا سگنل دے ڈالا۔ مگر وہ نہایت شستہ آواز میں

”ہیلو حادی!..... ہاؤ آریو؟“ اس نے مصافحہ کے لئے ہاتھ آگے بڑھا دیا جسے حدیقہ نے انکور کر ڈالا۔ وہ کسمسا کر دوسری جانب متوجہ ہو گیا۔ ہیلو ہائے کے بعد خرم نے اپنا تعارف کروایا۔ ”آئی ایم ڈاکٹر خرم فرام پاکستان۔“

آصف زیدی ایک دم چونکا ہو گئے۔ کیونکہ نام میں مانوسیت تھی اور حدیقہ کے چہرے کی بیزاری میں بھی اک بھید چھپا ہوا تھا۔ وہ چند لمحے خاموش رہے، پھر ہمت کر کے بولے۔

”آئی ایم ڈاکٹر آصف زیدی۔ ہر فادر۔“ اس نے حدیقہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”حدیقہ! آپ انہیں جانتی ہوں گی۔ پاکستانی کمیونٹی میں ملنا جلنا رہتا ہو گا۔ کیوں بیٹا؟“

”جی پاپا! اس کے علاوہ میں نے ان کے ساتھ چند مہینے کام کیا تھا۔“ وہ خود اعتمادی سے بولی۔

”ہمارا وہ وقت بہت ہی پریشمیس تھا سر! میں نے آج تک اتنی ہیلپ فل نرس کہیں نہیں دیکھی۔ شی از نو گڈ۔“ وہ خوشگوار لہجے میں بولا تو حدیقہ نے اسے ناگواری سے گھورا اور پھر سر کو جھٹکا دے کر منہ دوسری طرف موڑ لیا۔

”آئی سی۔“ اس نے سوالیہ نظروں سے دونوں کو گھورا۔ وہ تھوڑا سا لرز گئی۔

حدیقہ کے پاپا کہاں سے آئے؟ وہ شاق کی کیفیت میں گھر گیا۔ خرم مسلسل اسے دیکھے جا رہا تھا۔

”آئیے تشریف رکھئے۔“ جب کس ہاسپٹل میں ہے؟ پاکستان سے کب آئے؟ شادی شدہ ہو تو بچے کتنے ہیں؟ یہاں کون سے ایریا میں رہائش پذیر ہو؟“

پانچ منٹ میں سوالات کی بھرمار پر حدیقہ متذبذب سی ہو کر دونوں کو دیکھنے لگی۔ وہ نہایت مہذب طریقے سے سوچ سمجھ کر جواب دے رہا تھا۔ کھانا ٹیبل پر پہنچ چکا تھا۔ خرم نے ایکسکیوز کیا اور اپنے ٹیبل کی طرف بڑھ گیا۔ حدیقہ نے اسے رحم بھری نظر سے دیکھ کر خود کو لعنت ملامت کی اور کھانے میں بظاہر مصروف تو ہو گئی لیکن دل میں ہلچل مچ گئی تھی۔ وہ توقف کے بعد مسکرا کر دیا۔

”گڈ پائی۔“ آصف نے حدیقہ کو چھیڑتے ہوئے کہا۔ ”لیکن وقتاً فوقتاً دو غلا پن دکھانے سے باز نہیں آتے۔ میرا ان کے ساتھ بہت اچھا تجربہ بھی رہا اور برا بھی۔ جتنے زبان کے میٹھے ہیں، دل کے اتنے ہی کڑے ہیں۔“

”پاپا! یہ ڈینج تو آل اور دی ورلڈ کر دے کر رہی ہے۔ بے چارے پاکستانی تو خواجہ ابی بدنام ہو گئے ہیں۔“ وہ ہنسنے لگی۔ خرم کے سامنے حدیقہ تھی۔ آصف زیدی کی پشت خرم کی جانب تھی۔ خرم نے حدیقہ کو ہنسنے ہوئے دیکھا تو تملکا کر رہ گیا۔ وہ اپنی زندگی میں اپنے باپ کو حاصل کر کے کس قدر خوش اور مطمئن ہے۔ میں ہوں کہ سوگوار اور پریشان۔ اس کی ماں کا کیا ہوا؟ بے چاری کہیں گل سڑ رہی ہوگی، اپنے ناکردہ گناہوں کی سزا بھگت رہی ہوگی۔

اب مجھے کیا کرنا ہے؟..... کس سے مشورہ لوں؟..... سب اپنے، پرائے جو بن گئے ہیں۔ ہمدردیاں جتانے والے، خود غرضی کا لبادہ اوڑھ کر غائب ہو گئے ہیں۔ اس میرا تیرا کے عالم میں کسی کو کیا پڑی ہے کہ میری زندگی کی غلطیوں، کوتاہیوں اور جذباتی فیصلوں کی دکھ بھری داستان سن کر مجھے تسلی و تسفی دینے کی ضرورت محسوس کرے۔ اس نے سوچتے ہوئے بے دلی سے پیٹ کی آگ بجھائی اور ان کے جانے کا انتظار کرنے لگا۔ کیونکہ وہ ان کا پیچھا کر کے حدیقہ سے ملنے کے تمام بند راستے کھولنا چاہتا تھا۔ آج کے اس گولڈن چانس کو وہ مس کیوں کرتا۔ اُس نے حدیقہ کو حاصل کرنے کا اٹل فیصلہ کر لیا تھا۔ دل مطمئن بھی تھا اور مضطرب بھی کہ وہ کس منہ سے اس کے سامنے ہاتھ جوڑ کر اپنے گناہوں کو تسلیم کر کے اپنی تمام تر کوتاہیوں کی معافی مانگے گا۔ وہ سوچے جا رہا تھا اور نظریں حدیقہ کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔



آج کی سردرات میں حدیقہ عادتاً کمبل لپیٹے مطالعہ کر رہی تھی۔ ورنہ جنت کے اس حصے میں سردی اور گرمی کا کبھی احساس ہی نہ ہوتا تھا۔ یہ تو انسانوں کی محنت سے تشکیل کی ہوئی بہشت تھی، اللہ کی بہشت کی توشان ہی کیا ہوگی۔ وہ ناول کا صفحہ پلٹ کر حیران رہ گئی کہ اس نے تو نہ جانے کیا پڑھا تھا۔ دل و دماغ میں تو خرم بسا ہوا تھا۔ محبت اور نفرت کے امتزاج میں ملوث اس کا شوہر۔ اس نے ناول سائیڈ ٹیبل پر رکھا اور ذہن کو ہر طرح کی سوچوں اور خیالات سے عاری کرنے کی ناکام کوشش کی۔ تنگ آ کر اس نے نیبل لیپ آف کیا اور کمبل میں ایسے دبک کر آنکھیں بند کر کے لیٹ گئی جیسے نیند اسے حسین مرغزاروں میں لے جائے گی۔ مگر ایسا تو نہ ہوا۔ نیند تو کوسوں دور تھی۔ بھلا کیسے آتی؟

چند گھنٹے پیشتر اس نے خرم کو دیکھا تھا جس کو اس نے ٹوٹ کر پیار کیا تھا۔ اس کی

زیادتیوں پر بھی وہ اس کی ایک مسکراہٹ کو دار کر شیر و شکر ہو جایا کرتی تھی۔ لیکن من میں نفی برقرار ہی رہی اس کی قربت میں۔ کیونکہ اس کا پیار اس کے جسم کی ضرورت کے سوا کچھ نہ تھا۔

اس نے ان مشتعل سوچوں سے نکلنے کی کوشش کی مگر کامیابی نہ ہونے کی صورت میں وہ کچن کی طرف بڑھ گئی۔ فرسٹ ایڈ کیبنٹ کھول کر اس نے ٹرائکولائزر نکال کر کھائی اور دبے پاؤں اپنے کمرے میں آ گئی۔ مگر نیند پھر بھی کوسوں دور ہی تھی۔

اُف..... یہ شادی یعنی کسی مخالف جنس سے بندھ جانے کا نام ہے۔ بس صرف قید بامشقت کے سوا اور کیا ہے؟ کچھ بھی نہیں۔ وہ بڑبڑائی۔

نکاح کے چند بول عورت کو سرتا پابدل کر ہر طرح کی قربانی کے لئے تیار کر لیتے ہیں۔ نہ نیند کی پروا، نہ کھانے پینے کی خواہش۔ اس کی قربت میں دن اور رات کا حساب ہی گڑبڑ ہو جاتا ہے۔ نہ دن گزرنے کا احساس، نہ رات بیتنے کی خبر۔ وہ بھی کیا سہانے دن تھے۔ پلک جھپکتے گزر گئے۔ اس نے کروٹ بدل کر سوچا۔

مگر توہین آمیز لمحے کیسے جان لیوا تھے کہ طویل ہی ہوتے چلے جاتے تھے۔ اُس نے آہ بھری۔

اب اللہ کے فضل و کرم سے دنیا کی کون سی نعمت میرے پاس موجود نہیں؟ ان تمام نعمتوں میں تیری شمولیت کے بغیر غلامحسوس کرتی ہوں کہ اس سہانے موسم میں ہم دونوں ہاتھ میں ہاتھ ڈالے دنیا کی نظروں سے اوجھل ہو جائیں۔ وہ ایک دم اپنی اس سوچ پر چونک اٹھی۔

بے غیرت! کیا سوچ رہی ہو؟..... پھر سے اپنے اوپر عذاب مسلط کرنے کے بھیاںک اور ڈراؤنے خواب۔ زندگی کس قدر حسین ہے۔ اس کو انجوائے کرو۔ بھول جاؤ خرم کو جس نے تمہیں سوائے بے وفائی کے اور کچھ نہیں دیا۔ اگر آج اس کی بیوی زندہ ہوتی تو یہ سنگدل انسان مجھے مڑ کر دیکھنا بھی گوارا نہ کرتا۔ آج اپنی مسکینیت اور مظلومیت کو چہرے پر چسپاں کئے مجھے دھوکا نہیں دے سکتا۔ گوٹو ہیل۔ اُس نے قدرے اونچی آواز میں کہا اور کبیل کھینچ کر سر تک لے آئی۔

یہ ہے عورت اور اس کی بے غرض اور صلح کل ذات۔ اسی لئے تو جب دل چاہے اس سے رہائی آسان ہے۔ اور کوٹھوں کی رونق اور دلوں کے بہلاوے کا سامان بنائی جاتی ہے۔ یہ سب اس کی نرمی اور خاطر جوئی کے نتائج ہیں۔

وہ خود کو طبیعت میں آنے والی نرمی پر کوسنے لگی۔ نیند نہ آنے کی صورت میں وہ بستر میں ہی لیپ ٹاپ لے کر بیٹھ گئی اور ایک وسیع و عریض دنیا کی سیر و سیاحت کرنے لگی۔



”حادی بیٹا! ڈاکٹر خرم میرے پاس بیٹھے ہوئے ہیں۔ اگر اجازت دو تو ڈنر پر گھر لاسکتا ہوں۔“ آصف نے نہایت پیار سے فون پر کہا تو وہ اچنبھے سے بولی۔

”پاپا! یہ پاکی چپکو ہو گیا ہے۔ اسے بھگانے کی کوشش کریں۔ گھر کا راستہ دیکھ لیا تو چوکھٹا کھاڑ دے گا مگر آنا بند نہ کرے گا۔“

”وہ تم سے ملنا چاہتا ہے۔“ وہ آہستگی سے بولے۔

”مجھ سے کیوں پاپا؟ اس کے ساتھ چند مہینے کام کرنے کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ سوڑا ہی بن جائے۔“ وہ بے اختیار ہی سے بولی۔

”میاں بیوی کا رشتہ ریشم کے دھاگے کی مانند نازک لیکن آئرن کی مانند ٹوٹ اور مضبوط ہوتا ہے۔ حادی بچے! اسے معاف کر دو۔ خرم برا انسان ہرگز نہیں۔ پچھلے تین مہینے سے میرے ساتھ کام کر رہا ہے۔ ہی ازا ایکسٹریملی گڈ ہیومن بینگ۔“

”تین مہینے سے؟“ حیرت سے اس کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ ”تو آپ کو اس نے مظلوم بن کر اپنی جھوٹی کہانی سنا دی ہے اور آپ نے بھی ون سائیڈ ڈسٹوری پر یقین کر لیا۔“

”ایسی بات نہیں۔ ڈنر کے دوسرے دن ہی میں نے اسے اپنے پاس بلا کر اپنے شک کو یقین میں بدل کر اسے اسی ہاسپٹل میں جاب دے دی تھی۔ مقصد اے پرکھنا ہی تھا۔ میں نے اس کی روئیداد سنی ہے۔ باقی باتیں باپ بیٹی بعد میں کریں گے۔ فی الحال ابھی تمہاری طرف سے اجازت کی ضرورت ہے۔“ آصف نے پیار بھرے لہجے میں کہا۔

”پاپا! یہ مجھ پر زیادتی ہے۔“ وہ روہانسی ہو گئی۔ ”وہ آپ کو استعمال کرنا چاہتا ہے۔ کیونکہ میں نے اسے منہ نہ لگانے کا تہیہ کر لیا ہے۔ وہ بخوبی جانتا ہے۔“

”بچے! ازراہ مجبوری اپنے تعلقات کو بحال کرنے سے زندگی مسرتوں کی آماجگاہ نہیں بنتی۔ بلکہ آزمائشوں کا کبھی نہ ختم ہونے والا سلسلہ چل نکلتا ہے۔ تمہیں صرف ایک چانس دینے کی التجا کر رہے ہیں۔ آنے سے سانسے بیٹھ کر بات کرنے سے ان گنت

مسائل حل ہو جائیں گے۔ بیٹا! اتنی ہمت تو میرا بہادر بیٹا کر ہی سکتا ہے نا۔“ وہ ملائمت سے بولے۔

”پلیز پاپا! آج انہیں ٹال دیجئے۔ پہلے ہم دونوں باپ بیٹی بیٹھ کر آپس میں ڈسکس کریں گے، پھر ملاقات کے بارے میں سوچیں گے، پھر یہ رشتہ نئے سرے سے قبول کرنے کے لئے مجھے وقت چاہئے ہو گا۔“ وہ بھی ملائمت سے بولی۔ ”پاپا! یہ دل ہی تو ہے۔ اس کو منانا کون سا آسان کام ہے۔“

”اوکے، اوکے۔ اس ویک اینڈ پر بلا لیتے ہیں۔ باربی کیو کا خوب مزار ہے گا۔“ وہ ہنس رہے تھے۔

”دیکھتے ہیں۔ ابھی کچھ بھی کمٹ نہ کیجئے گا۔“ وہ آہستگی سے بولی۔ ”مجھے سوچنے تو دیں۔“

”درست۔“ آصف نے پیار سے کہا۔ ”بھئی جو رو کے غلاموں کے قصے تو تم نے لاکھوں سنے ہوں گے۔ مگر بیٹی کا ہاتھ بندھا غلام اس کا باپ۔ یہ کہانی کہیں سے سننے میں نہ آئی ہو گی۔“ ہمیں جب حکم صادر ہو گا، آپ کو مطلع کر دیا جائے گا۔“ انہوں نے فون رکھ دیا اور خرم نے مودبانہ انداز میں اثبات میں سر ہلایا۔

’ہر کوئی کہتا ہے، بہت سادہ طبیعت کا ہے۔ واہ بھی واہ! گدھے کی طرح شریف النفس اور نرا بے وقوف اور آکھے لگ، لائی لگ۔ پاپا نے بھی زندگی میں کچی گولیاں تو کھیلی نہیں۔ سب کچھ کھو کر بہت کچھ پانے میں کامیاب بھی رہے۔ انہیں میں تو چکھا دینے میں کامیاب نہ ہو سکی۔ وہ تو ہے ہی بدھو اور احمق۔ بھلا پاپا کو اپنے شیشے میں کیسے اتار سکتا ہے؟ سادگی اور چالاکی دو متضاد خصلتیں ہیں۔ ان دونوں کی یکجائی کے لئے کھوپڑی میں بھیچہ ہونا بہت اہم ہے جس سے وہ فارغ ہے۔ وہ طبعاً سادہ اور خونی رشتوں سے جڑا ہوا انسان سہی، مگر ہر رشتے نے اس کی شرافت اور انسانیت کا غلط فائدہ اٹھایا اور اس کا گھر برباد کر کے رکھ دیا۔ اس نے جہاں بھی چالاکی سے اپنا کام نکلانے کی کوشش کی، وہیں رنگے ہاتھوں پکڑا گیا۔ اب دیکھتے ہیں پاپا کے ساتھ اپنی سادگی اور ناعاقبت اندیشی میں چالاکی کی ملاوٹ سے کہاں تک کامیاب ہو پاتا ہے۔‘ وہ خود کلامی کر رہی تھی۔

’نو! تم ایسے شوہر بن ہی بھلی جو بیوی کی خاطر شینڈ لینے کی ہمت نہ رکھتا ہو۔ اپنے حقوق پامال ہوتے دیکھ کر چشم پوشی سے کام لے کر خود کو ڈی نی کلٹ پوزیشن

سے نکالنے کے لئے بزدلی سے کام لیتا ہو۔ اور اگر غصہ آئے تو صرف کمزور پر۔ جو اُسے تھرپٹ ان کرنے کی قابلیت نہ رکھتا ہو۔ اور اس کے سامنے ہتھیار ڈال کر جاں بخشی کی درخواست کرتا ہو۔ جو اس سے سڑانگ ہو، طاقتور کے سامنے نہایت خوشامدی اور ڈرپوک۔ بیوی کے لئے تو جیسے اس سے بڑا ظالم اور طنز انسان پیدا ہی نہ ہوا ہو۔ اور اپنی سختی اور دلیری کی داستانیں ہر ایک کے گوش گزار کر خود کو پھنے خان کہلانے میں بے پناہ فخر و خوشی محسوس کرتا ہو..... اُسے نہیں کروں گی معاف۔ نادان کہیں کا۔ پڑھا لکھا جاہل اور نابلد۔

وہ دیر تک اس کے بارے میں سوچتی رہی، دل کو ٹوٹتی رہی کہ شاید دل کے کسی نہاں خانے سے اسے اپنانے کی صدا اُبھرے اور ذہن بلکی سی سرگوشی سے ہی اسے معاف کرنے پر آمادہ کر لے۔ مگر ایسا کچھ نہ تھا۔ وہ جانتی تھی کہ انسانی جبلت، وہ بھی شوہر کی صورت میں بدلنا ناممکن ہے۔ یہ اس کا تجربہ بول رہا تھا۔ مانا کہ محبت ایک سمندر کی مانند ہے جس کی گہرائی اور وسعت کا آج تک کوئی اندازہ ہی نہ لگا سکا۔ اس کی شوریدہ سرلہروں کے اندر کا جوار بھانا سکوت اور ٹھہراؤ کی زبان جان نہ سکا۔ اس محبت پر پھر سے کیسے تکیہ کر لوں؟ کیسے خود کو پھر سے بے وقوف بنا لوں؟..... تم نے تو مجھے پیار کیا ہی نہیں خرم! ورنہ پیار تو زندگی میں آسانیاں پیدا کرتا ہے۔ اس میں پابندی اور قید و بند کی اذیت کا دخل نہیں ہوتا۔ محبت تو بے لگام اور ہر پل بڑھتے ہی چلے جانے کا نام ہے۔ یہ تمہاری محبت کیسی تھی جسے میں آج تک سمجھ نہ سکی؟..... تم تو اپنے فلسفے اور منطق میں بالکل ہی ہار گئے۔ تمہاری محبت، چاہت اور اُلفت میرے لئے گالی بن گئی۔ خرم! کیا اسے محبت کہتے ہیں؟..... اب میری زندگی میں جو شور شرابا برپا ہوا ہے، جتنی رسوائی ہوئی ہے، جتنی میری ہتک اور بے عزتی ہوئی ہے، کیا اس کی واپسی ہو سکتی ہے؟..... اگر ایسا کرنے کی سکت رکھتے ہو تو پھر میری تم سے کوئی ناراضگی نہیں رہے گی۔ کوئی گلہ شکوہ نہ ہو گا۔ کیونکہ میری محبت کھری اور سچی ہے۔ اسی کے بل بوتے پر میرے مقدر کی سیاہی اور میری پیشانی پر لگنے والا کلنک کا ٹیکہ ماند پڑ جائے گا۔ وہ بارون کی حرکت پر ایک جھٹکے سے بیٹھ گئی اور بڑبڑائی۔

”یہ تصور بھی تمہارا ہی تھا خرم!..... میں تمہیں معاف نہیں کروں گی۔“



”بیٹا! بات یہ ہے، میں حدیقہ کو پریشان نہیں کرنا چاہتا۔ اس کا ماضی کیسے گزرا

ہے، تم بخوبی جانتے ہو۔ اسے میں نے ایک دو بار مینشن تو کیا ہے مگر اس کی طرف سے خاطر خواہ ری ایکشن نہیں تھا۔ تم ذرا صبر و تحمل سے کام لو۔ تمہاری امانت بہت ہی محفوظ اور پائیدار ہاتھوں میں ہے۔ جہاں اس کے بغیر اتنا عرصہ گزار لیا، وہاں تھوڑا اور سہی۔ اب حدیقہ ہی یہ فیصلہ کرے گی کہ آیا وہ تمہیں معاف کرنے کی ہمت رکھتی بھی ہے یا نہیں۔ ماں کے جانے کے بعد وہ بالکل ہی ٹوٹ پھوٹ گئی ہے۔ کسی مسئلے کو سننا ہی نہیں چاہتی۔ اس نے خود کو شب و روز اپنے کام میں اتنا بڑی کر لیا ہے کہ مجھ سے بھی بات بمشکل ہو پاتی ہے۔ میں خود اس سے بہت نادم رہتا ہوں اور پچھتاؤں کی ایک سلگتی آگ میں ہر وقت جلتا رہتا ہوں۔ کیونکہ میں نے واپس آنے میں بہت دیر کر دی۔ تم نے تو جلد ہی واپسی کا راستہ پکڑ کر بہت بڑی عقل مندی کی ہے۔“ آصف حد درجہ سنجیدگی سے بول رہے تھے۔

”آپ نے درست فرمایا۔ مگر راستہ بہت خاردار ہے انکل! میرے جسم کا پور پور زخمی ہو گیا ہے۔ اس درد کی شدت نے بے حوصلہ کر دیا ہے۔ میں سوچتا ہوں کہ حدیقہ کے پاس کس حق کے تل بوتے پر جاؤں؟ کن عہد و پیمان کا واسطہ دے کر اسے منا لوں؟ اور نئے وعدوں کی سچائی کا کیسے یقین دلاؤں؟ وہ پچھلے وعدے وعید کا حساب لینے بیٹھ جائے گی تو پھر ان سوالات کا کیا جواب دوں گا؟ میرا ذہن اسی شش و پنج میں جکڑا ہوا ہے۔ آپ ہی مجھے بتائیں کہ کیا کروں؟..... ہاری ہوئی بازی کو کیسے جیت لوں؟ اب وہ مجھ پر اعتماد کر کے ایک بار پھر کیونکر رسک لے گی؟“ وہ بہت دُھلی لگ رہا تھا۔

”بیٹے! یہ مرد ذات بڑی عجیب ذات ہے۔ عورت کے جہرے کا تل پسند آ گیا تو اس کی تمام شخصیت کو انور کر کے ایک تل کے پیچھے چل پڑتا ہے۔ جب وہ اُسے حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے تو وہی تل دُور کہیں پس پردہ ہا چھپتا ہے اور پھر اس کی پرسنالٹی کی ایک ایک خامی اور خوبی ابھرنے لگتی ہے جنہیں وہ کسی صورت قبول نہیں کر پاتا۔ اور اسے گھر کے غلیظ ترین کونے کا حصہ بنا دیا جاتا ہے۔ جیسے گھر کا استعمال شدہ، ناکارہ اور ناپسندیدہ فرنیچر۔ کبھی یہاں تو کبھی وہاں۔ ضرورت اور استعمال کے مطابق اس کی جگہ تو بدل جاتی ہے مگر اس کی اہمیت میں قطعاً فرق نہیں آتا۔ وہی بے مول پراپرٹی، جس کی انسانی فطرت کے پیش نظر کوئی وقعت نہیں ہوتی۔ یہ تمام باتیں جو میں کر رہا ہوں، مجھ پر بھی لاگو آتی ہیں۔ کیونکہ میں نے بھی تو یہی کچھ

کیا تھا صدیقہ کے ساتھ۔ بلکہ میں نے تو اسے بالکل بے کار سمجھ کر ایسا ٹھکرایا کہ اس کی ضرورت کا احساس تک نہ ہوا۔ تو اس ضمن میں گھائے میں کون رہا؟ میں اور تم۔ ایسا کرنے سے شوہر کی ہار ہوتی ہے۔ گین کچھ نہیں کرتا۔ ہم دونوں کی مثال سے بڑی اور کون سی مثال ہو سکتی ہے؟ ایک بار دل کو محبت کی ناکامی پر کچھ کے لگ جائیں تو پھر اس زخمی دل کو پہلے والی حالت میں لانا ناممکن ہو جاتا ہے۔ تم گم شدہ محبت کو کہاں تلاش کرو گے؟ وہ تو اب ملنے سے رہی۔ کسی اور دل کا دروازہ کھلکھٹا لو۔ شاید تمہیں وہاں جگہ مل جائے۔ جب محبت کو ایک واجبی اور وقتی حربہ سمجھ کر استعمال میں لایا جائے تو وہ نفرت کا روپ اتنی تیزی سے اپناتی ہے کہ جیسے شیطان اپنے تئیں بلی بھر میں پینتر بدل لیتا ہے۔ بدترین، وحشت زدہ، غلیظ اور ڈراؤنی صورت میں تو کبھی بے تحاشا محبت و مسرت کے انبساط میں جھومتی ہوئی شکل میں۔“ لہجے میں دکھ تھا۔

”انکل! میں امید رکھتا ہوں کہ ایک بار صدیقہ سے ملنے کے بعد میں اپنا کھویا ہوا مقام حاصل کر لوں گا۔ کیونکہ وہ بے تحاشا پیار کرتی تھی مجھ سے۔ شاید اسے بیٹا ہوا کوئی خوشگوار لمحہ یاد آ جائے۔“ وہ امید و بیم کے لہجے میں بولا۔

”تھی۔ اب نہیں ہے۔ بیٹا! یہ حالات اور زمانہ انسان کو بدل ڈالتے ہیں۔ اس کی ایب یوزڈ لائف اور دھکارا ہوا ماضی جس میں اس نے تمہارے سامنے ہاتھ جوڑ کر منتیں کیں، کئی سال ایڑیاں رگڑ کر اپنے حقوق کے حصول کے لئے التجائیں کیں، بچوں کی طرح کھلکھلاتے ہوئے ایک بچے کی ماں بننے کی ڈیمانڈ کی، تمہاری قربت میں رہنے کی جو اس نے دن رات ہنتی کی، جو گڑگڑا کر دعائیں مانگی ہیں، ان کے لا حاصل ہونے کے بعد اس کے اندر زہر نہیں بھرے گا تو کیا شہد اور شیرینی بھر جائے گی؟ وہ اب نئے سرے سے کسی اذیت و کرب کو اپنا ہم سفر نہیں بنائے گی۔“

ان کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ انگلیوں کی پوروں سے تیزی سے آنکھیں پونچھ کر خرم کو دیکھنے لگے۔ وہ سر جھکائے ایک ہارے ہوئے، رندھے ہوئے انسان کی طرح بیٹھا ان کی گفتگو سن رہا تھا۔

وہ دل ہی دل میں سوچنے بچ مچ حدیقہ کے ساتھ پہلی رات بسر کرنے کے بعد وہ گھر کی فالتو ترین چیز گردانی جانے لگی تھی۔ میری کم ہمتی اور بزدلی کا فائدہ میرے خاندان نے جی بھر کر اٹھایا ہے۔ میں سب سمجھ گیا ہوں۔ مگر اب کیا کیا جائے کہ اسے اپنے دل کی رانی اور گھر کی ملکہ بنا کر اپنی بقیہ زندگی اس کے ساتھ عیش و طرب میں

کیسے گزار لوں؟ اُف..... ایک وقت تھا، تمام فیصلوں کی پاسداری کرتے ہوئے وہ کس وضع داری سے کام لیتی تھی۔ مگر آج وقت نے ایسا پلٹا کھایا ہے کہ میں بھکاری بنا اُس کے فیصلے کو اپنے دامن میں بھر کر ایک پختہ عزم کے ساتھ سرنگوں ہونے کو تیار ہوں۔
دونوں سوچ میں محو تھے۔ کمرے میں خاموشی طاری تھی۔

”تو پھر خرم! بولو۔ اس ناقابلِ تلافی غلطی کو ریورس کیسے کیا جائے؟“ ڈاکٹر آصف نے خاموشی کو توڑتے ہوئے نہایت ملائمت سے کہا۔

”پیا سا کنوئیں کے پاس جانے کے لئے تیار ہے۔ آپ ہی کنوئیں تک جانے کا بندراستہ کھول سکتے ہیں۔ اس سے بہتر طریقہ میرے ذہن میں نہیں آ رہا۔“ خرم نے بے تابی سے کہا۔

”حدیقہ مجھے کسی بل اکیلا نہیں چھوڑتی۔ جیسے وہ میرے دِن تنہا تھی۔ لیکن تمہاری باتیں سن کر بے تحاشا یاد آ گئی۔ آج میں اپنی بیٹی کے لئے کس قدر بے چین اور پریشان ہوں۔ وہ بے ضرری عورت بھی تو کسی کی بیٹی تھی۔ ہم ایسا کیوں نہیں سوچتے؟ اُس وقت جب دل میں جذبہ اُلفت بھی تھا، پھر بھی اُسے کمتر اور خود کو برتر جانا۔ اپنی بیٹی کے لئے مسرتوں سے لبریز زندگی کی تمنا اور پرانی بیٹی کے لئے وہی فرسودہ اور بے انصاف قانون کی مداح سرائی میں اس پر عمل درآمد ہونا، یہ تو ہمارے اخلاقیات کا لیول ہے۔ پھر ہماری افزائش نسل میں سکون اور خوشی کیسے آ سکتی ہے؟“ وہ دکھ بھرے لہجے میں بولے۔

”انکل! آپ کس سوچ میں پڑ گئے ہیں؟ میری چاہ و آرزو پر بھروسہ کیجئے۔ میں جو بھی کہہ رہا ہوں، صاف نیت اور سچے ارادوں کے ساتھ کہہ رہا ہوں۔ آپ کو کبھی شرمندہ نہیں کروں گا۔“ وہ بے قراری سے بولا۔

”بیٹا! میری ایک بات یاد رکھنا۔ چاہے تمہاری زندگی میں حدیقہ کے علاوہ کوئی اور بیوی ہی کیوں نہ آجائے، انصاف کے ترازو میں بیلنس نہیں رکھو گے تو اپنی زندگی کو دنیا کی فریب کاریوں میں الجھا کر کبھی تسکین حاصل نہیں کر سکو گے۔ بیوی کا شوہر بننے کے ساتھ ہی ایک باپ بن کر سوچنے سے اپنی ازدواجی زندگی کامیابی سے گزار پاؤ گے۔ یہ پلے باندھ لینا کہ وہ بھی کسی کی بیٹی ہے۔ میرے تلخ تجربات اور مشاہدات کا یہ نچوڑ ہے جو میں تمہیں بتا رہا ہوں۔“ لہجہ بہت مستحکم تھا۔

”کوئی اور میری زندگی کا شریک بھلا کیسے ہو سکتا ہے؟ جب میں نے اپنی تمام

غلطیوں اور کوتاہیوں پر ندامت سے بھرپور لفظوں کا سہارا لے کر معافی مانگنے کا فیصلہ کر ہی لیا ہے تو پھر کوئی اور کیوں؟ حقیقہ ہی کیوں نہ ہو۔ جس نے مجھے ٹوٹ کر پیار کیا تھا۔ ناؤ آئی ایم سیریس انکل! آپ کی مدد کے بغیر میں بالکل ہی ناکام رہوں گا۔“ وہ سر جھکا کر التجائیہ انداز میں بولا۔

”قدر ناشناس شوہر کو بیوی کبھی معاف تو نہیں کرتی۔ مگر میں حقیقہ کو پریشرا ناز کر کے اس سے اپنی بات منوانا نہیں چاہتا۔ اب وہ بچی تو ہے نہیں۔ بھئی ماشاء اللہ! برسر روزگار ہے۔ یہاں اس کا نام چلتا ہے۔ تمہاری خوش بختی ہوگی اگر وہ تمہیں اپنالے۔“ آصف فخر سے بول رہے تھے اور وہ شرمندہ ہوئے جا رہا تھا۔

”آپ ٹھیک فرما رہے ہیں۔ لیکن رسائی تو آپ کے توسط سے ہو سکتی ہے۔“ وہ چپیں بچیں کرتے ہوئے بولا۔

”تم نے مجھے کافی مشکل کام دے ڈالا ہے۔ سوچتا ہوں کہ کیسے اور کب یہ دھماکا کیا جائے کہ وہ پریشان بھی نہ ہو اور مان بھی جائے۔ فی الحال تو اس کی خاموشی سے اس کی طرف سے رضامندی کی ہلکی سی رمت بھی نظر نہیں آرہی۔“ وہ دکھ سے بولے۔

”وہ آپ کی خواہش کو ہرگز رد نہیں کرے گی۔ مجھے پوری اُمید ہے۔“ خرم پُر اعتماد لہجے میں بولا۔

”میں اپنی خواہش ہی تو اس پر مسلط نہیں کرنا چاہتا۔ وہ کہیں بدک گئی تو میں اس بھری دنیا میں بالکل تنہا ہو جاؤں گا۔ اب تو مجھے اس کے ساتھ رہنے کی عادت ہو گئی ہے۔“ وہ اُداس سے ہو کر بولے۔ لیکن پھر بھی میں یہی چاہوں گا کہ وہ اپنے خاوند کی ہو کر خوشیوں اور راحتوں بھری زندگی کو ویکلم کہے۔“

”تھینک یو انکل! میں آپ کا احسان زندگی بھر نہ بھولوں گا۔“ وہ مودبانہ انداز

میں بولا۔

”مجھے تھوڑا وقت چاہئے۔ ایک آئیڈیا آیا ہے۔ کیوں نہ ہارون اور شیریں سے مشورہ بھی کر لو اور حقیقہ تک ان کے ذریعے صلح جوئی کی عرضداشت بھی بھیج دو۔ بہت جلد تم اس کے خیالات کو جان لو گے۔“ وہ سوچتے ہوئے بولے۔

”انکل! شیریں نے بھی غلط فہمی کی بنیاد پر اتنا بڑا دکھ اٹھایا ہے کہ اب وہ میرے کسی کام نہ آتی ہے۔ نہ ہی کوئی مشورہ یا نصیحت کرتی ہے۔ اور ہارون، وہ تو حقیقہ کے نام پر نہ جانے کہاں کھو جاتا ہے۔ اس پر بھی تو اتنی بڑی تہمت لگ گئی تھی۔ اب

وہ حدیقہ سے قریب آنے سے بہت گھبرانے لگا ہے۔“ وہ بے بسی سے بولا۔
 ”کوشش تو کر دیکھو۔ شیریں، ماں جی اور ہارون اسے آسانی سے مناسکتے ہیں۔
 آخر وہ رشتوں کی نزاکت اور اہمیت کے لحاظ سے استحقاق تو رکھتے ہی ہیں۔ اور پھر
 حدیقہ تو حد درجہ بالحاظ اور وضع دار لڑکی ہے۔ سوچنے پر مجبور ہو جائے گی۔“ آصف پُر
 اُمید لہجے میں بولے۔

”انکل! میرا ساتھ کوئی نہیں دے گا۔ میں اکیلا ہوں۔ بس اس اکیلے پن کو
 مٹانے کا سہرا فقط حدیقہ کے سر جاسکتا ہے۔ اُف! اُس نے تو میرے غلامانہ رویے کو
 نہ بھولنے کی قسم ہی اٹھا رکھی ہے۔ انکل! آپ اس سے پوچھئے کہ کیا سچ کچ وہ مجھ سے
 نفرت کرنے لگی ہے؟ میری کچ اداؤں، دغا بازی اور بدسلوکی کو فراموش کر کے مجھے
 اپنی زندگی میں شامل کرنے کی جتنی شرائط ہیں، مجھے قبول ہوں گی۔ انکل! میں اسے
 پاتا چاہتا ہوں، صدقِ دل سے۔ اسے کہیے گا، مجھے اپنے احسانوں کا شیدائی بنالے۔“
 یہ کہتے ہوئے اس کی آواز بھرا گئی۔



جب سے صدیقہ اس دنیا سے رخصت ہوئی تھی، حدیقہ میں بلا کی سنجیدگی آگئی
 تھی۔ جسے آصف بھی بہت بری طرح محسوس کر کے اُداس ہو جایا کرتے تھے۔ وہ اُن
 کے پاس گھنٹوں بیٹھی رہتی مگر چہرہ خاموشی اور اُداسی کی داستان بنا رہتا۔ وہ اپنے بزنس
 میں جوں جوں آگے بڑھتی جا رہی تھی، ماں کی کم مائیگی کا وقت اتنا ہی شدت سے
 ستاتا تھا۔ راتوں میں بھی تڑپتی ہوئی اُٹھ کر بیٹھ جاتی۔ ماں کو آوازیں دینے لگتی کہ ماما!
 آپ نے تو اپنی تمام عمر دال روٹی کے حساب کتاب میں ہی گزار دی۔ اب آپ کی
 زندگی میں اطمینان و تسکین سے بھرپور دن آنے والے تھے تو آپ ہی چھوڑ کر چلی
 گئیں۔ ماما! آپ کی بیٹی نے تو اپنی کسپہری اور کم مائیگی سے دل لگا لیا تھا، اسے ہنس
 کر سینے سے لگا لیا تھا۔ کیونکہ مجھے ایسی زندگی سے نفرت ہو گئی تھی، جس کی جستجو میں
 آپ نے کانٹوں سے بھرا سفر گزارا تھا۔ اور میں نے بھی اسی کی تلاش میں اپنی ذات
 کو بے نشان و بے نام کر دیا تھا۔

جب وہ طمع اور لالچ چھوڑا تو ماما! رزق اور دولت مجھ پر عاشق ہو گئی۔ کیونکہ مجھے
 آپ کی دعائیں لگ گئیں۔ آپ پر دعاؤں کے دروازے بند ہو گئے تھے ماما! اس لئے
 آپ زندگی بھر اُٹھ نہ سکیں۔ جب فقر و مان سے سینہ تان کر زندگی گزارنے کا وقت آیا

تو پھر والدین کی دعاؤں نے آگے پیچھے اور دائیں بائیں سے گھیر کر اپنے پاس ہی بلا لیا۔ وہاں تو انہوں نے آپ کو معاف کر دیا ہوگا۔ جیسے آپ نے مجھے معاف کر کے سینے سے لگا لیا تھا، بالکل اسی طرح۔
وہ کر دے بدل کر سسک اٹھی۔

اُس کی کئی راتیں اسی تڑپ اور کسک میں گزرتی تھیں۔ اپنے پاپا آصف سے تو شیر کرنا معیوب سا لگتا تھا۔ کیونکہ مانوسیت ہوتے ہوتے بھی تو ٹائم چاہئے۔ اپنائیت اور لگاؤ کا مسئلہ تو تھا ہی نہیں۔ وہ خون کی کشش تھی یا اس کا اپنا ہی فسوں تھا کہ وہ ان سے نزدیک تو آتی جا رہی تھی مگر اپنا کوئی دکھ ان سے شیر نہ کرتی تھی۔ شروع میں ہی خرم کے بارے میں جتنا بتانا ضروری سمجھا، وہ انفارمیشن دے کر اب کبھی اس کا نام تک زبان پر نہ لاتی۔

وہ اپنے پاپا کے گھر میں بیگانوں کی طرح نہیں رہ رہی تھی۔ ان کی قربت میں جس تحفظ کا احساس تھا، اس کی تو کوئی قیمت ہی نہ تھی۔ شیریں سے ملنا جلنا نہ ہونے کے برابر تھا۔ ہارون سے تو کبھی آنکھیں چار نہ ہوئی تھیں۔

صبح اپنے آفس جانا، رات دیر تک کام میں الجھے رہنا اور واپس آ کر پاپا کو محو انتظار پانا۔ اسے دلی تقویت ملا کرتی تھی کہ کوئی تو اس کا جہاں میں اس کی آمد کا انتظار کرتا ہے۔ وہ فوراً ہی اس کے لئے مائیکرو میں کھانا گرم کرنے لگتے۔ اس کے ساتھ نیبل پر بیٹھ کر اس کی خاموش نگاہوں میں کھوئے رہتے۔ وہ انہیں کبھی منع نہیں کیا کرتی تھی کہ وہ اس کا انتظار نہ کیا کریں، سو جائیں۔ آرام کریں۔ اس کے کھانے کی فکر نہ کریں وغیرہ وغیرہ۔ وہ خاموش رہتی اور اس وقت کو انجوائے کرتی۔ ان کی ہر بات کا مسکراہٹ سے جواب دیتی اور وہی یہی دیکھ کر نہال ہو ہو جاتے تھے۔ پیار کے اظہار کے لئے لفظوں کی ادائیگی اہم نہیں تھی۔ دونوں کی باڈی لینگویج بے پناہ محبت کی نشاندہی کرنے کے لئے کافی تھی۔

آج سندے کی صبح تھی۔ باپ بیٹی دونوں ہی دیر سے اُٹھے۔ آصف نے ناشتہ گھر پر کرنے سے انکار کر دیا تو حدیقہ نے کھڑکی کھول کر آسمان پر اُچھتی نگاہ ڈالی۔ نیلا دھلا ہوا آسمان اپنی شان و شوکت سے براجمان تھا۔ دن کی روشنی میں معطر ہوا کے جھونکے جن میں خنکی تھی، اس کے چہرے کو تروتازہ کرتے ہوئے، وجود کی رگ رگ میں اتر گئے۔ اس نے پاپا کی طرف مسکرا کر دیکھا۔ وہی مسکراہٹ جو پاپا کے

لئے زبان کا کام کیا کرتی تھی۔

”میری بیٹا ناشتہ کے لئے کہاں جانا چاہتی ہے؟“ آصف پیار سے مغلوب ہو کر بولے۔

”میں کہ آپ؟“ وہ ہنستے ہوئے مختصر اُبولی۔ ”آپ کا من چاہ رہا ہو گا۔“

”میں اور حدیقہ۔ یعنی ہم دونوں۔“ وہ خوشگوار لہجے میں بولے۔

”کہیں بھی۔“ وہ مسکرا کر بولی۔

”اگر برانہ مانو تو ایک بات کہوں؟“ وہ تذبذب میں بولے۔

”جی پاپا!..... فرمائیے۔“ وہ حیرت سے چونک کر بولی اور غور سے پاپا کی نظروں کا جائزہ لینے لگی۔

”بات یہ ہے کہ.....“ وہ خاموش ہو گئے۔

”ماما یاد آرہی ہیں تو چلیں، فاتحہ پڑھ کر ناشتہ کے لئے نکل چلیں گے۔“ وہ سنجیدگی سے بولی۔

”ہوں۔ یہ تو لچنم نام ہو رہا ہے۔“ وہ کھڑکی کی طرف دیکھ کر بولے۔ ”سندے کا بریک فاسٹ تو غائب ہی ہو جاتا ہے۔“

”جی پاپا! تو تیار ہوتے ہیں۔ ماما سے مل کر.....“ وہ کہتے ہوئے چپ ہو کر آنسو ضبط کرنے لگی۔

”بیٹا! جو لوگ اس دنیا سے چلے جاتے ہیں اور پھر اتنی اذیت ناک زندگی

گزارنے کے بعد، وہ بہت خوش نصیب ہوتے ہیں۔ یہ دنیا تو دکھوں، مصیبتوں اور

تکلیفوں کی آماجگاہ ہے۔ اگلا جہان تو بہت خوب صورت ہے۔ اس کے چلے جانے

کے کرب کو بھول جاؤ۔ وہ وہاں بہت خوش ہے۔“ آصف نے تسلی دیتے ہوئے کہا تو

وہ رو پڑی۔ انہوں نے اسے سینے سے لگا لیا۔

دونوں تیار ہو کر آرام دہ، شاہانہ قسم کی گاڑی میں بیٹھ گئے۔ راستے بھر خاموشی

رہی۔ ایک پل کے لئے بھی دونوں نے ایک دوسرے سے بات نہ کی۔ دونوں کے

چہروں پر اُداسی اور ذہنی تناؤ کی لائینیں نمایاں نظر آرہی تھیں۔ دونوں کو اپنی اپنی جگہ

پچھتاوا تھا اور بے بسی و لاچارگی کے اس عالم میں کھوئے وہ صدیقہ سے ملنے کے لئے

پہنچ گئے۔

لج کرتے ہوئے آصف نے حدیقہ کی طرف پیار بھری نظروں سے دیکھ کر کہا۔
 ”ہاں تو بیٹا! میں آپ سے بات کسی اور نوعیت کی کرنا چاہ رہا تھا۔ لیکن صدیقہ
 کے ذکر پر میں بھول ہی گیا کہ بات کون سی کرنا چاہ رہا تھا۔“

”اب بتا دیجئے۔“ وہ بھی نہایت ملائمت سے بولی۔
 ”بیٹا! خرم تم سے ملنا چاہتا ہے۔“ وہ تیزی سے کہہ کر ایسے ری لیکس ہو کر بیٹھ
 گئے جیسے سر سے منوں بوجھ اتار پھینکا ہو۔ ”میں نے پہلے بھی ذکر کیا تھا۔

”میں جانتی ہوں پاپا!“ وہ سنجیدگی سے بولی۔
 ”تو پھر اسے کب کی ڈیٹ دوں؟“ وہ بھی سنجیدگی سے بولے۔
 ”میری زندگی کا ایک لمحہ بھی ان پر صرف کرنا سراسر زیاں ہے۔“ وہ تلخی مگر آہستگی

سے بولی۔
 ”بیٹا! تم عقل و شعور رکھتی ہو۔ نشیب و فراز میں گزرا ہوا تمہارا ماضی ایک بہت
 بڑے تجربے کا حامل ہے۔ پھر بھی تم ریکویسٹ کرتا ہوں کہ اسے ایک بار چانس دے
 دو۔“ وہ نرمی سے بولے۔

”چانس..... اور وہ بھی خرم جیسے بے دید، بے لحاظ اور بے فیض انسان کو؟.....
 نہیں پاپا! یہ نہیں ہو سکتا۔“ وہ دکھ بھرے لہجے میں بولی۔

”اگر میں صدیقہ سے اپنے گناہوں کی معافی مانگنے جاتا تو کیا وہ مجھے دھتکار
 دیتی؟“ وہ ملائمت سے بولے۔

”ہرگز نہیں پاپا! کیونکہ انہیں آپ کا ہر پل انتظار رہتا تھا۔ نہ جانے کیوں؟ جبکہ
 آپ نے آنے کا نشان تک نہ چھوڑا تھا، نہ ہی وعدہ کیا تھا لوٹ آنے کا۔ لیکن پھر بھی
 منتظر رہتی تھیں۔ اس کی وجہ ہے۔“ وہ کھانا کھاتے ہوئے بولی۔

”وجہ؟“ وہ سوالیہ انداز میں بولے۔
 ”آپ نے انہیں چھ مہینے تو پیار کیا تھاناں۔ جبکہ خرم نے مجھ پر ویسے کے فوراً
 بعد ظلم و ستم ڈھانے شروع کر دیئے تھے۔ پاپا! وہ بزدل اور ڈرپوک شوہر فیصلہ ہی نہ کر
 پایا کہ مجھے چھوڑ دے۔ اب میرے پاس واپس کیونکر آئے گا؟ میں اس کی الزام
 تراشیوں کو فراموش نہیں کر سکتی۔“ وہ روہانسی ہو گئی۔

”تمہیں پریشان کرنا مقصد ہرگز نہیں۔ اس کی خواہش تم تک پہنچانا میرا فرض بنتا
 ہے بیٹا!“ وہ سنجیدگی سے بول کر خاموش ہو گئے۔

”پاپا! آپ کا دل کیا کہتا ہے؟“ وہ سوچتے ہوئے بولی۔

”جسٹ ون چانس۔“ وہ آہستہ سے بولے۔

”آپ نے ایسا کیسے سوچ لیا؟“ وہ حیرت سے بولی۔

”میں نے خود کو اس کے سانچے میں ڈھال کر بہت گہرائی سے سوچا ہے۔ عورت گھر آباد کرتی ہے، اس میں مسرتوں کے شوخ و مشگ رنگ وہ بھرتی ہے۔ مرد کیا جانے یہ آرٹ۔“ وہ لمبی آہ بھر کر بولے۔ ”تمہاری ماں ایسی عورت تھی کہ وہ میرا گھر تو کیا، خاندان سنوار دیتی۔ بہت زیرک اور سمجھ دار خاتون تھی۔ مجھ سے پیار ہی اُس کا گناہ بن گیا۔ اسی جرم میں بے چاری بری طرح قید و بند کی صعوبتوں کے شکنجے میں جکڑی گئی۔ میں نہیں چاہتا کہ تم بھی ایک تنہا اور بے مقصد و بے معنی زندگی گزار جاؤ۔ میں تمہارا باپ ہوں، تمہاری بہتری ہی چاہوں گا۔ اگر تمہیں مجھ پر بھروسہ ہے تو۔“

وہ ان کا ہاتھ پکڑ کر سر جھکا کر رودی۔

”آپ پر بھروسہ تو پیدائش کے پہلے دن سے تھا پاپا! اگر آپ کی یہ خواہش ہے تو میں خرم سے مل لیتی ہوں۔ مجھے پہلی ملاقات میں ہی اندازہ ہو جائے گا کہ وہ کیا چاہتے ہیں۔“

وہ یہ فیصلہ سنا کر روتی رہی اور آصف اس کے سر پر ہاتھ پھیر کر تسلی دیتے رہے۔



آج وہ آفس سے جلدی ہی گھر آگئی تھی۔ تیار ہو کر اس نے آئینے میں اپنا سراپا دیکھا۔ دکھوں اور کرب ناک مسافت طے کرنے کے باوجود وہ بہت فریش لگ رہی تھی۔ من کی معصومیت اور شرافت تھی جو چہرے سے عیاں ہو رہی تھی۔ اس نے کالے رنگ کی کالڈنی ساڑھی پہنی ہوئی تھی۔ گوری اور پنک گردن پر ڈائمنڈ کا چھوٹا سا لاکٹ اور کانوں میں ڈائمنڈ کے ٹاپس میں وہ بہت گریس فل لگ رہی تھی۔ میک اپ چھوڑے ایک زمانہ بیت گیا تھا۔ آج اس نے اپنے پنک، بھرے ہوئے خوب صورت ہونٹوں پر ریڈ لپ اسٹک لگائی، خمار آلود بادامی آنکھوں میں ہلکی سی کاجل کی لائن لگا کر اسے عجیب لگ رہا تھا۔ کچھ سکی سی بھی ہو رہی تھی۔

پاپا سے نظریں چراتے وہ باہر نکل گئی۔ اسے جاتے دیکھ کر وہ دل ہی دل میں

مسکرا دیئے۔ اس پر بے تحاشا پیار آنے لگا۔

بالکل ماں کی طرح پاکیزہ اور معصوم ہے۔ نہ چاہتے ہوئے بھی میرا دل رکھ لیا۔

میری زبان سے نکلے ہوئے الفاظ کو اہمیت دے ڈالی۔ آخر بیٹی کس کی ہے۔ وہ دیوار پر آویزاں تصویر جو صدیقہ کی شادی کی تھی، اسے دیکھتے ہوئے سوچے جا رہے تھے۔ انہیں بیٹے ہوئے لمحے یاد آنے لگے۔ چہرے پر مسکراہٹ اور طمانیت کے بعد بچپن کی یادوں کے الم ناک سائے لہرانے لگے۔ ایک طرف محبت اور چاہ سے شادی کا بندھن بہت آسانی سے ٹوٹ جاتا ہے۔ یہ تو دو طرفہ ساز ہے، جس میں جذبات، محسوسات، ضروریات کے تاریک دوسرے سے ٹکرا کر سر کو جہنم دیتے ہیں۔ ہمارے درمیان رشتے کی ڈور اسی اصول کو مد نظر رکھ کر باندھی گئی تھی۔ وہ تو اسے مضبوطی سے پکڑے ہوئے تھی، میں ہی ایک سرا چھوڑ گیا اور وہ منہ کے بل ایسی گری کہ پھر اٹھ نہ سکی۔ اور مجھے جیون بھر کا دکھ اور درد دے کر اس دنیا کی نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ صدیقہ! ابھی تمہارے جانے کی عمر تو نہ تھی۔ وہ ہلک ہلک کر رونے لگے۔

وہ وہاں سے اٹھ کر گھر کے باہر پورچ کے سامنے کھڑے ہو گئے۔ لمبے لمبے سانس لینے سے طبیعت قدرے سنبھل سی گئی۔ شام گہری ہو رہی تھی۔ آسمان پر کہیں کہیں بادل کے ٹکڑے سرگرداں تھے۔ چاند ان سے آنکھ پجولی کھیلتے ہوئے کیسا شریر لگ رہا تھا۔ وہ دیکھتے ہوئے مسکرا اٹھے۔ آصف کو وہ رات یاد آگئی، جب آسمان پر ایسا ہی کھیل جاری و ساری تھا اور انہوں نے بے خود ہو کر صدیقہ کو بانہوں میں بھر لیا تھا۔ کیا یہ محبت تھی، عشق تھا، دیوانگی اور جنون تھا کہ دو جسموں کی ضرورت تھی؟ وہ خود سے سوال کئے جا رہے تھے۔ مگر جواب ذہن کے کسی بھی گوشے سے نہ ابھر رہا تھا۔

پھر ساتھ ہی ذہنی کی کڑواہٹ سے بھرپور باتیں اور نفرت انگیز حرکتیں یاد آنے لگیں۔ ان کی نظریں آسمان سے ہٹ کر زمین بوس ہو گئیں کہ کار کے سامنے رکنے سے وہ چونک گئے۔

حدیقہ واپس آگئی تھی۔ اتنی جلدی..... کیوں؟ ایک خیال ذہن میں آیا۔ ایک خندہ دل میں اٹھا۔

حدیقہ گاڑی سے نکلی اور اپنے نکلے پڑ سکون قدم اٹھاتی ہوئی آصف کے قریب آ کر پیار بھرے لہجے میں بولی۔

”مجھے علم تھا کہ بابا اکیلے گھبرا کر باہر نکل کر بیٹی کا راستہ دیکھ رہے ہوں گے۔

اس لئے میں آدھے راستے سے ہی واپس آگئی ہوں۔“

”بیٹا! خرم سے ملنا ضروری تھا۔“ وہ چونک کر بولے۔

”ان سے ملاقات کا وقت کل دوپہر پنج بریک پر درست رہے گا۔ اس وقت میں آپ کو اپنا وقت دینا چاہتی ہوں۔ ہم دونوں باہر ڈنر پر جلتے ہیں۔ آج میری آپ کے ساتھ ڈیٹ ہے پاپا! یو آر مور امپورٹنٹ دین خرم۔“ وہ مسکرا کر کہہ رہی تھی۔ آصف نے آنسو پیتے ہوئے اسے گلے لگا کر بھرپور دعا دی۔

”سدا سہاگن رہو۔“

حدیقہ نے ایک طر سے بھرپور قہقہہ لگایا۔



یہ سوچ کر اس کی تمام خوشی و طمانیت فوراً کافور ہو گئی کہ کیا وہ خرم کو اتنا بڑا دھوکا دے سکتی ہے جس کے بارے میں انجام کا اندازہ لگائے بغیر ہی وہ فیصلہ کر چکی ہے۔ کیا میں اپنے نامہ اعمال میں جھوٹ، دھوکہ، مکر و فریب جیسی لعنت لکھوا کر مطمئن رہ سکتی ہوں؟ یہ کیسے ممکن ہے کہ گندم بونے کے بعد فصل چاول کی کاٹنے کی امید رکھوں۔ میں ابھی بھی نہایت بے وقوف اور احمق ہوں۔ اپنی غلطیوں اور گناہوں سے چشم پوشی کر رہی ہوں۔ میں یہ تسلیم کرتی ہوں کہ میں تمہاری قربت کے بغیر بھی تمہارے نام کو چھتے زندگی بٹا سکتی ہوں۔ کیونکہ نے گزرے ہوئے کل میں بھی تم سے بے تحاشا پیار تھا۔ اور تم آج بھی میرے دل کے نہاں خانوں میں چار سال کی دوری اور جدائی کے باوجود آباد ہو۔ مجھ سے دعا اور بے وفائی کرنے کے باوجود تمہیں بھول نہیں سکی۔ بھولنے کی ایکٹنگ ضرور کرتی رہی۔ مجھ سے تحفظ اور سائبان چھین کر تم نے پلٹ کے نہ دیکھا کہ دیارِ غیر میں، میں کس حال میں ہوں۔ بچ منجھوڑ کر لا لعلق ہو گئے۔ یہ دکھ معمولی نہ تھا۔ اس درد کی شدت سے نکلنے کے لئے میں نے وقتی، عارضی اور شیطانی سہاروں پر بھروسہ کر لیا۔ اور اس مرد پر یقین کر لیا جو میری پیشانی پر کلک تھا۔ اُسے اپنی اجڑی ہوئی تاریک زندگی میں مشعلِ راہ کیسے تصور کر بیٹھی؟ ہارون! میں نے تمہیں اپنی تنہائی کو مٹانے کی خاطر اپنی مقررہ حدود کو پار کرنے کی اجازت کیونکر دے ڈالی؟ جس کا نتیجہ کتنا بھیانک نکلا کہ وہ راہبر بن کر زندگی میں داخل ہوا اور میری عزت و نسوانی وقار کی دھجیاں اڑانے والا لٹیرا بن کر نکل گیا۔ اس نے اپنی زندگی سنوار لی اور مجھے نہ تمہارے قابل چھوڑا، نہ تمہارے خاندان کے قابل۔ میں اس کی شکل دیکھنے کی روادار نہیں ہوں۔ تمہیں پا کر اس کے ساتھ ایک دنیا داری کے اصولوں اور قانون کو کیسے استوار کر سکتی ہوں؟ تمہارے خاندان میں

شمولیت مجھے ہر دم کالج کی کرسیوں کی مانند چکنا چور کرے گی۔ میں خود سے آنکھ نہیں ملا سکوں گی۔ ہارون کا کس منہ سے سامنا کیا کروں گی؟ بڑی مشکل آزمائش ہوگی میرے لئے۔ مجھے خود سے گھن آنے لگی ہے۔ گریبان میں جھانکوں تو اپنے وجود کی بدبو اور سرائٹ میں دم گھٹنے لگتا ہے۔ تم اس سے کیسے محفوظ رہ سکتے ہو؟ ایک نہ ایک دن حقیقت کو پالو گے تو پھر میں تمہاری نظروں سے گرنے کا دکھ تو برداشت کر لوں گی، اپنی نظروں سے گرنے کا کرب مجھے ہلاک کر دے گا۔

میں تو عورت کے نام پر دھبہ ہوں خرم! جو عورت پہلی نظر میں مخالف جنس کے ذہن و قلب میں ابھرنے والی شوریدہ سری کو محسوس نہ کر سکے، اس کی نظروں کی عبارت کو نہ پڑھ سکے، وہ عورت نسلوں کو تباہ و برباد کر ڈالتی ہے۔ میں کیا ہوں؟ نہ فرمانبردار بیٹی ثابت ہوئی، نہ ہی ننگسار دوست اور وفا شعار، تابعدار بیوی اور نہ ہی دُور اندیش، باریک بین عورت ہونے کا شرف حاصل کر سکی۔ آج اپنے ناپاک اور غلیظ وجود پر تمہارے نام کا رزق برقِ مخمیں پہناتا مجھے پاکبازی بخش سکتا ہے، نہ ہی میری کھوئی ہوئی عزت و تحریم کو بحال کر سکتا ہے۔ میری شخصیت میں آج بھی ادھورا پن موجود ہے۔ کیونکہ میرا بچپن جو باپ کی محرومی کے احساس میں نامکمل اور ادھورے پن کا شکار رہا، جوانی تلخیوں اور کڑواہٹ کے ساتھ براہِ جان ہوئی تو تم میں خود کو مکمل ہوتے دیکھا۔ جو ایک بہت بڑی بھول تھی۔

تو کیا یہ ہے میرا پیار، وفا اور چاہت اپنے شوہر سے؟..... یہ ہے میری اتنا، خودداری اور غیرت کہ اسے دھوکہ دے ڈالوں؟ تم تو مجھے وفا کی پٹلی اور ایثار و پیار کی دیوی کا نام دینے لگے ہو۔ خرم! میں تو ایک گالی بن گئی ہوں۔ بے ہودہ اور فحش گالی۔ ویران، اجڑی ہوئی، بنجر اور بدنما کردار کی عورت ہوں۔ ان خصلتوں کے ساتھ میں اپنا تار تار گھونسا کس بل بوتے پر دوبارہ تعمیر کر سکتی ہوں؟ وفا، ایثار، محبت و لگاؤ کے نٹکوں کو کہاں تلاش کروں؟..... اُف! یہ تو اپنے وجود میں گردش کرنے والے خون میں ہی سراپت کرتے رہتے ہیں جنہیں میں نے خون سے نکال کر جلا دیا۔ اب اس کی راکھ سے گھونسا کیسے بن سکتا ہے؟ گھونسلے کا ہر تنکا ایثار و وفا سے مضبوط اور اٹوٹ بنتا ہے۔ اور انہی کی مضبوطی سے ایک محل تعمیر کیا جاتا ہے، جس پر کسی جھکڑ، آندھی اور تیز و تند طوفان اثر انداز نہیں ہوتے۔ دھوکے اور جھوٹ کی بنیاد پر ہمارا گھونسا ہلکی سی جنبش سے ملیا میٹ ہو جائے گا۔“ وہ عالمِ وحشت سے کانپنے لگی۔ ”اور شیریں اور بچے ایک

دم سے لاوارث ہو جائیں گے جب یہ جان لیوا راز افشا ہو گیا۔“

پانی پی کر اپنے تمام جذبات پر قابو پا کر خیالات کے دھارے کا رخ بدل کر مسکرا دی۔ جب اللہ تعالیٰ مجھے گولڈن چالس دے رہا ہے تو فائدہ اٹھانا میرا حق بنتا ہے۔ ہم دونوں ایک دوسرے کے لئے بنے نہ ہوتے تو آج قسمت ہم پر تمام راہیں یوں نہ کھول دیتی۔ آج کی شناخت کرو، کل سے بے فکر ہو جاؤ۔ وہ اپنے ذہن میں اُبھرنے والی تمام مثبت و منفی سوچوں کو کھرچ کر کمرے میں آگئی۔ مگر دل بے سکون اور بے تاب ہو کر تڑپ اٹھا تھا۔ گلٹ سر چڑھ کر بولنے لگا تھا۔ ضمیر نے جھنجھوڑ کر دُہائی چا ڈالی۔ حدیقہ! اس امتحان پر پوری نہ اُتری تو تمہیں جینے کا حق نہیں۔ کیونکہ عورت تو ایثار، وفا اور چاہ کے ضمیر سے اٹھائی گئی ہے۔

وہ بے سدھ سی ہو کر نیچے پر گر گئی اور آنسو بہتے چلے گئے۔ نہ جانے کب اس کی آنکھ لگ گئی۔

موبائل کی بیپ مسلسل بج رہی تھی۔ کافی دیر بعد وہ آنکھیں ملتی ہوئی بیٹھ گئی۔ وال کلاک کی طرف دیکھ کر بڑبڑائی۔ آج خرم کو لُچ پر بلا کر اپنا فیصلہ سنانا مقصود تھا۔ بے چارا انتظار کر رہا ہوگا۔

اس نے بے دلی اور بے سکونی سے موبائل آن کیا۔ دوسری طرف شہد میں ڈوبی ہوئی آواز اُبھری۔ وہی آواز جو ہمیشہ اسے دیوانہ اور پاگل کر دیا کرتی تھی۔ میٹھی اور مسکون آواز۔

حدیقہ کی آنکھیں اشکبار ہو گئیں۔ مری ہوئی آواز میں برلا۔

”خرم! آپ نے بہت دیر کر دی۔ میں آپ کے قابل نہ تو پہلے تھی، نہ ہی اب ہوں۔ جس حدیقہ کو آپ اپنانا چاہتے ہیں، وہ تو اُس دن قتل کر دی گئی تھی، جس دن آپ نے دوسری شادی کر لی تھی۔ اب حدیقہ ڈھونڈے سے بھی نہیں ملے گی۔ وہ چار سال کی دُوری اور جدائی میں مسافت طے کرتے کرتے راہوں کی دھول بن کر فضاؤں میں تحلیل ہو چکی ہے۔ وہ پہلے بے حیثیت نہیں تھی، آج بے وقعت ہو گئی ہے۔ اللہ تعالیٰ انسان کو وہیں سے آزماتا ہے جس پر اُسے کبر و پندار ہوتا ہے۔ مجھے اپنی پاکبازی اور تقدس پر بہت غرور تھا۔ وہی امتحان بن گیا۔ آپ کی جدائی، کرب، تنہائی اور آپ کی طرف سے بے اعتنائی نے میری عقل و سمجھ پر پردہ ڈال دیا۔ اور میں نادیدہ انجام تک پہنچ گئی۔ نہ چاہتے ہوئے بھی میری معصومیت، میری ناتجربگی اور

لاوارثی میرا گناہ کبیرہ بن کر میرے نصیب کو داغ دار کر گئی۔
 ”حادی! تم جس ماں کی بیٹی ہو، اسے ایسی باتیں زیب نہیں دیتیں۔“ وہ حیرت سے بولا۔

”میری ماں بہت عظیم تھی۔ وفا و ایثار اس کا ایمان تھا۔ محبت و چاہت اس کا مذہب تھا۔ کوہ ہمالیہ کی مانند مضبوط اور بلند تھی۔ وہ ایک ایسا نگینہ تھی، جس میں فقط وفا کا رنگ منور تھا۔ کاش! میں اُن جیسی ہوتی۔“ وہ حسرت و یاس سے بولی۔
 ”حادی! تم اپنا مقام معلوم کرنا چاہتی ہو تو میرے دل میں جھانک کر دیکھو۔ تمہارا درجہ بہت اعلیٰ ہے۔ گوہر وفا ہو تم۔ محبتوں اور لگاؤوں کا سرچشمہ ہو تم۔ مجھے فیض یاب ہونے کا موقع دے ڈالو فقط ایک بار۔ یہ احسان زندگی بھر نہیں بھولوں گا۔“ وہ التجائیہ لہجے میں بولا۔ ”میرے ساتھ ایک مٹی سی گڑیا بھی تمہارے سینے لگنے کو بائیں پھیلائے منتظر ہے۔ اُس کا مان رکھ لو۔“

”یہ فیصلہ میں نے اپنے سچے اور کھرے پیار اور اپنی اُن مٹ وفا کو مدِ نظر رکھ کر کیا ہے۔ یہ فیصلہ میری وفا کی مجبوری ہے۔ اسی میں زمانے اور حالات کی ملاوٹ ہو گئی ہے۔ فقط ایک غلیظ اور ناپاک قطرے کی آمیزش سے وفا میں دراڑ پڑ گئی ہے۔ میں اس دراڑ کو اپنے ایثار و قربانی سے جوڑنا چاہتی ہوں، وفا کی سلامتی کے لئے۔ گڑیا کے لئے میں ایک بہترین مثال نہیں ہوں خرم! مجھے اتنا اعلیٰ مقام سوچ کر شرمندہ نہ کریں۔ بتابی و بربادی بھی سلسلوں میں چلتی ہے۔ مجھ سے کوئی سوال مت کیجئے گا۔ کہیں میرا ادا کردہ ایک لفظ چار سو طوفان برپا نہ کر دے۔ بس میں قصور وار ہوں۔ مجھے سزا ملنی چاہئے۔ اور مجھے ہنس کر سولی چڑھ جانا چاہئے۔“ وہ سختی سے بولی۔

”جرم تو مجھ سے اشارت ہوا تھا۔ اور اس کی سزا کا میں حقدار ہوں۔ تم نہیں۔ میں تم سے کسی قسم کا سوال کرنے کا سزاوار نہیں ہوں۔ تم جو بھی ہو، جیسی بھی ہو، میری حدیقہ ہو۔ میری زندگی کا ساتھی اور رازداں، میرے دل کا سکون اور روح کی ٹھنڈک ہو۔ میری نئی نسل کا نام اور اس کی پہچان تم سے ہی چلے گی حادی! آئی تو یو۔“ وہ جذباتی سا ہو گیا۔

”یو آر ٹو لیٹ خرم! مجھے خود کے ساتھ رہنے کا اختیار تو ہے۔ آپ کو پا کر میں اپنی ہستی، اپنی ذات سے بے گانہ نہیں ہونا چاہتی۔ میرا ضمیر ہر دم مجھے نہ ہونے کا احساس دلا کر گھائل کرتا رہے گا۔ اس زخم کے درد کو مجھ میں برداشت کرنے کی ہمت و سکت

نہیں ہوگی۔ خرم! مجھے معاف کر دیجئے۔ اس پیار، وفا اور چاہ کے صدقے میں جو ہر حال میں زندہ جاوید رہی۔ عورت، مرد کی کھیتی ہے۔ اگر آپ نے اپنی کھیتی میں پیار و محبت کے بیج بوئے ہوتے تو آج محبتوں کے تناور درختوں کے سائے میں ہم سستا رہے ہوتے۔ ہم دونوں ہی کھلے آسمان کے تلے نیچے سر اور برہنہ پاؤں چلتے ہوئے حیات کے آخری سرے تک پہنچ کر مڑ کر دیکھے بغیر اگلی دنیا کا سرا پکڑ کر کس منہ سے اللہ تعالیٰ کا سامنا کریں گے؟ میں یہ سوچ کر دہل گئی ہوں خرم! آپ اور میں دونوں ہی قصور وار ہیں۔ میں آپ کو اندھیری دنیا کا اسی بنا کر اپنے گناہوں میں مزید اضافہ نہیں کر سکتی۔ مجھے خود کے ساتھ رہنے دیجئے۔ اگر سچ بچ آپ کو مجھ سے پیار ہے۔“

وہ زار و قطار رو رہی تھی۔ اس برہمتوں کا دروازہ کھل گیا تھا۔ دل میں تسکین نے

نے کروٹ بدلی۔ وہ ہلکی پھلکی ہو گئی تھی۔

”حادی! محبت کی کبھی انتہا نہیں ہوتی۔ کبھی موت لاحق نہیں ہوتی۔ جسم مر جاتے ہیں، روح ازل سے ابد تک زندہ رہتی ہے۔ تمام خدشات سے باہر نکل آؤ پلہیز! میں اپنی ہر غلطی مانتا ہوں۔“ وہ پیار بھرے لہجے میں بولا۔ ”ذرا اپنے دل سے پوچھو کہ میں وہاں موجود ہوں کہ نہیں؟“

”اب آپ سے دوری ہی تو میری محبت کی جاودانی ہے خرم! میری وفا کی درخشانی ہے اور میرے ایثار کی اُن مٹ کہانی ہے۔“ اس نے مستحکم لہجے میں کہا اور فون بند کر دیا اور دراز سے ٹراکٹولا زرنکال کر نکل لی اور تکیے پر سر رکھ کر اپنے بالوں میں انگلیاں پھیر کر خود کو سہلانے لگی۔

دوسری جانب خرم نے کھلی ہوئی زینب کی طرف دیکھ کر مستحکم لہجے میں کہا۔

”گڑیا! تمہاری ماں کو واپس لانا میرے اختیار میں نہیں تھا۔ مگر شاید ابھی بھی اس ماں پر میرا اختیار ہے۔ گڑیا اپنی ماں کو لینے جائے گی۔ کیونکہ میری نیت سچی، ارادہ نیک اور فیصلہ مستحکم ہے۔ آئی لو یو حدیقہ!“

اُس نے زینب کو اٹھایا اور اوپر اُچھال دیا۔ چہرے پر اُمید و بیم کے سائے لہرا رہے تھے۔

(تمت بالخیر)